بہنوں کا اپنا ماہنامہ

اپریل 2016

شعاع

سُمیرا حمید کا مکمل ناول

ربّ البشر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING SECTION
Online Library For Pakistan
READING SECTION
Online Library For Pakistan
READING SECTION
Online Library For Pakistan
READING Section

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

رضیہ جمیل

آذر ریاض

امت الصبور

شاہین رشید

خالدہ جیلانی

MEMBER
AP
CR

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

Downloaded From Paksociety.com

پاک سوسائٹی

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، زاہد قاسمی 11
نعت، زاہد قاسمی 11
نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

بندھن، دانش تیمور 24
شادی مبارک ہو، آسیہ رزاقی 32
دستک، شاہین رشید 28
جب تجھ سے ناتا، گل ارم 17

ناول

خواب شیشے کا عفت سحر طاہر 36
رقصِ بسمل، نبیلہ عزیز 216

مکمل ناول

ربّ البشر سمیرا حمید 108
محبت مارچ کا موسم، سائرہ رضا 162

ناولٹ

سیاہ حاشیہ، صائمہ اکرم 226
کوئی تعویذ ہو، سمیرا یونس 74

افسانے

میں ہوں نا، بنت سحر 59
جگنو، حاجرہ ریحان 156
رشتے زمانے کا، مصباح علی 67
کھلے گلاب، مریم بنت ارشاد 102
کس سفر میں ہے، سدرۃ المنتہیٰ 259

نظمیں غزلیں

غزل، محسن احسان 267
نظم، ڈاکٹر طاہر مسعود 266
غزل، لطیف ساحل 266

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 7000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

مستقل سلسلے

خط آپ کے، رضیہ جمیل 274
مسکراہٹیں، ادارہ 268
آئینہ خانے میں، واصفہ سہیل 285
بالوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 270
کھلتا کسی پہ، خالدہ جیلانی 273
تاریخ کے جھروکے، امت الصبور 282
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 288
خوبصورت بنئے، ادارہ 290

اپریل 2016
جلد 30 شمارہ 8
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام ۲۱ این ۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

رگِ سنگِ گل

پہلی شعاع

شعاع اپریل کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار مختلف پیرائے میں کرتا ہے۔ اور اظہار کا انداز ہی اس کی شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ انسان اپنی گفتگو کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ الفاظ جب ترتیب پاکر گفتگو میں ڈھلتے ہیں تو تب یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہمارا مخاطب کس شخصیت کا مالک ہے۔

اگرچہ الفاظ بجائے خود اپنے اندر معنی کا ایک جہاں رکھتے ہیں۔

نشتر کی صورت بھی رکھتے ہیں اور مرہم کی خاصیت بھی۔

دل داری کے رمز سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور بے رخی کے کاری چرکے لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔

یہ الفاظ ہی ہیں جو زندگی میں رنگ بھرتے ہیں اور مسرتیں بھی لیکن۔ دل کو غم کدے میں بدلنے کا ہنر بھی ان ہی کے پاس ہے۔

مگر یہ تمام الفاظ اس وقت زندگی پاتے ہیں جب برتنے والا ان پر قادر بھی ہو اور غالب بھی۔

اس لیے الفاظ کا سوچ سمجھ کر استعمال ہی دانائی ہے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی پشیمانی کے گہرے سمندر میں غرق کر سکتی ہے۔

بسا اوقات زندگی میں ایسے مقامات بھی آجاتے ہیں جہاں الفاظ گونگے ہو جاتے ہیں۔ اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ خاموشی کلام کرنے لگتی ہے۔

اور خاموشی وہیں کلام کرتی ہے جہاں دوستی اور محبت کے انمول اور حقیقی رشتے موجود ہوں۔

اس شمارے میں،

- سمیرا حمید کا مکمل ناول ۔ ربّ البشر،
- سائرہ رضا کا مکمل ناول ۔ محبت مارچ کا موسم،
- صائمہ اکرم اور سمیرا یونس ہارون کے ناولٹ،
- مصباح علی، بنت سحر، مریم بنت ارشاد، ہاجرہ ریحان اور سدرۃ المنتہیٰ کے افسانے،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے ۔ قارئین کا سلسلہ،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- دانش تیمور اور عائزہ خان کا بندھن،
- شعاع کے ساتھ ساتھ ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

اپریل کا شمارہ آپ کو کیسا لگا، خط لکھ کر ہمیں اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

www.Paksocietu.com

حمد باری تعالیٰ

کروں حمد تیری میں اے خدا، تیری شان جَلَّ جلالہٗ
تُو ہی سب جہانوں کا بادشاہ، تیری شان جَلَّ جلالہٗ

بسا ہر جہاں میں نیا جہاں، یہ زمین ہو کہ آسماں
تیرا ذکر جاری ہے جا بہ جا، تیری شان جَلَّ جلالہٗ

تیرے در پہ جھکتا ہے کُل جہاں، یہ ملائکہ سب ہی انس و جاں
تیری حمد کرتے ہیں سب سدا، تیری شان جَلَّ جلالہٗ

تیری ملک ساری ہے کائنات، تیرے فضل سے ہیں یہ دن رات
شمس و قمر میں تیری ضیاء، تیری شان جَلَّ جلالہٗ

ہیں رسولِ آخری مصطفیٰؐ، جو ہیں باعثِ رحمتِ کُل جہاں
سبھی انبیاءؑ کے ہیں پیشوا، تیری شان جَلَّ جلالہٗ

میرے حال پر ہے تیری نظر، میری سب خطائیں تُو معاف کر
تیرے بن نہیں کوئی آسرا، تیری شان جَلَّ جلالہٗ

تیرا نام ہو وردِ زباں، دمِ واپسی میرے مہرباں
کرے تجھ سے زاہد یہ التجا، تیری شان جَلَّ جلالہٗ

زاہد قاسمی

جو نبیؐ کے قریب ہوتے ہیں
اُن کے روشن نصیب ہوتے ہیں

اُمتی جو درود پڑھتے ہیں
مصطفیٰؐ کے قریب ہوتے ہیں

پیروی جو سدا نبیؐ کی کریں
وہ ہی ربّ کے قریب ہوتے ہیں

درد رکھیں جو اُن کا سینے میں
آقاؐ اُن کے طبیب ہوتے ہیں

رتبہ آقاؐ کا جو نہ سمجھ پائیں
وہ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں

دل میں غم، آنکھ میں آنسو
وقتِ رخصت نصیب ہوتے ہیں

اُن کے قدموں میں آ گیا زاہد
کس کے ایسے نصیب ہوتے ہیں

زاہد قاسمی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

اللہ کے منع کردہ کاموں کا بیان

غیبت کے حرام ہونے اور زبان کی حفاظت کرنے کا حکم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ تم اسے ناپسند سمجھو گے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً" اللہ تعالیٰ بہت رجوع کرنے والا نہایت مہربان ہے۔" (الحجرات۔12)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کا تمہیں علم نہیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب ہی سے باز پرس ہوگی۔" (الاسرا۔36)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "انسان جو لفظ بھی بولتا ہے، تو اس کے پاس ہی ایک نگران تیار ہے۔" (ق۔18)

امام نووی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں : "معلوم ہونا چاہیے کہ ہر مکلف انسان کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی زبان کی، ہر قسم کی گفتگو سے حفاظت کرے، صرف وہ گفتگو کرے جس میں مصلحت واضح ہو اور جہاں مصلحت کے اعتبار سے بولنا اور خاموش رہنا دونوں برابر ہوں تو پھر خاموش رہنا سنت ہے، اس لیے کہ بعض دفعہ جائز گفتگو بھی حرام یا مکروہ تک پہنچا دیتی ہے اور ایسا عام طور پر ہوتا ہے۔ اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں۔"

خاموشی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ یا تو بھلائی کی بات کہے ورنہ خاموش رہے۔" (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے واضح ہے کہ گفتگو اسی وقت مناسب ہے جب اس میں کوئی بھلائی ہو۔ اور یہ وہی بات ہے جس کی مصلحت ظاہر ہو۔ اور جب مصلحت کے ظہور میں (یقین کی بجائے) شک ہو تو پھر گفتگو ہی نہ کرے۔

فوائد : اس سے فضول گوئی کی شناعت اور بے فائدہ گفتگو نہ کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

سب سے افضل

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! مسلمانوں میں سے کون افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔" (بخاری و مسلم)

زبان کی حفاظت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص مجھے اپنے دو جبڑوں کے درمیان والی چیز (زبان) اور اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان والی چیز (شرم گاہ) کی حفاظت کی ضمانت دے دے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : دو جبڑوں کے درمیان زبان ہوتی ہے اور دو ٹانگوں کے درمیان شرم گاہ۔ ان دونوں کی حفاظت پر جنت کی بشارت ہے۔ حفاظت کا مطلب ہے کہ ان کا استعمال صرف جائز جگہوں پر کیا جائے اور ناجائز

استعمال سے ان کی حفاظت کی جائے۔

بے سوچے سمجھے بات کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"بندہ ایک بات کرتا ہے، اس میں غور و فکر نہیں کرتا، وہ اس بات کی وجہ سے مشرق و مغرب کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ جہنم کی آگ کی طرف گر جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں زبان کی بے اعتدالی کے نقصانات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان ہر بات کرنے سے پہلے اسے تولے اور پھر بولے۔

توجہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بندہ اللہ کی رضامندی کی بات کرتا ہے، اس کی طرف اس کی توجہ بھی نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے کئی درجے بلند فرماتا ہے۔ اور بندہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی والی بات کرتا ہے۔ جس کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں ہوتا لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔" (بخاری)

کلمۂ خیر

حضرت ابو عبدالرحمٰن بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آدمی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی بات کرتا ہے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں تک پہنچے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے لیے قیامت کے دن تک اپنی رضامندی لکھ دیتا ہے۔ اور آدمی (بعض دفعہ) اللہ کی ناراضی کا کوئی بول بولتا ہے، اسے گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں تک پہنچے گا، اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے لیے اپنی ملاقات کے دن تک اپنی ناراضی لکھ دیتا ہے۔"

(اسے امام مالک نے مؤطا میں روایت کیا ہے، نیز اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس حدیث میں بھی ایک ایسی حقیقت کا بیان ہے۔ جس کا عام مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ آدمی زبان سے ایسا کلمۂ خیر ادا کرتا ہے۔ جس سے کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے، یا اس کی اصلاح ہو جاتی ہے یا وہ ظلم و معصیت کے ارادے سے باز آجاتا ہے تو یقیناً" یہ کلمۂ خیر عنداللہ بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اور اسی طرح بعض دفعہ انسان کی زبان سے ایسا کلمۂ شر ادا ہو جاتا ہے کہ اس کو اس کی تباہ کاری و حشر سامانی کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن اس کا کلمہ کسی کی دل آزاری، یا گمراہی یا ظلم و معصیت کا باعث بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ زبان کی حفاظت اور اس کا صحیح استعمال نہایت ضروری ہے، ورنہ یہ انسان کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے گی۔

سب سے بڑا خطرہ

حضرت سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے ایسی بات بتایئے۔ جس کو میں مضبوطی سے پکڑ لوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم کہو: میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ۔"

میں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے زیادہ خطرے والی چیز، جس کا آپ کو مجھ سے اندیشہ ہو، کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑی، پھر فرمایا:

"یہ زبان۔"

(اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے۔)

فوائدومسائل :

1۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی ربوبیت پر ایمان، یہ تمام اعمال صالحہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر کسی عمل کی عنداللہ کوئی اہمیت نہیں۔

2۔ اس پر استقامت کا مطلب ہے کہ اس کی رضا اور عدم رضا کو ہروقت سامنے رکھا جائے۔ اس کے اوامر کو بجالایا جائے تاکہ وہ راضی ہو جائے اور نواحی سے بچا جائے تاکہ وہ ناراض نہ ہو۔ زبان کی حفاظت کی تاکید بھی اسی لیے ہے کہ زبان کی بے احتیاطی سے انسان غضب الٰہی کا مورد نہ بن جائے۔

دل کی سختی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کے ذکر کے علاوہ باتیں زیادہ نہ کرو، اس لیے کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ دیگر زیادہ باتیں، دل کی سختی ہے۔ اور لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور سخت دل (والا آدمی) ہے۔" (ترمذی)

فوائدومسائل :

1۔ دل کے سخت ہونے کا مطلب ہے کہ حالات و واقعات سے وہ عبرت و موعظت نہ پکڑے اور وعظ و نصیحت سے کوئی اثر قبول نہ کرے۔

۔2 اللہ کے ذکر کے بجائے فضول باتوں سے قلوب انسانی سخت ہو جاتے ہیں جو نہایت بدبختی کی علامت ہے۔ اس لیے انسان کو اللہ کا ذکر ہی کثرت سے کرنا چاہیے۔

زبان پر قابو

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! نجات کس طرح ممکن ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنی زبان کو قابو میں رکھو، تمہارا گھر تمہیں اپنے اندر سما لے (تمہارا فارغ وقت گھر کے اندر ہی گزرے) اور اپنی غلطیوں پر خوب روؤ۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائدومسائل :

1۔ لوگوں سے زیادہ میل جول اور ان سے گپ شپ میں انسان کے دین کو بہت خطرات لاحق رہتے ہیں، اس لیے زیادہ اختلاط کے بجائے گھر میں اللہ کی اطاعت اور ذکر و فکر اور تلاوت وغیرہ میں اپنے فارغ اوقات کو صرف کرنا بہت بہتر ہے۔

2۔ اسی طرح تنہائیوں میں اپنی خطاؤں اور لغزشوں پر رونا بھی اللہ کا بہت پسندیدہ ہے، اس حدیث میں زبان کی حفاظت کے علاوہ ان دوباتوں کی بھی تاکید ہے۔

اللہ کا ڈر

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب انسان صبح کرتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضاء زبان سے نہایت عاجزی سے عرض کرتے ہیں، کہتے ہیں تو ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرنا، اس لیے کہ ہمارا معاملہ تیرے ساتھ وابستہ ہے، اگر تو سیدھی رہے گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اگر تو نے کجی اختیار کی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔" (ترمذی)

فوائدومسائل :

1۔ اس سے واضح ہے کہ زبان کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا کتنا ضروری ہے کہ زبان کی ذرا سی بے اعتدالی کی سزا پورے جسم انسانی کو بھگتنی پڑتی ہے۔ لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو مار جسم ہی کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ بعض دفعہ جسم کو ہمیشہ کی نیند تک سلا دیا جاتا ہے۔

2۔ "ٹیڑھے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ زبان کے ٹیڑھے پن کی زد پورے جسم پر پڑتی ہے اور سیدھے رہنے کا مطلب ابتلاو آزمائش سے محفوظ رہنا ہے۔

3۔ ایک دوسری حدیث میں دل کو تمام جسم انسانی کی

اصلاح یا فساد کا باعث بتلایا گیا ہے‘ جب کہ اس حدیث سے زبان کا یہ مقام واضح ہوتا ہے۔ تو ان میں باہم کوئی تعارض نہیں۔ اس لیے کہ زبان دل کی جانشین اور اس کی ترجمان ہے اور انسان‘ زبان اور دل دونوں کے مجموعے سے عبارت ہے اور آدمیت انہی دونوں چھوٹی چیزوں کا نام ہے۔ ایک عربی مفکر نے کیا خوب کہا ہے۔ ”آدمی کی زبان نصف ہے اور اس کا دل دوسرا نصف ہے۔“

غیبت کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب مجھے معراج کرائی گئی تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے‘ وہ (ان سے) اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔

تو میں نے پوچھا:

”جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟“

انہوں نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں (غیبت کرتے ہیں) اور ان کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ لوگوں کا گوشت کھانا کنایہ ہے غیبت کرنے سے۔

2۔ عزتیں پامال کرنے سے مراد لوگوں کے سامنے برائی بیان کر کے ان کی ساکھ اور وقار کو مجروح کرنا ہے‘ یہ سب باتیں حرام اور سخت ممنوع ہیں۔

3۔ مذکورہ سزا سے اس جرم کی قباحت واضح ہے۔

حرام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ہر مسلمان کا خون‘ اس کی آبرو اور اس کا مال دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اسلام میں خون‘ عزت اور مال‘ ان سب کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی مسلمان کی عزت و آبرو پر حملہ کرے یا اس کا مال ہتھیائے یا اسے ناحق قتل کرے۔

2۔ اسے باب الغیبتہ میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ غیبت سے بھی انسان کی عزت مجروح ہوتی ہے‘ اس لیے یہ بھی حرام ہے۔

غیبت سننے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کر لیتے ہیں۔“ (القصص۔55)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”مومن بے ہودہ (سب و شتم‘ لایعنی‘ جھوٹ اور بے حیائی پر مبنی) باتوں سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔“ (المومنون۔3)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”بے شک کان‘ آنکھ اور دل‘ ان سب سے باز پرس ہو گی۔“ (الاسرا۔36)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو ہمارے حکموں میں طعن و تشنیع کر رہے ہوں تو ان سے اعراض کر لے (ان کی مجلس سے علیحدگی اختیار کر لے) یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔“ (الانعام۔68)

فائدہ آیات :

1۔ مذکورہ آیات سے واضح ہے کہ جھوٹ‘ مکر و فریب‘ بے حیائی‘ بے ہودہ اور لایعنی باتوں سے کنارہ کش رہنا اہل ایمان کا شیوہ ہے اور ان کو اس سے اعراض کرنے کا حکم ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیبت کا سننا بھی حرام ہے کیونکہ وہ بھی لغو میں شامل

ہے۔

2۔ اسی طرح ان مجلسوں کا بائیکاٹ ضروری ہے جہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا استہزا اڑایا جارہا ہو۔ یہ استہزا چاہے زبانی ہو یا عملی 'یعنی احکام الٰہیہ کی صریح مخالفت کی جارہی ہو' یہ بھی آیت الٰہیہ کا استہزا اور مذاق ہی ہے' جیسے آج کل منگنی' مہندی اور شادی بیاہ اور ختنہ و سالگرہ وغیرہ کی تقریبات ہیں 'جن میں بے حیائی' بے پردگی' تصویر سازی' ناچ گانا' مرد و عورت کا بے باکانہ اختلاط اور جوان بچیوں کا براتیوں کا استقبال اور ان پر گل پاشی کرنا' وغیرہ جیسی قباحتیں عام ہیں۔ اس قسم کی تقریبات میں اگر انسان ان قباحتوں کو روکنے پر قادر نہیں ہے تو ان میں شرکت سخت گناہ ہے' اس لیے ان کا بائیکاٹ ضروری ہے۔

مسلمان بھائی کا دفاع

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا دفاع کیا' اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اس کے چہرے سے جہنم کی آگ دور کردے گا۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : عزت کے دفاع کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مجلس میں کسی کی عیب جوئی کرکے اس کی توہین و تنقیص کررہا ہو تو اس کا دفاع کیا جائے اور اہل مجلس کو بتلایا جائے کہ اس کی بابت یہ باتیں صحیح نہیں ہیں' اس کا دامن ان چیزوں سے پاک ہے۔

کلمہ گو کا احترام

حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ اپنی اس مشہور اور طویل حدیث میں' جو باب الرجاء میں گزر چکی ہے' بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو فرمایا:

"مالک بن دخشم کہاں ہے؟"

ایک آدمی نے کہا: "وہ تو منافق ہے' اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں کرتا۔"

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ بات مت کہو' کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس نے لا الہ اللہ کہا ہے۔ اس سے اس کا ارادہ اللہ کی رضا ہی حاصل کرنا ہے۔ اور یقیناً" اللہ نے اس شخص پر جہنم کی آگ حرام کردی ہے جس نے اللہ کے چہرے کی تلاش میں (اللہ کی رضا کی خاطر) لا الہ الا اللہ کہا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ مومن پر جہنم کی آگ حرام ہونے کا مطلب ہے: علیٰ سبیل الخلود 'یعنی مومن کا ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا حرام ہے' ورنہ کبیرہ گناہ کا مرتکب مومن' اگر اللہ نے اسے معاف نہ کیا' تو بطور سزا جہنم میں جائے گا اور جب تک اللہ چاہے گا' جہنم کی سزا بھگتے گا' تاہم بعد میں اسے جنت میں داخل کردیا جائے گا۔

2۔ اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ مسلمان کی غیبت کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

منافقت ظاہر کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرا گمان ہے کہ فلاں فلاں آدمی ہمارے دین کی کسی بات کو نہیں جانتے۔" (بخاری)

اس حدیث کے ایک راوی لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ یہ دونوں آدمی منافقین میں سے تھے۔

فائدہ : منافقین بھی اہل فساد اور مشتبہ کردار ہی کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی حقیقت سے بھی لوگوں کو آگاہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے تاکہ لوگ ان سے بچ کر رہیں اور ان کا دین یا دنیا خراب نہ ہو۔

* * *

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔

غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی، نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا، طعنے تشنے ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ، ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

گ ل م۔ ڈیرہ غازی خان

شعاع و خواتین سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد رسالوں کا ڈھیر دیکھا اور اسی وقت سے پڑھنے کی خواہش تھی، جب ابھی اردو کا جوڑ سیکھ رہے تھے۔ تیسری چوتھی کلاس سے پڑھنا شروع کیا اور اب چار بچوں کی مما ہیں۔ اس وقت کہانیوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ بس پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

اب میرے بچوں کو میری طرح پڑھنے کا شوق ہے۔ میری پانچ سال کی بیٹی کہتی ہے۔ ”مما مجھے بھی پڑھ کر سناؤ۔“ میں نے کہا۔

”جب بڑی ہو جاؤ خود پڑھنا۔“

میں نے رسالے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے سنبھال کے رکھے ہوئے ہیں۔

جب سے ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔“ شروع ہوا ہے۔ ہر مہینے سوچتی تھی کہ اس میں ضرور شرکت کروں گی اور آخر کار آج ہمت کر ہی لی۔

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج۔ میری شادی 25 جون 2004ء کو ہوئی۔

س۔ شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں؟

ج۔ شادی سے پہلے بہت سے مشاغل تھے۔ بہت بے فکری کی زندگی تھی۔ اپنی مرضی سے سونا، اپنی مرضی سے اٹھنا۔ پورا دن ڈائجسٹ پڑھنا۔ اپنی پڑھائی کرنا۔ شادی، خوشیوں میں خوب انجوائے کرنا۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنا۔

س۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا گھر والوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج۔ اس رشتے میں سراسر گھر والوں کی مرضی تھی۔ لیکن میں بھی دل میں مطمئن تھی کہ چلو شادی شدہ ہیں۔ بڑی عمر کے میچور مرد ہیں۔ ان کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں تھی۔ ماں باپ نے ترس کھا کر چلو اولاد ہو جائے گی۔ ہماری بیٹی کو بھی خوش رکھے گا اور بڑی بیوی کا بھی خیال رکھے گا۔ میں نے بھی سوچا کہ کم عمر

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی

- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مُکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مُکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مُتعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

بیوی دیکھ کر مجھے خوش رکھے گا۔ بہ نسبت لاابالی کم عمر نوجوان لڑکوں کے۔ لیکن سب کچھ اس کے الٹ نکلا۔

س۔ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا، وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ج۔ کچھ خاص تصور نہیں تھا۔ بس یہ تھا کہ محبت کرنے والا ہو۔ خیال کرنے والا، دکھ سکھ کا ساتھی ہو۔ جو میری تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے۔ میری خوشی کو اپنی خوشی۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی، شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟

ج۔ منگنی نہیں ہوئی۔ ڈائریکٹ نکاح۔ میں نے تو خیر آتے جاتے انہیں دیکھ لیا تھا لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ بات چیت کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ بالکل غیر تھے۔ ملاقات کا تو سوچنا ہی محال تھا۔

س۔ شادی سے پہلے آپ کے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟ وہ ان خیالات پر پورا اترے سب؟

ج۔ سسرال کے نام پر ان کے گھر میں ان کی پہلی بیوی تھی۔ ماں باپ وفات پا چکے تھے۔ بہن بھائی سارے شادی شدہ تھے۔ اور ان سے بہت بڑے یہ سب سے چھوٹے ہیں۔ ان کی پہلی بیوی ان سے عمر میں 25 سال بڑی اور میں ان سے 20 سال چھوٹی۔ میں نے سوچا اتنی بڑی عمر کی عورت ہے۔ خدمت کر کے اس کا دل جیت لوں گی۔ اور اتنی کم عمر بیوی پا کر یہ بھی میرا خیال رکھیں گے۔ لیکن قسمت کو شاید کچھ آزمائش منظور تھی۔ اور حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔

س۔ شادی کے لیے آپ کو تعلیم کی قربانی دینا پڑی؟ یا کوئی اور؟

ج۔ شادی کے لیے خیر تعلیم تو نہیں چھوڑنا پڑی بلکہ ان کو پڑھائی کا شوق ہے۔ انہوں نے شادی کے بعد مجھے بی۔ ایڈ اور ایم۔ اے کروایا علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اور خود بھی دوبارہ پڑھائی شروع کر دی۔ البتہ تمام شوق، مشاغل کی قربانی دینی پڑی۔

س۔ شادی کی رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟

ج۔ نہیں شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔ خاص کچھ نہیں کہا۔ بس پہلی بیوی کی تعریفیں کرتے رہے۔

س۔ شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج۔ شادی کے بعد پوری کی پوری زندگی تبدیل ہو گئی۔ میری عمر 22 سال، ان کی 42، ان کی پہلی بیوی کی عمر 65 سال۔ بڑی عمر کے دو لوگوں میں میری زندگی پس کے رہ گئی۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ ایسے نہ بیٹھو۔ میک اپ نہ کرو۔ فیشن ایبل کپڑے نہ پہنو، غرض یہ کہ ہر چیز پر تنقید۔ وہ عورت ان کو سکھاتی اور یہ اس کی باتوں پر من و عن عمل کرتے۔ بہت لمبی داستان ہے۔ پوری لکھنے میں صفحے کے صفحے بھر جائیں، شاید باتیں ختم نہ ہوں۔ اس عورت کو خطرہ اس کا بچہ ہو جائے گا، اس کی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی اس نے ان کو میرے خلاف بھرنا شروع کر دیا۔ اور یہ کان کے کچے، اس کی ہر بات مانتے۔ اس کے کہنے پر پڑھے لکھے ہونے کے باوجود میری پٹائی کرتے۔ گالم گلوچ کرتے ہر قسم کا طنز طعنہ دیتے۔ گھر میں بالکل ایسی حیثیت دے دی جیسی نوکرانی کی ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ بیٹھتے کھاتے پیتے اور ہر قسم کی ڈسکشن اسی کے ساتھ کرتے تھے۔ مجھے بس کام کرنے والی مشین سمجھا جاتا تھا اور کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بہت مشکل وقت دیکھا ہے۔ جس کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ بس اتنا کہوں گی بہت صبر کیا۔ اتنی کم عمری میں اپنی ہر خواہش۔ ہر پسند ناپسند کو ختم کر دیا۔ ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ اور واقعی سچ کہتے ہیں "صبر کا پھل میٹھا ہے" واقعی اللہ نے مجھے میرے صبر کا پھل دیا۔ اور آج میں سب کے سامنے سرخرو ہوں۔

س۔ سسرال اور میکے کے ماحول میں کوئی فرق محسوس ہوا؟

ج۔ زمین آسمان کا فرق۔ ماں باپ کے گھر میں اپنی مرضی، آزادی نہ کوئی روک ٹوک۔ لیکن یہاں پر سسرال نہ ہونے کے باوجود صرف دو لوگوں نے جینا حرام کر دیا۔ یہ اپنا کمپلیکس چھپانے کے لیے مجھ پر ظلم کرتے اور اس عورت کو خوش کرتے۔ میرے شوہر کا تعلق بالکل دیہات سے ہے۔ جہاں پر پڑھائی کا نام و نشان نہیں۔ جہالت شکوک و شبہات کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، مرد عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ ان کی تربیت، بچپن جوانی ایسے ماحول میں گزرا۔ یہ اپنی پہلی شادی کے وقت شہر تو آ گئے تھے۔ لیکن عادتیں وہی کی وہی۔ ہر بات پر شک کرتے تھے۔ ماں باپ کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی شادی غمی میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لپ اسٹک لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ کہ تمہارے میک اپ کرنے سے اس عورت کے دل پر کیا گزرے گی جس کی اولاد نہیں ہے۔ لہٰذا بنا سنورا نہ کرو۔ شادی کے دوسرے دن سے جو لپ اسٹک اتاری۔ آج لگاؤں گی۔ اب آزادی ہے لیکن لگانے کو دل نہیں کرتا۔ ہر خواہش ہی ختم ہو گئی ہے۔ بس اپنے بچوں کی اچھی قسمت کی دعا کرتی ہوں۔ اپنا جیسا بھی وقت تھا اچھا برا بس گزر گیا۔ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ خیر سے گزر گیا۔

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی؟

ج۔ وہ عورت اور یہ خود ہر بات پر تنقید، کھانے سے لے کر سونے تک ہر کام میں۔ بس کبھی کبھار اپنے بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر کبھی دو بول محبت کے چوری چھپے بول لیتے تھے۔ لیکن اس عورت سے چھپ کے، کیونکہ ہماری رہائش ایک ہی کمرے میں تھی۔ یہ کہتے تھے علیحدہ کمرے میں سو کر میں اس کی بددعائیں نہیں لینا چاہتا۔

شادی کے ساڑھے آٹھ سال ایک ہی کمرے میں گزارے اور وہیں پہ میرے چار بچے پیدا ہوئے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ اب جا کے علیحدہ گھر لیا ہے۔ ساڑھے تین سال ہو گئے ہیں۔ علیحدہ گھر لیے ہوئے ہیں۔ اب اللہ کا شکر ہے میں علیحدہ گھر میں ہوں۔

س۔ شادی کے کتنے عرصہ بعد کام کاج سنبھالا؟

ج۔ شادی کے دوسرے دن سے۔ کوئی نئی دلہن کا ناز نخرہ نہیں اٹھایا گیا۔ دونوں میاں بیوی نے کہا۔ بچے کے لیے تمہیں اس گھر میں لائے ہیں۔ ورنہ ہم نے تمہیں کیا کرنا تھا۔ یہ خود بھی کہتے تھے ہم نے تمہارا کیا کرنا ہے۔ ہمیں بچے کی ضرورت ہے۔

س۔ کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟

ج۔ ذائقے میں زمین آسمان کا فرق۔ ان کے گھر میں صرف روٹی، سالن اور کچھ بھی نہیں پکایا جاتا تھا۔ چولہے کا سارا کام اس عورت نے خود سنبھالا ہوا تھا۔ باقی ماسیوں والے سارے کام میرے ذمے تھے۔ اپنے لیے انڈا تک بنانے کی اجازت نہیں تھی۔

س۔ سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟

ج۔ بالکل نہیں، کوئی مقام نہیں ملا۔ جب شوہر نے ہی عزت نہیں کی۔ تو اور کیا عزت کرتے۔ وہ تو سوکن تھی۔ میرے شوہر کے بہن بھائی بھی اس کا ساتھ دیتے۔ کہتے تھے وہ تو پہلے سے ہے۔ تمہارے ساتھ ہمارا کیا واسطہ۔ میری سوکن بہت ہی چالاک عورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی عورتوں کو ہدایت دے۔ کوئی ایسی بددعا نہیں ہے جو اس نے نہ دی ہو۔ بس صبر کرتی رہی کہ بچہ ہو جائے گا تو شاید کچھ حالات بہتر ہو جائیں۔

س۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات پوری ہوئیں؟

ج۔ جب میاں سے توقعات پوری نہیں ہوئیں تو اوروں نے کیا خیال کرنا تھا۔ ان کے شادی شدہ بہن بھائی جب بھی آتے ہمارا تماشا دیکھتے، میری باتیں اس کو کہتے اس کی باتیں مجھے۔ میرے منہ پر میرے اور میری سوکن کے منہ پر اس کے، سارے تماشا دیکھنے والے تھے۔ کسی نے نہ ان کو سمجھایا اور نہ میری سوکن کو۔ میرے اوپر ہوئے ظلم کے قصے بڑے مزے

سے ایک دوسرے کو سناتے۔

س۔ بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں ایک بڑا مقام بن کر آتی ہے خصوصا "پہلا بچہ۔

ج۔ میری تو شادی ہی بچے کے لیے ہوئی تھی۔ لہٰذا بچے کی خواہش تو تھی۔ ان کی پہلی شادی کو سترہ سال ہو گئے تھے۔ اور میں شادی کے ایک سال دو ماہ کے بعد امید سے ہوئی۔ اصل آزمائش اب شروع ہوئی۔ اس عورت کو زیادہ حسد پیدا ہو گیا کہ اب اس کی جگہ میرا رتبہ بڑھ جائے گا مختلف طریقوں سے مجھے ازیت پہنچانے کی کوشش کرتی جو ناقابل بیان ہے۔ اگر بیان کروں تو پڑھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ خیر خدا خدا کر کے نو مہینے گزرے اور اللہ نے بیٹا دیا۔ میرے شوہر دل میں تو خوش ہوئے لیکن ظاہر نہیں کیا۔ پورے مہینے ڈھول والے آتے رہے۔

اصل آزمائش اب تھی میرے شوہر نے چالیس دن مجھ سے بات نہ کی کہ پہلی بیوی کا دل دکھے گا نہ بچے کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ اب اس عورت نے نئی چال چلی۔ اسے ڈر تھا کہیں بیٹے کے بعد یہ شوہر کو نہ لے جائے۔ اس نے شوہر سے کہنا شروع کر دیا یا اس سے بچہ چھین لو یا اس کو طلاق دے دو یا تیسری شادی کر لو۔ بس ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی اور شادی کروں گا تو حالات ٹھیک ہوں گے۔ بس بچے کی پیدائش کے بعد سے یہ تیسری شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔

میرے شوہر کی کوئی رشتے دار تھی، پہلے سے طلاق یافتہ اس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ ڈیڑھ سال اس کے گھر جاتے رہے۔ ان کا تعلق بالکل دیہات سے تھا۔ وہ تو خوش ہو گئے کہ طلاق یافتہ کو نوکری والا مل رہا ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے۔ یہ نہ دیکھا کہ پہلے سے دو بیویاں ہیں ایک بچہ ہے۔ جو اتنے عرصہ کے بعد پیدا ہوا ہے۔

بس جی وہ عورت ان کے پیچھے لگ گئی شادی کرو۔ اور یہ جناب روز گھر سے غائب ڈیڑھ سال انہوں نے اس لڑکی والوں کے گھر دن رات گزارا اور اپنے ایک بڑے بھائی کو بھی ساتھ شامل کر لیا اس مہم میں۔ میری سوکن ان لوگوں کو یقین دلاتی تمہاری بیٹی کو اور کون لے گا رشتے دار ہے۔ زمین دار ہے پکی نوکری ہے۔ تمہاری بیٹی عیش کرے گی۔ میرا کہنا کہ اس کو تو چھوڑ دے گا اور یہ خود بھی نہیں رہے گی جب شادی کا سنے گی۔

ہر روز میرے سامنے گھر میں شادی کی باتیں ہوتیں۔ دونوں میاں بیوی آپس میں ڈسکس کرتے۔ میں خاموشی سے سنتی رہتی۔ اپنے امی ابو کو بتاتی وہ کہتے۔

”بیٹا صبر کرو۔ عورت کا صرف ایک ہی گھر اچھا ہوتا ہے۔ شریف عورت گزارہ کرتی ہے۔ اللہ غیب سے تمہاری مدد کرے گا۔“

بس اللہ سے دعائیں مانگتی۔ بس بہت مشکل وقت تھا۔ چھبیس سال کی عمر میں ایسے لگتی جیسے چھیالیس سال کی ہوں۔

آخر کار میری سوکن کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ میری شادی کے ساڑھے تین سال کے بعد جب میرا بیٹا ایک سال دس ماہ کا تھا میرے شوہر نے وہیں لڑکی والوں کے گھر تیسری شادی کر لی۔ اور لڑکی کو اس کے ماں باپ کے گھر رکھا۔

مجھے جب پتا چلا بس کچھ نہ پوچھیں کہ قیامت آنا کسے کہتے ہیں، اس وقت ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ماں بہنوں نے ساتھ دیا اور اللہ کا ساتھ تھا۔ بس اللہ نے ہمت دی۔ ابو نے کہا۔

”بیٹا! گھر نہیں چھوڑنا تمہارا بیٹا ہے۔ کہاں جاؤ گی۔“

بس اللہ آزمائش میں ڈالتا ہے تو ہمت بھی دے دیتا ہے۔

خیر تیسری شادی کے بعد میرے شوہر کے رویے میں بہت فرق آگیا۔ بہت تبدیل ہو گئے اور میری اچھائیاں ان کو نظر آنے لگیں اور خیال کرنے لگے۔ پہلے تو کہتے تھے۔ ”میری پہلی بیوی کا دل دکھے گا کیسے تمہارے ساتھ بیٹھوں، باتیں کروں۔“

پھر جب انہوں نے دیکھا کہ تیسری والی کے ساتھ تو بولنے باتیں کرنے سے پہلی بیوی کا دل نہیں دکھتا، بددعائیں بھی نہیں دیتی۔ خوش ہوتی ہے بلکہ تیسری والی کو تو کہتی تھی۔ شوہر کو خوش رکھا کرو، میک اپ کیا کرو۔ پھر ان کی سمجھ میں آیا یہ تو سراسر اس کا حسد ہے، جلاپا ہے، بغض ہے جو اس کو بچے کی وجہ سے میرے ساتھ تھا۔ پھر ان کو کچھ سمجھ میں آیا۔ اب سب کے سامنے بیٹھ کر باتیں بھی کرتے تھے۔ اور کچھ خیال بھی کرتے تھے اور خرچا وغیرہ بھی دیتے تھے۔

پہلے تو سب کچھ اس عورت کے ہاتھ میں تھا۔ کپڑے بھی وہی لے کر دیتی تھی۔ جب اس کا دل چاہتا۔ بچے کی چیزیں بھی وہی۔ یا پھر میری امی بہنیں ہی کرتی تھیں۔

اب پہلی والی کی یہ خواہش تھی کہ تیسری کو بچہ ہو اور شوہر مجھے چھوڑ دے لیکن شاید خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ اللہ کو مجھ پر ترس آگیا اور مجھے آزمائش میں ثابت قدم رکھا اور میرے قدم نہیں ڈگمگائے۔ کچھ حوصلہ ملا شوہر کے اچھے سلوک کی وجہ سے۔

ان کی تیسری شادی کے بعد میں پھر امید سے ہو گئی۔ اور خیر سے دوسرا بیٹا ہو گیا۔ اور شوہر کا رویہ بہت اچھا تھا۔ ان کو پہلی بیوی کی سازش کا پتا چل گیا کہ یہ بچے والی کو نکالنا چاہتی ہے۔ اب یہ اس کا کہنا نہ مانتے اور میرا اور بچوں کا خیال رکھتے۔

اب ہم دو ایک ساتھ اور تیسری اپنے ماں باپ کے گھر۔ اس کو بھی خرچا پانی دیتے اور باقاعدگی سے آتے جاتے۔ اور کبھی میری غیر موجودگی میں اس کو پہلی بیوی کے پاس لے آتے۔

پہلی والی اس کے ساتھ بڑی خوش تھی۔ یہ حیران پریشان۔ یہ کیا ماجرا؟ جس کو اپنے ہاتھوں سے لے کر آئی اس کے ساتھ اتنی جلن اور اس کے ساتھ خوش۔ پھر ان کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ کہ اس کو بچے اور بچے کی ماں سے جلن ہے کہ یہ تو بچے کی وجہ سے ہر چیز کی مالک بن گئی ہے۔ اب میری بڑی سوکن نے تیسری والی کا بچے کے لیے علاج کرانا شروع کر دیا کہ اس کو بھی بچہ ہو۔ شوہر سمجھ گئے کہ یہ بچوں کے ساتھ شراکت چاہتی ہے۔ ان کا رویہ میرے ساتھ کافی اچھا ہو گیا۔

اس دوران میری دو بیٹیاں بھی ہو گئیں۔ واقعی بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ جب اپنی بیٹی ہوئی تو پرائی بیٹی کا بھی احساس ہوا۔ اور حالات کافی اچھے ہو گئے۔

میری بڑی سوکن اپنی چال میں خود پھنس گئی۔ مجھے تکلیف دینے کے لیے تیسری شادی کروائی تھی۔ خود مصیبت میں پھنس گئی۔ اب میرے شوہر اس کا کہنا نہ مانتے۔ ایک کمرے کے گھر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ پھر بچوں کے لیے میرے شوہر نے اکتوبر 2012 میں علیحدہ گھر لیا۔ گھر لینے کے بعد بڑی بیوی کی بھی منتیں کرتے رہتے کہ تم بھی چلو۔ لیکن اسے اپنے اعمال ڈراتے تھے۔ کہ جس کے ساتھ اتنا برا رویہ رکھا اب اس کے ساتھ کیسے چلوں۔

اب وہ ادھر پرانے گھر میں ہے۔ ہم ادھر علیحدہ گھر میں ہیں۔ اور جب تیسری والوں نے علیحدہ گھر کا سنا تو انہوں نے کہا ہم تو اسی انتظار میں تھے۔ اس کو چھوڑ دو گے اور ہماری بیٹی کو رکھو گے۔ اس کو تو علیحدہ گھر لے دیا ہے۔ چار بچے بھی ہو گئے ہیں۔ اب ہماری بیٹی کو چھوڑ دو کیونکہ اس وقت تک میرے شوہر نے وہاں آنا جانا ذرا کم کر دیا تھا۔ ان کو شاید ضمیر کچوکے لگاتا ہو گا۔

اب ہم علیحدہ گھر میں ہیں۔

جنوری 2015 میں میرے شوہر نے تیسری والی کو طلاق دے دی کیونکہ اس کا بچہ نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے ماں باپ اس کی کسی اور جگہ شادی کروانا چاہتے تھے۔ اور بڑی بیوی پہلے والے گھر میں ہے۔ میرے شوہر تو آتے جاتے رہتے ہیں پہلی والی کے پاس لیکن مستقل میرے اور بچوں کے پاس رہتے ہیں۔ میں اس عورت کے پاس ان ساڑھے تین سالوں میں کبھی نہیں گئی۔ جب وہ حالات سوچتی ہوں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اب اپنی سوکن کے بارے میں سوچتی ہوں تو جی چاہتا ہے اس کو کبھی معاف نہ کروں آپ مجھے بتائیں

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ایسی عورت معاف کرنے کے قابل ہے؟

واقعی سچ کہتے ہیں "جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودے خود اس میں جا گرتا ہے" میرے لیے مصیبتیں اکھٹی کرتی رہی خود اس میں پھنس گئی۔

اب اس کی عمر پچھتر سال ہے۔ چل پھر نہیں سکتی واش روم تک بڑی مشکل سے جاتی ہے۔ لیکن طنطنہ ویسے ہی قائم ہے۔

سچ کہتے ہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ ماشاء اللہ سے گھر ہے۔ بچے ہیں۔ شوہر بھی کافی اچھے ہیں۔ شکر ہے اللہ نے مجھے اس آزمائش میں ثابت قدم رکھا۔ اگر کم عمری کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ ہو جاتا تو پتا نہیں میرے بچوں کا کیا بنتا۔

آپ سب سے گزارش ہے کہ میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے خصوصی دعا فرمادیں اور ایک اور بات یہ کہنا چاہوں گی۔ کہ شادی کے بارہ سالہ عرصے میں جو حالات مجھ پر بیتے اس کی وجہ سے میں ذہنی طور پر بالکل فارغ ہو گئی۔ نہ بچوں کے کام ہوتے تھے نہ گھر کے کام، سارا دن بستر پر پڑی رہتی تھی۔ حالانکہ پڑھائی میں سارے بہن بھائیوں سے لائق فائق۔ باادب حاضر جواب بچی تھی۔

اب یہ حالت کہ ایک کام کرنے کے بعد دوسرا نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے ذہن پر اثر پڑا۔ ذہنی و جسمانی صحت دونوں ختم بچھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ۔

ایک دن بھائی آیا۔ جب میری حالت دیکھی گھر جا کر کہا۔ "بہن کے پاس جائیں۔ وہ تو پاگل ہوئی بیٹھی ہے۔"

کیونکہ میری شکل دیکھ کے اس کو اندازہ ہوا۔ پھر میں نے ملتان کے ایک اچھے سائیکاٹرسٹ سے اپنا علاج کروایا۔ اب طبیعت بہت بہتر ہے۔ ابھی علاج جاری ہے۔ ابھی بچوں کے امتحانات کے بعد دوبارہ ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ دعا کریں اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔

س۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کو ترجیح دیتی ہیں یا؟

ج۔ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اس حد تک اتفاق ہے کہ اگر آپس میں پیار، محبت خلوص ہو پھر تو رشتوں کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ نہیں تو پھر علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے۔

اپنے حالات دیکھتے ہوئے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ قارئین بھی میرے نتائج سے یقیناً" اتفاق کریں گے۔ (1) کبھی بھی بیوی کے ہوتے ہوئے شادی شدہ مرد کو اپنی کم عمر بیٹی کا رشتہ نہیں دینا چاہیے، میری تمام والدین سے التماس ہے۔ بہت مشکلات ہوتی ہیں۔ جس پر بیتتی ہے پتا اسی کو ہوتا ہے۔

(2) کبھی بھی اتنے ایج ڈیفرنس میں رشتہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیشہ عمر کا جوڑ دیکھنا چاہیے۔

(3) کبھی بھی دیہاتی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے والے آدمی سے شہری لڑکی کا رشتہ نہیں کرنا چاہیے۔

یہ صرف میرے تجربات ہیں۔ ضروری نہیں سب کے ساتھ ایسا ہو۔

اور تمام قاری بہنوں سے یہی کہوں گی کہ جیسے بھی حالات ہوں صرف اپنے اللہ پر چھوڑ دیں۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ مشکلات سے نہ ڈریں، اللہ تعالیٰ خود کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے۔ اگر آپ کی کوئی بہن یا رشتے دار ایسے حالات کا شکار ہو تو براہ مہربانی اس کا ساتھ دیں۔ ان تمام کرائسس میں میرے ماں باپ بہن بھائیوں نے ساتھ دیا تب میں نے یہ امتحان پاس کیا ہے ورنہ ہو سکتا ہے شاید میری ہمت جواب دے جاتی۔ رشتوں کا خیال کریں، بہن بھائی بہت قیمتی چیز ہیں۔

آخر میں آپ سے یہ کہنا ہے کہ میرے شوہر کا رویہ اب میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔ کبھی دل چاہتا ہے پچھلے رویے پر ان کو کبھی معاف نہ کروں اور کبھی دل کرتا ہے اللہ معاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کیا کروں۔ میری ان تمام بہنوں سے گزارش ہے جن کی اولاد نہیں ہے اگر ان کے شوہر دوسری شادی کریں بچوں کے لیے تو پلیز صبر کریں۔ یہ سب اللہ کے فیصلے ہیں جس کو چاہے اولاد دے جس کو چاہے نہ دے۔

* * *

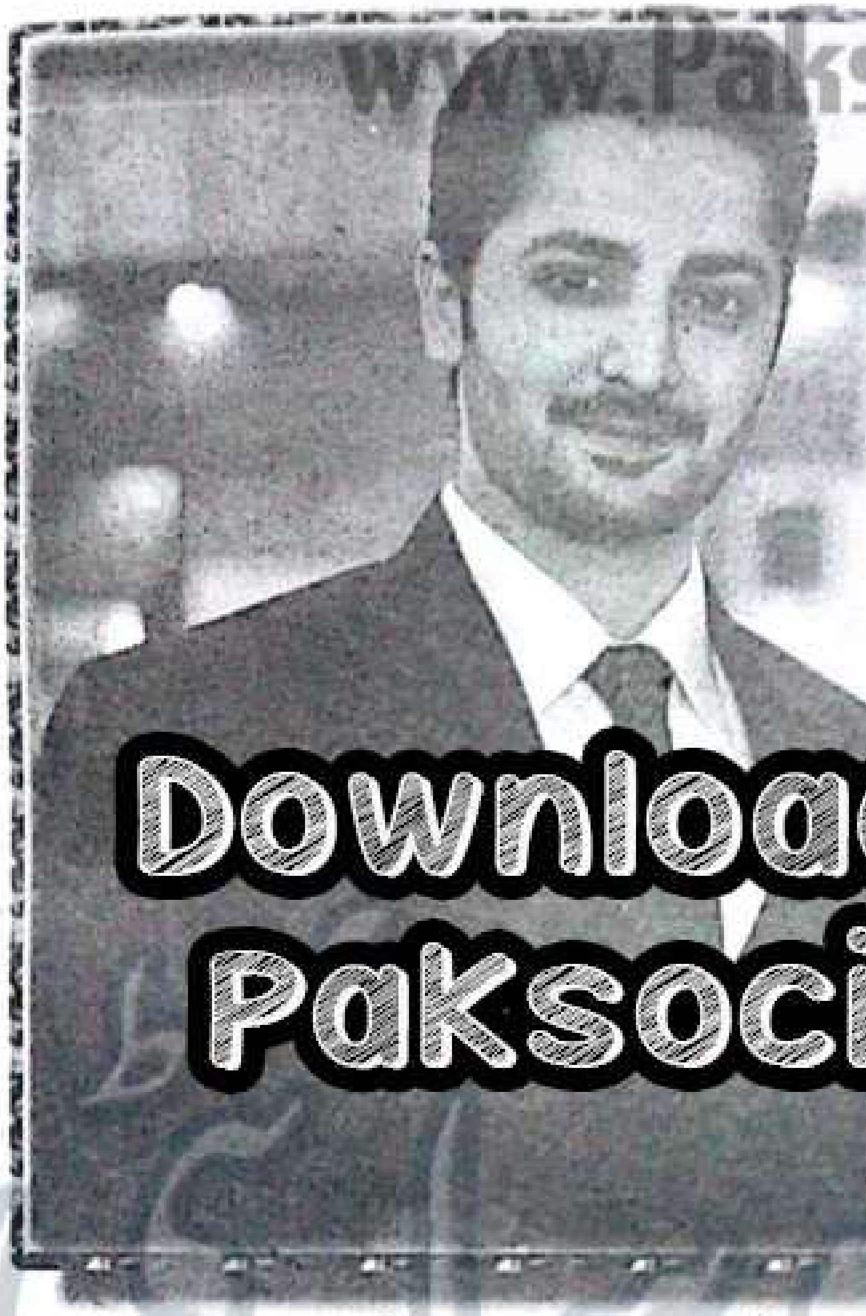

Downloaded From Paksociety.com

بندھن

عائزہ خان ہمراہ دانش تیمور

شاہین رشید

عائزہ خان اور دانش تیمور کی شادی کیا ہوئی۔ فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا... ہمارے قارئین بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ ہم فرمائش کریں گے اور وہ جھٹ پٹ پوری ہو جائے گی اور فرمائش پوری نہ ہو تو ناراضی الگ... پیارے قارئین، بے شک اس کام میں ہم نے ایک عمر گنوا دی ہے، مگر آج بھی ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں...

8 اگست 2014ء کو عائزہ اور دانش کی شادی ہوئی، ہم نے مبارک باد کے لیے فون کیا اور کہا کہ "بندھن" کے لیے سب سے پہلا انٹرویو مجھے دینا۔" بڑے اخلاق سے دانش نے کہا۔

"کیوں نہیں آپا! آپ کو ہی دوں گا۔"

مگر نہیں جی... یہ بڑے اسٹار ہیں۔ پوری دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ فلم ٹی وی کے جگمگاتے ستارے ہیں... ان کے پاس اتنا ٹائم کہاں ہوتا ہے۔ ملنا تو دور کی بات رہی فون پر بات کرنے کا بھی ٹائم نہیں ہوتا۔ خیر دعا ہے کہ خوش رہیں۔ (آمین)

انٹرویو تو ہو گیا، مگر طویل نہیں، جیسے خواہش تھی ویسا نہیں ہوا۔ تھوڑے کو بھی بہت جانیے گا اور یہ انٹرویو بھی قارئین بہنوں کی بے حد فرمائش پر کیا ہے۔

"کیسی ہیں عائزہ آپ اور حورین؟"

"جی۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"بیٹی اللہ کی رحمت اور بیٹے اللہ کی نعمت ہوتے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہیں۔ آپ کی کیا خواہش تھی؟"

"میری خواہش تھی کہ چاہے بیٹا ہو یا بیٹی، صحت و تندرستی والا بچہ ہو اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ اللہ نے ہمیں صاحب اولاد کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ اولاد میں یہ دونوں "میوے" مجھے پسند ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ چونکہ "بیٹی رحمت" ہے تو اپنے ساتھ بہت سی رحمتیں لے کر آتی ہے۔ "حورین" کے آنے سے زندگی میں کیا رنگینی آئی؟"

"دانش جیسا اچھا شوہر مل جانا ہی بہت بڑی خوش قسمتی تھی تو زندگی تو پہلے ہی حسین تھی۔ "حورین" کے آنے سے "حسین تر" ہو گئی اور آپ کو بتاؤں کہ "حورین" ہمارے لیے بہت لکی ثابت ہوئی کہ جب یہ پیدا ہوئی تو دانش کی فلم "رانگ نمبر" ریلیز ہوئی جس نے بہت کامیابی بھی حاصل کی۔"

"بیٹی کے حوالے سے لوگ آپ سے کیا سوال کرتے ہیں... ؟ مطلب اس کے فیوچر کے حوالے سے... ؟کوئی رائے، کوئی مشورہ... ؟"

"رائے، مشورے تو لوگ بہت دیتے ہیں، مگر ہو گا تو وہ ہی جو اس کے نصیب میں ہو گا۔ ہم اور آپ کون ہوتے ہیں نصیبوں کے آگے بولنے والے، بس جو بھی ہو، اچھا ہو اور ہماری بیٹی بہت اعلا تعلیم یافتہ اور نصیبوں والی ہو۔"

"مجھے یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس فیلڈ میں آؤں گی۔؟"

"بالکل جی... نہ میں نے نہ میرے گھر والوں نے اور دیکھ لیں نہ صرف اس فیلڈ میں آئی بلکہ اس فیلڈ کے بندے سے شادی بھی ہوئی تو یہ سب قسمت اور نصیب کی بات ہے۔"

"آپ خوش ہیں اپنی لائف میں؟"

"الحمدللہ۔ بہت خوش ہوں اور اللہ میری بیٹی کا نصیب بھی ایسا کرے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے۔ (آمین)۔"

"عموماً" خواتین فنکارائیں اپنے کیریئر کے عروج میں شادی نہیں کرتیں، مگر آپ نے اپنے عروج میں شادی کی، جلدی کی؟ یا اچھا کیا کہ کر لی؟"

"میں نے اچھا کیا... کیونکہ لڑکی کا اصل گھر تو اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ وقت پر شادی ہو جائے تو اس سے اچھی بات ہی کیا ہے اور میں کون سا اپنے گھر کی کفالت کر رہی تھی۔ شوقیہ کام کر رہی تھی اور شادی کر کے مجھے بالکل بھی پچھتاوا نہیں ہے بلکہ میں تو اپنی زندگی میں اپنے شوہر اور اپنی بیٹی کے ساتھ بہت خوش ہوں بلکہ میں تو کہوں گی کہ میں تو شادی کے بعد اس فیلڈ میں زیادہ باعزت ہو گئی ہوں۔"

"ہوں... گڈ... دو سال کے بعد آپ اس فیلڈ میں واپس آئی ہیں... کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت اچھا... اور جو گیپ رہا، وہ بھی سب کو معلوم ہے، یہ تو ایک خوب صورت گیپ تھا۔ 8 اگست 2014ء کو ماشاء اللہ ہماری شادی ہوئی اور 13 جولائی 2015ء کو ہماری بیٹی "حورین" پیدا ہوئی اور اب 2016ء ہے۔ بیٹی تو ابھی بہت چھوٹی ہے، لیکن لوگوں کی محبتیں دوبارہ اس فیلڈ میں کھینچ لائی ہیں۔ ہماری بیٹی تو ہمارے لیے پہلے سے بھی زیادہ محبتیں، خوشیاں اور کامیابیاں لے کر آئی ہے۔"

"لوگوں کی محبتیں اس فیلڈ میں کھینچ لائیں، رسپانس کیا ملا؟"

"رسپانس تو ایسا ملا کہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اور دانش سے اتنی محبت کرتے ہیں، جو عزت و احترام ہمیں شادی کے بعد ملا، اس کا تو ہم نے بھی اتنا نہیں سوچا تھا۔ میں نے کہا نا کہ شادی نے ہماری عزت و احترام میں اضافہ ہی کیا ہے اور جتنا پیار لوگ ہم سے کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ پیار ہماری بیٹی سے کرتے ہیں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی؟"

"جی بالکل... بہت دھوم دھام سے ہوئی اور یہ بات تو آپ سب کو پتا ہے... کتنی دھوم دھام سے ہوئی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ماشاء اللہ۔"

"شادی پسند سے ہونی چاہیے اور کیا کیفیت تھی رخصتی کے وقت؟"

"میرے خیال میں اگر آپ کسی کو پسند کرتے ہیں تو اپنے والدین کو بتادیں۔۔۔ پھر ان کا کام ہے کہ وہ دیکھیں کہ بیٹی یا بیٹے کی پسند کیسی ہے چونکہ والدین نے دنیا دیکھی ہوتی ہے اس لیے وہ جو فیصلہ کریں گے' وہ آپ کے حق میں بہتر ہوگا اور رخصتی کے وقت وہی کیفیت تھی جو ایک بیٹی کی ہوتی ہے اپنا میکہ چھوڑتے وقت۔"

"شادی سے پہلے' منگیتر کے ساتھ گھومنے پھرنے کا مزہ ہے یا شادی کے بعد؟"

"میرے خیال میں گھومنے پھرنے کا مزہ شادی کے بعد ہی ہے۔ پتا نہیں کیوں لوگ کہتے ہیں کہ پہلے مزہ آتا ہے' مگر مجھے تو شادی کے بعد ہی دانش کے ساتھ گھومنا اچھا لگا۔"

"اب جبکہ آپ اس فیلڈ میں دوبارہ آگئی ہیں تو چھوٹی بچی کی وجہ سے آپ کو مشکل تو پیش آئے گی؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہماری جوائنٹ فیملی ہے اور امی ابو سنبھال لیتے ہیں۔۔۔ مجھے ویسے بھی کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔"

"دانش سنبھالتے ہیں۔۔۔؟"

"جی جی۔۔۔ بہت۔۔۔ رات کو اکثر اٹھ جاتی ہے تو میری گود سے زیادہ دانش کی گود میں چپ ہو جاتی ہے۔۔۔ میں دودھ بنا رہی ہوتی ہوں تو دانش ہی سنبھالتے ہیں اور حورین کے کاموں میں میری بہت مدد کرتے ہیں۔ کہیں جانا ہو اور میں تیار ہو رہی ہوں تب بھی دانش بیٹی کو سنبھال لیتے ہیں۔"

"حورین کی کبھی خدانخواستہ طبیعت خراب ہو تو زیادہ پریشان کون ہوتا ہے۔"

"ہم دونوں۔۔۔ بلکہ پورا گھر ہی پریشان ہو جاتا ہے اور ایسے موقع پر بھی دانش بہت خیال رکھتے ہیں حورین کا۔ کیونکہ طبیعت خراب میں حورین بہت تنگ کرتی ہے۔"

"شاپنگ کے لیے ساتھ جاتے ہیں؟"

"جی بالکل۔۔۔ شاپنگ کا تو بہت شوق ہے۔ جبکہ دانش تھوڑا گھبراتے ہیں۔۔۔ شروع شروع میں تو میں کچھ عرصہ شاپنگ کے لیے نہیں گئی کہ ابھی اتنا کچھ بنایا ہے' لیکن خیر۔۔۔ شاپنگ سے کب دل بھرتا ہے میرا۔۔۔"

"دانش کا کون سا کام کرنا سب سے زیادہ مشکل لگتا ہے آپ کو۔۔۔؟"

"میں دانش کے سب کام خوشی خوشی کر لیتی ہوں' مگر مجھے استری کرنا سب سے زیادہ مشکل کام لگتا ہے' مگر پھر بھی کر لیتی ہوں۔"

"آپ دونوں ماشاء اللہ کماتے ہیں۔۔۔ تو آپ بھی خرچ کرتی ہیں۔۔۔ یا سب کچھ دانش کے ذمے ہے۔"

"دانش کا تو سب کچھ میرا ہے' مطلب سب یہی خرچ کرتے ہیں اور میری کمائی۔۔۔ چلیں۔ کوئی اور بات کریں۔" ہنستے ہوئے۔

"بڑے بزرگ کہتے تھے کہ بیوی شوہر کی جیب میں بے جھجک ہاتھ ڈال کر پیسے نکال لیتی ہے کیونکہ اس کا حق ہوتا ہے۔۔۔ تو آپ بھی جیب یا والٹ خالی کرتی ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ کبھی ایسا نہیں کرتی اور نہ ہی کر سکتی ہوں۔ مجھے جب ضرورت ہوتی ہے تو ان سے پوچھ کر ان کے والٹ سے پیسے نکالتی ہوں۔ کبھی ان کی اجازت کے بغیر پیسے نہیں نکالتی۔"

"شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلی آئی۔۔۔ گھر کو سجانے سنوارنے اور گھرداری کا کتنا شوق ہے؟"

"شادی کے بعد مجھ میں بہت زیادہ خوداعتمادی آگئی ہے' بے شک میں خوداعتماد تو پہلے بھی تھی مگر اب اور بھی زیادہ ہو گئی ہوں۔ اور گھر کو سجانے سنوارنے کا مجھے بہت شوق ہے اور کھانا پکانے کا بھی شوق ہے۔ اگرچہ گھر میں شیف ہے لیکن کبھی کبھار پھر بھی کچن میں چلی جاتی ہوں۔"

"پکانے کا شوق ہے اور کھانے کا؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

”جی۔۔۔ جی کھانے کا بھی بہت شوق ہے۔۔۔ لذیذ اور حیدر آبادی کھانے تو میری کمزوری ہیں۔۔۔ ضرور کھاتی ہوں۔“

دانش تیمور

”کیا حال ہیں دانش۔۔۔ آپ بتائیں کہ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟“

”اللہ کا شکر ہے۔۔۔ اور شادی کے بعد زندگی میں یہ تبدیلی آئی کہ زندگی گزارنے کا نہیں بلکہ جینے کا مزہ آنے لگا ہے اور پھر بیٹی کے آجانے سے تو زندگی اور بھی زیادہ حسین ہو گئی ہے۔“

”منہ دکھائی میں کیا دیا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟“

”منہ دکھائی میں کیا دیا؟“ تو جس کو دیا‘ یہ اس کے اور میرے بیچ کی باتیں ہیں۔ پبلک میں نہیں لانا چاہتا اور جہاں تک ہنی مون کا تعلق ہے تو وہ ”تھائی لینڈ“ گئے تھے ہم۔“

”عائزہ آپ کے لیے کھانا پکاتی ہے؟“ یا باہر کے کھانے پسند ہیں؟“

”کھانا میرا کک بناتا ہے۔ عائزہ کچن میں کم جاتی ہے۔ لیکن جب بھی اور جو کچھ بھی بناتی ہے ’لاجواب بناتی ہے۔ باہر کے کھانے تو جب بھی موڈ ہو آؤٹنگ کا‘ تب کھاتے ہیں۔“

”آپ چاہیں گے کہ عائزہ آپ کے ساتھ فلم میں کام کرے؟“

”ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ کوئی اچھا اسکرپٹ آیا تو ہم دونوں ایک ساتھ ضرور کام کریں گے۔“

”جوائنٹ فیملی سسٹم ہے آپ کا۔۔۔ اور آپ کو پسند ہے یہ سسٹم؟“

”جی بالکل‘ جوائنٹ فیملی سسٹم ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔ ہماری فیملی میں میرے والدین‘ میرا چھوٹا بھائی اور ہم دونوں ہوتے ہیں۔“

”بیٹی کو اور عائزہ کو اپنی مصروفیات میں سے کتنا ٹائم دیتے ہیں۔“

”کوشش کرتا ہوں کہ جتنا فری ٹائم ہو۔ بیٹی اور بیگم کے ساتھ ہی گزاروں۔“

”آپ چاہیں گے کہ عائزہ دوبارہ ڈراموں میں کام کرے؟ ماڈلنگ میں تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔“

”بالکل۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ اللہ نے اسے بہت ٹیلنٹ دیا ہے۔۔۔ اور پھر اداکاری کا اسے شوق بھی ہے۔۔۔ اور وہ آج کل ”یاسر نواز“ کے سیریل میں کام کر بھی رہی ہے۔۔۔ اور ہاں ماڈلنگ کے لیے بھی اچھی آفر آگئی تو کرلی اور آئندہ بھی اچھی آفر آئی تو ضرور کریں گے۔“

”عائزہ کی کس بات سے متاثر ہو کر شادی کا فیصلہ کیا تھا؟“

”عائزہ میں کوئی ایک خوبی نہیں ہے کہ جس سے میں متاثر ہوا۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔۔۔ سب سے زیادہ اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولتی ہے اور بہت حقیقت پسند ہے۔“

”عائزہ آپ کو گیٹ تک خدا حافظ کہنے آتی ہے یا کمرے سے بائے بائے کر دیتی ہے۔؟“

”میں کہیں بھی جاؤں۔۔۔ خواہ کام کے سلسلے میں یا جم‘ عائزہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آتی ہے۔۔۔ پہلے وہ اکیلی آتی تھی۔ اب ہماری بیٹی بھی ساتھ ہوتی ہے۔“

”گیٹ پہ سوال جواب ہوتے ہیں کہ کب آئیں گے؟“

”جی بالکل۔۔۔ ضرور پوچھتی ہے کہ کب آئیں گے اور جلدی فارغ ہو جائیں تو جلدی آجائیے گا۔“

”عائزہ آپ کو بجی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں؟“

”مجھے عائزہ بغیر میک اپ کے۔ سادگی میں بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے زیادہ میک اپ پسند نہیں۔“

”غصے میں عائزہ کا رد عمل؟۔۔۔ توڑ پھوڑ یا کچھ اور؟“

”نہ توڑ پھوڑ۔۔۔ نہ چیخنا چلانا۔۔۔ بس روہانسی ہو جاتی ہے۔ عائزہ ایک بہت اچھی بیوی ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو ختم کیا۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ناجیہ بیگ

”کیا حال ہیں۔جی؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“

”کہاں غائب ہیں؟“... ”حسبِ حال“ میں نظر نہیں آرہیں خیریت ہے نا...؟“

”جی بالکل خیریت ہے... اور میں کراچی شفٹ ہو گئی ہوں اور حسبِ حال چھوڑدیا ہے۔“

”کیوں چھوڑا...؟ کوئی لڑائی شڑائی؟“

”ارے نہیں... ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چونکہ حسبِ حال کا فارمیٹ تبدیل ہو گیا تھا اور میرا اب کوئی کام نہیں تھا... تو میں کراچی شفٹ ہو گئی۔“

”اچھا... گڈ... کراچی میں کیا مصروفیات ہیں؟“

”آپ کو اور آپ کی طرح دیگر چاہنے والوں کو سن کر بہت خوشی ہوگی کہ میں اداکاری کی طرف لوٹ آئی ہوں... اور ”اے اینڈ بی“ کے پروجیکٹس کے علاوہ جیو کے کچھ پروجیکٹس بھی کررہی ہوں۔“

”واہ... بس تو آپ کا کوئی ڈراما آن ایئر ہوگا تو مزید ایک انٹرویو ڈیو ہے آپ پر۔“

”بالکل ڈن ہے... اور نہ صرف میں اداکاری کی طرف لوٹ آئی ہوں بلکہ آپ عنقریب مجھے ایک شو میں بہ حیثیت ہوسٹ کے بھی دیکھیں گی۔“

”اچھا!... گڈ... ویسے حسبِ حال کو مس تو کرتی ہوں گی...“

”کیوں نہیں... آخر سات سال یہ پروگرام کیا ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے؟“

”بالکل۔ کراچی میں مزا آرہا ہے؟ اور کراچی شفٹ ہونے کا خیال کیوں آیا؟“ ”اس لیے کہ ڈراموں کا اور شوز وغیرہ کا زیادہ کام ہوہی کراچی میں رہا ہے۔ اور پھر آپ کو پتا ہے کہ مجھے آفرز بھی آتی رہتی تھیں۔ تو سوچا کہ جب ”حسبِ حال“ نہیں تو پھر اداکاری ہی سہی۔“

”ہاں... کیونکہ شروعات تو آپ نے ڈراموں سے ہی کی تھی؟ ایسا ہی ہے نا۔“

”جی بالکل ایسا ہی ہے... مگر ”حسب حال“ کی وجہ سے تھوڑا سا وقفہ آگیا تھا۔“

”تھوڑا نہیں کافی لمبا وقفہ آگیا تھا۔“

ہنستے ہوئے...“ جی... اب انتظار ختم ہو گیا ہے۔“

”چلیں جی... ان شاءاللہ پھر بات ہوگی۔“

نیلم منیر

”کیا حال ہیں؟“

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کبھی عامر لیاقت کے ساتھ' کبھی پروگرام میں مہمان۔ اور پھر ڈرامے' بہت مصروف رہتی ہیں آپ؟"

"جی اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے مصروف رکھا ہوا ہے۔ بے کار بیٹھنا تو مجھے ویسے بھی پسند نہیں ہے۔"

"جدوجہد میں زندگی گزری؟"

"جی..... بہت زیادہ..... ہماری کم عمری میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا..... والدہ نے ہی جدوجہد کر کے ہماری تربیت کی' ہمیں لکھایا پڑھایا تو بچپن سے ہی سوچ لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ کرنا ہے....."

"کیا آپ دیگر بہن بھائیوں میں بڑی ہیں؟..... اور پھر کس طرح جدوجہد کا آغاز کیا؟"

"جی ہم چار بہنیں ہیں اور میرا نمبر تیسرا ہے۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب میں نویں کلاس میں تھی تو مجھے ایک کمرشل کی آفر آگئی جسے میں نے فوری طور پر قبول کرلیا۔ بس تب سے اب تک کام کر رہی ہوں۔"

"آپ پٹھان فیملی سے ہیں' تو کیا کسی نے اعتراض نہیں کیا' جبکہ آپ کے سر پر والد کا سایہ بھی نہیں تھا؟"

"جی..... جب اللہ ساتھ ہو تو پھر سب کے دل بھی نرم ہو جاتے ہیں۔ اور بجائے اعتراض کرنے کے سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ جو میرے لیے باعث اطمینان تھا..... ہاں..... مجھے یہ ضرور کہا گیا تھا کہ ایسا کوئی کام نہ کرنا جس کی وجہ سے ہمیں شرمندگی ہو۔"

"پھر تو فلم کے لیے آپ کام نہیں کریں گی۔ جبکہ آپ کے چاہنے والے آپ کو فلم میں بھی دیکھنا چاہیں گے۔"

"جی..... میں فلم میں کام کر رہی ہوں اور اپنی حدود میں رہ کر۔ مجھے بہت پہلے سے فلمز کی آفرز آرہی تھیں۔ لیکن میں ایک اچھی فلم کی تلاش میں تھی جو کہ الحمد اللہ مجھے مل گئی ہے..... مجھے پاکستانی ڈائریکٹرز نے اور بالی ووڈ کے ڈائریکٹرز نے بھی آفرز دیں مگر میں نے منع کر دیا..... میں اپنے ملک کی اچھی فلموں میں کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"جب ماڈلنگ کی آفر آئی تو اداکاری کی بھی خواہش ہوتی ہوگی آپ کو؟"

"جی..... بالکل ہوتی تھی..... لیکن سوچا یہ تھا کہ بہ حیثیت ماڈل اپنا نام بناؤں گی' لیکن اداکاری کے جنون نے اور پھر یہ سوچ کر کہ لوگ بھی مجھے دیکھنا چاہتے ہیں' میں نے اداکاری کی ہامی بھرلی اور "تھوڑا سا آسمان" سے اداکاری کا آغاز کیا۔"

"اور اب یہی آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے..... اور آمد بہ آسانی ہوئی یا پھر کچھ مشکلات بھی ہوئیں؟"

"جی اداکاری ہی اوڑھنا بچھونا ہے اور بے شک آمد آسانی ہوئی مگر راتوں رات شہرت والا کام نہیں ہوا..... جگہ بنانے کے لیے محنت کرنا پڑی اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محنت کا صلہ دیا مجھے۔"

"فلم کے بارے میں تھوڑا بتائیں؟"

"جی..... محسن علی کی ڈائریکشن میں کام کر رہی ہوں۔ بہت اچھی کہانی ہے..... اور ان شاء اللہ بقرعید پر ریلیز ہوگی۔ فلم کا نام "چھپن چھپائی" ہے۔ اور میرے ساتھ احسن خان لیڈر رول کر رہے ہیں..... دیگر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

فنکاروں میں ”ریحان شیخ“ ”فیضان خواجہ“ اور طلعت حسین صاحب شامل ہیں۔“

”اپنے پسندیدہ ڈرامے بتائیں؟“

”مجھے اپنے سارے ہی ڈرامے اچھے لگتے ہیں' کیونکہ میں بہت سوچ سمجھ کر کردار لیتی ہوں۔ مگر پھر بھی اپنا پہلا ڈراما ”تھوڑا سا آسمان“ ”جل پری قید تنہائی' اشک“ زیادہ پسند ہیں.... اور آئندہ کے لیے میری خواہش ہے کہ میں بہتر سے بہترین رولز کی طرف جاؤں۔“

”اداکاری میں کس کی تقلید کرتی ہیں؟“

”فالو میں کسی کو نہیں کرتی' مگر پسند بہت سے لوگوں کو کرتی ہوں۔ اپنے سینئرز سے بہت کچھ سیکھتی ہوں۔ جیسے ہمایوں سعید' فیصل قریشی' عدنان صدیقی ہیں اور ثانیہ سعید ہیں۔“

”ماشاء اللہ اتنی شہرت ہے آپ کی.... تو پاکستان میں تو شاپنگ مشکل سے ہی ہوتی ہوگی؟“

”جی بالکل.... اسی لیے میری ساری شاپنگ میری والدہ ہی کرتی ہیں اور لباس میں وہ مشرقی لباس کی ہی شاپنگ کرتی ہیں کیونکہ مجھے مشرقی لباس ہی پسند ہے۔“

Downloaded From

”گھر جلدی آجاتی ہیں؟“

”جی میری کوشش ہوتی ہے کہ گھر جلدی آجاؤں.... کیونکہ مجھے خود بھی دیر تک گھر سے باہر رہنا پسند نہیں ہے.... اور میرے ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کو معلوم ہے کہ نیلم کو جلدی گھر جانا ہوتا ہے۔“

”اتنا کام کرکے مزاج' خوش باش ہوا یا غصہ پہلے سے زیادہ تیز ہوا؟“

”نہیں نہیں.... کام کے لیے مزاج کو خوشگوار ہی رکھنا پڑتا ہے ورنہ کام میں انصاف نہیں ہوسکتا.... غصہ تیز ہی ہے مگر اچھی بات ہے کہ جلدی اتر بھی جاتا ہے۔“

عینی جعفری

”کیا حال ہیں جی.... کہاں غائب ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے.... اور کیا مطلب غائب سے؟“

”مطلب یہ کہ آج کل اسکرین پر نظر نہیں آرہیں۔“

”اوہ۔ (قہقہہ).... آپ کو پتا تو ہے کہ شادی کے بعد لندن سیٹل ہوگئی ہوں۔“

”تو کیا اداکاری کو خیرباد کہہ دیا؟“

”ارے نہیں.... میں ان شاء اللہ بہت جلد بڑی اور چھوٹی اسکرین پہ آپ کو نظر آؤں گی.... بڑی اسکرین پہ تو ”خالد عثمان بٹ“ کے ساتھ لیڈ رول کر رہی ہوں۔ فلم کا نام ”بالوماہی“ ہے۔“

”اس سے پہلے آپ نے ”میں ہوں شاہد آفریدی“ فلم میں بھی تو کام کیا تھا؟“

”اس فلم میں میرا لیڈ رول نہیں تھا.... کیونکہ اس کی اسٹوری کرکٹ پر مبنی تھی.... اس میں میرا کردار

READING
Section

زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اب جو فلم کر رہی ہوں... اس میں میں نے بتایا آپ کو کہ لیڈ رول کر رہی ہوں۔"

"لیڈ رول تو ہے... مگر کیا لو اسٹوری ٹائپ ہے؟"

"فلم تو ہوتی ہی لو اسٹوری ٹائپ ہے... اور اس میں میرا کردار آج کی مضبوط عورت کا کردار ہے... اور بہت اچھا ہے۔"

"اس فیلڈ میں وہی "ان" ہوتا ہے جو نظروں کے سامنے ہوتا ہے... لندن جانے سے کیریئر متاثر تو ہوا ہوگا؟"

"جی بالکل ہوا... مگر ازدواجی زندگی بھی بہت اہم ہے لڑکی کے لیے... خیر۔ اب میں دوبارہ فیلڈ میں آگئی ہوں۔"

"اداکاری اور ماڈلنگ کو ساتھ ساتھ رکھیں گی کیا؟"

"پتا نہیں کیا بات ہے کہ میں ایک وقت میں کئی کئی کام نہیں کر سکتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ایک وقت میں ایک کام کروں مگر جم کر کروں۔ میں خود کو اداکاری تک ہی محدود رکھنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اداکاری میرا جنون ہے... اور مجھے مزا بھی اداکاری میں ہی آتا ہے۔"

"اپنے آپ کو فٹ کس طرح رکھتی ہیں کہ ایور گرین رہیں؟"

ہنستے ہوئے... "اچھی خوراک اور بہت سارا پانی میری فٹنس کا راز ہے... ورزش بھی کرتی ہوں۔ بس یہی ہے میری صحت، فٹنس اور خوب صورتی کا راز۔"

"فیشن سے لگاؤ...؟"

"ہے... مگر بہت زیادہ نہیں... سادگی پسند ہوں... سادگی میں زیادہ حسن ہے۔"

"چلیں جی... آپ کا نیا ڈراما آئے گا تو پھر بات کریں گے۔"

◆

ماہنامہ کرن
اپریل 2016 کا شمارہ شائع ہو گیا

- "کھولے پنکھ یادوں نے" مصنفین سے سروے،
- اداکار "آفان وحید قریشی" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "عاصمہ حسین"
- اداکارہ "زرنش خان" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
- اس ماہ "حورالعین اقبال" کے "مقابل ہے آئینہ"
- "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا نیا سلسلے وار ناول،
- "راپنزل" تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" نایاب جیلانی کا مکمل ناول اختتام کی طرف،
- "جو لکھا تھا میرے نصیب میں" اَیلا کرن علی کا مکمل ناول،
- "دل آباد کریں" نازیہ جمال کا مکمل ناول،
- "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ،
- "میرے بدگمان" اُم ایمان قاضی کا ناولٹ،
- نظیر فاطمہ، عابدہ احمد، بنت سحر اور سحرش فاطمہ کے افسانے اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب
"بہار، رنگ اور خوشبو"
کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

Downloaded From

شادی مبارک ہو

عمر خلیل ہمراہ حرا عمر

آسیہ رزاقی

"عمر خلیل... عرف انعم کی شادی؟ ہائیں۔ کل کا بچہ... آج شادی۔ کمال ہے بھئی۔"

"ارے کیا کہہ رہی ہو طاہرہ۔" ہم نے ریسیور کو گھورا۔ "ابھی کچھ دن پہلے ہی تو وہ پیدا ہوا تھا۔ جب تم ہمارے ابا کے گھر مقیم تھیں۔ 29 بی میں۔" یقین دلایا۔ وہ ہنسنے لگیں۔

"کچھ دن پہلے نہیں۔ بہت دن پہلے... پھر وہ انگلینڈ چلا گیا پڑھنے۔ اب آیا ہے تو اس کی جاب بھی شروع ہو گئی ہے۔ لڑکی ہمیں اچھی لگی۔"

وہ سنا رہی تھیں۔ ہم حیرانی کے سمندر میں غوطے لگا رہے تھے۔ جاب شروع ہو گئی ہے؟ ارے۔ کیا کرتا ہو گا وہاں۔ گھر میں تو اس سے کچھ ہوتا نہ تھا۔ انوکھا لاڈلا۔ سب سے چھوٹا۔ بھائی بہنوں کا محتاج۔ من من چن چن۔ مارے لاڈ کے بہن بھائی ان کو بابے پکارتے تھے۔ اب بھی، لیکن اب بھانجیاں بھی ہیں۔ جن کے وہ انو بابا ہیں۔ خیر۔

ہمیں تو اس بینک کی فکر لاحق ہو گئی۔ جہاں وہ کام کر رہے ہیں۔

اکتوبر ختم ہو رہا تھا۔ ایبٹ آباد میں سردی بڑھ رہی تھی۔ ہم نے لپ جھپ تیاری شروع کی۔ اور 2 نومبر کو لاہور پہنچے۔ آتے ہی مارکیٹ کی سیر کی۔ اون خریدا۔ اور اپنا شوق پورا کیا۔ ایبٹ آباد میں تو "بچے کھچے اون" کے کئی کئی رنگوں کے ڈیزائن بنا کر تیار کر لیے تھے۔ پورے نو یا دس تھے۔ سب لاہور آئے،

READING
Section

کیونکہ وہیں تو تقسیم ہوتے تھے۔ خیر کئی سال بھی سوئٹر بنا لیے۔ پھر آنے والی دلہن کے لیے بھی لمبا سوئٹر بن لیا۔

خیر صاحب اب عمر خلیل کی مہندی جو گھر میں ہی تھی۔ قریبی عزیز ہی تھے۔ ہماری گانے والی مخصوص ٹولی تو اب تتر بتر ہو گئی تھی۔ تارو اور فلاح امریکہ، عاشی تھائی لینڈ، لے دے کر سلمٰی اور صنیعہ ہی تھیں۔ پارو بھی کراچی میں تھی۔ خیر۔ لاؤنج میں مایوں مہندی کا سماں۔ تخت پر پیلی مسند۔ پیلے یعنی کہ گیندے کے پھولوں کی لڑیاں، لڑکیاں فلمی گانوں میں مگن۔ میں نے حسب عادت پاکستانی گانوں کی فرمائش کی۔ سلمٰی، صنیعہ اور باقی لڑکیاں بھی شامل ہو گئیں۔ اچھی خاصی محفل رہی۔ دولہا بلائے گئے۔ بہنوں کے جھرمٹ میں شرماتے ہوئے آئے۔ رسم کی گئی۔ ابٹن خوب ہی تھوپا گیا۔ دولہا کا منہ غائب۔ اسامہ نے کسی کو معاف نہ کیا۔ اماں ابا کو بھی تھوپا۔

عامر نے گھر میں باربی کیو کا انتظام کیا تھا۔ اور نہ جانے کھانے میں کتنی اقسام تھیں۔ اور سنا کہ سب ہی بے حد لذیذ۔ سیخ کباب۔ پکوڑے۔ دم کا قیمہ، گرم گرم نان۔ سادہ اور روغنی، دو میٹھے۔ نازک اندام، رسیلی جلیبیاں جو گرم گرم پیش کی گئیں۔ لان میں حلوائی موجود۔

سردی یک لخت بڑھ گئی۔ ہم لوگ اندر آ گئے۔ بارات شادی ہال میں گئی۔ دولہا نظر لگنے کے حد تک پیارا۔ گلابی رنگ، براؤن بال، آف وائٹ شیروانی میں بہت ہی وجیہہ لگ رہے تھے۔

سرخ دوپٹے میں چہرہ چھپائے، دلہن آئیں۔ ہم نے شکل نہیں دیکھی۔ بھئی۔ دولہا ہی تھا دیکھنے کے لائق۔ گو کہ دولہا تو عمر تھے۔ مگر تقریب کے دولہا اسامہ لگ رہے تھے۔ بے حد مصروف، آخر بڑے بھائی تھے۔ اور ہر جگہ ہر دفعہ اسامہ ہی مصروف نظر آئے۔ جہیز کو ٹھکانے لگانے تک۔ بچارا کھپتا رہا۔

"بابے! کچھ تو بھی ہاتھ ہلا لے۔ کمرہ سیٹ کروا لے۔"

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
اپریل 2016 کے شمارے سالگرہ نمبر کی ایک جھلک

To Download
Stay Tuned To

- سالگرہ نمبر کی خاص پیش کش، قارئین سے سروے،
- "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ"
مصنفین سے سوال جواب،
- عنیزہ سید کا مکمل ناول "گیت، پری اور تم"،
- عمیرہ احمد کا ناول "آبِ حیات"،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"،
- "دشتِ جنوں" آمنہ ریاض کا مکمل ناول،
- "محبت، خوشبو کی مانند" نفیسہ سعید کا مکمل ناول،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، بنت سحر اور ماورا خان کے افسانے،
- راک اسٹار "عمر جیسوال" سے ملاقات،
- باتیں "ماہا وارثی" سے،
- "کرن کرن روشنی" احادیث کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے
اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،
اپریل 2016 کا شمارہ سالگرہ نمبر آج ہی خرید لیں۔

تو جواب ملا۔ "میں تو دولہا ہوں۔"

طاہرہ رخصتی کروا کے گھر آئیں۔ سیدھی کچن میں پہنچیں۔ کھیر چنائی' اوہو' کچن تو پانی سے بھرا سمندر' نہ کوئی نالی۔ نہ بظاہر پانی کا کوئی اور راستہ کیسی کھیر' کیسی رسم' تولیے لا کر کس طرح ماں بیٹیوں نے پانی خشک کیا۔ تھک گئیں۔

ولیمہ گراؤنڈ میں تھا۔ سبزہ زار' منتظم اعلا عامر ماموں اور اسامہ بھائی نے شادی کی رات ہی وہاں اسٹیج بنوا کر اس پر صوفے رکھوا دیے تھے۔ قالین رول کیے کناروں پر رکھے تھے۔ تاکہ اگلے دن ذرا سہولت رہے۔ سب شادی میں مصروف تھے۔ رات میں کسی وقت سوسائٹی کا ٹینکر آیا۔ گراؤنڈ میں پانی ڈال گیا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر منتظم صاحبان جائزہ لینے آئے۔ سر پکڑ کر رہ گئے۔ صوفے پانی میں دھلے دھلائے' قالین پانی میں ڈوبے ہوئے۔ افراتفری' گھر سے باہر تک۔ دولہا بھنوں اور دلہن کے گرد بیٹھے دانت دکھاتے رہے۔ ہاں بھئی۔ دولہا' دولہا ہے۔ اس کی جو ذمہ داری تھی وہ اس نے بخوبی نبھائی۔ سب کے سامنے قبول ہے۔ قبول ہے۔ کہہ کر۔

کس قدر مشکلوں سے وہ بھیگے قالین از سر نو ٹرک پر لادے گئے۔ صوفے چڑھائے گئے۔ دس گنا وزن ہو چکا تھا۔ اب گراؤنڈ کا پانی خشک کرنے کا مسئلہ۔ کہیں سے بڑے قالین نہیں مل رہے۔ دونوں منتظم اعلا ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ فون کانوں سے لگائے چیخ رہے ہیں۔ سردی۔ دھوپ بھی ہلکی۔

نہ جانے کون کون سے بھاری بھر کم آلات منگا کر پانی خشک کیا گیا قالین بھی مہیا کیے گئے۔ یہ الگ داستان ہے۔ درد سری' کوفت' دولہا میاں بے فکر' سوٹ میں ملبوس مسکراتے ہوئے تشریف لائے مع دلہن۔

دلہن نے آف وائٹ غرارہ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس پر خوب کام بنا ہوا تھا آتشی گلابی پٹی پر کار چوب بہار دے رہا تھا۔ کم عمری اور بھولے پن کی عملی تفسیر۔ دونوں ہی کم عمر' بھولے بھالے' بچے لگ رہے تھے۔

اسامہ کی مصروفیت۔ کسی تصویر۔ کسی گروپ فوٹو میں نظر نہ آئے۔ ذمہ دار۔ محنتی بچہ۔ اللہ عمر دراز کرے۔ محنتی اور حساس فرماں بردار ہے۔ نیک ماں باپ کی اولاد۔ اللہ دونوں بھائیوں کو بہت سی خوشیاں عطا کرے۔ آمین۔

پھر جناب یوں ہوا۔ جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے۔ سرد موسم کی شادیوں کی شرکت میں۔ ٹھنڈ لگی۔ اور ہم نے بستر سنبھال لیا۔ سخت بیماری جھیلی۔ بس زندگی بھی ان دواؤں اور دعاؤں کے باعث قائم رہی۔ جو دوائیں ہمارے بھانجے علی ارسلان نے تجویز کیں۔ اتفاق سے وہ ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے۔ اور دعائیں جو منزہ نے کینیڈا میں بیٹھے بیٹھے فیس بک میں ہماری مشہوری کر دی۔ سخت علالت کی اور دعاؤں کی اپیل۔ پھر تو نہ جانے کس کس نے فیس بک میں دعاؤں کے ذخیرے جمع کر دیے۔ جو عزیز رشتے دار لاہور' کراچی میں تھے بلکہ اسلام آباد میں بھی۔ سب نے دعائیں کیں۔ اللہ سب کو ان کا اجر دے۔ اور سب کو صحت عطا کرے۔ آمین۔

دو ماہ کی بیماری۔ اور جو خدمت سلمٰی نے کی۔ بیٹے صاحب ایبٹ آباد سے آ گئے۔ دوائیں۔ ان ہیلر' اسٹیم' جو زندگی بھر نہ کیا تھا۔ وہ کرنا پڑا' ہائے مجبوری۔ ایلوپیتھک دواؤں سے واسطہ پڑا نہ تھا۔ ہمیشہ ہومیو پیتھک علاج کیا۔ لیکن۔ پبلک کے پُرزور اصرار پر۔۔۔ سب کچھ کرنا اور سہنا پڑا۔ چھوٹی موٹی بیماری میں تو ٹوٹکوں اور خمیروں سے ہی صحت حاصل کر کے اطمینان ہو جاتا تھا۔

امریکہ بیماری کی خبر پہنچی تو بھانجیاں' جی ہاں' نند کی بیٹیاں' تینوں لاہور آ گئیں سوچیے' اتنی محبت بھلا کسے نصیب ہوتی ہے۔ آتے ہی مجھے اپنی آغوش محبت میں لے لیا۔ ہاں جی۔ اماں جان' دادی جان' نانی جان کا کردار ادا کرنے لگیں۔ جیسا میں نے ان کے بچپن میں ان کے ساتھ کیا تھا۔

وہ بھی اسی طرح نصیحتوں شفقتوں کے انبار لگا رہی ہیں۔ اُفوہ۔ خدمتیں الگ۔

اللہ خوش رکھے۔ آمین۔

عفت سحر طاہر

خواب سلسلے چاہت کا

آسمان سے بارش برسنے کا آج عجیب ہی منظر تھا۔ تند و تیز پر شور ہواؤں کے ساتھ، مگر مسلسل۔ کسی بیوہ اور کسی یتیم کے آنسوؤں کی سی روانی کے ساتھ۔

"کون ہے یہ... تمہاری ناجائز اولاد؟" تیز... سماعتوں میں چبھتی آواز۔

اس کا ساکت جسم ہلکا سا تھرایا۔

"خدا کی قسم! آپ کا خون... آپ کے بیٹے کا جانشین۔ آپ کا وارث..." کوئی تڑپ کر گڑگڑایا۔

"جاؤ بی بی! جاؤ... جا کے ثبوت لاؤ۔"

تنفر، حقارت اور رعونت... سب کچھ تھا فرعون وقت کے لہجے میں اور پھر ایک عورت کی چلچلاتی آواز۔

"پتا نہیں کس گندی نالی کا کیڑا ہے... معاف کرو بی بی ہمارے سر مت منڈھو اپنے گناہوں کی پوٹلی..." وہاں سب ہی ایسے تھے اس کا تنفس تیز تر ہوا۔

کسی نے دھکے دے کر انہیں زبردستی بارش اور تیز ہواؤں کے سپرد کر دیا تھا۔

اس کی ماں برستے پانی میں سڑک پر ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گری تو وہ بے قرار سا تڑپ اٹھا۔ ان کی پیشانی لہو میں تر تھی۔

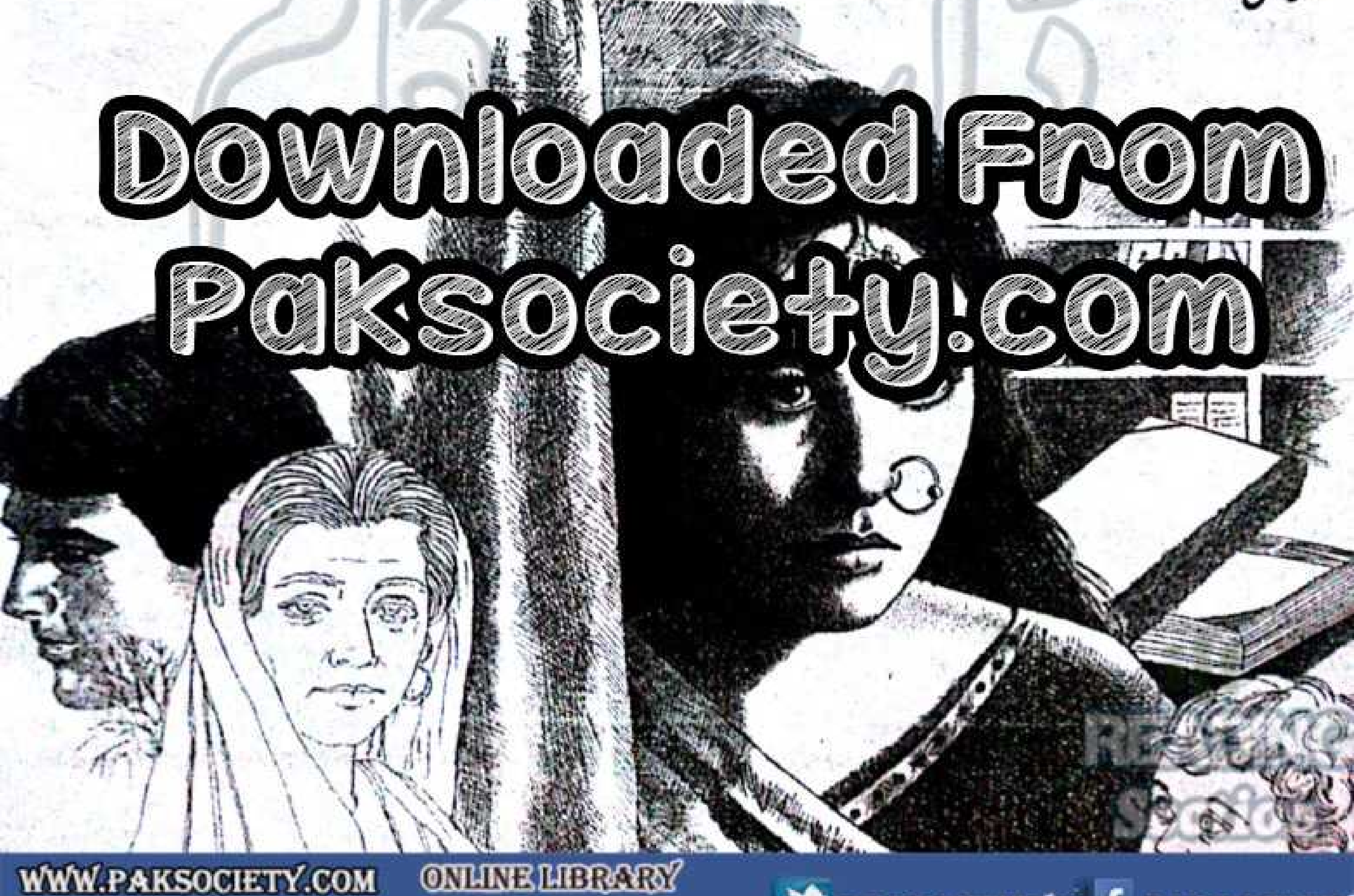

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

”امی۔۔۔!“ زور سے انہیں پکارا اور بے اختیار ہی اٹھ بیٹھا۔

اپنے نرم بستر میں۔۔۔ کمرے کے پرسکون ماحول میں۔۔۔ اسے آگ لگتی محسوس ہوئی۔

یہ خواب۔۔۔ یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا اور جب تک وہ زندہ تھا شاید تب تک اسے یونہی اس کا خود سے کیا وعدہ یاد دلاتا رہنے والا تھا۔

”کسی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ ماں۔ جہاں لا کے ہمیں پھینکا گیا تھا ایک دن ان کو بھی وہیں اوندھے منہ گراؤں گا۔“ اس کی آنکھیں لہو رنگ تھیں اور دل میں وہ ہمیشہ کی طرح وہی عہد دہرا رہا تھا جو وہ ہر بار یہ خواب دکھائی دینے پر خود سے کیا کرتا تھا۔

* * *

عالیشان سے ”آفندی ہاؤس“ میں اس وقت خوب صورت سی ہلچل مچی ہوئی تھی اور مزے کی بات یہ کہ ساری ہی نسوانی چیخ و پکار۔

”اللہ۔۔۔“ چچی جان نے سر ہاتھوں میں تھام لیا تو ذرا ہی دیر میں ناشتے کی میز پہ مچی ہلچل تھمی۔

”کیا ہوا امی۔۔۔؟“ فرزین نے تشویش سے پوچھا۔

”اُفوہ! صبح سے اکیلی کچن میں لگی ہوئی ہیں۔ طبیعت خراب ہو گئی ہو گی۔“ تزئین کو خیال آیا۔

”بی پی لو ہو گیا ہو گا۔۔۔ انڈا کھلاؤ۔“ ملاحہ نے اپنی ڈاکٹری جھاڑی اور پھر اس پہ الگ بحث۔

”ارے نہیں بی پی میں یہ تھوڑی۔۔۔ فلاں فلاں چیز اور فلاں۔۔۔ ارے نہیں۔۔۔ وہ لاؤ۔۔۔“ اگلے ہی لمحے ناشتے کی میز پھر سے مچھلی بازار۔

”نکمیوں۔۔۔ نالائقوں بس کرو اب۔“ چچی جان نے گرج کر کہا تو سب کی سب آنکھیں پھاڑے تشویش زدہ ہو گئیں۔

”ہائیں۔ ہم تو ہمدردی کر رہے ہیں امی۔۔۔“ فرزین نے منہ بسورا۔

چچی جان نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ”میں باز آئی ایسی ہمدردی سے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سر میں درد کے ساتھ ڈپریشن میں بھی مبتلا کر دیا تم لوگوں کی ہڑبونگ نے۔“

”لو جی۔۔۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔“ ملاحہ ہلکا سا منہ بنا کر اپنے ناشتے پر جھک گئی۔

”ابھی اگر آغا جی یہاں ہوتے تو پھر دیکھتیں ان سب کی بولتی کیسے بند ہوتی ہے۔“ تائی جان کا انداز مخصوص سختی اور تنبیہہ لیے ہوئے تھا۔

”اُفوہ امی پلیز۔۔۔ ہر وقت آغا جان سے نہ دھمکاتی رہا کریں ہمیں۔“ ملاحہ ہمیشہ کی طرح چڑی۔ ایک آغا جان کیا کم تھے جو اوپر سے امی بھی۔۔۔

”شکر کرو، اتنی ڈھیر ساری پوتیوں میں سے ایک آدھ پھینک وینک نہیں دی انہوں نے۔ ایسا عظیم غم ہے انہیں پوتا نہ ہونے کا۔۔۔“ وہ لٹھ مار انداز میں کہتی ہوئی آکر اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھی تو تائی جان نے اپنی دوسری نمبر کی اس باغی اولاد کو ہلکا سا گھور کے دیکھا۔ پھر اسے جھڑکا۔

”ہر وقت فضول باتیں مت کیا کرو مہرو۔۔۔“

”دادا ہیں تمہارے۔ محبت اور آسائشوں بھری زندگی دی ہے انہوں نے تمہیں۔“ چچی جان کو بھی مہراہ کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

”مان لیں امی۔۔۔۔ کبھی کبھار بھی آغا جان کو ”پوتا ڈپریشن“ کا جو دورہ پڑتا ہے تو وہ شدید ہی ہوتا ہے۔“ ملاحہ نے ڈھٹائی سے کہتے بہن کا ساتھ دیا تھا۔

”یہ ساری بکواس ان کے سامنے کرنا پھر پتا چلے گا کتنے بیس کا سو ہوتا ہے۔“ تائی جان ان کی بے موقع بحث اور فضول گفتگو سے بھنا گئیں۔ ایک تو ویسے ہی انہیں اور چچی جان دونوں کو ہی بیٹا نہ ہونے کا غم تھا۔

”ہک ہا۔۔۔ اتنی وسیع و عریض جائیداد۔۔۔ اور حق دار کون؟ یہ سینے پر دھری پانچ سلیں۔“

آغا جان تو برملا کہا کرتے اور پوتیوں کے جذبات کا خیال کیے بنا ان کے سامنے بہ آواز بلند کہتے۔

”بہت شکریہ۔۔۔ اللہ کا کرم ہے۔ ہمیں خود ہی پتا ہے کہ سو میں کتنے بیس کے نوٹ ہوتے ہیں۔“

وہ ناشتا کر کے فارغ ہو گئی تھیں۔ مہپاہ اور تزئین کو یونیورسٹی اور فرزین اور ملاحہ کو کالج جانا تھا۔

”آپی کب آرہی ہیں امی۔۔۔؟“ ملاحہ کو خیال آیا۔ سب سے بڑی ملائکہ شادی شدہ تھی اور اپنے شوہر اور دو سالہ بیٹے کے ساتھ مسقط ہوتی تھی۔

”ابھی تو کوئی پکا ارادہ نہیں کیا اس نے۔ کچھ دن بعد بتائے گی۔“ انہوں نے بتایا تو وہ سرہلا کے باقیوں کے پیچھے چل دی۔

فرزین اور ملاحہ کو کالج ڈراپ کرنے کے بعد ڈرائیور نے مہپاہ اور تزئین کو یونیورسٹی اتارا۔

تزئین تو اندر داخل ہوتے ہی اپنی دوستوں کے گروپ کی طرف بڑھ گئی مگر مہپاہ کی آنکھوں نے بے چینی سے ادھر ادھر کسی کو کھوجا۔ اور پھر ذرا آگے بڑھنے پر مخصوص کونے میں سفیدے کے درخت پاس وہ خوش رو دکھائی دے گیا تو وہ کھل کے مسکرا دی۔ اور تیزی سے اس کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

”دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔۔۔ شغل میلے کی بات تھی اور تو اسے دل پہ ہی لے بیٹھا ہے۔“ نصیر قاضی اس کی بات سن کر جس طرح بدکا کوئی اور موقع ہوتا تو وقار آفندی ہنستا مگر اس وقت تو وہ کسی اور ہی الجھن کے گھیرے میں تھا۔

”شغل میلہ ہی ہے۔۔۔ میں اور کیا کہہ رہا ہوں۔“ اس نے قاضی سے نظر چرائی۔ اور نصیر قاضی بچہ نہیں۔۔۔ گھاگ شکاری تھا۔ پرانا پاپی۔ اس معاملے میں چوک نہیں سکتا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول
شائع ہو گئے ہیں

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبیں قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں لبنیٰ جدون قیمت: 250 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہء عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

READING
Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"شغل میلے والوں کی حالت مجنوؤں جیسی نہیں بن جایا کرتی وقار! اپنے بابا جان کو جانتا ہے نا۔ تمہاری ہی نہیں میری بھی کھال اتروا دیں گے۔" قاضی نے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

"تو میں کب تجھے بیچ میں ڈال رہا ہوں۔ تو بس مجھے زر گل بائی کا نمبر دے دے یا نیا ایڈریس۔ پرانے والے پہ تو وہ ملی ہی نہیں۔" وہ بے چینی سے بولا۔

"نکل گئی ہوں گی ماں بیٹی کسی کے ساتھ۔ طوائف اور بنجارے کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہوتا میری جان۔"

قاضی نے لب و لہجے میں مقدور بھر لاپروائی سموئی۔

"قاضی پلیز یار۔۔۔" وہ اس کے بچپن کا دوست تھا۔ آنکھوں سے سب رنگ پہچانتا تھا۔ لہجے میں ناراضی بھر کے بولا تو وہ بے بس ہونے لگا۔

"کیوں آگ میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔۔۔ جہنم ہے یہ جہنم۔۔۔"

"بس ایسے ہی یار۔ دل پشوری ہے اور کچھ نہیں۔" وقار نے اس کے وہم کو کم کرنا چاہا۔

"جھوٹ اس سے بولو جو تمہارے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ناواقف ہو وقار۔" قاضی کے انداز میں ہلکی سی سرزنش تھی۔

"اور شادی طے ہونے والی ہے تیری۔ دل پشوری کا سامان تو آل ریڈی ہو جائے گا۔ پھر کیوں گند میں گرتا ہے یار میرے۔"

"اوفو۔۔۔ میں یہاں لیکچر لینے نہیں آیا تجھ سے۔ بتانا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ کاشف سے پوچھ لوں گا اور وہ بتا بھی دے گا۔" اب کی بار وہ ٹھیک ٹھاک ناراض ہوا اور آخر میں جتا بھی دیا۔

"یہ طوائفیں وقت گزاری کے لیے ہوتی ہیں وقار۔ اور ہم تو بس ایویں شغل میلے میں وہاں چلے گئے۔" قاضی اسے مقدور بھر سمجھانا چاہتا تھا۔

"اسے طوائف مت کہو۔ دھندا نہیں کرتی وہ۔ اس کے نصیب برے کہ ایک طوائف کے گھر پیدا ہو گئی۔ صرف گانا گاتی ہے وہ۔" وہ خفیف سا بگڑتے ہوئے بولا۔

"مفت میں نہیں سناتی گانا۔ اس کی آواز اور ادائیں ہر روپے والے کے لیے بکاؤ مال ہیں۔ لوگ اسے گندی نظروں سے دیکھنے کے پیسے ادا کرتے ہیں۔"

قاضی نے صاف صاف کہنے کی ٹھانی تو وہ بھڑک اٹھا۔

"تم حد سے بڑھ رہے ہو نصیر قاضی۔"

"حد تک تو تم آن پہنچے ہو وقار! مذاق میں شروع ہوئی بات کو زندگی کا مسئلہ بنا لیا تم نے۔۔۔ کتنی بار مل چکے ہو اس سے؟" قاضی کو اس کے لہجے سے زیادہ اس کی زندگی اور عزت کی فکر تھی۔

"تین ماہ سے مل رہا تھا اور ایک بار بھی کوئی اخلاق سے گری حرکت نہیں دیکھی میں نے اس کی۔" ڈھٹائی دکھاتے ہوئے وہ تفاخر سے بولا تو قاضی نے طنز کیا۔

"تو پھر اب۔۔۔ کہاں اڑ گئی چڑیا۔"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ آخری ملاقات دو ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ تب تک تو ٹھیک چل رہا تھا سب کچھ۔ اب وہاں گیا تو پتا چلا کہیں کوٹھی میں شفٹ ہو گئی زر گل بائی۔" اس کے لب و لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"تجھ سے بڑی آسامی ہاتھ لگ گئی ہو گی شہزادے۔"

اب کی بار قاضی کے لہجے میں اطمینان تھا۔ "خس کم جہاں پاک" مگر وہ یوں بھڑکے گا قاضی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"بکواس مت کرو اور خبردار جو ایک بھی فضول لفظ کہا اس کے بارے میں....."

غصے سے اس کی رنگت لال پڑ گئی تھی اور ماتھے کی رگ پھڑکنے لگی۔ قاضی ایک دم چپ سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں پہلے ہی پریشان ہوں اس کے بارے میں اور روپے پیسے کا لالچ ہوتا اسے تو میرے پاس بھی کم جائیداد نہیں تھی۔ فوراً ہی شادی کی آفر قبول کر لیتی، مگر وہ تو مانی ہی نہیں اور اب ایک دم سے یوں غائب ہو جانا....."

وہ غصے بھری بے بسی سے کہہ رہا تھا۔ قاضی کو جھٹکا لگا۔ شدید جھٹکا۔

"تو نے شادی کی آفر کی اسے.....؟"

اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وقار آفندی نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے اسے دیکھا اور بے حد سکون سے پر لہجے میں بولا۔

"ہاں..... اور آفر ہی نہیں کی بلکہ میں یہ شادی کروں گا۔" نصیر قاضی اپنے بال نوچ کے رہ گیا۔

غلطی..... بلکہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی جو اس "خر دماغ" کو زرگل بائی کے کوٹھے پہ لے گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وقار آفندی نوٹوں کے ساتھ دل بھی زرگل بائی کی حسین اور طرح نگار بیٹی زرنگار پر لٹا آئے گا۔

* * *

"ٹائم دیکھ رہی ہو..... میں تو بس کیمسٹری کی سلینہ ممتاز کے ساتھ نکلنے والا تھا۔"

اس نے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی مہاہ کی آنکھوں کے آگے لہرا کر جتایا تو وہ بھی تنکی۔

"نکل ہی گئے ہوتے..... تاکہ میں بھی فزکس کے جنید ہمدانی کے پرپوزل کو قبول کرتے ہوئے شرمندگی محسوس نہ کرتی۔" ضبط کرتے ہوئے بھی طلال کو ہنسی آگئی تھی۔

"مجال ہے جو جواب دیے بغیر تم لڑکیوں کی زبان رہ جائے۔"

"تو تم لڑکے ایسے سوال کرتے ہی کیوں ہو؟" مہاہ نے فائل اوپر کرتے ہوئے دھوپ سے بچنے کی سعی کی اور طلال نوید کو گھور کے دیکھا۔ تو وہ صفائی پیش کرنے لگا۔

"روز دیر سے آتی ہو۔ اب کیا سوکھا رعب بھی نہیں ڈال سکتا بندہ۔"

"ہاں..... ویسے رعب "سوکھا سڑا" ہی تھا بلکہ "سڑا بسا" زیادہ مناسب رہے گا یہاں۔"

اس نے طنز سے کہتے ہوئے سلینہ ممتاز کے دبلے پتلے وجود اور گہری سانولی رنگت کا حوالہ دیا تو وہ تنبیہی اونہوں کر کے رہ گیا البتہ ہونٹوں کے کناروں سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ دونوں درختوں کی چھاؤں میں یونیورسٹی گراؤنڈ کے فٹ پاتھ پہ چلنے لگے۔

"اتنی لیٹ تو نہیں ہوئی کہ تم سلینہ سے شادی کر کے خودکشی کرنے کا سوچنے لگو۔ پانچ دس منٹ ہی تو اوپر ہوتے ہیں۔" مہاہ کا اس سے بات کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ حق جتاتا۔ پیار بھرا اور بے پناہ مان کہ وہ اس کا ہر جملہ برداشت کرے گا ہر رعب جھیلے گا۔

"یوں روزانہ پانچ پانچ منٹ کر کے ہی تو جان نکالتی ہو۔ یہی لگتا ہے نہیں آؤ گی ..."

وہ بے بسی سے بولا تو مہاہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔

"تو کیا ہوا اگر ایک دن نہ بھی آئی تو..... کیا ہو گا؟" لاپروائی کا لبادہ اوڑھ کر بے نیاز بنتے ہوئے پوچھا تو وہ عین اس کے سامنے آگیا۔ مہاہ رکی۔ وہ سنجیدہ تھا۔

"تو سانس نہیں آئے گی یار....." مہاہ کے دل کو کچھ ہوا تو اس کی نگاہ میں الجھی نظروں کو تیزی سے پھیرتی وہ اس

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

کا مذاق اڑانے لگی۔

"ہاں... لگتا ہے "دل والے" دیکھ ہی لی تم نے بھی۔"

"یعنی... تم سمجھ رہی ہو کہ میں ڈائیلاگ جھاڑ رہا ہوں؟" طلال کو صدمہ ہوا۔ تو مہواہ کو ضبط کے باوجود بھی ہنسی آگئی۔

"نہ کیا کرو طلال... قسم سے ایسے مرجانے اور سانس نہ آنے والے جملے مجھے فلمی ڈائیلاگ ہی لگتے ہیں اور ہاں "چیپ" میں نے دل میں کہہ لیا ہے۔ اونچی آواز میں کہتی تو تم مائنڈ کر جاتے۔" بڑی معصومیت سے اپنا احسان جتایا تو وہ دانت پیس کر پاؤں پٹخ کر پلٹ گیا۔ مہواہ کی ہنسی اور قدموں کی چاپ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

☼ ☼ ☼

مبین آفندی جوان بیٹیوں کے باپ... عمر کے اس دور میں تھے کہ ہر فیصلہ ہر بات بلا جھجک اگلے بندے تک پہنچا دیتے، مگر آغا ذوالفقار آفندی کے اسٹڈی روم میں داخل ہوئے تو ان کے دل میں خفیف سے خوف کی لہر بھی تھی۔

اور ان کی بیوی... صاعقہ... اگر اسے پتا چلتا کہ مبین آفندی کون سے گڑے مردے اکھاڑنے باپ کے پاس جا رہے ہیں تو وہ زنجیر بن کے شوہر کے قدموں میں پڑ جاتیں۔ سلام دعا ہو گئی۔ ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں...

پھر آغا جان اپنی کتاب میں مگن ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح اصولاً "اب مبین آفندی کو اٹھ کے چلے جانا چاہیے تھا۔

پانچ منٹ گزرے، آٹھ، دس... پندرھویں منٹ اور ننانوے صفحے پر پہنچ کر انہوں نے کتاب پر سے نظر ہٹائی اور چشمے کے اوپر سے گھور کے اپنے لخت جگر کو دیکھا۔

وہ گڑبڑائے۔ "جی... جی آغا جان...؟"

"کیا میں نے کچھ کہا...؟" انہوں نے کمال تحمل سے پوچھا۔

"نہیں، لیکن میں نے سمجھا شاید..."

آغا جان نے کتاب سے صفحے کا کونا موڑ کر بند کی اور ایک طرف رکھتے ہوئے سیدھے سبھاؤ بولے۔ "اب تم وہ بولو جو کہنے آئے ہو۔ بہت گفتگو ہو گئی بزبان خاموشی۔" ان کا لب و لہجہ پر رعب تھا۔

وہ ہچکچائے۔ "میں ڈر رہا تھا آغا جان۔ شاید آپ میری بات پسند نہ کریں۔"

"تم کہو مبین آفندی۔ مجھ میں ابھی بھی حوصلہ ہے ہر بات سننے اور برداشت کرنے کا..."

وہ اپنے مخصوص پر تنفر انداز میں بولے ذرا سا رکے اور پھر گویا اپنی برداشت کی مثال دیتے ہوئے دوبارہ اضافہ کیا۔

"اپنے دو بیٹوں کو کھونے کے بعد بھی... آغا ذوالفقار آفندی وہیں کھڑا ہے۔ نہ گرا ہے اور نہ جھکا ہے۔"

مبین آفندی کئی ثانیوں تک ان کے دھیمے، مگر مضبوط اور گھن گرج والے لہجے کے زیر اثر رہے۔ پھر بے اختیار بولے۔

"اللہ آپ پہ کبھی وہ وقت نہ لائے آغا جان۔"

مگر اللہ لایا کرتا ہے۔

وہ ہمارے بیچ ہی دنوں کو پھیر پھیر کے لاتا ہے۔ زبردست کو ایک نہ ایک دن زیر دست ہونا پڑتا ہے، مگر وہ نہیں جانتے جن کے دلوں پہ مہریں لگ چکی ہوں۔

"سیدھی اور صاف بات کرو مبین! ہمیں یہ گھماؤ پھیر پسند نہیں۔" انہوں نے سپاٹ انداز میں کہا تو اپنی پوری

زندگی کی ہمت مجتمع کرتے ہوئے مبین آفندی نے کہہ ہی دیا۔

"اور اگر آپ کا ایک بیٹا... آپ کے پاس لوٹنا چاہے تو؟"

لمحہ بھر کو مبین آفندی کو لگا جیسے آغا جان کا وجود کپکپایا ہو ان کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی چمکی۔

"فاران...؟" چودہ سال بعد یہ نام ان کے ہونٹوں سے نکلا تو دونوں ہی کے کانوں کو عجیب سا لگا۔

"جی آغا جان...!" مبین آفندی نے ان کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی سعی کی، مگر اول لمحے کی بے اختیاری کے بعد سے وہاں پھر سے وہی ہمیشہ والا پتھریلا پن نمایاں تھا۔

"اچھا! اکڑ ٹوٹ گئی اس کی...؟" بے حد تمسخر سے انہوں نے پوچھا۔ مبین چند ثانیوں تک خاموش جیسے کوئی بے حد پر اثر الفاظ ڈھونڈتے رہے۔ اور آخر کار فتح یاب بھی رہے۔

"اس کے پاس آپ کا پوتا ہے آغا جان! آپ کا وارث۔ آپ کی آئندہ نسل کا امین۔"

آغا جان سن سی کیفیت میں انہیں دیکھے گئے پھر بات سنے بنا اٹھ کر باہر نکل گئے۔ مبین آفندی بے بس بیٹھے رہ گئے تھے۔

* * *

کیا ہی جنگل میں آگ اس تیزی سے پھیلتی ہو گی جتنی تیزی سے یہ خبر اس کے دوستوں میں پھیلی۔

نصیر قاضی تو تھا ہی... کاشف اور مبشر بھی اسے سمجھانے آئے اور اگلے کئی گھنٹوں تک سر کھپاتے ہی رہے۔ آخر میں اسی کی بات رہی۔

"میں مر جاؤں گا یار! میرے دل پہ میرا اختیار نہیں ہے۔" وہ چلا اٹھا۔ اسے پروا نہیں تھی ان میں سے کوئی اس کے متعلق کیا سوچتا ہے۔

وہ تینوں ہکا بکا تھے بلکہ نصیر قاضی نے تو سر ہی تھام لیا۔ اسے کیا خبر تھی کچھ گھنٹوں کی تفریح میں وہ اپنا یار کھو بیٹھے گا۔ اور اس کے بابا جان... ان کا جاہ و جلال...؟ اگر انہیں پتا چلا کہ نصیر قاضی ان کے بیٹے کو گھنگھرو چھنکاتی ان راہوں پر لے گیا تھا تو وہ اس کی کھال میں بھس بھروانے سے بھی نہ ہچکچاتے۔

"اپنے دل پہ تھوڑا کنٹرول کرو وقار! بے اختیاری انسان کو بڑا ذلیل کرواتی ہے۔ اور دل کی مانو گے تو وہ ہر چمکتی چیز کو سونا ہی بتائے گا۔ یہ تو دماغ ہے جو صحیح غلط کا فیصلہ بھی صحیح کرتا ہے۔ سو اپنے دماغ سے کام لو۔" مبشر بڑا اس بڑا عملی بندہ تھا۔ بڑی جمع تفریق کر کے فیصلے کرنے والا۔ سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے اس کا پتا چلانا ہے اور ہر حال میں..." وہ باری باری تینوں کا چہرہ دیکھتے ہوئے قطعیت سے بولا۔

"یک طرفہ محبت کا شکار ہو تم وقار...! اس کی کوئی دلچسپی ہوتی تو وہ دنیا کی بھیڑ میں گم نہ ہو جاتی۔" نصیر نے اسے ابھی بھی باز رکھنا چاہا۔

"اسے بھی تم لوگوں کی طرح میرے خاندان، میری عزت اور مرتبے کی فکر تھی... میں نے کہا بھی تھا میں سب سنبھال لوں گا۔" وہ اپنے بال نوچنے کو تھا۔

"وہ عقل مند ہے وقار! جانتی ہے، مستقبل میں کیسا طوفان آئے گا تمہارے فیصلے سے... یہ "سب اچھا" صرف اسی وقت تک ہے جب تک بابا جان کو پتا نہیں چل جاتا۔" کاشف نے دھیمے انداز میں کہا تھا۔

"تم مجھے صرف اس کا پتا کروا دو کاشف۔ میں ہر بات سنبھال لوں گا۔ وہ مرد ہی کیا جو طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے۔" وہ اپنی بات میں اٹل تھا۔

"کاشف کچھ نہیں کرے گا..." نصیر قاضی نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے قطعی انداز میں کہا تو وہ چونک کر اس کا

چہرہ دیکھنے لگا۔

"میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی جو میں تجھے وہاں لے گیا' مگر بس۔۔۔ میں مزید کسی گناہ کا بوجھ اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس معاملے میں تیرا ساتھ نہیں دے گا۔"

اس کے تاثرات پتھریلے تھے۔ وقار آفندی کی کنپٹیاں تپیں۔

"گناہ نہیں ہے یہ۔۔۔ نیکی ہوگی میری زندگی کی سب سے بڑی۔ گانا گاتی ہے وہ۔ آواز بیچتی ہے' جسم نہیں۔ عزت کی زندگی دینا چاہتا ہوں میں اسے۔"

پر تپش لہجے میں کہا' مگر ان تینوں کو تو آغا ذوالفقار آفندی نام کی تلوار اپنے سر پہ لٹکتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کیا خاک متاثر ہوتے۔

وقار آفندی ان سے ناراض ہو کر گیا۔ کاشف اچھی طرح زرگل بائی کے نئے ٹھکانے سے واقف تھا' مگر ان تینوں نے تہیہ کر رکھا تھا وقار کو اس دلدل میں گرنے سے بچانے کا۔ سو کسی کا بھی وقار کو زرنگار کے متعلق کوئی خبر دینے کا ارادہ نہیں تھا۔

* * *

"بھائی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جان۔۔۔ آپ ٹھنڈے ذہن سے سوچیں۔۔۔"

سہیل آفندی کم ہی آغا جان کے سامنے بولنے کی ہمت کرتے تھے' مگر مبین آفندی نے انہیں ہمت دلا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

"کیا سوچوں سہیل۔۔۔ وہ مجھے سوچنے کے قابل چھوڑ کے کب گیا تھا۔" ان کا لہجہ جلتا ہوا سا تھا۔

"بچوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں آغا جان! بڑے ہمیشہ انہیں معاف کرتے آئے ہیں۔" مبین آفندی نے سنجیدگی سے کہا۔

"غلطی اور گناہ میں فرق ہوتا ہے مبین۔" انہوں نے تنبیہی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ پھر جتانے والے انداز میں اضافہ کیا۔ "والدین کی نافرمانی گناہ کبیرہ میں شامل ہوتی ہے۔"

"وہ معافی مانگ رہا ہے آغا جان۔"

"ہر غلطی کی تلافی "معافی" نہیں ہوتی۔"

"گستاخی معاف آغا جان۔۔۔ اب بیٹے سے تاوان بھروائیں گے؟" مبین آفندی نے دبے لفظوں انہیں احساس دلانا چاہا تو وہ گرج کر بولے۔

"تاوان۔۔۔؟ تاوان کی بات کرتے ہو تم لوگ؟ تاوان تو میں نے بھرا ہے۔ ایک زندگی کا تاوان۔۔۔ وہ کیا تاوان ادا کریں گے۔" ان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ سہیل آفندی تو چپ ہو رہے' مگر مبین صاحب نے تھوڑی ہمت کی۔

"وہ شدید بیمار ہے آغا جان۔۔۔! اور شرمندہ بھی۔"

آغا جان خاموش رہے۔

"پھر آپ یہ بھی تو سوچیے' اس کے پاس اس گھر کا وارث ہے۔ آپ کی نسل کا نام لیوا۔ یہ بیٹیاں تو پرائے گھروں کو چلے جانے والی ہیں۔" مبین آفندی نے نرمی سے ان کے مزاج کو دوسری طرف لگانے کی کوشش کی۔

"اس سے پہلے کہ اس تمام جائیداد میں کوئی "اور" حصہ داری کا دعوا لے کر آجائے۔" سہیل آفندی کو دور کی کوڑی سوجھی تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"اور کون؟"

"آپ جانتے ہیں آغا جان میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ "وہ" بھی تو آئی تھی اپنے بیٹے کو لے کر "جانشینی" کا دعوی کرتے ہوئے۔" انہوں نے ذومعنی انداز میں کہا تو اب کی بار آغا جان نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"ہوں۔ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔"

"اور ویسے بھی آغا جان۔ فاران نے تو یوں سمجھیں کسی کا ساتھ دینے کی سزا پائی ہے اور بس۔ ورنہ اس گندے کھیل سے اس کا تعلق کوئی نہیں تھا۔"

مبین آفندی نے ان کی برین واشنگ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور ویسے بھی ان طویل چودہ سالوں میں آغا خان کو خود بھی احساس ہو ہی گیا تھا۔ ایک کے قصور پر دوسرے بیٹے کو محض اس کی حمایت کرنے پر انہوں نے خود سے دور کر دیا تھا۔

"بہرحال۔ غلطی تو اس کی بھی بڑی تھی۔ مجھ سے مخالفت میں دلائل دیے اس نے۔ اگر اس نے تاوان میں چودہ سال بھرے ہیں تو میں نے اپنی شریک حیات کی زندگی۔"

وہ تلخی سے بولے۔ چند لمحے توقف کیا پھر گہری سانس بھرتے ہوئے بولے۔

"وقت نکال کے رابطہ کریں گے اب سے۔ فی الحال تو میرا ذہن تیار نہیں ہے۔"

اور مبین آفندی کے لیے اتنا بھی کافی تھا وہ اور سہیل آفندی کھل کے مسکرا دیے۔

صلح کا نقارہ بج چکا۔ اب محض چند ریشمی پردے سرکنے باقی تھے۔ تمام نظارے بالکل صاف دکھائی دینے والے تھے۔

⁂

تائی جان کو علم ہوا تو پہلے تو وہ سکتے میں آگئیں۔ پھر گویا حواس میں لوٹتے ہوئے شوہر سے الجھنے لگیں۔ "دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا مبین؟ خود اپنے پیروں پہ کلہاڑی مار رہے ہیں آپ۔"

انہوں نے ہلکا سا گھور کر اپنی شریک حیات کو دیکھا۔ "اس میں دماغ کی خرابی والی بات کہاں سے نظر آگئی تمہیں؟"

"ارے۔" بے اختیار تیز لہجے میں کہتے ہوئے جیسے انہوں نے اپنے لب و لہجے پر قابو رکھا۔ "اتنی بڑی جائیداد۔ بزنس ہے۔ اور آپ زمین کھود کھود کر حصے دار نکال رہے ہیں۔"

"دماغ تو تمہارا خراب ہے صاعقہ۔" انہوں نے تلخی سے کہا۔ "اب کیا بیٹیوں کو جہیز میں دوگی یہ جائیداد اور بزنس؟"

لمحہ بھر کو وہ لاجواب ہوئیں۔

"ہماری جگہیں داماد سنبھالیں گے کیا؟ اور ویسے بھی اسے جائیداد یا بزنس کا لالچ ہوتا تو چودہ سال لاتعلقی میں نہ گزارتا۔ خالی ہاتھ گیا تھا اس گھر سے۔ بیوی اور بیٹے کے ساتھ۔ اس کی خاموشی کی قدر کرو۔ عیاشی تو ہم نے کی ہے چودہ سال اس کے حصے پر بھی۔"

مبین آفندی جذباتی ہونے لگے۔ تو صاعقہ بیگم بھی قائل سی ہو گئیں۔

"یہ تو ہے ویسے۔"

"اس کا بیٹا جوان ہے اب۔ نیا خون ہے سہارا بنے گا باپ، دادا کا اور ویسے بھی ہم کون سا سب اس کے حوالے کر کے خود فارغ بیٹھنے والے ہیں۔ بس دل کو تقویت ہو جائے گی کہ کوئی ہے۔ جو آگے بھی یہ تمام سلسلے چلا سکتا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ہے۔"

وہ بے حد رنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانتا تھا کہ دونوں بھائی ' بیٹے کے لیے ترستے تھے مگر دونوں ہی بیٹیوں کے باپ بنے۔ ان کی قسمت میں اولاد نرینہ لکھی ہی نہ تھی۔

"اور جو ماں باپ کا دل دکھا کر گئے ان کو کیسے رنگ لگائے اللہ تعالیٰ نے۔"

تائی جان نے آہ سی بھری تو انہوں نے تنبیہی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔

"کفر مت بولو۔ والدین کا دل دکھانے والوں کو اللہ رنگ لگایا نہیں مگر "دکھایا" ضرور کرتا ہے۔ وہ بھی دنیا کے۔ چودہ سال تمہیں کیا معلوم کتنی ٹھوکریں کھائی ہوں اس نے۔"

"ہاں تو ماں باپ کا دل دکھانے کی سزا تو بھگتنی ہی ہو گی نا۔" وہ جھٹ سے بولیں۔

مبین آفندی نے دائیں بائیں سر ہلایا اور ہنس دیے۔ "تم عورتیں بھی نا۔ ابھی تو تمہیں ان کی رنگ برنگی زندگی نظر آرہی تھی۔ ساتھ ہی لڑھک کے سزا پہ آگئیں۔"

تائی جان جھینپ سی گئیں۔ "ہاں تو غلط کیا کہا۔ بیٹے بھی تو اللہ نے ان ہی کو دیے۔"

"چلو ' اب ایک بیٹا آرہا ہے نا۔ تم لوگوں کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔"

وہ مسکرا کر بولے تو تائی جان نے گہری سانس بھری۔ اب یہ تو اللہ ہی جانتا تھا کہ آنے والا وقت کس کے لیے کیا لانے والا تھا۔

* * *

بھٹے کھاتے۔ دونوں کیمپس کی لہر کے ساتھ ساتھ چلتے ایک دوسرے کی سنگت میں مطمئن اور خوش و خرم تھے۔

"آنٹی آئیں نہیں سیالکوٹ سے۔؟" مہرماہ نے پوچھا۔

"کل کا پروگرام طے ہوا ہے۔ اب دیکھو۔ بڑے عرصے کے بعد گئی ہیں ماموں کی طرف تو کچھ زیادہ ہی دل لگ گیا ان کا۔" طلال مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔

وہ دونوں نہر کنارے گھاس پر بیٹھ گئے۔

"پتا ہے میں نے امی سے بات کر لی تمہارے پرپوزل کی۔"

مہرماہ کے چہرے پر رنگین سی لہر دوڑی تھی۔ ہلکے سے شرمیلے پن کے ساتھ بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔

"دیٹس گریٹ۔" پھر بے تابی سے پوچھنے لگا۔ "کیا کہا انہوں نے؟"

"بھئی۔ یہ تو اب تمام رشتوں پر غور کر کے ہی فائنل ہو گا۔ تم چکر لگا لینا اپنی ماما کے ساتھ۔" مہرماہ نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا تو وہ قہقہہ لگا بیٹھا۔

"کتنی خوش فہم ہوتی ہو تم لڑکیاں بھی نا۔ ایسے کون سے رشتے لائن لگا کے کھڑے ہیں۔"

"اوہو۔ مسٹر۔ کسی وہم میں مت رہنا۔" وہ چمک کر بولی۔ پھر تفاخرانہ بتایا۔ "میرا بھی ایک کزن آرہا ہے۔"

"چیچوں کی ملیاں سے؟" طلال نے بھولپن سے طنز کیا تو وہ اسے گھور کر جلانے والے انداز میں بولی۔

"جی نہیں۔ شارجہ سے۔"

"ابھی پیدا ہوا ہے کیا؟"

"ہاں۔ اٹھائیس سال کا ہے۔" مہرماہ ڈھٹائی سے ہنسی۔

”اچھا۔“ طلال نے سر کھجاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

”عمر تھوڑی سی زیادہ نہیں بتادی تم نے؟“

”دراصل ریڈی میڈ ہے۔“ وہ اب بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

”شٹ اپ۔“ طلال ہنستے ہوئے بولا۔

”واقعی۔ ہمارے لیے تو ریڈی میڈ ہی ہو گا۔ چودہ سال ہوئے اسے یہاں سے گئے۔ اب ایک دم سے دیکھیں گے تو اٹھا ئیس والا ہو گا۔“ وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

”مگر سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ اچانک سے اتنا بڑا کزن آ کہاں سے گیا؟“ طلال نے کھایا ہوا بھٹہ شاپر میں ڈال کر ایک طرف رکھتے ہوئے عالمانہ سوال کیا۔

”بتایا تو ہے ریڈی میڈ ہے اور شارجہ سے امپورٹ ہو کے آرہا ہے۔“

”پہلے تو تم نے ذکر نہیں کیا۔“

”پہلے بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کیونکہ ان سے کوئی رابطہ ہی نہ تھا اور نہ ہی دوبارہ سے صلح صفائی کا ارادہ۔ یہ تو ابھی چچا جان نے خود رابطہ کیا۔ آغا جان سے معافی مانگی اور واپسی کی اجازت بھی۔“

مہر ماہ نے مختصرا“ بتایا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔ ”لہٰذا تم جلدی سے اپنا پروپوزل بھیج دو۔ کیونکہ مابدولت اب ایک ہینڈسم اور ڈیشنگ قسم کے کزن کی کزن بن چکی ہیں۔“

”ہاں ہاہا۔“

طلال کا قہقہہ کئی گردنوں کو ان کی طرف موڑ گیا۔ مہر ماہ نے خجل ہو کر کھایا ہوا بھٹہ اسے دے مارا۔ جو اس نے دونوں ہاتھوں سے کامیابی سے کیچ کر لیا۔

”یہ دو خصوصیات تم نے اپنے پاس سے ہی لگالیں؟“ وہ مذاق اڑا رہا تھا۔

”میرے چچا بھی بہت ڈیشنگ اسمشنگ ہیں۔ ان کی جوانی کی تصویریں دیکھ رکھی ہیں میں نے۔ بیٹا بھی ویسا ہی ہو گا نا۔“ مہر ماہ اترا کر بولی۔ پھر اضافہ بھی کیا۔ وہ بھی من چاہا۔

”بھئی۔ خوب صورتی تو ہمیں وراثت میں ملی ہے۔“

سورج کی کرنیں پانی کی لہروں سے منعکس ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ یوں معصوم سے تفاخر کے ساتھ مسکراتی وہ واقعی کوئی ”شے“ لگ رہی تھی۔

طلال کا جی چاہا اسے اٹھا کے دل میں رکھ لے۔

”او۔ ہیلو۔“ مہر ماہ نے اس کی نظروں کے سامنے چٹکی بجائی۔

”کدھر کھو گئے ہو۔؟“

اس کی نظروں کی بے خودی کو محسوس کرتے ہوئے وہ مسکراہٹ دبا کر پوچھ رہی تھی۔

طلال نے گہری سانس بھرتے ہوئے سفیدے کے بلند درختوں پر نگاہ ڈالی اور سادگی سے بولا۔

”ایسے ہی۔ سوچ رہا تھا۔ اتنے سفید جھوٹ بولتے ہوئے لڑکیوں کا دل نہیں گھبراتا؟“

وہ جو کچھ ”اور“ سننے کے لیے سراپا اشتیاق بنی ہوئی تھی۔ فائل اٹھا کر اسے مارنے لگی۔ تو وہ پھرتی سے اٹھ کے بھاگا تھا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنا بیگ شانے پہ ڈالتی کپڑے جھاڑنے لگی۔

✲ ✲ ✲

گلے شکوے‘ معافی تلافی۔ سب ہو چکا۔

“آپ کے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے میرے پاس آغا جان۔” فاران آفندی کی آواز خوشی و جوش سے کپکپا رہی تھی۔

“آؤ گے تو سب سرپرائز دیکھ لیں گے ہم۔”

آغا جان اسکائپ پر دکھائی دیتے فاران آفندی پر پیاسی نظریں جمائے ہوئے بظاہر بڑے رعب داب سے بولے۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ چودہ سال بعد لخت جگر کو دیکھا تو تمام گلے شکوے دم توڑ گئے تھے۔

“میرا پوتا کہاں ہے۔ اسے بھی بتا رکھا ہے ہمارے بارے میں یا نہیں؟”

“جی آغا جان۔ سب پتا ہے اسے۔ ابھی جاب پہ گیا ہوا ہے۔ آئے گا تو بات کرواؤں گا آپ سے۔”

“اب چھوڑو جاب واب۔ ہمارے تو پرکھوں میں کسی نے نوکری نہیں کی کسی کی۔” وہ ناپسندیدگی سے بولے تو فاران آفندی مسکرا دیے۔

“جو آپ کا حکم آغا جان! ویسے بھی اب تو سب وائنڈ اپ کرنا ہے یہاں سے۔ آپ حکم کریں کب حاضر ہو جاؤں؟” وہ جذباتی ہوئے تو آغا جان کا پتھر دل بھی پگھلنے لگا۔ مگر باپ تھے۔ ماں نہیں جو دل کا بھید ظاہر کر دیتے۔

“اڑ کے تو نہیں آؤ گے ظاہر ہے۔ سب کام ختم کرو وہاں سے اور آ جاؤ۔ بہت کاٹ لی جلا وطنی۔”

“ٹھیک ہے آغا جان۔” وہ خوش تھے۔ بے حد خوش۔ گردش دوراں نے انہیں پہلے سے کمزور کر دیا تھا اور کچھ جگر کا عارضہ جان کا دشمن ہو رہا تھا۔

“اور ثمرہ کہاں ہے؟” آغا جان کے اچانک سوال پر وہ خاموش سے ہو گئے۔ پھر دھیمے لہجے میں بولے۔

“یہیں ہے آغا جان۔ کچن میں۔ موحد آنے والا ہے تو کھانا بنا رہی ہے شاید۔”

“اس کا دل نہیں چاہا راضی نامے کو فاران آفندی؟” آغا جان نے طنزیہ ہنکارا بھرا تھا۔ وہ جلدی سے بولے۔

“نہیں نہیں آغا جان! ایسی بات نہیں۔ بس ماں ہے نا۔ تو اسے اپنا دکھ بھلائے نہیں بھولتا۔”

“ہم نے اسے تو سزا نہیں دی تھی۔ اس نے تو تمہاری سزا بھگتی۔ تمہارے جرم کی سزا پائی۔”

“جی۔ آغا جان!” وہ چپ سے ہو گئے۔ مبین آفندی اور سہیل آفندی فی الوقت ایک طرف خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔

“عورتوں کی عادت ہوتی ہے آغا جان! دکھوں کو تمام عمر بچوں کی مانند سینے سے لگا کے رکھتی ہیں۔ ہم وہاں سے نکلے تو موحد کو نمونیا ہو گیا تھا۔” بے حد دکھی لہجے میں کہتے ہوئے وہ تھم سے گئے۔ تینوں نفوس دم سادھے متوجہ تھے۔

“پھر۔؟” آغا جان نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ لاڈلے پوتے کی یاد اور اس کی معصوم شکل نے اچانک ہی سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ ان کا لاڈلا‘ راج دلارا۔

انہیں یاد آیا۔ کتنا پیارا ہوا کرتا تھا وہ انہیں۔ اکلوتا پوتا۔

“پھر باوجود علاج کے نمونیا بگڑتا چلا گیا آغا جان۔” انھوں نے سائیڈ پہ رکھا پانی کا گلاس اٹھا کے منہ سے لگا لیا۔ دونوں بھائیوں نے فاران آفندی کے لہجے کی نمی کو بخوبی محسوس کیا تھا اور دم بخود بیٹھے آغا جان نے تو دل سے۔ خالی ہاتھ گھر سے نکلنے والے آدمی نے کیسے اسپتالوں میں دھکے کھائے ہوں گے۔

“بہرحال۔ وہ ماں ہے۔ وہ وقت‘ وہ دکھ بھول نہیں پاتی۔ میں تو سمجھاتا رہتا ہوں اس کو۔ باقی سب باتیں آ کر ہوں گی آغا جان۔ میں تفصیل میں جانے کی ہمت نہیں پاتا خود میں۔ مگر آپ کو وعدہ کرنا ہو گا آغا جان کہ اب آپ ہمیں نہیں ٹھکرائیں گے۔ بہت جدائی سہہ لی ہم نے۔ اب ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے۔ ماں تو کھو دی میں نے اپنی۔” وہ بے پناہ جذباتی ہو کر رو ہی دیے تھے۔

"اکیلا آدمی چودہ برسوں سے دنیا کے نجانے کیسے حالات سے نبرد آزما رہا تھا کہ اب ہمت جواب دے گئی تھی اس کی۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر بات ہو گی۔ فورا" واپسی کی تیاری پکڑو۔" آغا جان نے تیزی سے بات سمیٹی۔ تو وہ آزردگی سے مسکرا دیے۔ آغا جان کو ان کی مسکراہٹ اور تاثرات سے عجیب سا تاثر محسوس ہوا۔ مگر وہ لمحہ بھر کی بات تھی۔ وہ اب دونوں بھائیوں سے گفتگو میں مصروف تھے اور آغا جان ایک طرف بیٹھ کر ان کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی برسوں کی پیاس بجھانے میں۔

* * *

وہ تھکا ہوا تھا جب گھر پہنچا۔ ماما سے سلام دعا ہوئی۔ تازہ دم ہو کے کھانے کی میز پر پہنچا تو ماما اور بابا جان بالکل خاموش تھے۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں ابرو اچکا کر بابا جان سے حالات معلوم کرنے چاہے۔ تو انہوں نے ابرو سے ماما کی طرف اشارہ کر دیا۔

"کیا بات ہے۔ دونوں چھاؤنیوں میں خاموشی ہے آج تو۔"

وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ تو سویٹ ڈش کا ڈونگا لے کر آتی ثمو کی آنکھوں میں پھر سے نمی اترنے لگی۔ انہوں نے ڈونگا میز کے وسط میں رکھا۔ کرسی پہ بے دم سی گریں اور میز پہ سر ٹکا کے رونے لگیں۔

فاران آفندی کے ہونٹ بھنچے۔ آنکھوں میں لالی سی اترنے لگی۔ موحد کا تو مانو دل ہی کچل ڈالا ہو کسی نے۔ پھرتی سے اٹھ کے ثمو کی طرف بڑھا۔

"ماما۔ کیا ہو گیا۔ کیوں رو رہی ہیں؟ میں تو یونہی بکواس کر رہا تھا۔ آئم سوری۔"

جھک کر انہیں بانہوں کے گھیرے میں لیے وہ پریشان سا تھا۔

"تمہارا قصور نہیں ہے بچے۔ یہ کسی اور ہی دکھ کو رو رہی ہے۔" فاران قدرے ناراضی سے اسے شرمندگی کے حصار سے نکالتے ہوئے ثمو کو دیکھ رہے تھے۔

"میں ساری عمر بھی اپنے دکھ کو روؤں تو اس کی تکلیف میرے دل سے نہیں جائے گی فاران صاحب۔" وہ بھیگا چہرہ اٹھا کر روتے ہوئے بولیں۔ تو موحد نے لب بھینچ لیے۔ پھر بے چینی سے پوچھا۔

"ہوا کیا ہے ماما۔ آپ بتائیں بابا جان۔؟" اس کا رخ سخن فاران کی جانب تھا۔ جو کڑی نظروں سے ثمو کو دیکھ رہے تھے۔

"کھانے کی میز پہ بے برکتی پھیلا رہی ہو۔ اچھی بات ہو گی جو سب رزق چھوڑ کے اٹھ جائیں گے۔"

"ماما روئی کیوں ہیں بابا جان ؟" موحد کے لہجے میں ضد کا عنصر واضح تھا۔ یہ کوئی عام سی بات تو نہ تھی کہ ثمو یوں بے بسی سے رو دیتیں۔ اور فاران آفندی بجائے بوکھلانے اور پریشان ہو کر انہیں چپ کروانے کے انہیں مزید ڈانٹتے۔ کچھ تو گڑبڑ تھی معاملے میں۔

"فوہ یار! تم بھی نا۔ کھانا کھا لو پہلے پھر بات کرتے ہیں۔" وہ جھلا کر کہتے اب تنبیہی نظروں سے ثمو کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں بھی فورا" ہی احساس ہو گیا کہ انہوں نے غلط موقع پر غلط رد عمل دیا تھا۔ سو فورا" ہی دوپٹے سے منہ پونچھتے ہوئے خود کو نارمل کرنے لگیں۔

موحد کو علم تھا۔ اب فاران آفندی نے کہہ دیا کہ کھانے کے بعد بات ہو گی تو وہ جتنا بھی اصرار کر لیتا۔ اب بات کھانا کھانے کے بعد ہی کھلنی تھی۔

اس کے بعد لاکھ ثمرہ نے مسکرا مسکرا کر بصد اصرار ہر ڈش اس کے آگے کی مگر وہ بھوک اڑ جانے کے باعث تھوڑا ہی کھانا کھا پایا۔ حالانکہ ہر ڈش اس کی پسندیدہ تھی۔

کھانے کے بعد ثمرہ برتن اٹھانے لگیں تو ہمیشہ کی طرح تھکے ہونے کے اور ثمرہ کے منع کرنے کے باوجود موحد نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ وہ جلد از جلد ثمرہ کی آزردگی اور پریشانی کا ماخذ جاننا چاہتا تھا۔

"میں اور تمہاری ماما اسٹڈی میں بیٹھتے ہیں۔ تم ذرا مزے دار سی کریم کافی تو بنا کے لاؤ۔"

بابا جان پرسکون تھے۔ ثمرہ کے برعکس وہ قطعاً" پریشان نظر نہیں آتے تھے۔ وہ بے بسی سے ثمرہ کو دیکھنے لگا۔ تو وہ نظریں چرا گئیں۔

"بھئی۔ تمہارے جیسی کافی تو تمہاری ماما بھی نہیں بنا سکتیں۔" وہ توصیفی انداز میں اس کا شانہ تھپتھپا کر محبت سے بولے اور اسٹڈی کی طرف بڑھے تو ثمرہ کو اس نے مرے قدموں سے ان کے پیچھے جاتے دیکھا۔

گہری سانس بھرتا وہ کچن میں چلا آیا۔ پھر پانی بوائل کرتے کافی پھینٹتے اور پھر کافی بنا کر اس میں کریم ڈالتے ہوئے اس نے ہر ممکنہ پریشانی کو سوچ ڈالا جو ثمرہ کی اس قدر دل آزاری اور رونے کا باعث بن سکتی ہو۔

پھر ایک دم سے اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

"گڈ گاڈ۔" اس کی پیشانی کو گرم لہر چھو کے گزری۔ "کہیں بابا جان کی بیماری سے متعلق تو کچھ بات نہیں؟" دل گہرائی میں کہیں ڈوب کے ابھرا۔

واقعی۔ یہی بات ہوگی۔ ورنہ بابا جان اتنے سکون اور ماما اتنی "تھڑدلی" کا مظاہرہ نہ کرتیں۔

اس نے جلدی سے ٹرے اٹھائی اور تیز قدموں سے اسٹڈی روم کی طرف بڑھا۔ اس کا دل اوہام و خدشات سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اسٹڈی کے باہر ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ اندر سے پہلے بابا جان کا اونچا لہجہ سنائی دیا اور اس کے بعد ثمرہ کا۔

وہ دروازے پر دستک دے کر اندر آیا تو وہاں خاموشی چھا چکی تھی۔ اس نے ٹرے بابا جان کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھی اور ان دونوں کو ایک ایک مگ تھما کر اپنا مگ ہاتھ میں لیے ماما کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک نظر میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ثمرہ کی پلکیں نم تھیں یعنی وہ پھر سے رو رہی تھیں۔

"اب بتائیں۔ کیا بات ہوئی ہے۔ جس نے ماما کو اتنا آزردہ کر دیا ہے؟"

وہ براہ راست بابا جان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی کا گھونٹ بھر کے مسکرائے۔

"بہت خوب موحد۔ ہمیشہ کی طرح لاجواب کافی۔" وہ بے بس سا ثمرہ کو دیکھنے لگا۔ مگر وہ سلگتی نگاہوں سے فاران آفندی کی طرف متوجہ تھیں۔

"بات کو گھمائیں مت فاران۔! اتنا تو میرے جذبات کا خیال نہیں کیا حقیقت بتاتے وقت جتنا بیٹے کا کر رہے ہیں۔" وہ چٹختے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"مسئلہ موحد کا نہیں تمہارا ہے ثمرہ۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"موحد کی تو پوری زندگی داؤ پہ لگ چکی اس مسئلے میں فاران۔" وہ ضبط کھو کے چلائیں اور پھر رونے لگیں۔ موحد نے بوکھلا کر اپنا مگ تپائی پہ رکھا اور ثمرہ کے ہاتھ سے بھی مگ لے کے رکھ دیا۔

"آخر مجھے بھی تو بتائیں ماما۔ بابا جان۔ بات کیا ہے۔ کیوں معمہ بن رہے ہیں آپ دونوں۔" وہ زچ آگیا تھا۔

"تمہارے بابا جان ہمیں اسی عقوبت خانے میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ جہاں انسانیت کے بجائے بے حسی بستی ہے۔" ثمرہ پھٹ پڑنے والے انداز میں بولیں۔

"ثمرہ۔" فاران صاحب کا انداز تنبیہی تھا۔

"مطلب۔؟" موحد الجھا۔ اس کا تو ذہن بھی اس طرف نہیں جا سکتا تھا جس طرف کا قصد فاران آفندی کیے بیٹھے تھے۔

"آغا جان سے بات ہوئی ہے میری۔ وہ مجھے پاکستان بلا رہے ہیں موحد۔ بلکہ ہم سب کو۔"

انہوں نے گویا موحد کے سر پر بم پھوڑ دیا تھا۔ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس نے بے حد بے یقینی سے فاران آفندی کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تمام گلے شکوے دور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔" وہ مطمئن سے بتا رہے تھے۔

مگر موحد کے ضبط کی حد اس سے زیادہ نہ تھی۔ طیش کے مارے مٹھیاں بھینچے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"انہوں نے ؟ انہوں نے معاف کر دیا ہمیں؟ معافی تو انہیں ہم سے مانگنی چاہیے تھی بابا جان۔" وہ غصے سے بولا تو فاران اونچی آواز میں اسے ٹوک گئے۔

"موحد!"

"بالکل صحیح کہہ رہا ہے موحد۔" ثمرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، بھرائے لہجے میں بولیں۔

"کیسی فضول باتیں کر رہے ہو تم لوگ۔ بزرگ معافی مانگتے اچھے لگتے ہیں کیا؟" وہ جھلائے۔

"ظلم کرتے بھی اچھے نہیں لگتے۔" ثمرہ چیخی تھیں۔ موحد کو بھی اپنی رگوں میں خون کے بجائے تیزاب دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اگر یہ مذاق ہے تو اسے ختم کر دیں بابا جان۔ پلیز۔" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

ضبط کی طنابیں چھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں اسے۔

"مذاق نہیں ہے موحد! تم بھی اپنا ذہن کلیئر کر لو۔ ہم سب کچھ وائنڈ اپ کر کے پاکستان جا رہے ہیں۔" انہوں نے قطعی انداز میں کہا تو وہ بے اختیار غصے میں آ کر اونچی آواز میں بولنے لگا۔

"نو۔ نیور۔ کبھی نہیں بابا جان۔ میں ان ظالم لوگوں میں کبھی بھی واپس نہیں جانا چاہتا۔ آپ بھول گئے ہوں گے ان کے ظلم، مگر میرا دل ان کی نفرت سے بھرا ہوا ہے اور بس۔"

"معاف کرنے والوں کو اللہ پسند کرتا ہے موحد۔"

"تو یہ انہوں نے اس رات کیوں نہیں سوچا جب ہمیں اپنے گھر سے نکالا۔"

وہ چلایا۔ اس نے آج تک فاران آفندی کے سامنے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ مگر آج تو جیسے خون ابل اٹھا تھا اس کا۔

"آپ تو کہتے ہیں کہ میں آپ کے وجود کا حصہ ہوں بابا جان۔ پھر آپ نے "ہماری" زندگیوں کا فیصلہ اکیلے کیسے کر لیا؟"

اس کا انداز زخمی اور لہجہ کرچی کرچی تھا۔ ماں کا دل بری طرح سے تڑپ اٹھا، وہ موحد سے لپٹ کر رونے لگیں۔

فاران آفندی خود کو خلا میں معلق محسوس کرنے لگے۔

کافی کے مگوں سے اٹھتا دھواں معدوم ہوتے ہوئے اب ختم ہو گیا تھا۔ اور ان تینوں کے پاس الفاظ بھی۔

* * *

مہراہ آج بے حد خوش تھی۔

آج اس نے یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی۔ ایسے ہی خوامخواہ۔ نہ دکھائی دینے والی دھول صاف کرنے کے لیے۔ حالانکہ طلال کی ماما کا شام کو آنے کا پروگرام تھا۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ملاحہ، فرزین اور تزئین واپس آئیں تب بھی وہ کبھی گلدان کے پھول ٹھیک کرتی تو کبھی کسی پینٹنگ کو جھاڑتی۔

"بس بھی کرو مہو۔! نہ تو وہ صوفے کے ہتھے پہ آ کے بیٹھنے والی ہیں اور نہ ہی کسی واز یا پینٹنگ میں۔"

تزئین نے طنز کیا تو وہ بلاوجہ ہی ہنسی۔ آج تو کوئی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

"اور اگر آغا جان کو طلال پسند نہ آیا تو؟" تزئین کو مہرماہ کی اتنی خوشی کم ہی برداشت ہوتی تھی۔ بے دردی سے بولی تو مہرماہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپی۔ آپ نے کون سا طلال بھائی کو نہیں دیکھ رکھا۔"

فرزین نے جلدی سے۔ بہن کو ٹوکا تو وہ میگزین کھول کر صوفے میں دھنستے ہوئے شانے اچکا کر لاپروائی سے بولی۔

"میں تو آغا جان کی بات کر رہی ہوں۔ ان کی پسند و ناپسند کے اپنے ہی پیمانے ہیں۔ ضروری تو نہیں انجلینا جولی مجھے پسند ہے تو آغا جان کو بھی پسند آئے۔"

"تم فکر مت کرو۔ طلال کی فیملی کو انوائیٹ کر لینا ہی آغا جان کی آدھی پسندیدگی کی علامت ہے۔"

مہرماہ نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا تو وہ سر جھٹک کر میگزین کھنگالنے لگی۔

ہم عمر ہونے کی وجہ سے وہ اکثر و بیشتر مہرماہ کے مدمقابل رہتی تھی۔

شام کو نا صرف طلال کی ماما، بڑا بھائی اور بھابھی آئے، بلکہ طلال بھی ساتھ ہی تھا۔

ہلکی پھلکی کڑھائی سے مزین شیفون کی زرد اور میرون قمیص اور ٹراؤزر میں ملبوس شیفون کے دوپٹے کو سلیقے سے سر پہ اوڑھے مہرماہ آنکھوں میں محض کاجل کی لائنیں کھینچے، بہت اچھی لگ رہی تھی۔ گالوں سے چھلکتی سرخی آج بلش آن کو مات کر رہی تھی۔

"آپی۔ ماشاءاللہ۔ آپ کو تو آج کسی میک اپ کی ضرورت ہی نہیں۔" فرزین نے بے ساختہ ستائشی انداز میں کہا تو ملاحہ نے چٹاچٹ بہن کو چوم لیا۔

"اُفوہ" وہ مزید لال پڑنے لگی۔ ہاتھوں سے رگڑ کر چہرے پہ لکھی محبت کی تحریر گویا صاف کرنے کی کوشش کی۔ "ایک تو میں پہلے ہی نروس ہوں اوپر سے تم دونوں مجھے کنفیوز کر رہی ہو۔"

"اور تیسرے طلال صاحب بھی آ کے بروکھوے کے لیے بیٹھ گئے ہیں۔" تزئین نے بالوں کو کیچر میں جکڑتے ہوئے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ اسے پتا نہیں کیا سوجھی۔ میں نے منع بھی کیا تھا آنے سے۔" مہرماہ الجھی۔ فرزین ہنسنے لگی۔

"تو آغا جان سے کیسے ملاقات ہوتی پھر؟"

"ہاں۔ یہ بھی ہے۔" وہ واقعی الجھی ہوئی تھی۔ تزئین نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔ اور جتانے والے انداز میں بولی۔

"یونیورسٹی فیلوز ہو تم لوگ۔ سارا دن گپیں لگانے میں گزرتا ہے۔ پسند کر کے گھر بلایا ہے اسے۔ اب یہ شرما شرمی کا ڈراما کیسا؟" مہرماہ کے کمرے میں ایک دم سے خاموشی پھیلی۔ تیز ہوا سناٹے سے مہرماہ کو چھو کے گزری تھی۔

"آپی۔ آپ بات کو ہمیشہ سیریسلی لے لیتی ہیں۔ مذاق کر رہے ہیں ہم۔" فرزین نے گھبرا کر بات لپیٹنے کی کوشش کی مگر وہ یونہی لبوں پہ استہزائیہ سی مسکراہٹ لیے نکل گئی۔

"میں ذرا ڈرائننگ روم کی صورت حال کا جائزہ لے لوں۔" فرزین بے چاری خوامخواہ چور بن گئی تھی۔ بہانے سے کمرے سے نکلنے لگی تو ملاحہ بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑی۔

تزئین کی باتوں نے حقیقتاً مہرماہ کو دھچکا لگایا تھا۔ ایسا کوئی اعتراض تو امی ابو یا آغا جان نے بھی نہیں اٹھایا تھا۔

ہاں' یہ ضرور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر طلال اور اس کا خاندان گھر میں کسی کو پسند نہ آئے تو مہرماہ اعتراض یا احتجاج کا حق نہیں رکھتی تھی۔ مگر یہ تزئین۔ مہرماہ کا دل سلگا۔

یہ ہمیشہ سے ایسی ہے۔ جل ککڑی۔

وہ چڑ کر سوچتی۔ آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

جب ڈرائنگ روم سے اس کا بلاوا آیا تو وہ بہت گھبراہٹ کا شکار تھی۔ سب کے بیچ۔ طلال کے سامنے۔

"آپ بے فکر رہیں۔ آغا جان انہیں اسٹڈی میں لے گئے ہیں۔" ملاحہ نے اس کی مشکل آسان کی تو اس نے اطمینان کی سانس لی اس نے اندر جا کے طلال کی فیملی کو سلام کیا۔

بڑی پروقار سی طلال کی ماما اور ماڈرن سی بھابی۔ مہرماہ نے پہلی ہی نظر میں تزئین کو عین طلال کی ماما کے پہلو میں بیٹھے دیکھ لیا۔ اب چاہے تائی جان کی تنبیہی نظریں ہوں یا چچی جان کی۔ مہرماہ کو چائے پیش کرنے کے بعد سامنے صوفے پر تائی جان کے پاس بیٹھنا پڑا۔ جبکہ تزئین مسکرا مسکرا کر ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھی طلال کی بھابی نتاشہ سے باتوں میں یوں مصروف دکھائی دی جیسے پتا نہیں کب کی دوستی ہو۔

طلال کی ماما کی باتوں سے مہرماہ کے لیے ان کی پسندیدگی ظاہر تھی۔ جب کہ بلال بھائی کبھی کبھار مسکراتے ہوئے کچھ بات کر لیتے۔ مگر بھابی نتاشہ تو جیسے قسم کھا کے آئی تھی کہ مہرماہ سے کوئی بات نہیں پوچھے گی۔ وہ تو گویا یہاں آئی ہی تزئین سے گفتگو کرنے تھی۔ مگر فی الوقت تو مہرماہ کو طلال کی ماما کی اپنائیت بھری باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔

جاتے ہوئے طلال کی ماما نے اس کے ہاتھ پہ ہزار ہزار کے اچھے خاصے نوٹ رکھ دیے۔

"میرا بیٹا دوبئی سے آنے والا ہے۔ جو بھی رسم ہوگی اس کے آنے کے بعد طے ہوگی۔ فی الوقت آپ زبان پہ اعتبار کریں۔"

آغا جان نے کہا تھا۔ انہیں طلال سے مل کر مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ تایا جان اور چچا جان بھی مطمئن تھے۔

"واہ واہ۔ آپی بڑی امیر ہو گئی ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد ملاحہ نے مہرماہ کو چھیڑا۔

"میں تو اتنی دعائیں مانگ رہی تھی کہ آغا جان ہاں کہہ دیں بس۔" فرزین بھی خوش تھی۔

مہرماہ نے بڑی خوشی اور ترنگ میں آ کر دونوں کو دو دو ہزار تھما دیے۔

"یا ہو۔" ان دونوں نے نعرہ لگایا تو تپتے چہرے کے ساتھ وہ ہنس دی۔

Downloaded From

☆ ☆ ☆

زرنگار کی رنگت آنے والے کو دیکھ کر فق پڑ گئی۔

وہ جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ تھکے ماندے مسافروں جیسی چال کا بوجھل پن صاف ظاہر تھا۔

مگر زرنگار کو سامنے پا کر وہ ایک نئی زندگی جی اٹھا۔

"تم۔ تم یہاں کیوں آ گئے۔ کس نے بتایا تمہیں؟" وہ متوحش سی اسے پلٹ کر دروازے کی چٹخنی لگاتے دیکھ رہی تھی ایک دم زور سے چلانے لگی۔

"دروازہ کیوں بند کیا ہے تم نے۔ کنڈی کھولو۔ اماں۔ ولاور۔"

وقار نے آگے بڑھ کے اسے شانوں سے تھام کے جھٹکا دیا تو وہ تھم سی گئی۔

"یہی چاہتی ہو نا تم۔ شادی کا پروپوزل دیا تو تمہیں پسند نہیں آیا۔ کوٹھے پر رہو گی تو ایسے ہی کوئی آ کے چٹخنی

READING
Section

لگا لے گا۔ تو پھر میں کیا برا ہوں؟”

وہ جلتے سلگتے تپتے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اور اس سے بھاگتے بھاگتے تھک جانے والی۔ اسے ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے افسوس میں مبتلا زرنگار اسی کے سینے پر سر رکھ کے رو دی۔

وقار کا سارا غصہ بھک سے اڑ گیا۔ تو احساسات سبک رو ہونے لگے۔

“کس قدر بے وقوف ہو تم زری۔ میری سانسیں چھین کے اور اپنی سانسیں گنوا کے جینے کو زندگی کہتی ہو تم۔” اس کے ریشمی بالوں پہ نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

زرنگار پہ آیا سارا غصہ سارا طیش۔ بخارات بن کر اڑ گیا تھا۔

“میں تمہاری زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی وقار۔ میں تمہیں اس دنیا میں سر اٹھا کے جیتے دیکھنا چاہتی ہوں۔” وہ چہرہ اٹھا کے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس سے صرف چند انچ کے فاصلے پر وہ بے داغ چاند تھا۔ وقار بے اختیار مسکرایا۔ اور اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا۔

“اور میں تمہیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں عزت کی زندگی دینا چاہتا ہوں۔”

وہ اس سے دور ہو کر پلنگ کے کنارے جا بیٹھی۔ “یہ راہ کانٹوں سے بھری ہے وقار۔ گلاب تو بس اوپر ہی اوپر دکھائی دیتے ہیں۔”

“میں ان چند گلابوں کے لیے اپنی تمام زندگی داؤ پہ لگانے کے لیے تیار ہوں زری۔ کیونکہ ان گلابوں کی اہمیت میں اچھی طرح جانتا ہوں۔”

وہ جذباتیت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ زرنگار نم آنکھوں سے مسکرا دی۔ پھیکی سی مسکراہٹ بھی اس کے حسن کو گہنانے میں ناکام رہی تھی۔

“میرے ساتھ تم کبھی سر اٹھا کے نہیں چل سکو گے وقار۔ تمہاری فیملی تمہارا خاندان... کس نام سے متعارف کرواؤ گے مجھے۔”

“مسز وقار آفندی کے نام سے۔” وہ برجستہ بولا۔ اتنے ہفتوں کی خجل خواری کے بعد زرنگار کو پا لینے کا سرور ایسا تھا کہ اس کا سارا چونچال پن لوٹ آیا تھا۔

“یہ صرف کہنے میں ہی آسان ہے وقار۔ جذباتیت سے باہر نکل کے سوچو۔” وہ بے بسی سے بولی۔

“تم سے محبت کرتی ہوں۔ کل کلاں یہ محبت میرے سامنے شرمندہ ہو یا مر جائے... میں یہ نہیں دیکھ سکتی۔ تو کیوں نہ اچھے دوستوں کی طرح بچھڑ جائیں ہم۔”

وہ مضبوط قدموں سے چلتا اس کے سامنے آیا۔

“کیا میں تمہیں اپنے قول سے پھرنے والا لگتا ہوں؟” وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

“میں تمہیں کسی آزمائش میں نہیں دیکھ سکتی وقار! مجھ سے شادی کے بعد تمہارے لیے زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔ پلیز... میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔”

“شش...” وقار نے اس کے لبوں پہ اپنی انگلی رکھ دی۔

“بہت ہو گیا سمجھنا سمجھانا... اب بس۔” وہ اس کی تحیر سے کھلی آنکھوں میں ذرا سا جھک کے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

“میں اور تم شادی کر رہے ہیں اور بس...” زرنگار نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں پر سے ہٹاتے ہوئے متوحش انداز میں پوچھا۔

”اور تمہارے گھر والے...؟“

”تم میرے ساتھ دلہن بن کے جاؤگی تو کون ہوگا جو وقار آفندی اور اس کی بیوی کو عزت نہ دے۔ جسے میں قبول کر چکا اسے ان کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔“

وہ دھیمے، مگر مضبوط لہجے میں کہتا اس کے سارے اعتراضات بہا لے گیا تھا۔ زرنگار کو لگا تمام عمر کو کلوں پہ ننگے پاؤں چلتے ہوئے کٹنے والی زندگی یک لخت پھولوں بھری رہ گزر پہ نکل آئی تھی۔

وہ کھل کے مسکرا دی۔

* * *

اگلے روز وہ تزئین کے ساتھ یونیورسٹی پہنچی تو ہر ڈیری ملک چاکلیٹ بار ہاتھ میں پکڑے اسٹوڈنٹ نے اسے منگنی کی مبارک باد دی۔

تزئین حیران تو مہپاہ پریشان۔

”واہ یار چپکے چپکے... کسی کو بلایا بھی نہیں۔“ کئی ایک دوستوں نے گلے کیے۔ چاکلیٹ کھاتے ہوئے منہ بنایا۔

”یہ افواہ اڑائی کس نے؟“ مہپاہ کے منہ سے نکل گیا تو سب نے حیرت سے چیخیں ماریں۔

”افواہ... ادھر طلال نے چاکلیٹس کے ڈبوں پہ ڈبے اس منگنی کی خوشی میں پوری یونی میں بانٹ دیے اور تم ابھی بھی اسے افواہ کہہ رہی ہو۔“ اس کی دوست نے اسے ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا تو اس کو ہنسی آگئی۔

”بے وقوف ہے وہ تو...“ اس کے لہجے سے پیار چھلکتا تھا۔

”ہوں... چیپ۔“ تزئین سر جھٹکتی اپنی کلاس کی طرف بڑھ گئی، مگر اب مہپاہ کو اس کی رتی بھر بھی پروا نہیں تھی۔ وہ محتاط نظروں سے ادھر ادھر طلال کو ڈھونڈتی رہی۔ اب تو کسی سے اس کا پتا بھی نہیں پوچھ سکتی تھی۔ ہر کوئی چاکلیٹ کھاتا اسے منگنی کی مبارک باد دے رہا تھا۔ وہ تھک کر اپنے مخصوص سفیدے کے درخت کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی کلاس شروع ہونے میں تھوڑا وقت تھا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے صبح کی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی روح کے ہلکے پن کو بھی۔ تب ہی بھاگتے قدموں کی آواز نے اسے چونک کر آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر دیا۔

”یہ لو...“ وہ چاکلیٹ بار اس کی جانب بڑھا رہا تھا۔ مہپاہ کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ پھیلی۔

”یہ کیا ہے...؟“ جان بوجھ کر تنگ کر پوچھا۔ وہ اب چاکلیٹ کا ریپر اتار رہا تھا۔

”میری منگنی ہوگئی۔“ اطمینان سے بتایا۔ مہپاہ کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ مگر فی الحال تو اسے جھاڑنا ضروری تھا۔

”کس قدر فضول آدمی ہو تم۔ پوری یونیورسٹی میں دھوم مچا دی منگنی کی۔ ابھی میں سب کو بتا دیتی کہ کوئی منگنی ونگنی نہیں ہوئی تو سب چاکلیٹس اگل دیتے۔“

”جناب آغا جان نے دل و جان سے پسند کیا ہے مجھے۔ اور تمہارے ابو اور چچا جان تو میرے متاثرین میں شامل ہوگئے ہیں باقاعدہ۔“ وہ لمبی لمبی چھوڑ رہا تھا، مگر نگاہ اس کے دل فریب چہرے اور خوب صورت مسکراہٹ پر تھی۔ کل تک جو اندیشے تھے آج اڑن چھو ہو چکے تھے۔

وہ بے ساختہ ہنسی۔ ”اف... یہ تمہاری خوش فہمیاں...“

”میں تو انگوٹھی جیب میں ڈال کے لے گیا تھا۔ تمہارے آغا جان نے ٹانگ اڑا دی درمیان میں۔“ آدھی

چاکلیٹ اپنے منہ میں ڈال کر وہ منہ بنا کر بولا۔ اور باقی چاکلیٹ اسے تھما دی۔

”چچا جان آ رہے ہیں دوبئ سے۔ وہ بھی شریک ہوں گے فنکشن میں اور ابھی میری بڑی سسٹر نے آنا ہے مسقط سے۔۔۔“ مہماہ نے مسکراتے ہوئے تفصیل بتائی۔

طلال نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ڈبیہ نکالی۔ مہماہ حیران ہوئی۔ وہ تو ایسے ہی سمجھ رہی تھی، مگر وہ واقعی ڈبیہ کھول کے انگوٹھی نکال رہا تھا۔

”یہ کیا ہے۔۔۔؟“

”یہ میں اسی نیت سے لے گیا تھا اگر اجازت ملی تو پہنا دوں گا، مگر بزرگوں کے اپنے ہی بڑے ضروری مسئلے مسائل تھے سو اب یہ۔۔۔“

شکایتی انداز میں کہتے کہتے اس نے مہماہ کا ہاتھ تھام کر وہ نازک سی انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال بھی دی۔

”طلال۔۔۔“ اس کی رنگت میں گلال گھلنے لگا۔ ”تھوڑا ہی تو وقت ہے۔ سب کے سامنے پہناتا۔۔۔“

”وہ بھی پہناؤں گا۔ یہ تو تمہاری نیت سے لی تھی۔ پہنا دی۔“ وہ بہت چاہت سے بولا تھا۔ مہماہ کا دل بہت ترنگ میں دھڑکا۔

”کلاس شروع ہونے والی ہے۔“ وہ بہانے سے وہاں سے ہٹی۔ طلال کی محبت پاش نگاہوں کا سامنا کرنا کوئی آسان کام تھا کیا، مگر وہ وہیں ہری گھاس پہ لیٹ گیا اور گردن تلے ہاتھ باندھ لیے۔ مہماہ کے قدم ٹھٹکے۔

”کیا ہوا۔۔۔ تم نہیں چل رہے؟“

”اتنی خوب صورت شکل دیکھنے کے بعد اب سر تحسین ظفر کو کون دیکھے۔“

وہ شرارت سے کہتے ہوئے آنکھیں موند گیا تو وہ اس کے جواب پر ہنستی ہوئی واپس پلٹ گئی۔

* * *

”میں نے اس ماہ کے آخر کی سیٹیں بک کروائی ہیں پاکستان کے لیے ہم تینوں کی۔“

کھانے سے فارغ ہوتے ہی فاران آفندی نے بیوی اور بیٹے کو مطلع کیا تھا۔ بڑے دنوں بعد یہ موضوع پھر چھڑا تھا۔ صاف اور سنجیدہ لب و لہجہ۔ جہاں کسی بحث و مباحثے کی گنجائش نہ تھی، مگر خاموش رہنا موحد کی تو گویا موت تھی۔

”بابا جان! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“

”معاف کرنے والے کا مقام ظالم سے بلند ہوتا ہے موحد۔“

”تو وہ کیوں نہ بنے معاف کرنے والے۔۔۔؟“ وہ چیخا۔

”ابھی بھی آپ نے ہی معافی مانگی۔۔۔“ ثمرو پھٹ پڑیں۔

”معافی مانگنے سے میں چھوٹا نہیں ہو گیا ثمرو۔ میرے والدین ہیں وہ۔ ہاں۔ میں مانتا ہوں کہ میری غلطی نہیں تھی، مگر پھر بھی ان کا مقام ایسا ہے کہ میں بنا قصور کے بھی ان سے معافی مانگ سکتا ہوں۔“

”اور میں۔۔۔ میں اپنے موحد کی موت معاف کر دوں انہیں؟ نمونیا میں مبتلا تھا میرا بچہ اور کیسے ظالموں کی طرح سرد تاریک رات میں ہمیں گھر سے دربدر کر دیا آپ کے آغا جان نے۔“ وہ رونے لگیں۔

”تمہارا بیٹا۔۔۔ تمہارا موحد تمہارے پاس ہے ثمرو۔ بھول جاؤ ان خوف ناک لمحات کو۔ گزر گیا وہ سب۔“ انہوں نے سختی سے کہا تو موحد نے آگے بڑھ کے ماں کو گلے سے لگا لیا۔

”ماؤں کے لیے اتنا آسان نہیں ہوا کرتا بچوں کی تکلیفیں بھلانا کیونکہ ان کے سینوں میں باپ کا دل نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

READING
Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوتا۔" ثمرہ نے تلخی سے جواب دیا تھا۔

"مسافر کو ایک نہ ایک دن واپسی کا سفر ضرور طے کرنا پڑتا ہے ثمرہ! ہمارا ابھی لوٹنے کا وقت آگیا ہے۔ صبر سے کام لیا ہے تو اب اللہ کا شکر بھی ادا کرو کہ اس نے یہ دن بھی دکھایا۔" وہ ضبط سے بولے۔

"فاران پلیز۔ میرے دکھ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"اتنے سالوں سے تمہارے ہی دکھ کو تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب تم میری خوشی کو سمجھو ثمرہ۔" ان کے لب و لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ ثمرہ بس خاموشی سے آنسو بہانے لگیں مزید کچھ نہیں بولیں۔

"اور تم۔۔۔" وہ لب بھینچے ثمرہ کو اپنے ساتھ لگائے کھڑے موحد سے مخاطب ہوئے۔ "سب کچھ سمیٹو اس ایک ماہ میں۔ ہم لوگ پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں۔۔۔ اور اسے میری ریکویسٹ سمجھنا۔"

موحد کے پاس اعتراض کا ایک لفظ نہ بچا تھا۔ وہ دانتوں پر دانت جمائے کھڑا رہ گیا۔

* * *

گھر میں دل فریب سا شور و ہنگامہ مچ گیا جب ملائکہ نے سب کو حیران کر دیا اور اپنے بیٹے یوشع کے ساتھ "آفندی ہاؤس" آ پہنچی۔ لڑکیوں کی ہاؤ ہو۔ چیخ و پکار۔

"اف۔۔۔ یہ سرپرائز ہے۔ ہارٹ اٹیک ہو جاتا خوشی سے مجھے۔" مہپاہ کی بہن سے بہت دوستی تھی اسے بھینچتے ہوئے بولی۔ تو وہ ہنسنے لگی۔ دو سالہ یوشع وہاں صرف ماں اور باپ کو دیکھنے کا عادی تھا۔ یہاں اتنے سارے ہاتھوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر روتا ہوا اماں سے لپٹ گیا۔ تائی جان نے فوراً "ان ماں بیٹے پر سے روپے وار کے کام والی کے ہاتھ کسی غریب کو بھجوائے۔

گھر میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔

"اور تم سناؤ۔ طلال کیسا ہے؟" فرصت سے بیٹھتے ہوئے ملائکہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ آنکھ دبا کر شرارت سے بولی۔

"بہت اچھا ہے۔"

"اوہو۔ اچھا ہے تب ہی تو آغا جان نے اپروول دیا ہے۔" وہ بھی ہنسی تھی۔

"وہ تو پکی منگنی کے چکر میں آیا تھا۔" مہپاہ نے الٹا ہاتھ لہرا کے ملائکہ کو رنگ دکھائی اور اترا کر بولی۔

"مگر آغا جان نے بڑے چاچو کے آنے کی شرط رکھ دی۔" آخر میں منہ لٹکایا۔

"اللہ خیر کرے۔ سالوں بعد واپسی ہو رہی ہے۔ یہ کام نمٹا لیتے تو اچھا تھا۔ بھئی ہر کسی کا اپنا موڈ اپنا مزاج۔" تائی جان نے اندر داخل ہوتے آدھی بات سنی تھی تشویش سے بولیں۔

"ثمرہ تو یوں بھی تنک مزاج سی تھی۔ بیٹا پتا نہیں کیسا نکلا ہو گا۔"

انہوں نے سوئے ہوئے یوشع پر چادر ٹھیک کرتے ہوئے ناک چڑھائی۔

وہ بہت سخت مزاج کی خاتون تھیں۔ جن کے چہرے پر مسکراہٹ صرف اپنی اولاد کے لیے آتی تھی۔

"آغا جان نے ایسے ہی پروگرام آگے پہ ڈال دیا۔ انہوں نے بھلا آکر کون سی دھمالیں ڈال لینی ہیں۔"

"رشتہ تو ان سے ہے نا امی اور پھر اس ماہ کے آخر تک وہ آ رہے ہیں تو ان کے آنے سے پہلے ہی فنکشن بھگتا لینا کچھ مناسب نہ لگتا۔" ملائکہ نے رسانیت سے کہا۔

"ارے چلو ہٹو۔۔۔" انہوں نے نخوت سے ہاتھ جھٹکا۔ "رشتہ ہوتا تو باپ سے نبھاتے۔۔۔ بھائی سے نبھایا اس نے اور اسی ضد میں گھر چھوڑ گیا۔"

"آغا جان نے خود نکالا انہیں گھر سے امی۔" ملائکہ نے سنی ہوئی معلومات کے مطابق لقمہ دیا۔

"اب بھی تو معافی مانگی نا... تب ہی اپنی غلطی کا احساس کر کے معافی مانگ لیتا تو یوں بن باس نہ کاٹنا پڑتا۔" انہوں نے تیوری پہ بل ڈالے تھے۔

"لے کے بدشگونی ڈال دی ہمارے کام میں۔"

وہ بات ختم ہونے کے بعد بھی بڑبڑاتی رہی تھیں۔

* * *

دن جیسے پر لگا کے اڑے اور آج شام کی فلائٹ سے فاران آفندی چودہ سالوں کا بن باس کاٹ کے واپس لوٹ رہے تھے۔

"شکر خدا کا... تمہارے چاچو جان تو ظالم سماج بن گئے ہمارے درمیان۔ مہینہ گزارنا مشکل تھا۔" طلال کے سکھ کا سانس لینے پر مہماہ خوب ہنسی۔ اور پھر ادھر شام آئی اور گزر بھی گئی۔

سب پریشانی سے کال پہ کال ملاتے رہے، مگر فاران کے دونوں نمبرز بند آ رہے تھے۔ ساری فلائٹس چیک کر لیں، مگر مسافر ندارد۔ اسکائپ پر بھی وہ موجود نہ تھے۔

وہ رات شدید پریشانی کی رات تھی۔ ایرپورٹ انکوائری سے پتا چلا کہ فاران آفندی اینڈ فیملی کی سیٹیں کنفرم تھیں، مگر وہ آئے نہیں تھے۔

"مبین... تم کم از کم ایڈریس تو لیتے وہاں کا اس سے..." آغا جان کا دل سخت بے چین تھا۔ کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے۔ چڑ کر مبین آفندی سے بولے۔

"مجھے خیال ہی نہیں آیا آغا جان۔ یہی سوچا کہ اب تو واپس آ رہا ہے ایڈریس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔" انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے دبے لفظوں میں وضاحت بھی کر دی۔

پریشانی سی پریشانی تھی۔

اور پھر ایک اداس سی سہ پہر جب آسمان کا رنگ عجیب سا ہو رہا تھا اور دلوں میں بھی اوہام پہرہ ڈالے بیٹھے تھے۔

فاران آفندی کا ایک نمبر کھلا ملا تو مبین، نمبر ملاتے آغا جان کے کمرے کی طرف بڑھے۔

"ہاں... ہیلو... فاران..." رابطہ ملنے پر انہیں سکون ہوا، مگر دوسری جانب کوئی اجنبی سی آواز تھی۔

"کس کا فون ہے مبین... کیا فاران ہے؟"

آغا جان بے چینی سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھے تو دوسری طرف کی بات سنتے مبین آفندی کو جیسے ٹھوکر سی لگی اور وہ اپنے عمر رسیدہ باپ کے بازو کا بے اختیار سہارا لے بیٹھے۔

ان کی رنگت یکلخت سفید پڑ گئی تھی۔ آغا جان نے ان کے ہاتھ کی کپکپاہٹ بہت اچھی طرح اپنے بازو پر محسوس کی تھی۔

"مبین... مجھ سے بات کراؤ۔ فاران ہے کیا؟" وہ متوحش زدہ سے ہوئے، مگر مبین آفندی کی آنکھوں میں چمکتی نمی نے انہیں سن سا کر دیا۔ مبین آفندی کا موبائل گر گیا۔

"فاران... نہیں ہے آغا جان..." وہ کرسی پر ڈھے گئے۔ آغا جان کے دل میں درد کی شدید لہر سی اٹھی۔

مبین آفندی کا ٹوٹا ہارا انداز اور آنکھ میں چمکتی نمی ایک ہی اطلاع دے رہے تھے۔

فاران نہیں تھا... فاران نہیں "رہا" تھا۔ ان کے ذہن میں جھکڑ سے چل پڑے۔

Downloaded From

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مُکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مُکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مُتعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

بنتِ سحر

میں ہوں نا

کھڑکیوں کے پار مدھم سرد رات کا فسوں طاری تھا۔ دھند میں لپٹے در و دیوار میں دکھائی پڑتی روشنیاں برف کے لبادے میں لپٹے ننھے ننھے جگنوؤں کی طرح نظر آتی تھیں... میں بیڈ پر بیٹھی اُس کی عادات و حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے پردے برابر کیے تھے۔ ہیٹر آن کیا تھا۔ مجھ پر کمبل برابر کیا تھا۔ اور اب وہ

Downloaded From Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ستواں ناک کی نوک پر عینک ٹکائے' ریوالنگ چیئر پر گھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سی تھیں۔ اور چہرے پر بلا کا اطمینان اور سکون تھا۔ ٹیبل لیمپ جل رہا تھا' جس کی روشنی ترچھے رخ سے اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اس نے مجھے دیکھا۔ "مادام.... آج آپ کون سی کہانی سننا پسند کریں گی؟"

"کوئی سی بھی سنادو۔" میں نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ حرکت کرتی کرسی رکی۔

"دو ستاروں کی میجک اسٹوری سنادوں؟" استفسار کیا گیا۔

"پہلے تو کبھی تم نے میرے کہے پر عمل نہیں کیا۔ آج میری پسند کیسے اتنی اہم ہو گئی؟"

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا' مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ کمرے میں چھائی خاموشی کا پردہ چاک کرتی آواز اس کی تھی یا دیوار پر لگے وال کلاک کی۔ وہ کرسی پر گھومتا ہوا "Two stars" سنا رہا تھا اور میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ کہانی کے "درمیان" میں بولنا رولز کے خلاف تھا۔

"نیلے آسمان پر دو ستاروں کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ہنستے تھے۔ کھیلتے تھے ان کے گھر کے گرد بادلوں کی' سفید برف کی سی دیواریں تھیں جن کی اونچائی ان کے خوب صورت گھر کو سورج کی روشنی سے بچاتی تھی۔ ان کے گھر کے کھیت والے باغ میں چیریز' اسٹرابریز کے درخت تھے۔ وہاں تتلیاں اڑتی رہتی تھیں۔ آپ سن رہی ہیں نا؟" گھومتی ہوئی کرسی کو روک کر ناک سے پھسلتی عینک کو ٹھیک کیا تھا اور پھر خفگی بھری نظر مجھ پر ڈالی تھی۔

میں نے مدھم سی آواز میں کہا تھا۔

"ہاں.... ایک.... میں "سب" سن رہی ہوں۔ تم کہانی مکمل کرو۔" مجھے ادھوری کہانیوں سے خوف آتا تھا۔ خاموشی میں اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ گول گول گھومنے لگا تھا۔ اب ٹیبل لیمپ کی روشنی اس کی پیشانی پر ابھرتی شکنوں پر سیدھے رخ سے گر رہی تھی۔

"پھر ایک دن سرخ آندھی نے بادلوں کے گھیرے کو چیر دیا تھا اور سورج کی شعاعوں سے اسٹرابریز کے درخت اجڑ گئے اور تتلیوں کے پنکھ پگھل گئے۔ دونوں ستارے جلنے لگے تھے۔ آخر کار ایک ستارے نے اپنا مدار چھوڑ دیا اور دھند میں کہیں گم ہو گیا۔ وہ آج تک نہیں ملا اس کا ساتھی ستارہ اسے نگر' نگر ڈھونڈتا رہا' مگر وہ ملا ہی نہیں۔ اب وہ ستارہ کھیلتا بھی نہیں.... ہنستا بھی نہیں.... وہ اپنی جگہ منجمد ہو گیا ہے۔ آج تک اس کی حالت نہیں بدلی۔ باقی ستارے اس کے غم میں اپنی "جوڑیاں" توڑ دیتے ہیں' مگر وہ ستارہ ساکت ہے۔"

وال کلاک کی ٹک' ٹک ڈوبتی ابھرتی رہی۔

طویل لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے سر اٹھا کر ایبک کو دیکھا تھا۔ اس نے کتاب بند کر کے ٹیبل کی دراز میں آہستگی سے رکھ دی تھی اور ناک پر پھسلتی عینک کو کور میں ڈال کر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

اسے پتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور سوئچ بورڈ کے قریب جا کر ٹیوب لائٹ بند کر دی۔ کمرے میں اب صرف ٹیبل لیمپ کی ملگجی سی روشنی کا ہالہ دیواروں پر لرزنے لگا تھا۔

ایبک، دوبارہ ریوالنگ چیئر پر بیٹھ چکا تھا۔ ساکت حالت میں۔ دونوں ہاتھ ٹھوڑی پر جمائے ہوئے اب میری "باری" تھی۔ کہانی سنانے کی۔ وہ "کتابوں" سے کہانیاں سناتا تھا' مگر میں.... میں "زندگی" سے اخذ کی گئی کہانیاں سناتی تھی۔ کمرے میں حرارت پھیل گئی تھی۔

"میں تمہیں کون سی کہانی سناؤں؟" میں نے پوچھا تھا۔

"کوئی سی بھی سنادیں۔" اس کی گہری آنکھوں میں "کچھ" تھا۔ میں نے خود کو برف کے قلعے میں محبوس ہوتا محسوس کیا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھا ہوا تھا۔

"چلو... میں آج تمہیں زمین کے دو پرندوں کی کہانی سناتی ہوں۔" میں نے کہا۔ وہ "چپ" بیٹھا سن رہا تھا۔ کیونکہ کہانی کے "درمیان" بولنا رولز کے خلاف تھا۔

اور وہ رولز فالو کرنے میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔

"زمین پر دو پرندے رہتے تھے۔ ان میں بچپن ہی سے بہت دوستی تھی۔ چڑیا اور چڑا... دونوں اکٹھے اڑان بھرتے تھے۔ کھجوروں کے باغوں میں شرارتیں کرتے تھے۔ وہ دونوں اچھے دوست تھے پھر ان کے والدین نے ان کی شادی کردی تھی۔ وہ خوش تھے بہت خوش... پھر اللہ نے انہیں ایک چھوٹا سا ننھا منا سا بچہ دیا تھا۔ انہوں نے بچے کو پالا پوسا، بڑا کیا پھر اس کی بھی شادی کردی اور پھر دونوں کو اللہ نے ایک اور ننھا بچہ دیا۔ جو ان کے بیٹے کا بیٹا تھا۔ وہ بہت خوش تھے... مگر...؟" برف کے قلعے پر حرارت گرنے لگی تھی۔ میری آنکھ سے آنسو ٹپک کر کمبل کی اون میں گم ہوتا گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" ایبک شہریار نے "رولز" توڑا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔

"پھر چڑے کو اللہ نے بلالیا اور چڑیا اکیلی رہ گئی۔ وہ بھی تمہاری کہانی کے ستارے کی طرح منجمد ہوگئی۔" اندھیرے میں ٹیبل لیمپ کی ملگجی روشنی میں بھی میرے "آنسو" ایبک شہریار نے دیکھ لیے تھے۔

وہ کرسی گھماتا ہوا سوئچ بورڈ کی جانب بڑھا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی دودھیا سی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ وہ کرسی پر ہی بیٹھے بیٹھے میری طرف بیڈ کے نزدیک آیا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ تھامے "انہیں چوما اور پھر میرے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ دس سالہ لڑکا مجھے "تسلی" دے رہا تھا۔

"آپ مت روئیں۔ چڑیا اکیلی نہیں ہے۔ اللہ نے "ننھا چڑا" ایک بھی تو بھیجا ہے نا آپ کے لیے۔"

میں نے اس ذہین آنکھوں والے لڑکے کی پیشانی چومی۔

"اب اگر آپ روئیں تو میں بھی آپ کے ساتھ رو دوں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ دیوار پر لگی پینٹنگ میرے سامنے تھی۔ سفید فروالا گھوڑا جس کے پاؤں اٹھے ہوئے تھے۔

"آپ جانتی ہیں نا کہ میں روتے ہوئے کتنا برا لگتا ہوں۔" میں جانتی تھی، وہ کتنا برا "روتا" تھا۔

"ہاں۔ میں "اچھی" طرح جانتی ہوں۔" وہ مڑا ٹیوب لائٹ آف کی اور میرے قریب لیٹ گیا۔ میں نے کمبل برابر کیا۔ اس نے کمبل اٹھایا... مجھے دیکھا... مسکرایا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں... ہوں نا...؟" میں نے سرہلا دیا۔

روشنیاں گل ہوگئی تھیں، مگر وال کلاک کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔ کھڑکیوں کے پار برفیلی دھند پر تنے آسمان پر اب بھی "ستاروں" کی "جوڑیاں" ٹوٹ رہی تھیں۔

* * *

میں لاؤنج میں کھڑی بیگ کی زپ بند کررہی تھی۔ تائی امی غصے میں لاؤنج کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر آئیں۔

"نیلماں... گارڈن سے گلاب تم نے توڑے ہیں؟" وہ صاف رنگ کی تھیں۔ غصے میں ان کا چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہوجاتا تھا۔ اب بھی ہو رہا تھا۔ میں کمال اطمینان سے زپ بند کرتی واپس پلٹی تھی۔

"جی نہیں تائی... میں نے نہیں توڑے۔" وہ چپ سی آگے بڑھ گئیں۔

غالب سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا اسپورٹس بیگ کندھے پر لٹک رہا تھا۔

"چاچو... ہارن پر ہارن دے جارہے ہیں اور تم اسٹیچو بنی کھڑی ہو۔" میں نے آواز کی طرف دھیان دیا

تو پتا چلا واقعی ابو ہارن دے رہے تھے۔

ہم دونوں اکٹھے آگے بڑھے تھے۔ سیڑھیاں پھلانگتے پورچ میں آئے، بیگز گاڑی میں پھینکے۔

میں نے کار کا دروازہ کھولا اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔

ابو نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

صبح کے وقت روڈ پر گہما گہمی سی تھی اخبار بیچتے لڑکے... دودھ والے... برے برے منہ بناتے اسکول جاتے ہوئے لڑکے... میں شیشوں کے پار دیکھ رہی تھی۔ ہمیشہ سے ہی یہ میرا دلچسپ "مشغلہ" رہا تھا۔

"بات سنو..." غالب نے مجھے خفگی سے پکارا تھا۔

میں اس کی طرف مڑی۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔" میں نے پوچھا تھا۔ وہ چہرے پر دنیا جہان کی "مسکینیت" سجائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخر تھک ہار کر اس کی ٹائی کی ناٹ لگائی تھی۔ وہ یہ کام روزانہ مجھ سے کرواتا تھا اور میں بلا چوں چراں کر بھی دیتی تھی۔

غالب باہر دیکھنے لگا تھا۔

"میری طرف دیکھو۔" میں نے چڑ کر کہا تھا۔ وہ کمال اطمینان سے میری طرف مڑا تھا۔

"جی... آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" میرا دل چاہا وہ پینسل اسے زور سے چبھو دوں جو کہ میں نے پندرہ منٹ کی مشقت لگا کر تراشی تھی۔

"جی... آپ سے ہی کہا ہے۔" میں نے خفگی دکھائی، مگر رائیگاں گئی۔

"جی... مادام..." وہ شرارت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اپنے جوگرز کی طرح اس کے پیروں میں بھی ویسے جوگرز دیکھے تھے۔

میں نے نیچے اشارہ کیا تھا۔

"تسمے تو باندھ دو۔" وہ برے برے منہ بناتا، جاگرز کے تسمے باندھنے لگا تھا۔

یہ ہمارے روز کے "معمولات" تھے۔ میں اس کی ٹائی کی ناٹ لگا دیتی تھی اور وہ تسمے باندھ دیتا تھا۔

ابو نے بیک مرر سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "آخر تم دونوں کب تک ایک دوسرے کے کام کرتے رہو گے؟"

"Till death"۔ غالب نے جواب دیا تھا۔ (آخر دم تک)۔

ٹریفک کے شور میں آواز دب سی گئی تھی۔ ابو نے سنا تھا یا نہیں، مگر میں نے "سن" لیا تھا۔ ہم اچھے دوست ہم اچھے ساتھی تھے۔ زندگی کی صبحیں، شامیں اکٹھے گزرتی تھیں۔ ہم جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہیں لیتے تھے، پرسکون نہیں ہوتے تھے ہم ایک دوسرے کے "وجود" کا حصہ تھے۔

* * *

بریک ٹائم میں ہم اسپورٹس گراؤنڈ میں واک کرتے تھے اور دنیا جہان کی گپیں لگاتے تھے۔ اس دن بھی یہی کر رہے تھے۔ ہم نے چپس کا فل سائز پیکٹ لے لیا تھا جو میرے ہاتھ میں تھا اور ہم چلتے ہوئے چپس سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"تم نے تائی کو کیوں نہیں بتایا کہ وہ روز میں نے ان کے گارڈن سے توڑے تھے۔" میں نے پوچھا تھا۔

"ویسے ہی... مجھے پتا تھا کہ تم نے اپنی ڈرائنگ نوٹ بک میں لگائے ہوں گے۔"

"تم بہت اچھے ہو۔"

"ہاں اور تم بہت کم اچھی ہو۔" وہ مسکرایا تھا۔

"اچھا تم نے میتھ کے ٹیسٹ کی تیاری کرلی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں، مگر کیا تم نے نہیں کی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں... غالب... وہ رات مجھے جلدی نیند آگئی تھی نا۔ اب کیا ہوگا، مس زبیری تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔" میں بہت پریشان تھی۔ وہ جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ تھم سا گیا۔

"میں ہوں نا... فکر مت کرو۔ ابھی بریک آف ہونے میں وقت باقی ہے... میں تمہیں سمجھا دیتا

ہوں۔" اور پھر اس نے مجھے میتھ کی تیاری کروادی تھی۔ مجھے اس پر ہمیشہ بھروسا رہا تھا۔

* * *

ہم دونوں نے اکٹھے بچپن گزارا تھا۔ ہنستے ہوئے، روتے ہوئے۔ زندگی کے ہر لمحے میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ وہ بہت اچھی تسلیاں دیتا تھا۔ رات کو ہم قریبی پارک میں چہل قدمی کرنے جاتے تھے۔ آئس کریم کھاتے تھے، میں نے ساری زندگی غالب پر انحصار کیا تھا۔ ہماری پسند، ناپسند ایک دوسرے سے بہت ملتی تھی۔

ایک دوسرے کی غلطیاں سدھارتے تھے۔ بارش میں اکٹھے بھیگ جاتے تھے اور اکٹھے ٹیرس پر جھولے پر بیٹھ کر چھینکیں مارتے تھے۔ پاپ کارن کھاتے تھے۔ ابو کی لائبریری کی بھاری کتابیں پڑھتے تھے۔ امی اور تائی کی ڈانٹ کا قطعی اثر نہ ہوتا کہ ان کے نزدیک ہم مٹی کا مادھو تھے۔ جن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

وہ میری ڈائری لکھتا تھا اور میں اس کی ڈائری لکھتی تھی۔ واک پر جاتے وقت وہ میرا پرس سامنے رکھتا اور میں اس کا والٹ تھامے رکھتی تھی۔

سفیدے کے درختوں پر ہم نے اپنے نام لکھے تھے۔ اکثر ہم باتیں "بڑ" کے پتوں پر لکھ کر کرتے تھے۔ رات کو لان میں بڑے ابا کا ریڈیو اٹھا کر لے جاتے اور ٹیبل پر ریڈیو رکھا ہوتا تھا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے پروگرام "زندگی کہانی" سنتے تھے۔

ایک دن چائے بنانے کی "باری" اس کی ہوتی تھی اور اگلے دن میں چائے بناتی تھی۔

اخباروں سے لطیفے کاٹ کر بزم ادب کے پیریڈ میں پڑھنا، ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔

اسی طرح ہنستے روتے، بھاگتے دوڑتے ہم نے بچپن ایک ساتھ گزارا تھا۔

اور ہم لڑکپن کی دہلیز پر آن پہنچے تھے۔

* * *

میری واحد دوست علینہ کی منگنی تھی۔ میں اسی کے لیے تیار ہوئی تھی، میں نے بلیک کلر کے چوڑی دار پاجامہ پر سرخ فراک پہن لیا تھا۔ ہال میں روشنی تھی میں آہستگی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔ میں نے دوپٹا کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ غالب مجھے چھوڑ گیا تھا اور وہی مجھے واپس لینے آیا تھا۔

"اتنی دیر لگادی اور دوپٹا سر پر لو۔" مجھے وارننگ دی گئی تھی اور میں یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ مجھے اپنی بائیک پر لینے آیا تھا۔ میں دوپٹے کا نقاب اوڑھے اس کے پیچھے بیٹھی تھی۔ سڑک پار نظر آتی جگمگاتی روشنیاں کتنی پیاری لگ رہی تھیں نا۔ تارکول کی سڑک پر روشنیوں کا عکس بہت سحر انگیز تھا۔

"غالب... کتنا اچھا لگ رہا ہے نا یوں...." میں نے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا تھا۔

"ہاں... بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آدھی رات کو خوار ہونا۔"

"تم تو وہمی سے ہو... سڑک کے دائیں بائیں روشنیاں کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ دل کرتا ہے بندہ دیکھتا ہی جائے۔" سڑک پر خشک پتے اڑے جارہے تھے۔

"اور جو چچی پریشان ہو رہی ہوں گی وہ...."

"امی کو تو پریشان ہونے کی عادت ہے۔" میں نے کہا تھا۔

"کل یونیورسٹی جاؤں گی کیا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں... کل صفائی کرنی ہے پورے گھر کی... تو کل نہیں جاؤں گی۔ میری فائل تم سب مٹ کرا دینا۔"

"کل کوئی آرہا ہے... یا "یوم صفائی" منانا ہے؟؟" میں پاس سے گزرتی کاروں کے شیشوں کے پار، دھندلی پڑتی روشنیاں دیکھنے میں مگن تھی۔

"ہاں... تمہیں پتا نہیں ہے کیا... ابو کے دوست آرہے ہیں اپنے بیٹے کے رشتے کے سلسلے میں...."

بائیک جھٹکے سے رکی تھی۔ میں گرتے گرتے بچی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "تم راضی ہو اس رشتے پہ...؟"

"ہاں... تو... ہمیشہ ابو کے گھر میں تھوڑی رہنا ہے

میں نے۔۔۔ بیٹیاں تو آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں۔ ”اڑنا“ مقدر ہوتا ہے نا۔“ میں نے اداسی سے کہا تھا۔

میرے جواب پر اس نے خاموشی سے بائیک آگے بڑھادی تھی۔ میں جوار دگرد کی ”روشنیاں“ دیکھنے میں مگن تھی۔ اس شخص کی آنکھوں کی دھندلی پڑتی روشنیاں دیکھ ہی نہ سکی۔

رات کے بھیگے پن میں جب بائیک پورچ میں رکی تھی۔ لان میں بونے قد کے چنبیلی کے پودے کی مدھم خوشبو سارے گھر میں اڑ رہی تھی۔ میں اندر کی جانب بڑھتی، غالب کی آواز پر ”ساکت“ ہوئی تھی۔

”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نام کسی اور کے ساتھ لیا جائے۔۔۔ میں تمہیں جس دن نہ دیکھوں مجھے چین نہیں آتا۔ مجھے تمہاری ”عادت“ ہوگئی ہے۔ نیلماں۔۔۔ ! تم جانتی ہو نا۔۔۔ مجھے اپنی عادتیں بدلنا اچھا نہیں لگتا۔“ میں جب سرد وجود کے ساتھ دروازہ بند کر رہی تھی تو میں نے اس سیاہ آنکھوں والے شخص کی آواز سنی تھی۔

”میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ کل ہی امی، چچی سے بات کریں گی۔“

میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتی تو ”پتھر“ ہو جاتی۔ بھیگتی رات میں ایک سرگوشی بازگشت کی مانند میرے وجود کے ”گنبد“ میں گھومتی رہی۔

“ I want you ... neelmaan... ”

(میں تمہیں چاہتا ہوں نیلماں)

* * *

درودیوار پر لگی ننھی روشنیاں جگ مگ کر رہی تھیں۔ کھڑکی کے پار آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب رکھی ٹیبل کے ایک طرف رکھی کرسی پر میں بیٹھی تھی اور دوسری کرسی پر غالب بیٹھا تھا۔

”تم کافی کیوں نہیں پی رہی ہو؟“ وہ بے چینی سے پوچھ رہا تھا۔ ٹیبل پر دو کافی کے کپ رکھے تھے۔ مدھم خوش گوار دھواں کمرے میں پھیلنے لگا تھا۔

”تم نے آج اچھی کافی نہیں بنائی۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ وہ زچ ہوا تھا۔ چاند کی ترچھی روشنی ایرانی غالیچے میں مدغم سی ہو رہی تھی۔ میں نے کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔ باسی مہندی کی خوشبو حواسوں پر چھانے لگی تھی۔

”میں کیوں جھوٹ بولوں گی۔“ میں نے پوچھا تھا۔

”پہلے تو تم چپ چاپ میری بنائی کافی پی لیتی تھیں۔ اب اعتراض کیوں؟“ اب وہ پوچھ رہا تھا، میں نے کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا تھا۔ واقعی کافی بہت ”مزے“ کی تھی۔

”پہلے میں تمہاری دوست تھی، اب تمہاری بیوی ہوں۔“

”کیا مطلب۔۔۔ تم میرے ہر معاملے میں انٹرفیئر کروگی؟“

”بالکل۔۔۔ مجھے اس کا حق ہے پورا۔“ میں نے اطمینان سے دوسرا گھونٹ بھرا تھا۔

وہ اپنی ”کافی“ کا کپ بھول چکا تھا۔ میں نے آہستگی سے کپ ”بدل“ دیا تھا۔

”چلو۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ اچھا میں تمہیں آج کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“ تمہید باندھی جا رہی تھی۔ میں نے دونوں بازو ٹیبل پر رکھ کر اسے بغور دیکھا تھا۔ کانچ کی ست رنگی چوڑیاں بج اٹھی تھیں۔

”میں نہیں جانتا تھا نیلماں کہ میری زندگی میں تمہاری اتنی اہمیت ہوگی۔۔۔ مجھے اس کا بہت دیر سے احساس ہوا۔ مجھے تمہاری باتوں کے علاوہ کبھی کسی کی گفتگو متاثر نہیں کر سکتی۔ تمہیں دیکھ کر میری فیلنگز عجیب سی ہو جاتی ہیں۔ جیسے نیو ایر کے پٹاخے پھوٹتے ہیں۔ مجھے تمہاری ہنسی کی کھنک سننے کی عادت ہے۔ میں اکیلے ڈائریاں نہیں لکھ سکتا تھا۔ کافی نہیں پی سکتا تھا۔ آئس کریم نہیں کھا سکتا تھا۔ تمہارے بغیر میں ”زندگی کہانی“ نہیں انجوائے کر سکتا تھا۔۔۔ مجھے اب پتا چلا کہ یہ سب کیا تھا؟ تمہارے بغیر میں ”ادھورا“ ہوں۔ تم مجھے میرا second heart لگتی ہو۔ جس کا نہ ہونا مجھے مار ڈالے گا۔“

ایک کافی کا کپ خالی ہو چکا تھا، مگر دوسرے کپ

سے ہلکی سی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے نزدیک پیار، محبت، یہ سب کچھ "دقیانوسیت" تھا۔ وہ مجھ سے "اظہار محبت" کر رہا تھا۔ انداز کافی "عجیب" تھا، مگر متاثر کن تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔ "آئی رئیلی لو یو۔"

میں منجمد بیٹھی تھی۔ وہ تشویش سے بولا۔

"میں نے ٹھیک کہا نا۔۔۔ مجھے اصل میں پتا نہیں کہ ایسے موقعوں پر کیا کہتے ہیں۔۔۔" میں نے اس روشن پیشانی والے کی اس بات پر قہقہہ لگایا تھا۔

"ایک ڈیسینٹ اور اسمارٹ شخص کا اظہار محبت ایسا ہی دل کو چھو لینے والا ہوتا ہے۔" چاند کی روشنی پورے کمرے میں بکھرتی جا رہی تھی۔

"میں تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گا۔ کبھی اداس مت ہونا، میں ہوں نا، سب سنبھال لوں گا۔"

* * *

میں لان میں اونی شال اوڑھے بیٹھی ہوں۔ پانچ دن پہلے غالب نے مجھ سے کہا تھا۔

"جانے کیوں بیٹے کا باپ بننے کے بعد اور دادا بننے کے بعد بھی میری محبت تمہارے ساتھ اول روز کی طرح تازہ ہے۔ آج بھی میں تمہارے ساتھ کافی پی کر، واک کر کے ریلیکس محسوس کرتا ہوں۔" اور میں کتنا ہنسی تھی اس بات پر اور وہ چپ چاپ مجھے دیکھتا رہا۔۔۔ دیکھتا رہا۔

"میں نے ایک بات تمہیں کبھی نہیں بتائی؟" اس نے کہا تھا۔ میں حیران تھی کہ وہ کون سی بات تھی جس سے میں "لاعلم" تھی۔ جو میں نہیں جانتی تھی۔

"جانے کیوں مجھے آج تک اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ تم مجھے "ہنستی" ہوئی زیادہ اچھی لگتی ہو یا پھر "غصے" میں لڑتی ہوئی۔۔۔ جھگڑتی ہوئی۔"

میں حیران بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی نا کہ ہم خود کو "بہت" زیادہ جانتے ہوئے۔۔۔ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پاتے تھے۔

میں نے کبھی کبھی غالب کو غصے میں دیکھا تھا، مگر میری زندگی میں آنے والے سارے مردوں میں اس جیسا (polite) مہربان کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے شال کا پلو اپنے اوپر ڈال لیا ہے۔ فجر کی ٹھنڈی ہوا میں عجب منجمد کر دینے والے احساسات سے تھے، میں نے ہتھیلیوں کو آپس میں بھینچا تھا۔ زندگی کتنی ارزاں ہوا کرتی ہے نا۔ پل میں ریت کی طرح ہتھیلیوں سے پھسل جاتی ہے۔ اک آنسو لڑھکتا ہوا میرے ہاتھوں پر گرا تھا۔

میرا دل چاہ رہا ہے چیخ چیخ کر روؤں۔۔۔ چلاؤں۔۔۔ مگر حواس سلب ہوئے جاتے ہیں۔ اب کھڑکی کے ساتھ والی ٹیبل پر ایک کپ خالی پڑا رہے گا۔ کوئی پینے والا نہیں ہو گا۔

کافی کی تہہ سی جم جائے گی۔۔۔ چاند اپنا سفر طے کرتا ہوا طنزیہ نظر مجھ "اکیلی" پر ڈالتا منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے گا اور میں ڈائریاں ہاتھ میں تھامے بیٹھی روتی رہوں گی۔

لان میں "زندگی کہانی" کے سر ٹوٹ جائیں گے۔۔۔ میں غائب دماغ سی بیٹھی رہوں گی۔

* * *

بہنوں کے لیے خوشخبری
خواتین ڈائجسٹ کے ناولوں پر
40% رعایت
یہ رعایت صرف ہماری دُکان
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 - اردو بازار، کراچی پر دستیاب ہے

ایبک بال تھامے میرے پاس بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے میرے ہاتھ چومے تھے۔

"آج میں اور آپ دس بجے شاپنگ کرنے جائیں گے۔ آئس کریم بھی کھائیں گے۔ آپ کو کون سا فلیور پسند ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ میں "غلط" تھی۔ میرے پاس آئس کریم شیئر کرنے والا "ساتھی" تھا۔

"مجھے اسٹرابیری پسند ہے۔" میں نے کہا تھا۔

ایبک نے سر ہلایا تھا۔ پھر مجھے بغور دیکھا تھا۔

"شام سات بجے ریڈیو پر "زندگی کہانی" سننے لان میں آیئے گا۔ آپ آئیں گی نا دادو؟"

ایبک شہریار کے آگے میں ہتھیار ڈال رہی تھی۔ زندگی کہانی انجوائے کرنے کا تسلسل برقرار رہے گا۔ وہ کہنے لگا تھا۔

"I shall wait for you..."

میں نے گہرا سانس لیا تھا۔ "میں ضرور آؤں گی ایبک۔"

میں اسے اس کے نام سے بلاتی تھی۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔

ایبک نے تازہ پھول میری شال میں ڈال دیے تھے۔

"رات کو آپ کے بیڈ روم کی کھڑکی والی ٹیبل پر بیٹھ کر چائے پئیں گے۔" میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ جانے کیوں؟

چاند مجھے "اکیلا" نہ دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسے گا۔۔۔ میں جانتی تھی۔

"چائے نہیں کافی پئیں گے۔"

"ٹھیک ہے دادو۔۔۔ مگر کافی میں بناؤں گا۔" وہ پرجوش ہو کر بولا تھا۔ میں نے سخت نظر ایبک پر ڈالی تھی۔

"جی نہیں۔۔۔ ایبک شہریار! تم بھی اپنے دادا کی طرح اچھے کافی میکر نہیں ہو۔"

وہ خفا ہو کر پیٹھ موڑ گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے کھڑا کیا تھا اور روشن پیشانی چومی تھی۔

"پتا ہے ایبک۔۔۔ دادو کو اکیلے رات کو بہت ڈر لگتا تھا، مگر جب سے تم میرے پاس ہوتے ہو میں بے فکری محسوس کرتی ہوں۔۔۔ میں جانتی ہوں تمہارے دادا مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔۔۔ آج "تم" ہو میرے پاس۔۔۔ اب مجھے اکیلے کافی نہیں پینی پڑے گی۔۔۔ اب مجھے اکیلے دوا نہیں کھانی پڑے گی۔ میرے پاس اچھا قصہ گو ہے۔ جو مجھے رات کو اچھی اچھی کہانیاں سنایا کرے گا۔" سورج کی روشنی ایبک کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"آپ میری دوست ہیں۔۔۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ کو ڈر لگے تو مجھے بتا دیجیے گا۔ آپ جانتی ہیں نا کہ میں کتنا brave ہوں؟" پوچھا گیا تھا۔

میں نے ہنسی دبائی تھی۔

"ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں ایبک بہت بہادر ہے۔"

چہرہ جوش سے خون چھلکانے لگا تھا۔ ہم اٹھ کر اندر جانے لگے تھے۔۔۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا۔ جب پیچھے سے آواز آئی تھی۔

"I am nothing without you..."

(میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں) سالوں پہلے غالب کے الفاظ پر میں ساکت ہوئی تھی اور آج ایبک کی آواز نے مجھے "پتھر" جیسا کر دیا تھا۔ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا تھا۔

"آپ کبھی پریشان نہ ہونا۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔۔۔ ہوں نا؟"

وہ پوچھ رہا تھا۔

میں بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دی تھی۔

"Yes... I know-you are with me..."

(ہاں مجھے پتا ہے۔ تم میرے ساتھ ہو۔)

زندگی کے سفر میں ہمیشہ ہمارے پاس "سہارے" ہوتے ہیں، مگر ہمیں انہیں ڈھونڈنے میں بس وقت لگتا ہے۔

مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔

☼

مصباح علی

رشتے ناتے

”وہ آ گئے۔۔۔؟“

آج اس نے کوئی چوتھی بار دیوار پر لٹک کر آہستگی سے پوچھا تھا جواباً ”رملا نے ہاتھ جوڑے۔

”خدا کے لیے بھابھی! جیسے ہی آئیں گے‘ فوراً“ آپ کو بتاؤں گی بلکہ دینے آجاؤں گی۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا‘ آہستہ تو بولو‘ کوئی سن لے گا۔“ وہ شا کی نگاہ دائیں بائیں دوڑاتی دیوار سے ہٹنے لگی تو رملہ نے پوچھ ہی لیا۔

”آخر معاملہ کیا ہے؟ اس بار آپ زیادہ ہی منتظر نہیں ہیں۔“

سدرہ دھیما سا مسکرائی۔ ”تم خود ہی دیکھ لینا۔۔۔“ اور سیڑھی سے نیچے اتر گئی۔

رملہ حیران تھی ڈائجسٹ ہمیشہ پہلے ہفتے میں آتے ہیں اور یہ بات سدرہ بھابھی کو بہت اچھی طرح پتا ہے‘ لیکن اس بار پہلی تاریخ آنے سے چند دن پہلے ہی بے تابی۔۔۔ ان کا انتظار اس کا تجسس بڑھا رہا تھا۔

لمبے دنوں کی اترتی شام فرحت کا قدرتی انوکھا احساس رکھتی ہے۔ پرندوں کی واپسی‘ کرنوں کا پلٹنا‘ ہوا کا گزر۔۔۔ وہ پیڈسٹل فین کے پہلو میں کرسی بچھائے تیزی سے صفحات پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ تمام رسالوں کی فہرستیں چاٹ لیں۔ اک موہوم سا خیال تھا‘ کہیں اس بار سدرہ بھابھی نے اپنا قلم نہ آزمایا ہو‘ اس نے کئی بار انہیں مشورہ دیا تھا۔

Downloaded From

READING
Section

"آپ اتنی اچھی باتیں کرتی ہیں، لکھتی کیوں نہیں۔"

"ضروری تھوڑی ہے، جو باتیں کی جائیں، وہ لکھی بھی جائیں۔"

کیا پتا اب احساس ہو گیا ہو، لیکن فہرست میں کوئی ناول تو کیا افسانہ بھی ان کے نام پر نہ تھا۔ تجسس بدمزہ ہوا۔ غالباً" بھیا گھر آتے ہوئے معمول کی طرح تمام رسالے لے آئے تھے۔ اس کے بھی اور ہمسائی سدرہ بھابھی کے بھی۔ بھابھی کا یہ ذاتی کام تھا جو نہایت رازداری سے رملہ ہی نبھا رہی تھی، مگر شام کے اس وقت بھابھی کی امانت ان کے گھر دینے جانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

"نا بابا نا۔" اس نے کان کی لو چھوئی۔ "اگر رات کو چھت پر چارپائیاں بچھانے آئیں تب نہیں تو دوپہر میں دے دوں گی۔" مگر بھابھی کے اصرار کے سبب بڑھتے تجسس نے تمام فہرستیں چھانٹ لیں۔ سارے اندازے غلط نکل ہی رہے تھے کہ اچانک نظر کئی مہینوں سے چھپتے کالم پر رکی جو مقبولیت کی سند پا چکا تھا۔

"ا... رے۔" اس نے تیزی سے مطلوبہ صفحہ نکالا۔

س۔ "شادی کب ہوئی؟"

ج۔ "یکم اپریل کو... قسم سے باجی! بڑی آرزو تھی اس دن کے نکاح کی، جی بھر کے فول بنایا، پل پل انجوائے کیا بس جی، بیان سے عاری ہیں لفظ میرے۔"

"نہیں... بھابھی کی شادی اپریل میں؟ جہاں تک اسے یاد تھا خاصی ٹھنڈک تھی، پر کیا کہتے ہیں بسا اوقات جون کی تیز بارشوں میں بھی چادر لپیٹنے کو جی چاہ جاتا ہے... خیر۔"

"شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟"

"لیں باجی جی... شادی سے پہلے کے مشاغل بھی پوچھنے والی بات ہے، جناب مشاغل ہی مشاغل تھے، چھت پر چڑھ کر ہر آتے جاتے راہ گیر کو وٹے (کنکر) مارتی تھی، یہ مت سمجھیے گا بے چارے بڈھوں کو بھی، جناب دیکھ بھال کر، تاک تاک کر، تو عمر لڑکوں کو... پر کوئی بھی کم بخت قابو نہ آتا، اوپری مخلوق سمجھ کر سر پر پیر رکھ بھاگ جاتے، منحوس! پھر جی میں نے رشتے کے لیے خوب وظیفے، نوافل پڑھنا شروع کیے، کیا کسی نے چلے، مراقبے کاٹے ہوں گے، جو میں نے کاٹے، کوئی بھولے بھٹکے سے رشتہ مانگنے آ ہی جاتا، دم درود پڑھ پڑھ ایسی پھونکیں مارتی بڑے بڑے پیر حیران، بڑی ہی منتوں مرادوں سے خواہش بر آئی تھی، وہ بھی شاید اس لیے کہ ساس صاحبہ ایک آنکھ سے کانی تھیں، دوسری میں نے کرنی تھی۔"

"اللہ!" رملہ نے بمشکل ہنسی روکی۔ "آنٹی اور کانی... اف"

"یعنی دل میں ارادہ باندھا تھا، باجی تبلیغی جماعت والے کہتے ہیں ارادے کا بھی بڑا ثواب ہے، تو جناب جی وہی ہے رب میرا جو ہمارے گمان کو یقین میں بدل سکتا ہے، ہو گئی شادی۔"

جملے کے ہر طرف سے خوشیوں کی چاشنی ٹپکتی تھی۔

س۔ "اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا...؟"

ج۔ "میں اور جھکاؤں سر...!" تعجب ہوا۔ "بزرگوں نے جھکایا... ہزار فیصد میری مرضی شامل تھی، وظیفے، چلے کاٹ کاٹ کمر تختہ ہو گئی تھی، دراصل اک بار بچپن میں کھیلتے کودتے سن لیا تھا، موٹی لڑکیوں کی شادی مشکل سے ہوتی ہے، یقین مانیں، دل جان میں ایسا صدمہ اترا، ہر وقت بی پی لو، بھوک ہی بھوک، پھر تو میں صدمے سے موٹی تو کیا موٹی تر ہوتی گئی قدرے چھوٹی بھی ہو گئی، بالکل ٹینس بال کی طرح، اب ایسے میں کوئی رشتہ آ جائے غنیمت، عجلت اتنی تھی کہ مولوی صاحب کے پوچھنے سے پہلے ہی میرے منہ سے نکل گیا قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے، بعد میں پتا چلا وہ تو اپنے بیٹے مقبول کو پکار رہے تھے۔ "مقبول نکاح کا رجسٹر مدرسے رہ گیا ذرا بھاگ کر لانا... ہاہاہا۔"

س۔ ”منگنی کتنا عرصہ رہی، فون پر بات، ملاقات۔۔۔؟“

ج۔ ”ساس کے ارادے تو سالوں منگنی پر ٹرخانے کے تھے، مگر جناب جی میں نے ایک دن فون کھڑکا دیا۔ اپنے ہونے والے ہیڈ کراؤن (سرتاج) کو، اور ایسے ٹسوے بہائے کہ ہماری اماں دل کی مریضہ ہیں، اپنی آخری سانسوں میں میری خوشی دیکھنا چاہتی ہیں، لو پھر دیکھو، دو ہفتوں کے اندر اندر۔۔۔“

ایسے جیسے چٹکی بجاتے کہا ہو۔

س۔ ”سسرالیوں کے بارے میں تصوّرات کیا تھے۔۔۔؟“

ج۔ ”بڑے ہی خوف ناک تھے، حلقۂ یاراں سے سن رکھا تھا خلائی مخلوق نما ہوتے ہیں سسرالی، ویسے آپس کی بات ہے، کان آگے لائیں۔۔۔ قسم سے ظاہری طور پر سب خلائی مخلوق کو مات دیتے ہی لگے، موٹی تازی ساس اوپر سے کانی، کالے سوکھے لم تڑنگے گنجے سسر، اب ایسے گنجے اور کانی کی اولاد جیسی رلی ملی ہو سکتی تھی، ویسی ہی تھی۔۔۔ خیر، میں نے کسی کی باتوں کو دل پر لے کر اپنی صحت برباد نہیں کی، کیوں کہ اپنی صلاحیتوں پر یقین تھا۔“

لکھائی سے لگتا تھا خوب مسلز کو تھپکا ہو۔

س۔ ”شادی کے لیے آپ کو اپنی تعلیم کی قربانی دینی پڑی یا کوئی اور۔۔۔؟“

ج۔ ”باجی جی! تعلیم سے تو خیر کبھی وزیر تعلیم کو واسطہ نہیں تو قربانی کیسی۔۔۔ ہاں البتہ ایک قربانی دی تھی، دراصل میرے نکاح والے دن میری چھوٹی بہن نے چوری چھپے میرے جہیز کی جوتی نکال کر پہن لی، جب میری نظر پڑی، پیٹ میں بڑے وٹ (بل) پڑے، بس جی میں بڑے سے مجمع میں تھی، ویسے تو خیر میں لوگوں کی پروا کرنے والوں سے نہیں، مگر ماں جائی سمجھ کر معاف کر دیا، لیکن دل میں گالیاں بڑی دیں کہ۔“

(دانت ایسے دبائے جیسے بہن بیچ میں آ گئی ہو۔)

”پاؤں سڑیں کمینی کے، اتنی بو اٹھے سرف، صابن سے دھو دھو مانجھے، ہیل کانپے، موچ آئے، ہنستی دندناتی مٹکتی پھر رہی ہے، گر کر اگلے دانت ٹوٹ جائیں۔۔۔ جب کچھ نہ ہوا تو سلگتے دل کو یہ سوچ کر قرار آ گیا چلو! جوتی کے عوض پورا بندہ مل رہا ہے، گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔“

س۔ ”رخصتی سے پہلے آخری رسم یا رخصتی کے بعد پہلی رسم کیا ہوئی؟“

ج۔ ”ہاں باجی جی، ہمارے ہاں بھی سب کی طرح رخصتی سے پہلے آخری رسم رونے دھونے کی ہوتی ہے، اماں نے بڑا لپٹا لپٹا کر جھوٹے (جھولے) دیے، ایسی خوف ناک آوازیں نکالیں سوئے بچے خود کش بلاسٹ سمجھ کر چلّانے لگے، پر میں نے اماں کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”اماں بس کر اپنا ڈراما کیوں میرے دس ہزار کے میک اپ کے پیچھے پڑی ہے۔۔۔“ اور

جناب رخصتی کے بعد ان کے گھر عجیب رسمیں دیکھیں، سب سے پہلے تو چولوں (چوکھٹ) میں ساس صاحبہ تیل ڈالنے لگیں، بھئی یہ کیا؟ آتے ہی مجھے گرانے کا انتظام، میں نے خاموشی سے گزرتے گزرتے خالہ ساس کو اڑنگی (ٹانگ اڑانا) دی، بڑی اتراتی پھر رہی تھی اونچی ہیل پر، سنبھل نہ پائی، تیل پر پھسل اور دھڑام۔۔۔ انھیں نگاہ قریب کھڑے ہنستے بھانجے پر گئی، غلط فہمی میں اس کے دو جڑ دیے، لو جی! شروع ہو گئی دونوں خالہ ساسوں کی دھینگا مشتی، پھر کیسی رسم، کہاں کی رسم، کون سی رسم، بہت دیر تو انہیں چھڑانے میں لگ گئی، جب ان کے ہیر اسٹائل بدل گئے، تب جا کر کہیں مجھے کمرے میں چھوڑ آنے کا ارادہ کیا، وہاں ایک اور عجیب رسم دیکھی، سوکھے سے کانے جیسی میری نند، جس نے ساڑھی لپیٹ رکھی تھی، یقین مانو گمان ہوتا تھا۔ مردُے کی مرہم پٹی کی ہو، پہلے تو اس نند نے میرے میاں کی ساری جیبیں خالی کروائیں پھر وہ رسم یاد آ گئی، جی جناب! ان کے ہاں دولہا، دلہن کمرے میں قدم رکھنے سے پہلے جو اپنے جوتے سے دوسرے کا پاؤں دبا دے، سمجھو وہ حاوی،

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہے نا مضحکہ خیز؟ اب وہ سوکھی تیلی نند زمین پر بیٹھی اس کوشش میں تھی میری ٹانگ کو جما کر رکھے گی تاکہ بھیا آسانی سے پاؤں رکھ دیں، میں نے بھی پوزیشن تاڑلی، میاں کو دیکھوں گی بعد میں، پہلے اس سے تو نبٹوں، جیسے ہی اس نے سنبھلنے کے لیے زمین کا سہارا لیا، میں نے بھی پاؤں اٹھا، ہیل اس کی انگلیوں پر رکھ دی۔ اوہو، ہو ہو، پھر جو قیامت خیز ہوٹر بجے، آئندہ نہیں کرنے لگی یہ رسم۔"

س۔ "پہلی بات جو شوہر نے کی یا دیکھ کر کیا منہ سے نکلا؟"

ج۔ "در فٹے منہ! ان کے منہ سے کیا نکلنا تھا البتہ میرے منہ سے نکلتے نکلتے بچا، جیسے ہی کلف لگی ہڈیاں چرمراتے قریب بیٹھتے دیکھا، میں نے گھونگٹ الٹ ناک دبائی "زیادہ طرم خانی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے میاں، پہلے یہ کالا سیاہ منہ اور سری (سر) جس پر کڑوا تیل تھوپ رکھا ہے دھولو۔"

"جی کڑوا تیل تو نہیں لگایا... وہ تو اماں نے روغن بادام..."

"ہاں..." میں نے بات کاٹی "تو کڑوے باداموں کا ہی ہوگا نا، بڑی بدبو آرہی ہے۔"

"ہولے تو ریں ریں کر کے تھے پر دھونے کے لیے فورا" اٹھ گئے، میری اگلی ہانک۔ "یہ اپنے گولڈن دانت بھی مانجھ لے نا... اور جو کالے ڈورے ڈالے ہیں نا آنکھوں میں، نکال کر آنا..." انہوں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا پھر سابقہ نرم آواز میں بولے "اجی سرمہ تو نہیں لگایا ہوا۔"

"دکھ رہا ہے مجھے بھی، وہ تو خیر قدرتی سارے چہرے پر انڈیلا ہوا ہے... پر دھو آنا..." اس کے علاوہ تو کوئی مکالمہ نہیں ہوا ہمارے درمیان..."

س۔ "منہ دکھائی میں کیا دیا، پسند آیا؟"

ج۔ "ایک پرانی سی انگوٹھی لائے تھے، ڈرتے ڈرتے سامنے رکھی، میں نے ہی ترس کھا کر احسان عظیم کیا، اپنی انگلی آگے کر دی، لائے ہو تو پہنا بھی دو جب وہ پہنانے لگے میں نے ایسی زور سے ان کی ہتھیلی پر چنڈی وڈی (چٹکی بھری) کہ پھر ساری زندگی شرافت کے لبادے میں ہی رہے وہ۔"

ہر سوال پر رملہ کی آنکھیں ابلتیں، ہونٹ شرقا" پھیلتے رہے اور اچھلتے پیٹ سے **افففف** نکل رہا تھا۔

"سدرہ بھابھی آپ بھی نا۔"

سدرہ رملہ دونوں پڑوسن تھیں، ایک دوسرے کی ہمدرد، خیر خواہ، **سہیلیاں**، اکثر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا۔ جس میں زیادہ تر حصہ رسالے، ان میں چھپنے والے ناول، افسانے یا ان پر بننے والے ڈرامے پھر توجہ ایک خاص کالم نے کھینچ لی۔ وہ بہت بہت دیر افسردگی کے ساتھ اس پر تبادلہ خیال کرتیں، ان بہنوں کے لیے ڈھیر دعائیں، یہاں تک کہ نماز، روزہ کے بعد بھی وہی بہن یاد آجاتی، لقمے اندر جانے مشکل ہو جاتے، آنسو حلق میں پھنسنے لگتے تھے۔ رملہ پر تو کچھ زیادہ ہی اثر ہو گیا تھا۔ کیونکہ کنواری تھی، شادی کے نام سے کانوں کو ہاتھ لگاتی بلکہ کئی رشتوں کو رو دھو کر انکار کر دیا۔ سدرہ اسے اکثر سمجھاتی تھی۔

"بے وقوف! شادی نسل انسانی کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے، شادی تو آسودگی کا نام ہے۔"

"کون سی آسودگی بھابھی... ج۔ رکھاریاں، ق پھالیہ سب کی ایک سی کہانی ذلت، حقارت... اور آپ کی تو آنکھوں دیکھی ہے... بابا میں تو کنواری بھلی ہوں۔"

"کم عقل لڑکی۔" سدرہ نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ "سسرال تو سسرال ہے، نہ ہم اپنے عمل سے اسے میکہ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی ساس نند... یار ہر طرح کے حالات اور رسموں کو انجوائے کرنا چاہیے نا کہ ڈرنا..."

"بھابھی، آپ جانے کیسے مسکرا لیتی ہیں مجھے میں تو حوصلہ نہیں ہے۔"

"دیکھو اگر کہیں لڑکی کو دبا کر رکھا جاتا ہے اور وہ برداشت کر لیتی ہے تو کبھی نا کبھی جیت اس کی ہوتی

ضرور ہے اور سسرال والوں کو بھی بھلے دیر سے ہی سہی، مگر خیال آتا ضرور ہے، بہرحال تم نئی نسل کی لڑکی ہو، تم میں کچھ ہمت، کچھ حوصلہ زیادہ ہونا چاہیے، جہاں تک ٹھیک ہے، وہاں تک بات منوانے کا... اور سب لڑکیاں ر ش، م ح جیسی تھوڑی ہیں، کچھ تیز بھی ہوتی ہیں۔"

غالباً" وہ اس ماہ کا رسالہ پڑھ کر بہت روئی تھی۔ دل بھر بھر آتا، اوپر سے بھابھی کی باتیں...؟

"میں نے تو آج تک نہیں دیکھی سنی تیز لڑکی، جانے آپ نے کہاں دیکھی۔"

"چلو رونا چھوڑو۔" اس نے اس کے آنسو صاف کیے۔ "بہت جلد ملوگی تگڑی، دلیر بہو سے، اسی کالم میں اور جتنا تم اور باقی سب روئے ہوں گے، اس سے زیادہ ہنس کر، کفارہ ہو جائے گا ہر ظلم زیادتی کا..." اور آج اسی غائبانہ دلیر بہو سے شرف ملاقات ہو رہا تھا۔

س۔ "شادی کے بعد کیا تبدیلیاں آئیں... گھر کا کام کتنے عرصے میں سنبھالا؟"

ج۔ "باجی جی! میں اس خردماغ نئی نسل سے بالکل نہیں ہوں، تبدیلی وبدیلی کے نعرے مجھے پسند نہیں، جیسی تھی، ویسی ہوں اور کام... الحمدللہ تیرہ سال ہو گئے، ابھی تک نہیں سنبھالا، آئندہ تیرہ سالوں تک بھی ارادہ نہیں، پھر خیر سے بہو آجائے گی، دراصل شادی کے چند دن بعد ہی میری افریقن گائے جیسی جیٹھانی نے کہا، اب تمہارا ہاتھ کھیر میں ڈلوا دینا چاہیے، میں چپ رہی، اگلے دن ہی وہ موٹی کھیر کا دیگچہ چڑھا مجھے پکارنے لگی کہ گھوٹے میں چلاؤں میں نے بھی اتنی ہوشیاری سے اس کے ہاتھوں سے ڈوئی پکڑی کہ اس کا آدھا ہاتھ ابلتے چاولوں میں گیا، آہاہا، بڑی آئی میرا ہاتھ ڈالنے والی، پھر میری ساس کو ہوش آیا ایک دن کہنے لگیں۔ "آج روٹی تم پکاؤ" میں نے بھی چپ کر کے ایسی شاندار بنائی، واہ بھئی واہ، سسر کی چونکہ دونوں آنکھیں تھیں، اسی لیے کھائی نہیں بلکہ موٹی گائے کو آہستگی سے کہا۔ "بیٹا! مجھے تم اتار دو،" اور ساس کانی... وہ کھا گئی۔ پھر جو ساری رات پیٹ کے درد سے تڑپی، دوبارہ جرات نہیں ہوئی مجھے کوئی کام کہنے کی۔"

س۔ "میکے اور سسرال میں کیا فرق دیکھا، ان کے کھانوں میں فرق محسوس ہوا؟"

ج۔ "بس جی! میکہ م سے اور سسرال س سے اتنا ہی فرق محسوس ہوا، اور رہی کھانوں کے ذائقے کی بات اگر تو کانے جیسی سوکھی تیلی نند گوشت بھی بنائے تو اپنے جیسا سوکھا سڑا ہی بناتی ہے اور اگر جٹھانی — جسے جلنے کڑھنے کی بیماری ہے وہ بنائے تو جلا بھنا، ہاں اگر کانی ساس صاحبہ لگائی بجھائی کی عادت بالائے طاق رکھ کر بنائیں تو میں زہر مار کر ہی لیتی ہوں، آخر کو میرا میاں ہی کولہو کا بیل بنا کما کر لاتا ہے، اتنا تو فرض ہے میرا کہ کھا لوں۔"

س۔ "سسرال میں کن چیزوں پر تعریف ہوئی یا کسی نے مداخلت وغیرہ کی؟"

ج۔ "اے لو باجی! ہمت ہے ان کی مجھ پر تنقید کرنے کی، گدی سے زبان نہیں کھینچ لوں گی۔" (انداز بیاں سے لگتا تھا آستین کہنیوں تک چڑھ گئیں اور پھر ہنسی کا فوارہ...)

"مداخلت کی خوب کہی، میرے میاں کی کوئی دور کی رشتہ دار خاتون اکثر ہی آدھمکتیں، میری ساس کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھانے لگ جاتیں۔ ایک دو دفعہ تو میں نے برداشت کیا، جب باز نہ آئیں تو ادھر وہ آتیں، اور میں ان کے گھر، ان کی بہو کو ٹریننگ دینے لو پھر۔" پھر ہاتھ پر ہاتھ مار تالی۔ "پھر ہمت نہیں کی لگائی بجھائی کی، اپنا گھر ہی سنبھالنا مشکل ہو گیا اسے۔"

س۔ "سسرال والوں سے توقعات پوری ہوئیں؟"

ج۔ "بالکل جی، بالکل پوری ہوئیں، بلکہ ضرورت سے زیادہ ہوئیں، میرے سونے، جاگنے، اٹھنے بیٹھنے کسی معاملے میں کوئی دخل اندازی تو کیا جھانک نہیں سکتا، ایک بار گھر کی واشنگ مشین خراب ہو گئی۔ موٹی... گائے آئی لہراتی "کپڑے دھونے ہیں، مشین نکال لو۔" لو بتاؤ اس کے باپ نے دی تھی جو اسے نکال

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

—— دوں، میں نے مرا سا کہہ دیا ”مرضی ہے نکال لو۔“ پھر دل میں سوچا مشین تو اسٹیل کی ہے، کیوں نہ نیچے سے تار کاٹ کر سرا مشین سے جوڑ دوں، ہمیشہ کے لیے جان چھٹے گی گائے سے، خس کم جہاں پاک، میں کر بھی لیتی ایسا مگر اس منحوس کی قسمت اچھی تھی، ایسی بچ گئی، رات کو ہی آئی۔ میں نے اپنی مشین پھر سے پیک کر، ڈھیر سامان اوپر رکھ دیا اور کہا، چلو بیٹا واپڈا نے مہلت دے دی، اپنی ہی ٹھیک کروا لو پھر ایک بار سوکھے تنکے نما نند لہراتی آئی۔ میرے ماربل کے ڈنر سیٹ کا ڈونگہ نکال جانے لگی، میں نے اٹھایا شیشے کا گلاس اسے پیچھے سے مارنے کے لیے، پھر سوچا سر ہی توڑنا ہے تو اپنا شیشے کا گلاس کیوں ضائع کروں، پھر میں نے اسٹیل کا گلاس اٹھا دے مارا اس کی کمر پر، بچ گئی وہ، مگر مڑ کے پیچھے نہیں دیکھا دوبارہ کسی چیز کو۔“

س۔ ”بچوں کی پیدائش —— کیسا رہا تجربہ؟“

ج۔ ”ہا! آئے کیا یاد کروا دیا“ دل پر ہاتھ پڑا تھا ”قسم سے بڑا ہی کڑا وقت تھا، بڑی چیخم دھاڑ مچائی میں نے، میں اپنی اماں کی طرف تو نہ گئی بلکہ انہیں سارے خاندان سمیت بلا لیا، کیوں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا نا مجھے؟ بھئی جن کی اولاد ہے کریں خرچا بھی۔“

س۔ ”بچے کی پرورش کے سلسلے میں کسی نے مدد کی۔؟“

ج۔ ”بچہ پالنا اور وہ بھی اپنا، خاصا ہی مشکل کام تھا، ایک تو بیٹا اوپر سے ریں ریں بالکل اپنے خاندان کے سڑے مزاج پر گیا تھا، اور کیا مجال کوئی دو منٹ کو پکڑ لے۔ اب وہ سیدھے رستے ماننے والے تو تھے نہیں، پھر میں نے ہی انگلیاں ٹیڑھی کیں بلکہ گندی، یعنی اتنا گند مچایا، جہاں جی چاہا بچے کو دھویا، ادھر پھر پھینک، ادھر نیپیاں رکھ، الٹیاں کروا، ان کی ہر چیز میں گندے ہاتھ ڈال مہینے کے اندر ہی نوز ٹو نوز (ناکوں نک) بھریا، ایک دن ساس نے خود ہی کہا۔“

”بہو رانی! منے کو میں خود سنبھال لوں گی، تم بس اسے دودھ پلا دیا کرو۔“ بتاؤ ہو گئے نا سیدھے۔

س۔ ”آپ نے سسرال کا ماحول بہتر کرنے کی کوشش کی؟ کس حد تک کامیاب رہیں؟“

ج۔ ”میں نے سن رکھا تھا جیٹھانی کے ساتھ بڑے سخت ہیں وہ سب، مگر میری خداداد صلاحیتوں سے مجھے کوئی کوشش کرنی ہی نہ پڑی، بلا مقابلہ کامیاب۔“

س۔ ”سسرال میں آپ کی اہمیت، آپ کا مقام؟“

ج۔ میرے تمام جوابات سے اندازہ تو ہو گیا ہوگا، میری اہمیت اور مقام کا، لیکن پھر بھی بتا دوں، اہمیت کا یہ عالم ہے باجی، میں کمرے سے نکلوں ادھر سب اپنی جان چھپاتے، جسم سنبھالتے جگہ خالی کر دیتے ہیں، خاص کر افریقن گائے، گدے جیسے بدن پر چنڈی (چٹکی) مارنے کا قسم سے مزہ ہی الگ ہے، اور میاں۔ ہاہاہا۔“ (بڑا لمبا قہقہہ تھا۔)

”پچھلے ہفتے کا تازہ واقعہ سن لو، میری ساس کی بھانجی آئی ہوئی تھی اور میاں جی بیٹھ گئے سامنے، کالے کالے ڈیلے گھما اسے گھورنے اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہے تھے، میں نے اچانک انٹری ماری۔ صرف اتنا ہی کہا تھا ”جانتے ہو ناں، تم کون ہو۔؟“

ان کی منمناتی کانپتی آواز برآمد ہوئی ”جی بیگم میں ڈفر نعیم، نہیں ظفر نعیم“ لو بتاؤ بے چارے اپنا نام بھول ظفر سے ڈفر بن گئے میرے پریشر میں۔“

کوئی تک تو نہیں بنتی تھی ا سے نصیحت لینے کی۔ وہ تو خود چلتی پھرتی بہو آرٹ اکیڈمی تھی مگر پھر بھی ادارے نے آخری سوال جانے کیوں پر داغ دیا۔

س۔ ”کوئی پیغام، نصیحت، مشورہ کنواری لڑکیوں کو۔ یا دعا وغیرہ۔؟“

ج۔ ”میں اتنا ہی کہنا چاہوں گی سسرالیوں سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیے، اپنے اندر خود صلاحیت پیدا کریں بہو بننے کی، پہلے دن ہی ایسے تیور دکھائیں، پھر دیکھو۔ کیسے جھلے پاگلوں کی طرح سر گرائے پھرتے ہیں تمہارے آگے پیچھے، اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھ سے رجوع کریں، ایمان سے ایسے گر سکھاؤں گی۔ اوہو ہو۔“ (سر ملنگوں کی طرح دھنا گیا تھا۔) ”اور باجی

جی، دعا تو صرف ایک چھوٹے سے شعر کے ذریعے دے سکتی ہوں، حاضر خدمت ہے۔

"ساس نند چنگی ہوں تو جندی ہوں۔
(اچھی ہوں تو زندہ ہوں)"
نئیں تاں فوٹواں، دیوار اتے ٹنگی ہوں"
(نہیں تو فوٹو، دیوار پر لٹکی ہوں)

اس دعائیہ شعر کے بعد تو رملہ کا ہنسی روکنا دشوار ہوگیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا ان کا یہ کارنامہ "بقول ان کے کالی ساس یا ڈفر نعیم کے سامنے رکھ دوں، اور پھر ان کی ہمت دیکھوں۔ ہا۔ ہا۔ ہا بڑی دھاک بٹھا رہی ہیں قارئین پر۔ خیر۔ اب اس قابل رشک کارنامے کو بھابھی تک پہنچانے کے لیے اسے کل تک کا انتظار کرنا تھا۔ غالباً" آسمان ہاڑ کے بادلوں سے گھر رہا تھا۔

آج چھت پر سونے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

تقریباً" دن کے بارہ بجے تھے۔ وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر پیکٹ تھامے ان کے گھر تک آئی تھی۔ بڑی عجیب بات تھی۔ کل شام سے اب تک بھابھی سدرہ نے ایک بار بھی رسالوں کا نہیں پوچھا تھا۔ شاید گھر پر کوئی آیا ہوا ہو، عموماً" تب ہی بھابھی نظر نہیں آتی تھیں جب ان کے بقول ان کی افریقن گائے یا پھر کالے جیسی نند بمع فیملی تشریف فرما ہوں۔ اسی خیال کے تحت قدرے سنبھلتے ہوئے اس نے دہلیز پر قدم رکھا تھا۔

"یہ ہوتا ہے ملک شیک؟" ساتھ ہی چھناکے کی تیز آواز آئی تھی۔ "تیرہ برس ہوگئے شادی کو، ابھی تک میری پسند کا شیک نہیں بنا سکیں، برف ہی برف بھر کے لے آئیں۔ اونہہ اس سے تو بہتر تھا سادہ دودھ منہ پر مار دیتیں۔"

ڈفر۔ نہیں ظفر بھائی اس وقت گھر پر۔"

اسے اچنبھا ہوا "اوہ" پھر یاد آگیا "آج تو ہڑتال ہے۔ اور اس ڈفر جیسے بھائی کے سامنے بھابھی کو رسالے دینا۔ "اوں ہوں۔" اس نے واپسی کا ارادہ کرتے مڑتے مڑتے اک آخری نگاہ جالی کے پردے سے بھابھی سدرہ پر ڈالی۔ نہایت سنجیدہ، کہیں کہیں خوف کے آثار۔ ان کے پہلو میں ماتھا تیوریوں سے بھرے ان کی ساس جسے کالی ہونے کا خطاب دیا گیا تھا۔ اچھے بھلے دونوں ڈیلے گھما کبھی بہو، کبھی بیٹے کو گھور رہی تھیں۔ بھابھی گلاس کی کرچیاں اٹھانے فرش پر بیٹھی تھیں۔ ان کے لکھے ایک ایک سوال کا جواب رملہ کے دماغ میں دھما چوکڑی مچانے لگا۔

"اتنی بہادری سے لکھ سکتی ہیں، دکھا نہیں سکتیں۔" اس کی ابھرتی سوچ کو بھابھی کی پرانی باتوں نے دبا دیا۔

"رملہ ڈیئر! ہم سب عورتوں کی کہانی ایک جیسی ہی ہوتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں، کوئی ہمیں رلانا چاہے، ہم واقعی رو دیں، جو ہم کر نہیں سکتے، سوچ کر خوش تو ہو سکتے ہیں، اب اتنا تو حق ہے ہی۔" سفید مخروطی انگلیاں کانچ کی کرچیاں سمیٹتی۔ رملہ کے لیے یہ منظر بہت تکلیف دہ تھا۔

"آچ" گہری سسکاری۔ شاید کوئی ٹکڑا نرم جلد میں پیوست ہوا تھا۔ بھابھی کی آنکھوں میں پانی آیا ہی تھا کہ ظفر بھائی تیزی سے اٹھے اور قدرے ڈپٹتے ہوئے گویا ہوئے۔

"اگر غصے میں میرے ہاتھ سے گلاس چھٹ ہی گیا تو کیا ضروری تھا ہاتھ سے اٹھاؤ، جھاڑو نہیں ہے گھر میں۔" وہ ان کی زخمی انگلی تھامے کرچی نکال کر گھائل پور کو اپنی پور سے دبا رہے تھے تاکہ خون رکے۔ ماتھے پر بل ڈال کر ہی سہی مگر عقب سے ساس نے مرہم پکڑا کر احسان عظیم کیا تھا۔

"یہ لگا کر پٹی باندھ لے۔ آج روٹی بازار سے لے آنا۔" اسے بھابھی کا کہا جملہ شدت سے یاد آیا۔

"رملہ! اس رشتے میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے، یہ تو تانے بانے جیسا رشتہ ہے، کھنچاؤ اور ڈھیل کے اصول ہوتے ہیں، اگر کھنچاؤ ہی کھنچاؤ ہو تو کپڑا اکڑ کر پھٹ جاتا ہے، اگر ڈھیل ہی ڈھیل ہو تو جھر جھر کرتا بہت ہی بودا بنتا ہے، بس ڈھیل اور کھنچاؤ ہو، مگر متوازی۔"

ظفر بھائی نے جانے آہستگی سے کیا سرگوشی کی تھی، بھابھی کی آنکھوں میں پانی تھا مگر ہونٹوں پر نرم ریشم سی مسکراہٹ تھی۔

⁂

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سمیرا یونس ہارون

کوئی تعویذ ہو ردِ بلا کا

ناولٹ

کوئی تعویذ ہو رد بلا کا
محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے

اپنی رہائش گاہ سے دس منٹ کی پیدل مسافت پر واقع اس جھیل کنارے سر شام آنا اس کا معمول تھا۔ اور پچھلے نو دنوں سے یہ شعر نوک زبان پر آنا بھی جیسے معمول بن گیا تھا۔ براؤن ریشمی بال، بھوری آنکھیں اور سنہری رنگت والے اس وجیہہ شخص کو پچھلے سترہ روز سے ایثار مصطفیٰ اس جھیل کنارے دیکھتی آرہی تھی، مگر پچھلے نو روز سے اس شخص پہ نگاہ پڑتے ہی بغیر کسی ارادے، بنا کسی شعوری کوشش کے، بے اختیار یہ شعر اس کے ذہن میں کسی بے تاب پنچھی کی طرح پھڑپھڑانے لگتا، تو وہ اپنے اختیار، ارادے اور کوشش سے دل ناداں کو بہلاتی۔

''ایثار مصطفیٰ! حسین صورتیں سب ہی کو دلکش لگتی ہیں، سو اگر تم بھی متاثر ہو گئی ہو تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں کہ اسے محبت کا نام دیا جائے۔''

محبت کا سحر جینا دوبھر کر دے گا، اس اندیشے کے تحت وہ پچھلے نو دن سے اس ''جادو'' کے توڑ کے لیے یہی ایک ''منتر'' پڑھتی آرہی تھی۔ سر جھٹک کے وہ جھیل کنارے اس حصے کی سمت بڑھنے لگی، جہاں رکھے بنچ پہ بیٹھ کر پانی سے الوداعی مصافحہ کرتی۔ سورج کی کرنوں کا نظارہ کرنا اب اس کی پختہ عادت بن گئی تھی۔

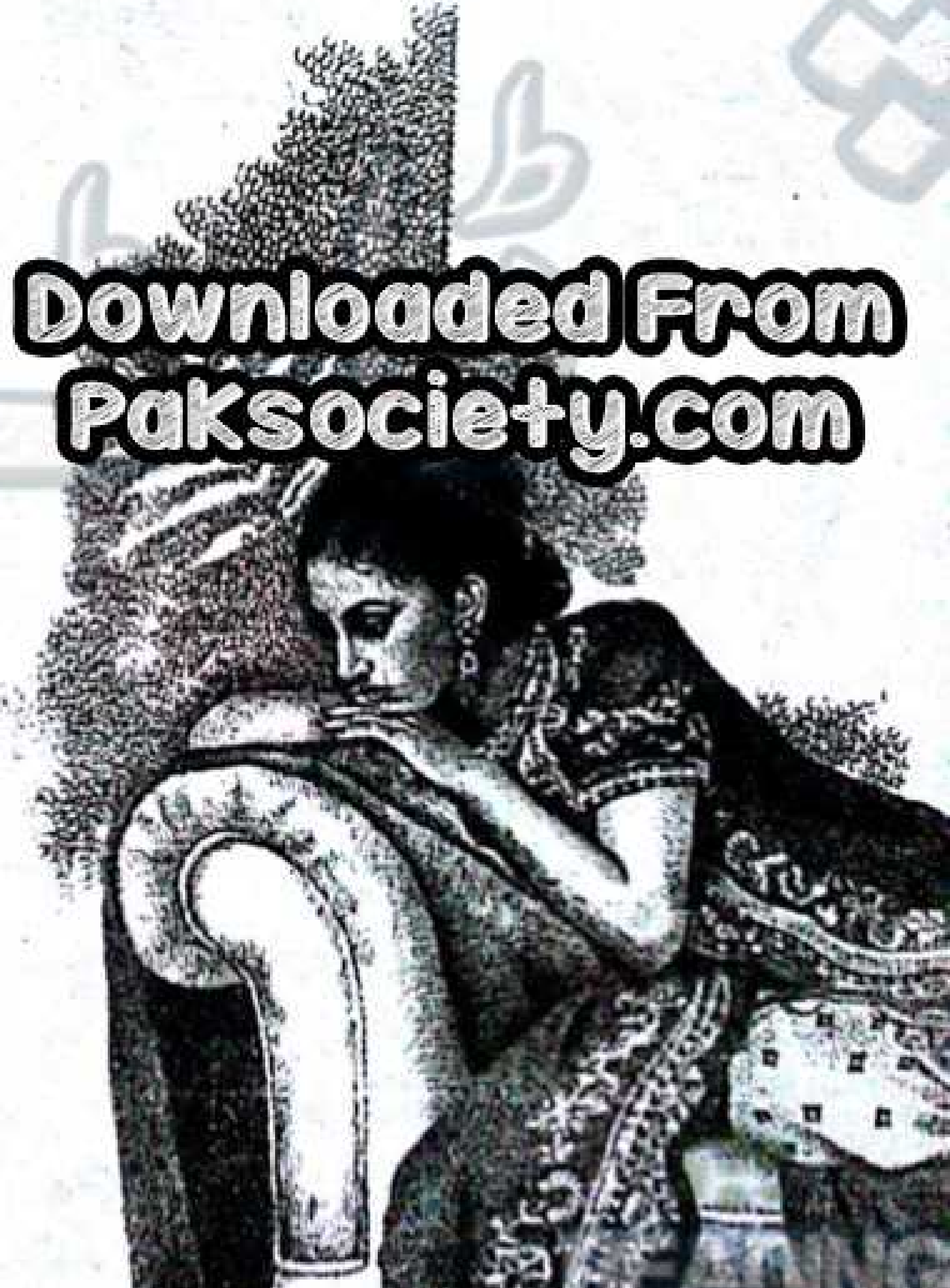
Downloaded From

وہ سر پہ پی کیپ پہنے، دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، اپنی بھوری آنکھیں نیلی جھیل پہ جمائے، اسی جگہ کھڑا تھا، جہاں اس نے اسے اول روز دیکھا تھا۔

پچھلے سترہ روز سے اس دلکش جھیل کی مقناطیسی کشش شاید اسے بھی بے بس کر کے یہاں کھینچ لائی ہے۔ ایثار نے ''پپالو'' کے قریب سے گزرتے ہوئے سوچا اور گہری سانس کھینچ کر اس کے مخصوص پرفیوم کی مہک کو اپنے اندر قید کرنے کی کوشش کی۔ ایک ناکام کوشش۔ بھلا خوشبو بھی کبھی قید ہوئی ہے؟ اپنی مخصوص جگہ پہ پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ پچھلے نو روز سے غیر محسوس طریقے سے عادت کا حصہ

Downloaded From

ہی بنتا جا رہا تھا۔

”مجھے اب اپنی یہ مخصوص جگہ بدل لینی چاہیے اور کسی ایسی جگہ کو چننا چاہیے جہاں سے اس کی صورت واضح نظر آئے۔“ اپنی مخصوص جگہ بیٹھتے ہوئے اس کے دل میں خیال ابھرا۔ اس بات کی طرف اس کا آج بھی دھیان نہیں گیا کہ نو روز سے یہ خیال بھی بلاناغہ ہی ذہن میں وارد ہوتا رہا ہے۔ گزرے نو دنوں سے نجانے کون کون سی حرکتیں اور کون کون سے فقرے بے خبری میں ہی عادت کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔

”ایثار مصطفیٰ! جادو بڑا زور آور ہے۔ اور اس کے کاٹے کے منتر میں دم نہیں۔ سو کچھ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو اس سحر کے اثر کو زائل کر کے کسی بھی ممکنہ خطرے سے بچا لے۔“ اس کے پاس سوچنے کے لیے اتنی باتیں تھیں کہ بعض اوقات کئی اہم باتوں پر دھیان دینے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ سو اس وقت بھی وہ نہ جان پائی کہ اس فقرے کی عمر بھی نو دن ہے۔ مگر اس کے جواب میں آنے والے خیال کا آج پہلا روز تھا۔

”ممکنہ خطرہ۔۔۔؟ بھلا محبت کا جادو چل جانے کی صورت میں ایسا کون سا نقصان ہو گا جو کاٹے کا منتر ضروری ٹھہرا ہے۔“ اس نے دور کھڑے اس شخص پہ نگاہ ڈالی۔ فاصلہ ہونے کے باعث اس کے نقوش واضح نہیں تھے۔ مگر ایثار مصطفیٰ کو اس کی صورت ازبر تھی۔ اس کے خدوخال دنیا کے مغربی حصے میں رہنے والوں سے مماثل تھے۔ وہ غیر ملکی تھا اور شاید غیر مسلم بھی۔ اس کے ظاہری حلیے اور مغربی نقوش سے ہر اجنبی یہی اندازہ لگاتا۔

”اگر یہ غیر ملکی، غیر مسلم بھی ہے تو یہ محبت مجھے خوار کر کے رکھ دے گی۔ لاحاصل محبت جی کا جنجال ہوتی ہے۔ سو لازم یہی ٹھہرا کہ اس ”ممکنہ خطرے“ سے خود کو بچا لیا جائے۔“ جھیل میں کنکر پھینک کر وہ دائرے گننے لگی۔ ایک، دو، تین۔۔۔

”یوں بھی محبت کے معاملے میں میرے نصیب نے کب اتنا ساتھ دیا ہے کہ کسی قسم کی خوش گمانی کی گنجائش بھی نکلتی۔“ اس نے گہری سانس بھر کے سوچا تو چار برسوں کی دوری پر کھڑی مجتبیٰ مسعود کی آواز قریب ہی سے سنائی دی۔ جو اس نے ایثار کے خونی رشتوں کی بے حسی پر گوش گزار کی تھی۔

”ایثار! جن بے حس لوگوں سے تم محبت کرتی ہو، ان سے بدلے میں محبت کی خواہش تمہاری حماقت ہے۔ اسی حماقت کے سبب تم نے اپنی زندگی اجیرن کر لی ہے۔ اب تمہیں خدا کا واسطہ ہے، کسی سے محبت کرنے لگو تو مقابل سے بدلے میں محبت کی خواہش نہ رکھنا، یا پھر محبت ہی کسی ایسے شخص سے کرنا جس کے نزدیک تم پہلے ہی بہت اہم ہو۔“ مجتبیٰ مسعود کی بہت پہلے کہی گئی بات اسے بڑے ہی غلط وقت پر یاد آ کر بے کل کر گئی۔ جو اگر اس وقت یاد نہ آتی تو وہ دل کو بہلانے کے لیے کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ ہی لیتی۔

”اگر میں بدلے میں محبت پانے کی تمنا سے تائب ہو بھی جاؤں تو ایسے کئی اور معاملات بھی ہیں جو جینا دشوار کیے ہوئے ہیں۔“ مجتبیٰ مسعود کی بات کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

”جانتا ہوں بخوبی۔۔۔ تمہارے ساتھ مسئلہ پتا ہے کیا ہے؟“ ایثار مصطفیٰ کو خود اس سے زیادہ جاننے کا دعویدار اب اس کی ذات کے متعلق تجزیہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

”تم اکثر چیزوں کو ”جو ہے“ اور ”جیسا ہے“ کی بنیاد پر قبول کر لینے کے بجائے ”کیوں ہے؟“ اور ”کیسے ہے؟“ کی کھوج میں نکل پڑتی ہو۔ سوچنا اور گہرائی میں اتر کر سوچنا جیسے ”خطرناک عارضے“ میں مبتلا ہو تم۔“ مجتبیٰ نے اسے آگاہ کیا تھا اور ایثار مصطفیٰ کی رگ رگ سے واقفیت کا دعویدار بھلا غلط کیسے ہو سکتا تھا؟

چار برس قبل وہ اگر مجتبیٰ کی تشخیص کردہ ”بیماری“ کی حقیقت کو تسلیم نہیں بھی کر پائی تھی تو اس کے چند روز بعد ہی اسے قبول کرنا پڑا تھا۔ جب کھانے کی میز پر اس کی ممی، بابا کے درمیان ہونے والی جھڑپ نے اسے افسردگی کی انتہاؤں پہ پہنچا دیا تھا۔ یہ جھڑپ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ یہ تو ان کا معمول تھا۔ جسے دونوں

ہی پوری ذمے داری سے نبھاتے بھی تھے۔ نئی بات تو یہ بھی نہیں تھی کہ دونوں ہی غصے کی انتہا میں' جہالت کی پاتال میں اتر کر ایک دوسرے کی کردار کشی میں سبقت لے جانے کی دھن میں بے قابو ہو رہے تھے مگر یہ قصہ ضرور نیا تھا کہ بابا نے ایک دم ضبط کھوتے ہوئے' کھانے کی میز پہ رکھی تیز دھار چھری ممی کی طرف پھینکنی چاہی تھی۔ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو بھی جاتے اگر جو مجتبیٰ سرعت سے اٹھ کر انہیں قابو نہ کرتا۔ اس صورت حال پہ زارا اور ابراہیم نے فقط چند لمحوں کے لیے نگاہ اٹھا کے دیکھا تھا اور دوبارہ پلیٹ پہ جھک گئے۔ ان دونوں کے نزدیک اس سارے ڈرامے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

اس نے نہایت دلگرفتی سے یہ سارا منظر دیکھا' اور پھر اداسیوں میں گھر کے سوچا۔

"یہ روز کا قصہ ہے تو میرا دل اس کا عادی کیوں نہیں ہو پاتا؟ میرا من کیوں برسوں سے اس گھر کے امن کے ناممکن قیام کے لیے ہمکتا ہے؟ جتنی محنت' کوشش یہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کرتے ہیں اگر اس سے نصف جدوجہد خود کو اچھا ثابت کرنے میں کریں تو زندگی نہ اتنی بیزار ہو' نہ اتنی دشوار۔" مایوسی اور قنوطیت کا دورہ آج پھر پڑا تھا۔ مجتبیٰ' بابا کو لے کر ان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں بعد ممی بھی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔ اس نے چمچ پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ دور کھسکائی۔ اور لاتعلقی سے کھانا کھاتے اپنے بھائی ابراہیم اور بہن زارا کو ایک نظر دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

بابا سے خلع کا مطالبہ کر کے ممی اپنے حق مہر کی رقم گنوانا نہیں چاہتی تھیں اور بابا ممی سے انتہائی حد تک بے زار ہونے کے باوجود اگر ممی کے دل میں پلتی خواہش کو پورا کر دیتے تو انہیں حق مہر کے پانچ لاکھ دینے پڑتے۔

کروڑوں کا کاروبار کرنے والے بابا کے لیے پانچ لاکھ کی ادائیگی کیوں مسئلہ بنی ہوئی ہے؟ وہ اس سوال کے متعلق سوچتی تو جواباً "ضد اور انا" کے سوا کوئی تیسرا لفظ اس حوالے سے ذہن میں جگہ نہیں بنا پاتا تھا۔

ضد اور انا کی اس جنگ میں ہارنا کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو ممی گھر چھوڑنے کے بجائے دن میں تین بار تو کم از کم ضرور بابا کو اپنی صورت دکھاتی تھیں۔ کیونکہ بابا نے ان سے کہہ رکھا تھا۔ "مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے' اپنی شکل ذرا کم ہی دکھایا کرو۔" ہر بار سامنا ہونے پر اپنی زبان کی "کرامات" بھی ضرور دکھاتی تھیں۔ وہ بابا کو اتنا زچ کر دینا چاہتی تھیں کہ وہ اپنی شکست تسلیم کر کے ان کا مطالبہ مان کر انہیں فاتح قرار دے دیں۔

لیکن بابا میں شاید برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ وہ ممی کی حرکتوں سے زچ ہو جانے کے بعد بھی نہ ان کا مطالبہ ماننے پر رضامند تھے' نہ اپنی ہار۔

کمرے میں گھٹن کا احساس بڑھ گیا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر کھڑکی کھول دی اور آسمان پہ تیرتے بادلوں سے شیر بھالو اور جولاہا بنانے لگی۔

"یا پھر شاید ممی ہی ہار مان لیں۔ آخر بابا نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جو کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔" بادلوں کا "گھوڑا" چاند پہ سوار ہوا تو چاندنی چند لمحوں کے لیے قید ہوئی۔

"اگر جو حملہ کامیاب ہو جاتا تو.....؟" اس سے آگے کا سوچ کے اس کی سانس بھی رکنے لگی۔ اس نے زور سے سر جھٹکا۔

"یہ بھی مقام شکر ہے کہ آج مجتبیٰ ڈنر کے لیے یہیں رک گیا تھا۔ ورنہ بابا کو بروقت ان کے ارادے سے باز رکھنا کیسے ممکن ہو پاتا؟" بادلوں کا گھوڑا چاند سے اترا تو چاندنی بھی آزاد ہو کر چاروں اور پھیل گئی۔ مگر چند پل کے لیے ہی اس کے پیچھے بادلوں کی پری سواری کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"اور یہ بھی صد شکر کہ پھپھو ان دنوں دادو سے ملنے راولاکوٹ گئی ہوئی تھیں۔ اگر جو یہیں ہوتیں تو مجتبیٰ کی یہاں موجودگی ممکن نہ تھی۔" وہ آفس سے واپسی پر ہمیشہ سب سے پہلے اپنی صورت اپنی ماں کو ہی دکھانے میں آسودگی محسوس کرتا تھا۔

"پری" نے چاند کی سواری چھوڑی تو چاروں اور پھیلی ٹھنڈی چاندنی میں اس نے ابراہیم اور زارا کو پورچ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ خوش باش، شاد مگن سے۔ فردا کی کسی بھی قسم کی فکر سے آزاد.... ہنسی، قہقہے کی مالا جپتے ہوئے۔ "جو ہو گا، دیکھا جائے گا" کا زندہ اشتہار۔

"یہ بھی خوب زندگی جی رہے ہیں۔ کسی بھی پریشان کن بات کو زیادہ اہمیت دیے بغیر۔ مگر میرے لیے ایسی زندگی جینا کیوں دشوار ہے؟" آسمان کی وسعتوں پہ نگاہیں جمائے وہ گویا رب سے استفسار کر رہی تھی۔

"شاید اس لیے کہ میں گہرائی میں اتر کر سوچنے جیسے خطرناک عارضے میں مبتلا ہوں۔" جواب میں بے اختیار ہی اسے مجتبیٰ کی کہی بات یاد آئی تو وہ مسکرا دی۔

"خدا جانے یہ بندہ اس قدر درست اندازے کیسے لگا لیتا ہے؟" اس نے تسلیم کیا۔ اس کی صلاحیت کو بھی اور اپنے عارضے کو بھی۔

"گوتم بدھ کے گیان دھیان میں اگر خلل نہ پڑے تو میں اندر آجاؤں؟" مجتبیٰ نے کمرے میں داخل ہو جانے کے بعد اجازت طلب کی اور مسہری کے سرہانے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر ایک نظر مجتبیٰ کو دیکھا اور مجتبیٰ کی مخالف سمت میں مسہری کے پائنتی بیٹھ گئی۔

"بابا کے انداز سے لگتا ہے کہ اب وہ کسی حتمی فیصلے تک پہنچ کے رہیں گے۔" دل میں پلتے خدشے کو اس نے زبان دی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں....؟" اس نے گہری سانس بھر کر کندھے اچکائے۔

"ویسے ماموں کہہ رہے تھے وہ اب تک یقیناً کسی فیصلے تک پہنچ چکے ہوتے، مگر کوئی وجہ ہے جو انہیں روکے ہوئے ہے۔"

اپنے دونوں بڑے بچوں کو وہ کافی سمجھ دار سمجھتے ہیں۔ جو اپنے والدین کی چپقلش کا کوئی اثر نہیں لیتے۔ مگر ایثار مصطفیٰ کی وجہ سے وہ اپنے ضبط کو بہت آزماتے ہیں۔ وہ اسے کسی صورت دکھی نہیں کرنا چاہتے۔"

مجتبیٰ مسعود نے اس کو کسی قسم کے برے خیال سے بچانے کی کوشش کی تھی.... اس نے بغور ایثار کی صورت دیکھی۔

"اچھا....؟" طنزیہ ہنسی کے ساتھ اس نے سر جھٹکا۔ اس کے والدین اپنی اولاد کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ اس ایک بات پہ اعتبار شاید وہ اس وقت بھی نہ کرے جب اس بات کی سچائی میں کوئی شک نہ ہو۔

"میں چند دنوں میں امی کو لینے راولاکوٹ جا رہا ہوں۔" مجتبیٰ لب بھینچ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم چلو گی...؟"

مجتبیٰ نے استفہامیہ نگاہیں اس پہ جمائیں۔

طبیعت پہ عجب بے زاری سی طاری تھی۔ دل بہلنے پر کسی طور آمادہ ہی نہیں تھا۔ سو اس نے انکار کرنا چاہا۔

"میری بات مانو! چلی چلو۔" اس نے ایثار کا ارادہ بھانپتے ہوئے مشورہ دیا۔ "بے کار فکروں سے دور رہو گی تو وہاں تمہارے دن یہاں سے بہتر گزریں گے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں پر سکون رہا کرتی تھی۔ ٹینشن زدہ ماحول سے دور رہنے کی وجہ سے بھی اور دادو کی پر شفقت اور مہربان وجود کے زیر سایہ ہونے کے سبب بھی۔ مگر پھر بھی دل یوں لمحوں میں رضامند ہو جانے پر متامل تھا۔ سو وہ اتنی جلدی ہامی کیسے بھرتی؟

"او گوتم بدھ!" وہ زچ ہوا اس کے اتنا سوچنے پر۔ "میں تمہیں یونہی تو گوتم بدھ نہیں کہتا۔ اتنا غور و فکر تو کوئی ماں اپنی بیٹی کا رشتہ آنے پر بھی نہیں کرتی ہو گی۔" اس کے چڑنے پہ وہ ہنس دی۔

"جب کوئی فیصلہ کر لو، تو مجھے آگاہ کر دینا.... میں چلا۔" وہ چڑا ہوا تھا۔ اور پھر دادو کی شفیق بانہوں میں سماتے اور پھپھو سے پر خلوص پیار وصول کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

بابا اس فیملی کا حصہ ہوتے ہوئے ان سے مختلف کیوں ہیں؟ بقول دادو کہ دادا بھی محبتوں کے معاملے میں دوسروں کو مقروض کر دیا کرتے تھے۔ تو پھر بابا کیوں حقدار کو بھی محبت خیرات کی طرح دیتے ہیں؟ ان

سوالات کے جوابات اسے نہ پہلے کبھی مل سکے تھے نہ اس وقت۔ مگر اس کے باوجود اس نے اتنا ضرور محسوس کیا تھا کہ اس کے لیے راولا کوٹ کی "فضا" میں افسردگی اور پریشانی کا تناسب کراچی کے مقابلے میں کافی کم تھا۔

"سنو! تم نانی امی کے پاس مستقل رہنے کا فیصلہ کر لو۔ شاد رہو گی۔" یہ بات اگلی شام وہ جھیل کنارے اس کے ساتھ چہل قدمی کرتے اسے ترو تازہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"انٹر تمہارا تمام ہوا۔ اب گریجویشن یہیں کسی اچھے سے کالج سے کر لینا۔" وہ کس طرح خوش رہ سکتی ہے؟ اس بات کے متعلق سوچنا اور کوشش کرنا، مجتبیٰ کی آرزو بنتی جا رہی تھی۔

"مجتبیٰ! بوٹنگ کریں؟" اس کا مشورہ مناسب لگنے کے باوجود، وہ اپنی عادت کے مطابق فوری فیصلہ نہیں کر پائی، سو بات بدل کر اس نے مجتبیٰ کا دھیان بھی اس طرف سے ہٹانا چاہا۔

مجتبیٰ اس کی اس کوشش پہ ہنس دیا۔

"اور اگر تم میرا مشورہ مان لو گی تو میرا وجدان کہتا ہے کہ تم نانا ابو کی طرح روز اس خوب صورت جھیل کو خراج تحسین پیش کرنے بھی ضرور آؤ گی کہ اس کی دلکشی تمہاری کلفت دور کرنے کا سبب ہے۔"

اس کے دادا عمر کے اس حصے میں جب ناتوانی جسم کا اضافی عضو بن جاتی ہے، اپنے سارے کاروبار کی ذمے داری بیٹے مصطفیٰ شاہد کو سونپ کر فارغ ہوئے تو قنوطیت نے کسی ان چاہے وجود کی طرح ان کے اندر گویا ڈیرا ہی جما لیا۔

اپنے ڈاکٹر دوست کے مشورے پر وہ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے جب راولا کوٹ پہنچے تو بخوسہ جھیل نے انہیں اپنے سحر میں جکڑ کر گویا عمر قید کی سزا سنا دی۔ پھر وہ کبھی لوٹ کر کراچی نہ جا سکے۔ جھیل کے قریب خوب صورت گھر کی تعمیر اور بلا ناغہ جھیل کی سیر قنوطیت کا بہترین علاج ثابت ہوئی تھی۔ یہاں کے شدید موسم نے قوت برداشت بڑھائی تو برفباری اور

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

سوہنی ہیئر آئل

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت۔ 150/ روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف۔ 150/ روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- 350/ روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- 500/ روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- 1000/ روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

جمی ہوئی جھیل کا نظارہ بھی دشوار نہ رہا۔

عمر قید کی یہ خوب صورت سزا انھوں نے زندگی کی آخری سانس تک بخوشی کاٹی اور اگلے جہاں کا رخت سفر باندھا تو داود کو لگا کہ وہ بھی اب راولا کوٹ کی ہی عادی ہو گئی ہیں اور اسی لیے شاید نجیبی کو یقین ہو چلا تھا کہ ایثار بھی یہاں خوش رہے گی۔ اس نے نجیبی کا مشورہ مان لیا تھا اور آج چار برس بیت جانے کے بعد نجیبی کی پیش گوئی بھی سچ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ مطمئن رہنے لگی تھی۔

اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ دوڑائی۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آس پاس موجود سیاحوں کی تعداد بتدریج کم ہو رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے "اپالو" کی جانب دیکھا اور واپسی کی راہ پہ قدم بڑھائے۔ وہ ماتھے پہ ٹکے گاگلز، شرٹ کے گریبان میں اٹکا کر ہاتھوں سے بال سنوار رہا تھا۔

اک چہرہ میری نگاہ میں ہے
کوئی یوسف ہے اور چاہ میں ہے

دل پھر بے ایمانی پہ اتر آیا تھا۔ اس نے سر جھٹکا، نگاہوں کا رخ بدلا اور اپنی راہ چل دی۔

"محبت میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔" دل کا دھیان پھر محبت میں اٹک گیا۔

"اف! تم خاموش کیوں نہیں ہو جاتے۔۔۔؟" اس نے نگاہیں نیچے رکھے دل کو ڈپٹا۔

اپنی راہ پہ چلتے ہوئے وہ اس کے قریب سے گزری تھی۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ "اپالو" نے بھی واپسی کی راہ لی ہے اور اس کے پیچھے قدم بڑھائے ہیں۔ پیور بلیک کی مہک اس کے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کی بغلی راہ سے ہوتے ہوئے، سرسبز پہاڑ سے گزر کر اور سڑک تک پہنچتے تک، وہ کسی کے قدموں کی چاپ اپنے عقب میں سنتی آئی۔ دفعتاً" ایک آواز نے متوجہ کیا۔

"ایکسکیوز می میم!" وہ بے اختیار پلٹی۔

"اس نے مجھے مخاطب کیا ہے؟" وہ بے یقین تھی۔ مگر اسے اس بات کا یقین تھا کہ یہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا فرد موجود نہیں، سوائے یہ بھی یقین کرنا پڑا کہ وہ اسی سے مخاطب ہے۔

"وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ!" اسے معروف گائیکہ فریدہ خانم کی گمکی کی طرح یاد آئیں۔

"یہاں قریب ہی کہیں مسٹر جوزف کا گھر ہے۔ مگر میں راہ بھول گیا ہوں۔ آپ اگر رہنمائی فرما دیں تو عنایت ہو گی۔" شستہ اردو، نرم لہجہ اور رہنمائی کی بات۔ اس کے حیران ہونے کے لیے کوئی ایک بات تو تھی نہیں، سو وہ جی بھر کے حیران ہوئی۔

"پچھلے سترہ روز سے کسی معمول کی طرح مخصوص راہ پہ آنے جانے والا شخص واپسی کی راہ کیسے بھول سکتا ہے؟" وہ متحیر تھی۔ "اور راستہ اگر پیچیدہ ہو تب بھی یقین کی کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ سڑک کی سیدھ میں چلتے ہوئے، بائیں سمت پہلا موڑ مڑتے ہی دور سے دکھائی دینے والا خوب صورت کاٹیج۔ نہ اتنی دور تھا، نہ ہی آڑی ٹیڑھی گلیوں میں آباد کہ راستہ بھٹکنے کا اندیشہ ہو۔" اس کے چہرے پہ حیرت کا تاثر باقی کسی بھی تاثر سے گہرا تھا۔

"بہت ممکن ہے کہ یہ شخص بھی آج محبت کے توڑ کا منتر پڑھ پڑھ کے بیزار ہو گیا ہو اور آج بے بس ہو کر مجھ سے گفتگو کی چاہ میں یہ بہانہ بنا بیٹھا ہو۔" یہ دل اور اس کی خوش فہمیاں۔ اسے اپنے دل میں وارد ہونے والے اس اچانک خیال پہ ہنسی آ گئی۔

"کہاں تو محبت کے جذبے سے مغلوب نہ ہو جانے کے لیے "وظیفہ" پڑھا جا رہا تھا، اور کہاں سیدھی سادی مدد کی درخواست کو بھی محبت کے معنوں میں ڈھالا جا رہا ہے۔ تم بھی نا ایثار۔۔۔! کبھی کبھی کمال کر جاتی ہو۔" اس نے اپنا ہی مذاق اڑایا۔

"میں دراصل پچھلے کئی روز سے ریسٹ ہاؤس میں رہائش پذیر تھا۔ کل شب میرے نانا مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ اب پہلی دفعہ میں ہی راستہ ذہن نشین کر لینا میرے لیے کافی دشوار ہے۔ کیونکہ میں اس معاملے میں کافی کند ذہن واقع ہوا ہوں۔ پلیز آپ مدد

کردیں۔" اس نے ایمار کے تاثرات سے خدا جانے کیا اندازہ لگایا تھا جواب سر کھجاتے ہوئے کسی قدر شرمندگی سے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

مسٹر جوزف نہ سماجی کارکن تھے' نہ ٹی وی پہ آنے والی کوئی معروف شخصیت جو وہ بنا اپنے ذہن پہ زور دیے محض نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ جاتی۔ مگر وہ فقط نام جان کر ہی شخصیت تک پہنچ گئی تھی۔ کیونکہ بقول دادو' دادا کی ان سے اچھی صاحب سلامت تھی۔ جس کے سبب دادو کی شناسائی بھی ہو گئی۔ جو اب دادا کی وفات کے بعد دور کی سلام دعا تک رہ گئی تھی۔ اس نے گردن ہلا کے رخ موڑا اور راستہ بتانے کا قصد کیا۔

"میں ڈیلس سے آیا ہوں۔ اور یہاں کشمیریوں کا مہمان ہوں۔ مہمان ہونے کی حیثیت سے میں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں؟" اس نے ایمار کا ارادہ بھانپتے ہوئے عاجزانہ کہا۔

ایمار کے کچھ کہتے لب باہم پیوست ہوئے اور سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔

"آپ اگر راستہ بتانے کے بجائے میرے گھر تک کمپنی ہی دے دیں تو؟" اس نے سر کھجایا۔ جھجک کر کی گئی فرمائش شاید وہ اسی طرح سر کھجا کر ہی بیان کرتا تھا۔ ایمار نے گہری سانس فضا کے سپرد کی اور آگے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"بہت شکریہ!" مسکرا کر اس نے ایمار کے پیچھے قدم بڑھائے۔

"میں اتنی اچھی تو نہیں کہ کسی بھی اجنبی کی ایسی فرمائش بغیر کسی عذر کے مان جاؤں۔" اپنے ہم قدم ہوئے شخص کو اس نے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"بہت بہتر ہوتا اگر جو میں کوئی بھی وجہ بیان کر کے سہولت سے انکار کر دیتی۔" وہ خاموشی سے نگاہیں جھکائے راستہ طے کرنے لگی۔

"میرا نام ڈیوڈ ہے۔ امریکہ سے تعلق ہے میرا۔۔۔ یہاں اپنے نانا سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا اور نگاہوں میں "اور آپ کا" سوال سموئے اس کی سمت دیکھا۔

ایمار نے اس کی مسکراہٹ کا جواب لبوں پہ مسکان سجا کے ضرور دیا مگر اس کی آنکھوں میں مچلتے تعارف کے سوال کو بہت خوبی سے نظر انداز کر کے نگاہوں کا رخ بدلا۔

"محض تعارف ہی تو چاہ رہا ہے' سو کیا قباحت ہے جو تم اپنا تعارف نہیں کروا رہیں؟" ڈیوڈ کی ہمراہی میں مسرور دل' دماغ کے اس فیصلے پہ تلملایا۔

"اس شخص سے روابط کہیں جان کا عذاب نہ بن جائیں۔" اس نے ضدی دل کو سمجھانے کی بے کار سی سعی کی۔ مگر وہ سمجھنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ ہنوز مچلنے لگا۔

"دل کی ایک مانو تو وہ اپنی منواتا چلا جاتا ہے۔" اس کے قدم سست پڑنے لگے۔ اس کے برابر چلتا شخص جو اس کی خاموشی اور سنجیدگی کے باعث اب خود بھی خاموش تھا' ایمار کے سست پڑتے قدموں کے باعث اس سے دو قدم آگے بڑھ گیا اور اس سے اگلے قدم پر ہی وہ موڑ تھا جس کے مڑتے ہی جوزف انکل کا خوب صورت کاٹیج نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ ڈیوڈ' ایمار سے قبل ہی وہ موڑ مڑ گیا اور اچانک ہی چونک کے پلٹا۔

ایمار متحیر سی موڑ پہ ہی رک گئی۔ اس نے ایمار کی متحیر صورت دیکھی اور لب بھینچے۔

"تو کیا یہ شخص راستہ نہیں بھولا تھا۔۔۔؟ تو کیا یہ شخص میرے اندازے کے مطابق واقعی آج جادو کے توڑ میں ناکام ہونے کے بعد یہ حرکت کر بیٹھا ہے؟ کیا واقعی۔" پیشتر اس کے کہ دل خوش گمانیوں کے محل تعمیر کرتا وہ بول اٹھا۔

"یہ سچ ہے کہ میں راستہ بھول گیا تھا۔ مگر اس موڑ کو دیکھ کر میری میموری' ری فریش ہو گئی سو۔۔۔" اس نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔

"میرے خدا! حد ہوتی ہے خوش فہمی کی بھی۔" اس کا اپنا دل اس کے کہنے میں بالکل نہیں تھا۔ سو وہ جھنجلائی۔ "بھلا ایک امریکی مغربی معاشرے کا پروردہ' ایک لڑکی سے بات کرنے کے لیے ڈرامے کیوں

کرے گا؟ کبھی تو عقل کو بھی کام میں لے آیا کرو ایثار ڈیئر! پڑے پڑے موٹی بھی ہو گئی ہے اور زنگ آلود بھی۔" اس نے خود اپنے آپ کو ہی لتاڑا۔ اور تیزی سے واپسی کی راہ لی۔

وہ دل کو مزید بے وقوفیاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ سو اپنے پیچھے "رکیے' سنیے" کی آواز بھی ان سنی کر گئی۔

* * *

اس کے اندر کوئی خوف تھا جو روز کے معمول میں مخل ہوا۔ اور چار برسوں سے جھیل کنارے کی سیر پچھلے دو روز سے متاثر ہوئی۔ مگر دل کی من مانیاں سو تیسرے روز ہی اس کے قدم پھر جھیل کی سمت بڑھنے لگے۔

وہ اسے دور سے دیکھ کر ہی مسکرایا تھا۔ ایثار اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی مخصوص جگہ کی سمت بڑھنے لگی تو وہ دائیں جانب سے اس کے ہم قدم ہوا۔

"ہیلو!" اس نے دوستانہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائی۔
جواباً" ایثار نے فقط مسکرانے پہ اکتفا کیا۔

"آپ دو دن سے نظر نہیں آئیں... ؟ خیریت رہی ؟"

اس نے میری عدم موجودگی محسوس کی۔ دل خوشگوار انداز میں دھڑکا۔

ہاں کی... مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم اس کے اس عمل کو کوئی الٹے سیدھے معنی پہناؤ۔ اس کی اب اپنے دل سے ذرا کم ہی بنتی تھی سو اس نے اپنی نظروں کا رخ بائیں جانب موڑا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

"اس روز میری راہ بھول جانے کی بات کو آپ جھوٹ جان کر شاید برا مان گئی تھیں۔ حالانکہ وہ جھوٹ بالکل نہیں تھا۔ مگر پھر بھی معذرت۔" وہ شرمندہ تھا۔ ایثار نے اس کی سمت دیکھا اور گویا ہوئی۔

"میں نے آپ کی بات کو سچ ہی مانا' سو برا لگنے کا کیا سوال!"

"اوہ خدا! تیرا شکر ہے۔" اس نے ایثار کی بات کے جواب میں بے اختیار شکر ادا کیا۔ "آپ کچھ بولیں تو... ورنہ پچھلے تین روز سے میں اس ایک بات پہ اللہ کی بہت ناشکری کر چکا ہوں کہ اتنی حسین صورت اور قوت گویائی سے محروم۔" وہ مسکراتے ہوئے کسی قدر شرارت سے گویا ہوا۔

"حسین صورت... ؟" اس کی نظروں میں اپنا سانولا' عام سے نقوش والا چہرہ آیا۔ "کمال ہے یہ شخص بھی۔" وہ سر جھٹک کے مسکرا دی۔ ڈیوڈ نے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور حوصلہ پاکے گویا ہوا۔

"آپ کا نام جان سکتا ہوں... ؟" وہی جھجک کر اور سر کھجا کر کی گئی فرمائش... جسے وہ دو روز قبل نظر انداز کر گئی تھی۔

"ایثار۔" وہ دھیمے سے گویا ہوئی۔

"ایثار... گڈ یعنی قربانی؟" اس نے نام کا مفہوم بتا کر اس سے تائید چاہی تو ایثار حیران رہ گئی۔

کسی اردو بولنے والے کی انگریزی بہت اچھی ہو تو یہ بات کوئی ایسے اچنبھے کی نہیں۔ کوئی انگریز اگر اردو بولے تو یہ بھی کوئی ایسی حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن اگر اردو بولنے والا انگریز شخص اپنا لب و لہجہ بھی اردو بنا لے اور مشکل الفاظ کے معنی بھی باآسانی بتا دے تو سننے والا کسی قدر حیران ضرور ہوتا ہے۔ سو اسے بھی حیرانی ہوئی۔

"حیران نہ ہوں۔" وہ اس کی حیران صورت سے حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"سات سے سولہ سال تک کی عمر کا عرصہ میرا کراچی میں بیتا ہے۔ اردو سے واقفیت ہوئی تو مجھے یہ زبان اتنی اچھی لگی کہ ڈیلس چلے جانے کے بعد بھی اس زبان کو مزید سیکھنے کی کوشش جاری رکھی' سو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ سے زیادہ اچھی اردو جانتا ہوں۔" اس نے اترانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس بینچ کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں سیاحوں کی تعداد نسبتاً" کم ہونے کے باعث ایثار کی نشست

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

خاص تھی۔

"نو برس کا عرصہ کراچی میں گزارنے کے باعث میں یہاں کے رسم و رواج، لوگوں کے رہن سہن، مذہب اسلام اور عورتوں کے مقام و مرتبے سے بھی کسی حد تک آگاہ ہوں۔" وہ ایثار کے ساتھ بینچ پہ کافی فاصلہ چھوڑ کے بیٹھا اور اپنی بات کو ثابت کردیا۔ ایثار مسکرائی۔

"آپ کی مسکراہٹ بہت دلکش ہے۔" ایثار کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے اس کے دل میں جو خیال ابھرا، اس کا برملا اظہار بھی کردیا۔

بے اختیار ہی ایثار نے لب بھینچ لیے۔

اس مغربی معاشرے کے پروردہ شخص کے لیے یہاں کے اقدار و روایات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس کے مطابق چلنا مشکل نہیں بھی تھا تو اسے یاد رکھنا دشوار ضرور تھا۔

"اوہ گاڈ!" ایثار کے لب بھینچ لینے پر اسے اپنی غلطی کا احساس "فوراً" ہی ہوگیا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کے گویا اپنی کمزور یادداشت کا ماتم کیا۔

"یا اللہ! یہ شخص اور اس کے انداز!" اس نے اپنے بچاؤ کے لیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

"ہمارے یہاں لڑکیاں کسی غیر مرد کے یوں سراہنے پر برا مانتی ہیں۔"

"میرے علم میں تھا، مگر میں بھول گیا۔" وہ شرمندہ تھا۔ "سوری!" اس نے اپنے کان پکڑ کر اپنی براؤن آنکھیں اس پہ جمادیں تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔

یارب! یہ میرے لیے کوئی راہ فرار چھوڑے گا بھی یا یونہی چاروں جانب سے گھیرا تنگ کرتا جائے گا؟ وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی اور واپسی کے لیے بہانہ تلاش کرنے لگی۔

"میری نماز کا وقت ہورہا ہے۔" اس نے کلائی موڑ کے وقت دیکھا۔

"چلوں گی اب۔" اس کی سمت دیکھے بغیر وہ تیزی سے چلتی چلی گئی۔

یہ شخص کسی بھوت کی طرح میرے ذہن سے کیوں چمٹ گیا ہے؟ اس نے بے بسی سے سوچا۔

ایسا کیا کروں کہ اس کا خیال دل و دماغ سے نکل جائے۔ گھر کی سمت بڑھتے ہوئے وہ لاچاری سے سوچے گئی۔

چند روز یہاں کا رخ نہ کرو، وہ مہمان ہی ہے۔ چلا جائے گا۔ دماغ نے راہ سجھائی۔

بہت خوب! ایسا کرنے سے میں تمہیں چین لینے دوں گا کیا؟ دل آج کل اس کا دشمن بنا ہوا تھا۔

کوئی بات نہیں۔ میں بے چینی سے رہ لوں گی۔ اس نے بے چارگی سے دل کو جواب دیا۔

اس سے کیا ہوگا؟ دل و دماغ سے اس کا قبضہ ہٹانے کے لیے یہ طریقہ علاج کامیاب نہیں ہوگا۔

"کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" وہ دل پہ غلبہ پانے کے چکر میں تھی۔

"یہ کوشش بھی تم دو روز قبل کر کے دیکھ چکی ہو۔" دل مغلوب ہونے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ ان ہی سوچوں میں الجھتے، وہ مخصوص راہ پہ چلتی چلی گئی۔ دھیان ارد گرد کے بجائے کہیں اور ہی تھا۔

"شکر ہے، تمہیں گھر کا راستہ مل گیا۔ میں بس ابھی آدھے گھنٹے میں نکلنے ہی والا تھا۔" لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پہ بیٹھے مجتبیٰ نے اسے دیکھ کر شکر کا کلمہ پڑھا۔ مجتبیٰ کی آواز پہ اس نے بڑی دقتوں سے منتشر دھیان کو سمیٹا اور مسکرائی۔

"کب آئے؟" وہ مجتبیٰ کے مقابل صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔" مجتبیٰ نے اس کے کھوئے کھوئے انداز کا نوٹس لیا۔

بابا کے کاروبار میں مجتبیٰ کا باپ برابر کا حصے دار تھا۔ دو برس قبل اسلام آباد میں ان کی کمپنی کی برانچ کھولی گئی تھی۔ تب سے وہ جب بھی کاروبار کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تو کئی گھنٹوں کا سفر طے کر کے راولا کوٹ بھی ضرور آتا۔ اکثر وہ اتنی عجلت میں ہوتا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہی واپس جانے کے لیے تیار ہوتا۔

"کراچی میں سب ٹھیک ہیں...؟" ہمیشہ کی طرح

آج بھی مجتبیٰ سے ملاقات کے بعد اس کا پہلا سوال یہی تھا۔

"ہاں۔"

"اور ممی' بابا....؟" مجتبیٰ اس کے آدھے سوال سے پورے سوال تک پہنچا۔ اگرچہ وہ مجتبیٰ کا جواب جانتی تھی مگر اس سوال سے وابستہ امید سے وہ کبھی جھگڑا نہیں کرتی تھی۔

"ان کے تعلقات ہنوز پاک' بھارت تعلقات جیسے ہیں۔ بہتری کے آثار دور تک دکھائی نہیں دیتے۔" مجتبیٰ یہ جاننے کے باوجود کہ ایسے حقائق اس کی افسردگی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں' اس سے کوئی بھی بات چھپا نہیں پاتا تھا۔

وہ چپ سی ہو گئی۔

"زارا نے اپنے انٹیریئر ڈیزائننگ شوروم کھولنے کے ارادے پر اپنے کسی دوست کے ساتھ مل کر عمل کر ڈالا ہے۔ پچھلے ہفتے اس کی افتتاحی تقریب تھی۔" مجتبیٰ نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے نسبتاً" اچھی خبر سنائی۔

"یعنی اس بار اچھی خبر بھی لائے ہو ساتھ۔" وہ مسکرائی۔ "کوئی اچھی خبر ابراہیم سے متعلق بھی سنا دو۔"

"ابراہیم سے متعلق....؟" وہ ہنسا۔

"ابراہیم بھی کمال شخص ہے.... کل اپنے فرینڈ کے ساتھ اس کی بائیک پہ سوار جسٹ فار انجوائے منٹ ایک شخص کا موبائل چھینا اور نیٹی جیٹی سے گزرتے ہوئے سمندر میں پھینک دیا۔" وہ اس پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ کوئی اہم بات نہیں' لاپروا سا لہجہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ مگر وہ اپنی ایسی کوشش میں ذرا کم ہی کامیاب ہو پاتا تھا' سو اس وقت بھی ناکام ہوا۔

"میرے خدا!" ابراہیم کی ایسی حرکتیں اسے رنج پہنچاتی تھیں۔ مجتبیٰ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"اچھا' تم اپنے بھائی کے لیے پریشان ہو۔ میں سمجھا اس شخص کے لیے ہو جس کا موبائل چھنا۔" اس نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

"بائے دی وے! اس سارے قصے میں تمہارے بھائی کے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوا جس پر افسردہ ہوا جائے۔" ہنوز طنزیہ لہجہ۔ اس نے ناراض نظروں سے مجتبیٰ کی سمت دیکھا۔

"ایسی حرکتوں کے باعث وہ پکڑا بھی جا سکتا ہے۔" اس نے فکرمندی کی وجہ بتائی۔

"پکڑا جائے گا تو بالکل صحیح پکڑا جائے گا۔ مگر اس بے چارے کا کیا ہو گا جو مفت میں' بلاوجہ ہی لٹتا۔" وہ آج اسے تسلی دینے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

"مادی چیزوں کی بھلا کیا اہمیت مجتبیٰ! اصل چیز تو رشتے ہیں۔" ابراہیم کی ایسی حرکتوں سے نفرت کرنے کے باوجود وہ اس کی وکالت کیے گئی۔

"تمہارے لیے ایسا کچھ کہنا اس لیے دشوار نہیں ایثار! کہ تم نے پیدا ہوتے ہی دولت کی فراوانی دیکھی ہے۔ یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بہت کوشش اور محنت کے بعد پیسے کی صورت دیکھتے ہیں۔ سو اسے اہمیت بھی دیتے ہیں۔" بولتے بولتے وہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے خاموش ہوا۔ اسے اندازہ ہوا' وہ اس کی بے کلی میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ سو اسے موضوع بدلنا پڑا۔

"ماموں نے تمہارے لیے یہ کتابیں بھجوائی ہیں۔" اس نے ایک طرف رکھی میز سے چند کتابیں اٹھا کر اس کی طرف بڑھائیں۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود کہ بابا اس پر ایسی کوئی عنایت نہیں کر سکتے۔ اس نے مجتبیٰ کی بات کو سچ مان لینے کا بھرپور تاثر دیا تھا۔

اگر کوئی شخص محض آپ کی خوشی کے لیے آپ سے جھوٹ بولے' تو پھر آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اس شخص کی خوشی کے لیے حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود اس پر یہ ظاہر کریں کہ اس کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر مجتبیٰ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے دل کی بات تک پہنچتا تھا' سو ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

"کراچی کی خبریں تم نے سن لیں' اب تم مجھے یہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

کی خبریں سناؤ۔" اس کے ذہن میں ایثار کا کھویا کھویا، الجھا الجھا سا انداز پھر نمودار ہوا۔

"یہاں کی خبروں میں کچھ بھی ایسا خاص نہیں جو گوش گزار کیا جائے۔"

"لیکن آج یقیناً" کچھ ایسا خاص ہوا ہے، جس نے تمہارے ذہن پر اپنا تسلط جمایا ہوا ہے۔" مجتبیٰ کے یقین سے کہنے پر اس کا دل یک بارگی دھڑکا۔

اس کا حقیقت چھپانا دشوار تھا، اور سچائی بتادینا اس سے زیادہ دشوار۔

"نہیں.... آج بھی کچھ خاص نہیں ہوا۔" اس ایک لمحے میں اس پر منکشف ہوا کہ وہ یہ حقیقت اسے کبھی نہ بتا پائے گی۔ سو نگاہیں چرانے لگی۔

مجتبیٰ نے شدت سے اس کے بدلے ہوئے رویے کو محسوس کیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ایثار کوئی بات اس سے پوشیدہ رکھنا چاہ رہی تھی۔

"اوکے! شاید میرا وہم ہی ہو۔" وہ ایثار پہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ اسے اس کے جھوٹ پہ اعتبار نہیں۔ سو مسکرا کر اس کے جھوٹ کو قبول کرلیا۔

* * *

"میں جب سات برس کا تھا تب میری ماں نے مجھے میرے نانا، نانی کے پاس کراچی بھیج دیا۔ کیونکہ تب وہ بیمار رہتی تھیں۔" اس نے اپنے گاگلز اتار کر بنچ پر اپنے اور ایثار کے درمیان رکھے۔ دل و دماغ کے درمیان جاری جنگ میں جیت ضدی دل کی ہوئی تھی۔ اب یہ اس کی ڈیوڈ سے کون سی ملاقات تھی؟ اسے یاد نہیں تھا۔

"کراچی میں میرے دن اچھے گزرے۔ اپنے نانا سے میری خوب دوستی ہوگئی۔ آج بھی میرے بہترین دوست میرے نانا ہی ہیں۔" اس نے دور جھیل میں کنکر پھینکا۔

"جب میں سولہ سال کا تھا تو نانی کے انتقال کے بعد نانا اداس رہنے لگے تھے۔ تب میں نے حد درجہ بور ہو کر بے وفائی کی حد کردی اور نانا کو ان کے حال پہ چھوڑ کے واپس ڈیلس چلا گیا۔" وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔

"ڈیلس پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ میری ماں کسی مسلمان شخص سے شادی کرکے خود بھی مسلمان ہوگئی ہے۔"

اپنی ماں کی دوسری شادی کی بات وہ بڑے آرام سے، عام سے لہجے میں کر رہا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

"میری ماں کی دوسری شادی میرے لیے اتنی حیران کن نہیں تھی، وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے۔ مگر میری ماں کے مذہب بدل لینے نے مجھے ضرور حیران کیا تھا۔ میری ماں اچھی خاصی مذہبی عورت تھی، اس نے کیسے اتنی آسانی سے اپنا مذہب چھوڑ دیا.... ؟ یہ بات اکثر مجھے حیران کرتی۔"

"آپ کی ماں کو اس مسلمان شخص سے محبت ہوگئی ہوگی اور محبت ایسا کروادیتی ہے۔" کچھ جاننے کی جستجو میں وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"محبت.... ؟" وہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ "ایسی کسی محبت کو میں نہیں مانتا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"محبت آپ کو اپنے مذہب سے بھی تو ہوتی ہے۔ مگر یہ کیسی محبت ہے جو آپ کو اپنے محبوب مذہب سے موڑ دیتی ہے۔ جس سے آپ کا تعلق اپنی پیدائش سے ہوتا ہے۔"

"کیا ضروری تھا کہ مجھے اس شخص سے محبت ہوتی، جس سے ملن کی امید ایک فی صد بھی نہیں۔" ڈیوڈ کے خیالات جان کر وہ بے اختیار پچھتائی تھی اللہ سے شکوہ کرگئی۔

"لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی بھی تو نہیں جنہوں نے اپنا مذہب بدل لیا ہے۔ صرف ایک آپ کی والدہ تو نہیں۔"

"لیکن میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو بہت مذہبی ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے مذہب سے محبت ہوتی ہے۔ مذہب کو بہت زیادہ اہمیت نہ دینے والوں کے لیے تو یہ عمل شاید کچھ ایسا مشکل نہ ہو۔ لیکن میری ماں تو مذہب سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتی تھی۔" اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اپنی پچھلی بات کی وضاحت کی۔

"پھر تو آپ خود بھی کافی مذہبی ہوں گے؟" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ استفسار کیا۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں..." وہ ہنسا۔ "میں زیادہ تر اپنے نانا کے ساتھ رہا ہوں تو مذہب سے میں بھی ان کی طرح کوسوں دور ہوں۔"

اس کے جواب نے ایثار کے دل میں کسی [illegible] اطمینان اتارا تو امید بھی آس پاس منڈلانے لگی۔

"یہ کہتا ہے کہ میں مذہب سے بہت دور ہوں اور مذہب سے دور رہنے والوں کے لیے مذہب کی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سو یہ ناممکن تو نہیں کہ یہ اپنا مذہب چھوڑ دے۔" آس پاس منڈلانے والی امید نے سرگوشی کی۔

"یعنی مذہب کی تبدیلی آپ کے لیے کبھی دشوار ثابت نہیں ہو گی؟" اس نے نگاہیں چراتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب بھی امید افزا ہو۔

"نہیں... میرے لیے ایسا عمل دشوار نہیں ہو گا۔" دل ایسا ہی کچھ سننے کا متمنی تھا۔

مگر... یہ دل اور اس دل کی تمنائیں...

"مگر میم! میں کیوں بلاوجہ ہی اپنا مذہب بدلنے لگا؟" اس نے مسکراتے ہوئے کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بلاوجہ نہیں۔" اس نے بے تابی سے کہا۔ "ایسا ہونا ناممکن تو نہیں کہ کوئی آپ پہ اپنا دل ہار دے۔"

"نہیں یار! ایسا نہیں ہو سکتا۔" اسے گویا یقین تھا۔

"ایسا ہو چکا ہے۔" روا روی میں اس کے لبوں سے پھسلا۔ ڈیوڈ کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔

"اف خدا! یہ زبان سے ادا ہو جانے والے الفاظ واپس کیوں نہیں ہوتے۔"

"میں کہنا دراصل یہ چاہ رہی تھی کہ فرض کریں ایسا ہو چکا ہے۔"

"چلو، فرض کر لیا کہ ایسا ہو چکا ہے۔" وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "تب بھی یار! مذہب تو وہ بدلے نا، جس کے ساتھ محبت کا حادثہ ہو گیا ہے۔" وہ ہنوز مسکرائے جا رہا تھا۔

ایثار کا دل یکبارگی دھڑک کے رکا۔ اس لمحے اس پر کھلا کہ وہ اپنے مذہب سے محبت اس شخص سے زیادہ کرتی ہے، "تو پھر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ محبت کا حادثہ آپ کے ساتھ پیش آ گیا ہے۔" اسے جو جواب درکار تھا وہ پچھلے سوال سے نہ مل سکا تو اس نے سوال بدل ڈالا۔ اس کے خوابوں کی زندگی کا انحصار ڈیوڈ کے جواب پر تھا، سو وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔ اس نے چند لمحوں تک سوچا اور پھر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"شاید مذہب کو اہمیت دوں۔" وہ یقین و بے یقینی کی کیفیت کے درمیان بولا۔ ایثار کے دل میں اداسی بڑے اطمینان سے لمبے قیام کے لیے پاؤں پسارے بیٹھ گئی۔

"شاید کیوں...؟ کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟" دل میں ایک موہوم سی امید اب بھی باقی تھی۔

"نہیں... مجھے یقین ہے کہ میں شاید ایسا نہ کر سکوں۔" الجھتے ہوئے وہ پھر شاید کہہ گیا۔

موہوم سی ٹمٹماتی امید ایک دم بجھ گئی۔ دل میں ملال اتر آیا اور آنکھوں میں نمکین پانی۔

"چلیں...؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رخ موڑے جانے کے لیے بالکل تیار۔

آنکھوں کے کنارے ٹھہرے اشکوں کو اس نے بڑی دقت سے حد پار کرنے سے روکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو قدم اٹھانے کے بعد وہ تیسرے قدم پہ ٹھٹک کے رک گئی۔ نگاہ دور سے آتے مجتبیٰ پہ پڑ گئی تھی اور دل بے ہنگم انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ وہ ان ہی کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے اس طرح ٹھہر جانے پر ڈیوڈ بھی "تقلیداً" رکا۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے مجتبیٰ عین اس کے سامنے آ رکا۔ چہرے پہ سنجیدگی کے تاثرات لیے وہ اسے کچھ برہم بھی لگا۔ دل میں موجود چور کے باعث ایثار سے نگاہیں ملانا دشوار ہوا۔ ورنہ بظاہر ایسی کوئی بات تو نہیں تھی جو نگاہیں چرائی

جائیں۔

"اسلام علیکم! مجتبیٰ! کیسے ہو؟" بالآخر اسے بولنا پڑا۔

مجتبیٰ نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور اپنی کھوجتی سنجیدہ نگاہوں سے ڈیوڈ کو گھورے گیا۔ ایثار کو اس کا انداز بڑا عجیب لگا۔

"یہ ڈیوڈ ہیں۔" ایثار نے ڈیوڈ کی سمت دیکھا اور پھر مجتبیٰ کی طرف دیکھ کر تعارف مکمل کیا۔ "ڈیلس سے آئے ہوئے ہمارے مہمان۔"

مجتبیٰ سپاٹ چہرہ لیے کھڑا رہا۔ ایثار کو اس کے انداز الجھن میں مبتلا کرنے لگے۔

"اور مسٹر ڈیوڈ! یہ میرے کزن ہیں مجتبیٰ!"

ڈیوڈ نے مسکرا کر خوش دلی سے مجتبیٰ کی سمت ہاتھ بڑھایا۔ جسے بغیر گرم جوشی' بلکہ کسی قدر سرد مہری سے تھاما گیا تھا۔

"میں پچھلے بیس منٹ سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہاں نہ آتا تو تم سے ملے بغیر ہی جانا پڑتا اور ایسا میں چاہتا نہیں تھا' سو یہاں آگیا۔" ڈیوڈ کو مکمل نظر انداز کیے وہ ایثار کی جانب مڑا۔

"اوکے! مس ایثار! میں چلا۔ آپ سے ملاقات اب کل ہوگی۔ اوکے بائے!" اس نے گاگلز آنکھوں پہ جمائے اور مزید کچھ بھی کہے سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔

کیوں ہوگی ہماری ملاقات کل۔۔۔؟ ان بے مقصد ملاقاتوں سے بھلا کیا فائدہ حاصل ہوگا ہمیں؟ وہ لحہ بہ لحہ دور ہوتے ہوئے ڈیوڈ کی پشت کو گھورتے سوچے گئی۔

کہتے ہیں' محبت ملن کی محتاج نہیں۔ وہ خدا جانے محبت کا کون سا درجہ ہوتا ہے؟ میں تو یا رب! اس سوچ سے ہی ہلکان ہو جاتی ہوں۔ اس نے لب بھینچے۔

مجتبیٰ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں پیچھے مڑ کے دیکھا اور ناگوار سی نگاہ ڈال کر اس کے اور ڈیوڈ کے درمیان آیا۔

ایثار نے خود کو کمپوز کیا اور مسکرائی۔ "تم میں بڑا اسٹیمنا ہے مجتبیٰ! خدا جانے محض تمیں' پینتیس منٹ کی ملاقات کے لیے تم اتنا لمبا سفر کیسے طے کر لیتے ہو؟"

"تم بھی تو روز' بلاناغہ ہی یہاں آنا فرض کی طرح نبھاتی ہو۔ تم میں بھی بڑا اسٹیمنا ہے۔" اس کے فقرے میں طنز اور تلخی کی آمیزش بڑی واضح تھی۔

"میری بات اور ہے۔ میں تو۔۔۔" ایثار نے اس کے طنز اور تلخی کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کیا اور کچھ کہنا چاہا۔ مگر مجتبیٰ نے اسے فقرہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

"بات اور نہیں ہے ایثار! بات ایک ہی ہے۔ میرے یوں پندرہ' بیس منٹ کی ملاقات کے لیے اتنا لمبا سفر طے کرنے میں بھی اور تمہارے۔۔۔" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر بات ادھوری چھوڑی۔

"یہ مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہا ہے؟" اس کا تیز لہجہ ایثار کو رنج پہنچا رہا تھا۔

"میرے علم میں نہیں تھا کہ تمہیں میری آمد اتنی ناگوار گزرے گی۔" وہی تلخ و ترش لب و لہجہ۔

"مجھے تمہاری آمد کبھی بری نہیں لگی مجتبیٰ! تم بات کو غلط معنوں میں کیوں لے رہے ہو؟" اسے مجتبیٰ کے ایسے رویے پہ دکھ بھی تھا اور حیرت بھی۔ اور یہ شخص کہتا ہے میں تمہیں خود تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تمہارے چہرے کے رنگوں سے تمہارے دل کی بات آرام سے پا لیتا ہوں۔ پھر آج اسے دشواری کیوں پیش آرہی ہے؟ اور دشواری تو درحقیقت اسے ہی پیش آ رہی تھی' مجتبیٰ کے اس نازیبا رویے کو سمجھنے کے لیے۔ وگرنہ مجتبیٰ تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے چہرے سے اس کے دل کا راز پا گیا تھا۔ اور نتیجتاً رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو گیا تھا۔

"مگر آج تمہیں میری آمد بری لگی ہے اور اس کی وجہ وہ انگریز کا بچہ ہے' جس سے تمہاری آج کی ملاقات ادھوری رہ گئی۔" طیش میں اس کے تند لب و لہجے سے جن الفاظ کی ادائیگی ہوئی' اس نے ایثار کے لہو کی گردش تیز کر دی۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ غصے سے بھی اور اپنی ہتک کے احساس سے بھی۔

یوں آپے سے باہر تو وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اگر

ہوا بھی تھا تو ایسی زبان۔۔۔؟ وہ متحیر تھی اس کے لب و لہجے پر۔

"مجتبیٰ! غصے کے سبب تم اپنی عقل کھو رہے ہو۔ تمہارے الفاظ مجھے دکھ پہنچا رہے ہیں۔" اس نے مجتبیٰ کو اس کے بدترین رویے کا احساس دلانا چاہا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔" اس نے درشتی سے کہا۔

"مجتبیٰ۔۔۔!" دکھ اور صدمے سے وہ بے جان ہوئی اور حرکت کرنے سے معذور ٹھہری۔ مجتبیٰ پلٹا اور تیز قدموں سے واپسی کی راہوں پہ چل پڑا۔

آنکھیں جو کب سے برسنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں ایک دم چھلک پڑیں۔ اردگرد کا منظر دھندلا گیا۔ اور دکھ کی کہر سے اندر کی دنیا بھی۔

* * *

"رات تمہارے باپ کا فون آیا تھا۔" دادو نے صوفے پہ اس کے برابر نشست سنبھالی اور ہاتھ میں پکڑے سیب کی ایک قاش کاٹ کر اس کی سمت بڑھائی۔

"حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ تمہارے باپ کو میرا نمبر یاد رہا۔" دادو کو بھی اس کی طرح، اس کے باپ سے دوسری کئی شکایتوں کے ساتھ یہ شکوہ بھی تھا کہ وہ شاذونادر ہی فون کیا کرتے تھے۔

"کہہ رہا تھا مریم نے مجتبیٰ کے لیے تمہیں مانگا ہے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ تمہاری مرضی پوچھ کے بتا دوں۔" دادو نے بلاوجہ کی تمہید باندھنے کے بجائے سیدھے سبھاؤ مطلب کی بات کی۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔ ہاتھ میں پکڑی سیب کی قاش اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دی

نجانے کیوں دل میں پلتی وہ شدید خواہش، جس کی تکمیل کا دور تک کوئی امکان ہوتا ہے نہ اشارہ، اسی خواہش کے پورا ہونے کے لیے لاشعور کسی معجزے کا ہمہ وقت منتظر کیوں رہتا ہے۔ اس نے اپنا نچلا لب بری طرح کاٹا۔

"جتنی ذہنی ہم آہنگی تم دونوں کے درمیان ہے، اس کے بعد لگتا تو نہیں کہ تمہاری مرضی، ہماری مرضی سے الگ ہوگی۔ مگر پھر بھی میرا خیال اگر غلط ہے تو بتا دو۔"

دادو کی بات پہ اسے گیارہ روز قبل کے مجتبیٰ کے وہ دل دکھانے والے الفاظ پھر سے تنگ کرنے لگے۔ جسے بھلانا بڑی دقتوں سے ممکن ہوا تھا۔ غصے کا احساس ایک بار پھر تمام احساسات پر حاوی ہوا۔

"اسے احساس کیوں نہیں ہوا اب تک کہ اس نے مجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔" مجتبیٰ کی طرف سے معذرت کی امید بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

"پھر کیا جواب ہے تمہارا؟" اس کی خاموشی پر دادو کو پھر پوچھنا پڑا۔

"دادو پلیز!" وہ جھنجلا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ایسی کسی بات کا جواب میں فی الحال نہیں دے سکتی۔" بے زاری سے کہتے اس نے باہر کی سمت قدم بڑھائے۔ دادو نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسے چڑچڑے پن کا مظاہرہ تو اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

"میں کچھ دیر میں آئی دادو!" اس نے دروازے کے پاس رک کر دادو کو اطلاع دی اور باہر نکل گئی۔

قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔۔۔ کبھی نہ سمجھ میں آنے والے۔۔۔ اس نے بے بسی سے لب کچلتے ہوئے، راہ میں آئے پتھر کو ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ آخر ایسے لوگ ہماری زندگی میں آتے ہی کیوں ہیں۔ جو قسمت میں کسی حساب سے بھی نہیں آتے۔ ایک نہایت ضدی اور سرکش آنسو بڑے ضبط کے باوجود پلکوں پہ آ ٹھہرا۔ اور اگر زندگی میں آ بھی جاتے ہیں تو پھر دل میں یہ خواہش ہی کیوں پیدا ہوتی ہے کہ یہ ہماری زندگی سے کبھی نہ جائیں۔ عجب بے بسی سی بے بسی تھی۔

یاالٰہی! تیرے اختیار میں تو سب کچھ ہے۔ پھر تو نے کیوں میرا نصیب اتنا برا لکھا۔ اس حوالے سے اپنے اللہ سے شکوے شکایات کا سلسلہ بھی اب پرانا ہو چکا

تھا۔

زندگی بھر بھی اگر ہم اللہ کی نعمتوں‘ احسانوں اور عنایتوں کے سائے تلے رہیں تو بھی شکر کا کلمہ زبان پہ شاذ ہی آتا ہے اور اگر دکھ کی‘ مشکل کی یا تکلیف کی آنچ بھی پڑ جائے تو شکوے شکایات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسان کی ایسی کوتاہیوں سے صرف نظر‘ صرف وہی کر سکتا ہے‘ جو ماں سے بڑھ کر چاہے۔ سوچ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو ستر ماؤں سے بڑھ کر چاہتا ہے۔ وہ مخصوص راہوں پہ چلتی ہوئی‘ مخصوص جگہ پہ پہنچی تو ٹھٹک کے رک گئی۔ وہ سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔ جس سے اب کبھی نہ ملنے کا اس نے گیارہ روز قبل قصد کیا تھا۔

وہ بے دھیانی میں اس سمت نہیں آئی تھی۔ مگر یہ خیال ضرور دل میں موجود تھا کہ یہ وہ وقت نہیں ہے‘ جس میں اس کی موجودگی کا امکان بھی ہو۔ سو وہ اس سمت آ گئی۔ اور اگر وہ اسے دیکھ نہ لیتا تو وہ خاموشی سے پلٹ بھی جاتی۔ مگر اس نے اسے دیکھ لیا تھا سو وہ خاموشی سے بینچ پہ بیٹھ گئی۔

”تھینک گاڈ! آپ نظر تو آئیں۔ آج اگر آپ نہ آتیں تو میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا‘ آپ کی طرف آنے کا۔“ اس نے بڑی بے ساختگی سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ خاموش ہی رہی۔ دل کچھ بھی کہنے سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”ویسے خیریت تو تھی نا؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کراچی گئی ہوئی تھی۔“ اسے اندازہ تھا کہ اگلا سوال کیا ہو گا‘ سو اس نے بغیر پوچھے ہی ذہن میں آنے والے اس بروقت جواب کو گوش گزار کیا۔

”اچھا!“ وہ ہلکے سے ہنسا۔

”میں تو پچھلے کئی روز سے بڑی مستقل مزاجی سے دن میں کئی بار یہاں کے چکر لگاتا رہا ہوں۔ آپ آگاہ کر کے بھی تو نہیں گئی تھیں نا اپنے کراچی جانے کے متعلق۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”کیوں آگاہ کرتی۔۔۔؟“ طبیعت کا چڑچڑا پن بڑھا اور مزید بڑھ کر کمال کو پہنچا۔

”میں یہاں آپ سے ملنے کے ارادے سے تو کبھی بھی نہیں آئی۔“ اسے اس شخص پہ شدید غصہ آیا جس کے باعث اس کا جینا از حد دشوار ہوا تھا۔

”پچھلے چار برسوں سے یہاں آنا میرا معمول ہے‘ اور آپ سے ملاقات اسی معمول کے سبب ہوتی رہی ہے۔“ آنکھوں میں نمی اترنے کا احساس ہوا تو اس نے رخ موڑ لیا۔

اس کے یوں معمولی بات پر اتنا برہم ہونے پر ڈیوڈ نے کسی قدر حیرانی سے اس کی سمت دیکھا۔

”اوکے! جو کچھ آپ نے کہا‘ سو فی صد درست۔ میں اس سے انکاری نہیں مگر۔۔۔“ اس نے ایثار کا مزاج ٹھنڈا کرنے کی ایک کوشش کی۔

”مگر جتنا آپ میری بات سے ناراض ہوئیں بات اس قدر ناراضی والی تھی نہیں۔“ اس خدشے کے تحت کہ وہ مزید مشتعل نہ ہو جائے‘ ڈیوڈ نے جھجکتے ہوئے‘ سر کھجا کر اپنا فقرہ مکمل کیا۔ ”پھر بھی بہت معذرت۔“

ایثار نے رخ موڑ کر اس کے شرمندہ چہرے کو دیکھا اور نادم ہوئی۔ خواب جتنے مرضی اونچے دیکھ لو مگر قسمت کے آگے مرضی نہیں چلتی۔ اس کے آگے ہم بے بس ہی ہوتے ہیں۔ سو اس کے مزاج کی تلخی اور چڑچڑا پن اسی بے بسی کی دین تھا۔ قسمت کی بے رخی کا احساس اس وقت شدت سے ہو رہا تھا‘ سو اسے خود کو سنبھالنے میں وقت لگا۔

”سوری۔“ اس نے بے چارگی سے لب کاٹے۔ ”دراصل کبھی کبھار مجھے دورہ پڑتا ہے۔ بے سبب ہی‘ بلاوجہ ہی غصہ کرنے کا۔“ وہ دانستہ مسکرائی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”آپ کی بات پر مجھے اپنی زندگی کی پہلی محبت یاد آ گئی۔“ اس کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھی۔

”پہلی محبت۔۔۔؟ یعنی کئی محبتیں نمٹا چکا ہے۔“ اس نے سوچا‘ مگر خاموش رہی تو وہ از خود کہنے لگا۔

”مجھے زندگی میں پہلی محبت بیس برس کی عمر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ڈور تھی سے ہوئی تھی۔ جس شاپنگ سینٹر سے میں شاپنگ کیا کرتا تھا وہاں وہ سیلز گرل تھی۔" لبوں پہ مسکراہٹ سجائے وہ جیسے ماضی کے کسی واقعے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"اچھی لڑکی تھی۔ سنہری بالوں اور گوری رنگت والی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو گیا ہوں۔ اسی قسم کے احساسات وہ بھی میرے متعلق رکھتی تھی۔"

ایثار اداسی سے اپنے ہاتھ کی لکیروں میں دل کی خوشی ڈھونڈنے لگی۔

"اسے بھی اکثر بلاوجہ ہی غصہ ہونے کا دورہ پڑتا تھا اور میری کبھی بھی یہ عادت نہیں رہی کہ میں کسی کی اونچی آواز آسانی سے برداشت کرلوں۔ سو ایک روز وہ غصے سے مجھ پہ چلائی تو میں بالکل برداشت نہیں کرسکا اور گھما کے ایک ہاتھ جڑ دیا۔" بات کی ابتدا سے لبوں پہ بجی محظوظ سی مسکراہٹ، جو درمیان میں دھیمی پڑی تھی وہ دوبارہ سے ہونٹوں پہ مچلنے لگی۔

اسے افسوس ہونے لگا وہ ایک کمزور لڑکی پہ ہاتھ اٹھا کے محظوظ ہو رہا تھا۔

"نتیجتاً" وہ غصے سے پاگل ہو گئی اور پاس پڑا ہوا ایش ٹرے اٹھا کر میرے سر پہ دے مارا۔ میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور جب تک تکلیف کچھ کم ہوئی اور آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تب تک وہ فرار ہو چکی تھی اور کچھ ایسی فرار ہوئی کہ آج تک نہیں مل سکی۔" وہ اب ہنس رہا تھا۔

"میرے خدا!" وہ اس "کمزور" سی لڑکی کی ایسی زور آوری پہ متحیر ہوئی۔

"شروع میں تو میں نے اسے ڈھونڈا کیونکہ سر پہ موجود زخم تکلیف دیتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بھولتا گیا۔ مگر اب جب کبھی اس سارے معاملے کو سوچتا ہوں تو نجانے کیوں غصے کے بجائے ہنسی آتی ہے۔" اس کی بات کی صداقت کا اندازہ لبوں سے جدا نہ ہونے والی مسکراہٹ سے بخوبی ہو رہا تھا۔

"کبھی کبھی تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہ آخر گئی کہاں؟ اس خوب صورتی سے غائب تو صرف جادوگر ہی ہوا کرتے ہیں... کہیں وہ سچ مچ جادوگرنی تو نہیں تھی؟" اس نے شرارت سے استفسار کیا۔

ایثار نے کندھے اچکائے تو وہ ہنس دیا۔

"یہ پہلی محبت، آخری بھی تھی یا...؟" وہی قسمت کی بے بسی جو اس وقت لفظوں میں طنز بن کے اتری۔

"اللہ نہ کرے، آخری کیوں ہونے لگی؟" اس نے ڈرنے کا ڈراما کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے ایثار کو گھورا۔

ایثار نے اس کی طرف دیکھا اور سوچا "ڈور تھی کی جادوگری کا تو علم نہیں، مگر اتنا ضرور یقین ہے کہ تمہارا جادو مجھ پہ کچھ یوں اثر انداز ہوا ہے کہ توڑ کا کوئی عمل بھی اثر انگیز ثابت نہیں ہو رہا۔"

"دوسری محبت کا آغاز، پہلی محبت کے اختتام کے چند روز بعد ہی ہو گیا تھا۔" وہ اپنا دوسرا "کارنامہ" بیان کرنے لگا۔

"اللہ جانے یہ "محبت" کسے سمجھتا ہے؟ یہاں تو ایک محبت ہی جان کو آگئی ہے۔" اس نے گہری سانس لی۔

"دوسری بار بھی مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں جولیا سے شدید محبت کرنے لگا ہوں۔ جب جولیا کو بھی یہ وہم ستانے لگا تو ہم دونوں ہی شادی کرنے کے لیے سنجیدہ ہو گئے۔" ہر بات پر مسکراتے ہوئے وہ ایثار کو آج بڑے ہی خوشگوار موڈ میں لگ رہا تھا۔ جبکہ خود اس کا دل بڑا ہی مضطرب اور بے کل۔

"ہم دونوں ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہنے لگے۔ شروع شروع میں تو ہم اچھے دوستوں کی طرح بڑے ہی پیار محبت سے رہے۔"

"ایک ساتھ، ایک ہی فلیٹ میں...؟" ایثار ایک دم چونکی۔ "اللہ جانے یہ شادی سے قبل کا ذکر کر رہا ہے یا بعد کا؟"

"مگر بعد میں، میں بور ہونے لگا۔ اس کی قربت سے مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔" اس کی گفتگو سے ایثار کا چہرہ

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سرخ پڑ گیا۔

"اس لیے میں نے جولیا سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ مجھے لگنے لگا تھا کہ میری دوسری محبت کی مدت بھی ختم ہوگئی ہے۔" وہی مسکراتا لہجہ۔

"یعنی شادی سے پہلے ہی..." اسے شاک لگا۔

"یارب! یہ مجھے کس شخص سے محبت ہوگئی ہے؟" اسے بے انتہا افسوس ہوا۔ وہ جانتی تھی وہ جس ملک کا شہری ہے، وہاں ایسا ہونا عام سی بات ہے۔ مگر یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا کہ وہ خود بھی ایسی برائیوں میں ملوث ہوسکتا ہے۔

"اور اس محبت کو بھی آپ میری آخری محبت مت سمجھیے گا۔" وہ اس کے خیالات سے بے خبر کہہ گیا۔

آخر میرا دل اس کی طرف مائل ہی کیوں ہوا؟ کاش یہ میرے لیے ایک عام سا شخص ہوتا، اتنا خاص نہ ہوتا تو میرا دل یوں دکھی تو نہ ہوتا نا اس انکشاف پر۔ وہ مضطرب بھی ہوئی اور اس کی بات از سرنو سوچ کر مشتعل بھی۔

"دوسری کے بعد بھی کئی محبتیں ہوئیں۔ مگر اب پتا چلتا ہے کہ جب واقعی محبت ہوتی ہے تو ہم نہ اس سے اکتاتے ہیں، نہ بے زار ہوتے ہیں۔ بلکہ مزاج کے برخلاف اونچی آواز بھی برداشت کرلیتے ہیں۔"

"اور اب یہ "واقعی محبت" اللہ جانے کیسی محبت ہوگی؟ اور کیا کچھ سننا پڑے گا۔" غصہ جو تھما نہیں تھا، مزید بڑھا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا؟" اس کے یوں اچانک اٹھ جانے پر ڈیوڈ نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔

اسے گویا کرنٹ لگا۔ ایک دم جلال میں اس نے ڈیوڈ کا ہاتھ پوری شدت سے جھٹکا۔

"آئی ایم سوری!" اسے اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہوگیا۔ مگر ایثار نے اس کی نادم صورت پر ایک قہر بھری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہ کیا اور نہایت ناگواری سے رخ موڑ کر تیز قدموں سے اس سے دور ہوتی گئی۔

"بیہودہ گھٹیا انسان۔" اس کا خون کھولنے لگا۔ بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہوجانا چاہیے تھا کہ یہ کس کردار کا ہوگا۔ اس نے لب کاٹے۔

لیکن مجھے اگر اندازہ بھی ہوتا تو میں کیا کرلیتی؟ دل پھر اس کے آگے تن کے کھڑا ہوگیا تھا۔ اسے تسلیم کرنا پڑا۔

اس شخص سے نفرت کرنا کبھی بھی میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ اپنی اس کمزوری سے بخوبی آگاہ ہوگئی تھی سو بے چارگی سے سوچ گئی۔

"شکر ہے شہزادی صاحبہ آج جلدی لوٹ آئیں۔" اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی مجتبیٰ جو دادو کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا ٹھٹک کے رکا اور مسکرا کے گویا ہوا۔

اس نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے...؟ اپنی جاگیر یا کوئی غلام جو یوں طنز کررہا ہے۔" غصہ، بے بسی، بے کلی اور نارسائی کے ملے جلے احساسات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ناکارہ کیا۔ وہ آج اپنے پچھلے رویے پر معذرت کرنے کے موڈ میں تھا، سو طنزیہ گفتگو کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ اب تو تم سے ملنے کے لیے اپائنٹمنٹ لینا پڑے گا۔"

پچھلی بار بھی میں بے سبب ہی اس کے عتاب کا نشانہ بنی تھی۔ غصہ تمام احساسات پہ غالب آیا اور نقطۂ عروج پہ پہنچا۔ سو وہ کہیں تو نکلنا تھا اس لیے مجتبیٰ پہ نکلا۔

اس نے مجتبیٰ کو طمانچہ جڑ دیا۔ مجتبیٰ ہکا بکا اس کی صورت تکتے گیا اور وہ تیزی سے اس کے عقب سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

* * *

"ایثار! آخر ایسی کون سی وجہ ہے جو تم مجتبیٰ سے شادی کے لیے رضامند ہی نہیں ہورہیں؟" دادو آج اچھی خاصی جھنجلائی ہوئی تھیں۔

"میں نے انکار تو نہیں کیا دادو!"

"تو ہاں بھی تو نہیں بھری۔ کوئی فیصلہ کرلو۔ چاہے

ہم سب کو مایوس کر دینے والا ہی۔" دادو کا پیمانۂ صبر لبریز ہوا تھا اور اب ان کی گفتگو سے ناراضی جھلکتی تھی۔

ہامی بھر لوں دادو! مجتبیٰ میرے دل میں کسی اور کے بسیرے کا سراغ پا گیا ہے۔ اب وہ بہت بدل گیا ہے دادو! اس کا دل چاہا وہ یہ سب دادو سے کہہ کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔ مگر اسے اپنے اس خیال پہ عمل کرنا دشوار لگا سو وہ خاموش رہی۔

اسے اب میری پروا نہیں رہی۔ ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہو چلا ہے مگر اسے بالکل احساس ہی نہیں ہے کہ اس کے الفاظ نے مجھے اتنا دکھی کیا تھا کہ بلا ارادہ ہی میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ اسے اپنی خطا کا احساس نہیں تھا۔ اس نے سارا قصور مجتبیٰ کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

جو کچھ دل چاہتا ہے' وہ تو ممکن ہے ہی' نہیں تو پھر میں کوئی ایسا فیصلہ کیوں کروں جو سب کو مایوس کر دے۔ ہامی تو بھرنی ہی ہے اس رشتے پر۔ مگر بس ایک معصوم سی خواہش تھی کہ وہ اپنے ڈیڑھ ماہ پہلے کے ناروا رویے پر شرمندگی کا اظہار کرے۔ جو اگر اس کے لیے مشکل ہے تو یونہی سہی۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کے اپنی معصوم خواہش سے دستبردار ہوئی۔

"دادو!" دادو جو اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر جا رہی تھیں' اس کی پکار پہ رکیں۔

"بابا تک میری بات پہنچا دیں کہ میری مرضی ان کی مرضی سے مختلف نہیں۔ وہ میرے لیے جو مناسب سمجھیں' اس پر عمل کر ڈالیں۔" بات کے اختتام تک نمی لہجے میں گھل سی گئی۔ نجانے کس دکھ پہ' وہ اس کا اندازہ نہ لگا پائی۔ دادو نے مسکراتے ہوئے آسودگی سے اس کی پیشانی چومی۔

"میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو اپنی ایثار کو آسودہ و مسرور دیکھنا ہے۔ اس ایک بات کی صداقت پہ تم کبھی شبہ نہ کرنا کہ میرے لب ہمیشہ تمہاری خوشیوں کے لیے دعاگو رہیں گے۔"

انتظار صرف اس کے ہامی بھرنے کا تھا' سو بات فوراً" کراچی پہنچی اور ایک ہفتے بعد کا دن مقرر ہو گیا۔

"منگنی کی تقریب میں ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دیں گے۔" منگنی سے ایک روز قبل صبح ناشتے کے بعد دادو نے جو خبر سنائی اس نے اسے حواس باختہ کر دیا۔

"دادو! یہ بہت جلدی ہے۔ میں شادی ابھی نہیں چاہتی۔"

"شادی ابھی نہیں ہو رہی۔ صرف ڈیٹ فکس کی جائے گی۔" دادو نے اس کے اعتراض کو ٹالنا چاہا۔

"تو ٹھیک ہے پھر ڈھائی' دو سال بعد کی ڈیٹ فکس کیجیے گا۔ میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔" اس نے تند لہجے میں ہٹ دھرمی سے کہا۔

"ایثار! فضول ضد کیوں کرنے لگی ہو؟ جب سب کچھ اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ چکی ہو تو اب اس انتہائی غیر اہم بات کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔" دادو ان دنوں اس کے وجہ' بے وجہ کے چڑچڑے پن سے عاجز آ گئی تھیں۔ سو اپنے لہجے کو تیز ہونے سے نہ بچا سکیں۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ اس قدر بے تکا فیصلہ آپ کو میرے لیے مناسب لگے گا۔" وہ جھنجھلائی۔

"ایثار! مجھے بحث و مباحثے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے' اپنے باپ سے کہو۔" دادو ناگواری سے کہتے ہوئے لاؤنج سے اٹھ کر چلی گئیں۔

اس نے برہمی سے گود میں دھرا کشن ایک طرف پھینکا اور سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ جو کچھ دل کی خواہش ہے وہ کسی طور ممکن نہیں۔ خدا جانے اب اطمینان قلب نصیب ہو گا بھی یا نہیں؟ بے بسی سے اس نے لب کچلے۔

لاحاصل محبت بھی کسی گناہ کی سزا سے کم نہیں۔ افسردگی اس کے گرد اپنا حصار تنگ کرنے لگی۔

اور اب یہ اللہ ہی جانے کہ کسی کو بھلانا واقعی اتنا دشوار ہوتا ہے یا میں ہی اس معاملے میں بہت کمزور ثابت ہو رہی ہوں۔ اپنی کوششوں میں پیہم ناکامی اسے مایوس کرنے لگی۔

اور اب بابا کا یہ فیصلہ۔۔۔ اس نے بے زاری سے صوفے کی پشت سے کمر ٹکائی۔ یوں لگتا ہے جیسے تقدیر مجھے سنبھلنے کا وقت دینے کو بھی تیار نہیں۔

اطلاعی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے چونک کر گھڑی کی سمت دیکھا۔ ابھی کافی وقت پڑا تھا، کراچی سے اس کی فیملی کے آنے میں۔ دادو سے خود ساختہ ناراضی کا دور چل رہا تھا۔ سو اس نے بڑی ڈھٹائی سے گھنٹی کی آواز کو نظر انداز کیا اور آنکھیں موند لیں۔

"ڈیوڈ تم سے ملنے آیا ہے۔" دادو کی آواز پہ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ دل کی دھڑکنوں کی ترتیب بری طرح بگڑی۔

"ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔ جا کے مل لو۔" ڈیوڈ کا ذکر وہ سرسری طور پر دادو سے کر چکی تھی، سو وہ اس سے غائبانہ متعارف تھیں۔

"جی اچھا!" یکلخت بیزاری نے اڑان بھری تھی۔ اکتاہٹ، اکتا کر بھاگی اور افسردگی اپنا محاصرہ توڑ کر۔ دادو کچن کی جانب چل دیں۔ اور اس نے ڈرائنگ روم کی سمت قدم بڑھا دیے۔

وہ سیٹی پہ دھیمے سروں میں کوئی دھن بجاتا، دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے طائرانہ نگاہوں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ گویا وقت گزاری مقصود ہو۔ وہ اسے مدتوں بعد دیکھ رہی تھی۔ کم از کم اسے تو یہی لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے دلکش انداز میں خوشدلی سے مسکرایا۔

"السلام علیکم!" ڈیوڈ نے بڑے بشاش لہجے میں سلام کیا۔

"وعلیکم!" ایمار نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

افسردہ دل کی کیفیت آن کی آن میں بدلنے پر وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ خوشی اگر یونہی اس کی ملاقات سے مشروط رہی تو آنے والے شب و روز کیسے ہوں گے؟ اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ پریشانی کی بات یہی تھی۔

"سوری ایمار!" بیٹھتے کے ساتھ ہی وہ بولا۔ "ایمار! میں اپنی اس حرکت پہ سخت نادم ہوں۔ جو آپ کے مزاج پہ اتنی گراں گزری کہ آپ نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ حالانکہ وہ ایک غیر اختیاری حرکت تھی۔ جس پر میں بعد میں بہت پشیمان ہوا۔" شرمندگی اس کے الفاظ سے ہی نہیں، چہرے سے بھی عیاں تھی۔

"مجھے اگر کوئی بات ناگوار گزری بھی تو اب تو میں اسے بالکل بھول گئی ہوں، سو آپ بھی بھول جائیں۔" اس کی شرمندہ صورت ہی ایمار کے لیے کافی تھی۔

"شکر ہے۔۔۔ آپ کی کمزور یادداشت میرے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ ورنہ میں تو گھر سے ناک سے لکیریں کھینچنے کی مشق بھی کر کے آیا تھا۔" اس نے مسکرا کر شرارت سے کہا۔

"تو پھر لکیریں کھینچ ہی لیں ورنہ آپ کی پریکٹس تو رائیگاں جائے گی۔"

"اس کی پروا نہیں۔ مجھے فکر ہے آج کا دن نہ رائیگاں جائے۔" وہ سنجیدہ ہوا اور اس کی معنی خیزی پہ ایمار چونکی۔

"آج میرے نانا کی بہترویں سالگرہ ہے۔" اسی پل دادو چائے کی ٹرالی سمیت نمودار ہوئیں۔ وہ مودب ہو کے بیٹھا "باقاعدہ طور پر تو کبھی نہیں منائی اور آج بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن اگر آپ میری گزارش پہ سالگرہ اٹینڈ کرنے آجائیں تو۔۔۔" سر کھجاتے ہوئے اس نے جھجک کر اپنی خواہش گوش گزار کی۔

آپ بلائیں، اور ہم نہ آئیں۔ ایسے تو حالات نہیں۔ بے اختیار ہی زبان کی نوک تک آجانے والے الفاظ کو اس نے لب بھینچ کے روکا۔ تم اپنے دل کے آگے اتنا مجبور نہ ہوا کرو۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم نے اب اس سے کبھی نہ ملنے کا قصد کیا تھا۔ اندر سے اٹھنے والی آواز کو اس نے واضح طور پر سنا اور گہری سانس بھری۔

دادو نے ایک نظر ڈیوڈ کو دیکھا اور پھر اس کی متذبذب صورت کو۔

"تقریب و قریب کچھ نہیں ہے دادو! بس میں وش کروں گا اور نانا کیک کاٹیں گے۔" اس نے مسکرا کر

وضاحت کی۔

"اچھا!" دادو بھی مسکرادیں۔

"چلی جانا ایثار! شام میں۔" دادو نے گویا اس کی مشکل سہل کی۔

"شام میں نہیں دادو! ابھی میرے ہمراہ میرے نانا میرے ساتھ ساتھ ایثار کے بھی منتظر ہوں گے۔ کیونکہ میں یہاں اسی مقصد کے تحت آیا ہوں۔ اور انہیں بتا کر آیا ہوں۔" اس نے دادو کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

آئندہ کبھی نہ ملنے کے فیصلے پر عمل میں آج تک نہیں کرپائی۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے جو سارے ارادے ملیامیٹ کردیتا ہے۔ دل نے کسی بھی الزام سے خود کو بری کیا۔

لیکن ایسا تو کچھ نہیں ہوا جو تمہارا جانا لازمی ٹھہرے۔ تم معذرت بھی کرسکتی ہو جانے سے۔ اس کے اندر کی یہ مانوس آواز بڑی فرض شناسی سے موقع پر وارد ہو جاتی تھی۔

مگر میں کیسے انکار کرکے اسے مایوس کردوں؟ وہ بڑی آس سے آیا ہے۔ دل کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

تم جب ایک فیصلہ کرچکی ہو تو پھر تمہیں کسی کی آس 'نراس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ دل و دماغ ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند تھے۔ اب پسپائی کس کا مقدر ٹھہرتی یہ دیکھنا تھا۔

"چلی جاؤ ایثار! مگر جلدی آجانا۔ اپنی ماں اور بہن کے آنے سے پہلے ہی۔" جس سمے وہ نہ جانے کا پکا ارادہ کرکے انکار کا بہانہ سوچ رہی تھی' اسی سمے دادو نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اب ڈیوڈ سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی' مگر اس سے دادو کی بات ٹالی نہ گئی۔ سو چندپل متذبذب رہنے کے بعد اس نے دادو کی بات مان لی۔

"موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔" گھر سے نکلتے ہی ڈیوڈ نے کہا۔ موسم بہار کے اوائل دن تھے۔ ابر آلود فضا کی بنا پر بارش کا امکان تھا۔

"ویسے کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر کا موسم اچھا ہونا چاہیے' باہر کی رت خود بخود خوب صورت لگے گی۔" اس کی جگر جگر کرتی بھوری آنکھوں میں آج کچھ ایسا ضرور تھا جو اس کے دل کی بے پناہ خوشی کا پتا دے رہا تھا۔

"اب معلوم نہیں موسم واقعی اچھا ہے یا مجھے ہی لگ رہا ہے۔"

ایثار نے اپنے ہم قدم چلتے اس خوش باش سے شخص کو نظر بھر کے دیکھا۔ "کیا آپ ہمیشہ ہی اپنے نانا کی سالگرہ پہ اتنا ہی خوش ہوتے ہیں؟" اس نے کسی قدر حیرت سے استفسار کیا تو جواباً" وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"اچھا یعنی آپ کے خیال میں میری غیر معمولی خوشی کا سبب یہی ہے؟"

"ظاہر ہے۔ پھر اور کچھ سمجھوں؟ کوئی اور وجہ ہے بھی تو آپ نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا؟" یہ شکوہ نہیں تھا' وجہ جاننے کی ایک کوشش تھی۔

"نہیں..... یہی وجہ ہے۔ کوئی اور نہیں۔" متبسم لہجے میں بتاتے ہوئے اس نے اصل وجہ چھپائی۔

"اب ایسی بھلا کیا وجہ ہوگی' جو یوں مخفی رکھی جا رہی ہے۔" اس کے یوں پوشیدہ رکھنے پہ وہ بدمزہ ہوئی۔

"ایک بات پوچھوں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ایثار سے استفسار کیا۔ جواباً" ایثار نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا تو وہ سر کھجا کر کہنے لگا۔

"بیتے دن میرے بغیر کیسے گزرے؟" اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے ایثار کو چونکایا۔

کہیں اسے شک تو نہیں ہو گیا کہ میرے وہ دن بڑے بے کیف و بے رونق گزرے ہیں۔" ایثار نے اس کا چہرہ ایک نظر میں کھوجنا چاہا' مگر کامیاب نہ ہو سکی تو بنا جواب دیے نگاہوں کا رخ بدلا۔

"میرے خدا!" ڈیوڈ نے لب بھینچ کر کسی قدر افسوس سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"شاید پھر آپ کے مزاج کے خلاف بول گیا

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوں۔" ایثار کی خاموشی اسے خفگی لگی۔

"افوہ! اب اتنی سی بات پہ اسے خفگی کا گمان ہونے لگا ہے۔" وہ جھنجلائی۔

"سوری! معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا جس میں آپ کی ناراضی کا شبہ بھی موجود ہو۔" وہ پشیمان تھا' اپنے لفظوں کی ادائیگی پر۔

"کیا مصیبت ہے؟" بظاہر ہنستے کھیلتے ہوئے بھی کوئی احساس ضرور تھا جو بے کل رکھتا تھا' سو مزاج کا چڑچڑا پن از سر نو عود آیا۔

"مجھے کوئی بات گراں نہیں گزری۔ آپ برائے کرم ....." لب کاٹتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

اس کے بے زار لب و لہجے پر ڈیوڈ نے لب بھینچ کر خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

آخر کیوں میں اس کے احساس سے خود کو آزاد نہیں کر پا رہی؟ بے بس سی سوچ دماغ میں ادھر سے ادھر چکرانے لگی۔ بہتر ہوتا جو میں اس کے ساتھ نہ آتی۔ اس سے مل کر تو احساس زیاں مزید شدت سے حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ عاجز ہو گئی۔ تمام راستہ اسی قسم کی سوچیں دامن گیر رہیں سو موڈ بھی آف رہا۔

ڈیوڈ کی جیپ نے بڑی وفاداری سے رہائش گاہ تک ساتھ نبھایا۔ مگر مزید اس کے نانا نے ڈیوڈ کی خاموشی کو ساتھ نہیں نبھانے دیا۔

"تم ان دنوں اپنی من مانی بہت کرنے لگے ہو۔ چھوٹی باتوں میں بھی اور اہم معاملات میں بھی۔" جوزف انکل نے اس وقت قدرے ناراضی سے کہا جب ڈیوڈ نے انہیں زبردستی چھری تھماتے ہوئے باقاعدہ کیک کاٹنے کو کہا۔

اس سالگرہ کا اہتمام جوزف انکل کی مرضی کے خلاف کیا گیا ہے۔ جوزف انکل کے برہم مزاج سے اس نے اندازہ لگایا۔

"میری تو کسی بات کو بھی تم قابل عمل نہیں سمجھتے۔ جو دل میں سما جائے پھر اس پر عمل مجھے دکھ پہنچا کے بھی ضرور کرتے ہو۔" وہ کسی بات کی وجہ سے ڈیوڈ سے ناراض تھے سو اس کا اظہار برملا' بغیر کسی لحاظ کے کر رہے تھے۔

"کچھ خیال کرلیں۔ مہمان کے سامنے ہی میری عزت رکھ لیں۔ میری بقیہ "تعریف" بعد میں کر لیجیے گا۔" شاکی لہجے میں اس نے کسی قدر ناراضی سے کہا۔

"ہاں ..... مہمان کے دل میں کوئی برا خیال نہ آئے۔" انہوں نے چبھتی ہوئی نگاہ ایثار پر ڈالی۔

"باقیوں کی خیر ہے ..... ان کی تمہیں پروا بھی کب ہے۔ اب بس یہی اہم ہیں۔" ایثار کے پورے جسم کا لہو چہرے پہ سمٹ آیا' جوزف انکل کے لب و لہجے پر۔

ڈیوڈ نے ہڑبڑا کے پہلے اسے اور پھر اپنے نانا کی سمت دیکھا۔

"آپ کی ناراضی مجھ سے ہے' تو پلیز اسے مجھ تک ہی محدود رکھیں۔" اس نے دبے لہجے میں التجا کی۔

"تمہاری زندگی میں ان چند دنوں میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ سو اب مزاج کی تبدیلی معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے اب تمہارا رویہ بہت کم تکلیف دیتا ہے۔ حالانکہ کسی اور کو بہت اہمیت دیتا میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔" بات کے اختتام پر انہوں نے پھر اسے ناپسندیدگی سے دیکھا۔

ان دونوں کے درمیان وجہ ناراضی اس کی ذات ہے۔ اس نے ٹھیک ٹھاک اندازہ لگایا۔

مشفق سے جوزف انکل جو ہمیشہ ہی اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ مگر آج ان کا ناقابل فہم رویہ اسے متحیر کر رہا تھا۔ ان کی ناراضی اپنے نواسے سے تھی۔ مگر وہ اسے کیوں بیچ میں رگید رہے تھے؟ وہ یہ جاننے سے قاصر تھی۔

"میں اپنی صفائی میں کہنے والے تمام الفاظ آپ کے سامنے ایک سے زائد بار دہرا چکا ہوں۔ سو اب مزید کیا کہوں؟" وہ مکمل طور پر بے بس ہوا تو جوزف انکل تلخی سے ہنس دیے۔

"مناسب بھی یہی ہے کہ اب کچھ نہ کہو۔ تم جتنا کہہ چکے ہو' میرے لیے کافی ہے۔" وہ بدستور مشتعل تھے۔

ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ایمار کی بیکلی کا احساس بھی بڑھ رہا تھا' سو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں۔ دادو راہ تک رہی ہوں گی۔" وہ پلٹی اور تیز قدموں سے واپسی کی راہ لی۔

"ایمار!" وہ پکارتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔

"مس ایمار! پلیز! بات سنیں!" اس کے پیچھے پیچھے وہ باہر تک آیا۔ ایمار نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔

"سوری ایمار! میں بہت شرمندہ ہوں' اپنے نانا کے رویے پر۔" ایمار نے اس وقت بھی اس کی سمت نہیں دیکھا' جب وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے ناگوار نہیں گزرا۔ وہ میرے بزرگ ہیں۔" جوزف انکل کی تلخ باتیں پھر سے ذہن میں آئیں تو رگوں میں دوڑتے لہو کی رفتار ایک بار پھر بڑھی۔ مگر اس نے "دل میں کچھ' زبان پہ کچھ" کے مصداق منافقت سے کام لیا۔

"پھر آپ یوں اچانک کیوں اٹھ کر آگئیں؟" اس نے چند لمحے خاموشی سے ایمار کی سمت دیکھنے کے بعد استفسار کیا۔

"مجھے اچانک ہی یاد آیا تھا کہ دادو نے جلد آنے کا کہا ہے۔ کراچی سے میری فیملی آرہی ہے نا' میری منگنی کے سلسلے میں۔ کل منگنی ہے میری۔" وہ اب اس کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریزاں رہتی تھی۔ سو اس وقت بھی نگاہیں سامنے راستے پر جمی رہیں۔

ایمار کے انکشاف پہ ایک لمبی چپ ان دونوں کے بیچ آکھڑی ہوئی۔

اسے ایک دم چپ کیوں لگ گئی ہے۔ خوش فہمی پھر سر اٹھانے لگی۔

کہیں اسے میری منگنی کی خبر نے رنج تو نہیں پہنچایا۔ اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کے دیکھا۔ وہ اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی اتار کر اس کی چابی گھمارہا تھا اسے اپنی جانب متوجہ پا کر مسکرایا۔

"بند ہو گئی ہے۔" وہی خوش باش' بے فکرا لہجہ' جس میں کسی بھی قسم کے ہلکے سے دکھ کی رمق کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ٹھنڈی آہ بھر کے اس نے نگاہیں دوبارہ سامنے کی جانب موڑلیں۔

"جی تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" اس نے گھڑی جیب میں رکھی اور سابقہ موضوع کی طرف آیا۔ "کل آپ کی منگنی ہے۔ ہے تو خوشی کی خبر مگر مجھے تو شاید برسبیل تذکرہ مطلع کیا جارہا ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں ہچکچاتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ شکوے کا بالکل حق ہی نہ رکھتا ہو۔

بات سچ تھی' سو وہ خاموش رہی۔ اس سے مروتاً" بھی تردید نہ ہو سکی۔

اب شاید یہ مجھ سے مدعو کرنے سے متعلق استفسار کرے۔ یہ اس کا خیال تھا' سو وہ منتظر بھی رہی۔ مگر وہ پھر مزید اس وقت تک نہیں بولا' جب تک ایمار کی رہائش گاہ تک نہیں پہنچ گیا۔

"اوکے! مس ایمار!" اس نے الوداعی لہجے میں کہا اور گیٹ کے باہر ہی اپنے قدم روک لیے۔ "میں اب چلوں۔" وہ مسکرایا۔

نارسائی کا کرب دل میں اس وقت اپنی موجودگی کا احساس بڑی شدت سے دلانے لگا۔ اس نے بے بسی سے لب کچلے۔

"سدا خوش رہنا۔" دھیمے لہجے میں آخری فقرہ کہہ کے وہ پلٹا اور قدم بہ قدم اس سے دور ہونے لگا۔

"سدا خوش رہنا۔" ایمار نے اس کے الفاظ زیرِ لب دہرائے اور سوچا۔ یہ التجا تھی' دعا یا ہدایت...؟ وہ یہ بات نہ اس کے لب و لہجے سے پہچان سکی نہ تاثرات سے۔ سو بے دلی سے سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

✲ ✲ ✲

"جوزف صاحب آئے تھے تم سے ملنے۔" وہ قیلولے کے بعد اٹھی تو دادو نے اسے مطلع کیا۔ وہ ایک دم چونکی۔

"کیوں...؟ خیریت...؟" ذکر چھڑتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ ان کے وہ کئی روز پہلے کے دل دکھانے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

والے الفاظ آج بھی ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہیں۔

"خدا جانے۔" داوو نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

"تم سے کوئی اہم بات کرنا چاہتے تھے شاید۔" داوو نے خیال ظاہر کیا۔

"تو مجھے اٹھا دیتیں ناں۔" اس نے بے چینی چھپاتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

"میں نے تمہیں جگانا چاہا تھا مگر انہوں نے خود ہی روک دیا۔" داوو نے اس کی طرف چائے کا کپ بڑھایا۔

"تنہا تھے یا...؟" اس نے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! تنہا تھے۔ تم تو شاید آگاہ ہو کہ ان کا نواسا تو اپنے وطن لوٹ گیا ہے۔" داوو کے جواب پر دل کی سرزمین پر گہرا سناٹا چھا گیا۔

ہاں! مجھے اندازہ تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی تو اپنے وطن لوٹ جائے گا۔ اس نے اداسی سے سوچا۔

مگر دل خوش فہم کو لگتا تھا کہ وہ جانے سے قبل ملنے ضرور آئے گا۔ سو اب پتا چلا کہ میں اس کے لیے نہایت غیر اہم تھی۔ اس نے کپ جوں کا توں میز پہ رکھ دیا۔

"جاتے سمے پیغام چھوڑ گئے ہیں تمہارے لیے۔"

"کون...؟" دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ دھیان ڈیوڈ کی طرف تھا سو اسے لگا داوو ڈیوڈ کے متعلق کہہ رہی ہیں۔

"جوزف صاحب اور کون۔" داوو نے اس کی غائب دماغی پر کسی قدر حیرت سے کہا۔

"اچھا!" وہ سنبھلی۔ "کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہہ رہے تھے کہ مجھ سے آ کے مل لے۔ کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" داوو نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہو آؤں داوو؟" بے اختیاری میں وہ اپنی بے تابی پہ قابو پانا بھولی۔ اس کی بے تابی پر داوو نے کسی قدر تعجب سے گھور کے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"خدا جانے ضروری بات کیا ہو؟" شرمندگی سے کہتے ہوئے وہ دوبارہ کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"بے کار کا سسپنس بے چین کیے دے رہا ہے۔" اس نے اپنی بے تابی کے مظاہرے پر گویا صفائی پیش کی۔

"چلی جاؤ۔ میں نے کب تم پر پابندی لگائی ہے؟" داوو بھلا کب اسے شرمندہ دیکھ سکتی تھیں، سو خالی کپ اٹھا کے وہاں سے چل دیں۔ گہرا سانس لے کر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی راہ لی۔

آسمان مکمل بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

بالکل ایسے جیسے میرا دل اداسی اور افسردگی سے۔ اس نے سوچا۔

"موسم بڑا دلکش ہو رہا ہے۔" اس کے کان کے قریب کوئی بولا۔ اس نے بے بسی سے نچلا لب دانتوں تلے دبایا اور دانستہ اپنا دھیان سامنے درخت پہ بیٹھے پرندوں کی جانب مبذول کیا۔

"انسان کے اندر کا موسم اچھا ہونا چاہیے، باہر کی رت خود بخود خوب صورت لگنے لگے گی۔" وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

اس کی یاد کے پیوند لگ گئے ورنہ
میرے وجود کی اڑجاتیں دھجیاں

کتنی فاصلہ طے ہوا تو اس نے جوزف انکل کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے پہلے اس کی پر تکلف چائے سے خاطر مدارات کی۔ وہ "ضروری" بات جاننے کے لیے بے چین تھی سو اسے ان کی یہ بلاوجہ کی ڈرامے بازی کھلی۔

"آپ نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟" بالآخر اسے استفسار کرنا پڑا۔ چند پل انہوں نے اس کی صورت تکی۔ پھر گہری سانس لے کر گویا ہوئے۔

"اپنے نواسے کی زندگی کی چند اہم باتیں آپ کے علم میں لانے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، سو سوچا آج اس ضرورت کو پورا کر لوں۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"خدا خیر کرے۔" اس کا دل بلاوجہ ہی وسوسوں میں گھرا۔

"ڈیوڈ سے متعلق...؟" اس نے استفسار کیا۔

"ڈیوڈ نہیں، عبداللہ۔" انہوں نے گویا تصحیح کی۔

"عبداللہ...؟" ناسمجھی کے عالم میں اس نے زیرِ لب دہرایا۔

"ہاں... وہ اب مسلمان ہو گیا ہے۔" ان کے سپاٹ چہرے کو وہ چند ثانیوں تک بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

"اچھا...؟" یقین آنے کے بعد اس نے اپنی بے ساختہ خوشی کو بڑی دقتوں سے چھپایا۔

"کیسے...؟" ان کے ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کو دیکھ کر اس نے جھجک کر پوچھا۔

"یہ سب کچھ بتانے کے لیے تو آپ کو بلایا ہے۔" انہوں نے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ یوں جیسے یہ ذکر ان کے لیے ناپسندیدہ ہو، یا پھر یوں جیسے کوئی مجبوری حقیقت بتانے پر مصر ہو۔

"ڈیوڈ میری چہیتی بیٹی "میری" کا بیٹا ہے۔ میری کی تربیت میں بچپن ہی سے اس کی ماں نے مسیحی مذہب کی محبت کا درس دیا۔ جو اس کے مذہب سے لگاؤ سے ظاہر بھی تھا۔ مگر اس کی ایک عادت سے میں خائف بھی رہتا تھا اور نالاں بھی۔ وہ اکثر اپنے مذہب کا مذہب اسلام سے موازنہ کرتی رہتی، اور پھر الجھتی رہتی۔" انہوں نے تھکی تھکی سی سرد آہ بھری۔ "وہ نہیں جانتی تھی کہ لاشعوری طور پر وہ مذہب اسلام سے متاثر ہونے لگی تھی۔ مگر میں بے خبر نہیں تھا۔ میں اس کی طرف سے فکر مند رہنے لگا تھا سو جلد ہی اس کی شادی ڈیلس میں مقیم اپنے خالہ زاد کے بیٹے سے کر دی۔ شادی کے بعد اس کی فون کالز سے اس کی خیریت اور اپنے مذہب سے ان کی انسیت کی خبر نے مجھے کافی مطمئن کر دیا۔" وہ بات اپنے اطمینان کی کر رہے تھے، مگر وہ ایمار کو اس سے حد درجہ آزردہ خاطر لگے۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

"شاید ماضی کے واقعات اس وقت ذہن پر تسلط جمائے ہوئے ہیں۔" اس نے ان کی پرسوچ نگاہوں سے اندازہ لگایا۔

"گزرتے وقت نے اسے ایک بیٹے سے نوازا، جو سات برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی ماں نے اگلے بچے کی آمد کے سبب اسے ہمارے پاس کراچی بھیج دیا۔ وہ وقت بڑا حسین تھا۔" ان خوب صورت دنوں کی یاد بھی ان کی رنجیدگی میں کمی کی وجہ نہیں بن پا رہی تھی۔ وہ مسلسل افسردگی کے حصار میں ہی تھے۔

"اور وقت کو تو یوں بھی گزرنے کی جلدی ہوتی ہے، سو حسین وقت اور بھی سبک رو ہوا۔ ایک روز اطلاع ملی میری مسلمان ہو گئی ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ خصوصاً" میری بیوی کے لیے۔ اس کے لیے یہ صدمہ سہارنا حد درجہ دشوار تھا۔ سو مجھے یقین ہے کہ میری بیوی کی موت کا سبب یہی خبر تھی۔ پھر تو جیسے زندگی سے ساری رونق ہی اٹھ گئی۔ ڈیوڈ ابھی کم عمر تھا۔ یہ بے رونقی تحمل نہیں کر پایا اور واپس اپنے وطن لوٹ گیا۔ زندگی بے کیف تو تھی ہی ڈیوڈ کے جانے کے بعد مزید ہو گئی۔ بہر حال..." انہوں نے آہ سرد بھری۔

"وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔ مگر اب کراچی کی فضا میں میرے لیے پہلے جیسا سکون نہیں تھا۔ سو میں نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ ڈیوڈ سے میرا ٹیلی فونک رابطہ برقرار تھا، سو بارہ برس بعد اس کی آمد کی اطلاع نے میرا دل خوشی سے بھر دیا۔ وہ یہاں صرف مجھ سے ملنے کی خاطر، صرف میری محبت میں آیا تھا۔ مگر پھر یہاں اس کے طویل قیام کا سبب محض میری محبت نہیں کسی اور کی محبت بھی تھی، جو اس کے واپسی کے ارادے کو متزلزل کرنے کا موجب بن رہی تھی۔" وہ ایک دم ہی خاموش ہو گئے تھے۔ مگر محض دم لینے کے لیے پل بھر کو ہی۔

"شروع کے چند دن اسے جھیل کا سحر اپنی جانب کھینچتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ جھیل کے سحر پر کسی اور کا سحر غالب آنے لگا۔ جس روز اسے اس بات کا ادراک ہوا، اس نے مجھ سے آ کے کہا۔" ان کی نگاہوں کے سامنے

وہ دن پوری جزئیات کے ساتھ ابھرا۔

"نانا! روز شام کے وقت جھیل کنارے ایک لڑکی آتی ہے۔ نہ اس کی آنکھیں جھیل سی گہری ہیں، نہ رنگت سونے جیسی۔ مگر اس میں کوئی بات ایسی ضرور ہے جو اس کی موجودگی تک مجھے صرف اس کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔" اس نے سیب پر اپنے دانت گاڑے۔

"بیٹا جی! ذرا دھیان سے۔ یہ ڈیلس نہیں کشمیر ہے۔ یہاں اگر کسی لڑکے کو کوئی دوشیزہ اچھی لگتی بھی ہے تو وہ اس کا اظہار اسی صورت کر سکتا ہے، اگر جو وہ لڑکی اس کی بیوی ہو۔" نانا نے اپنے لیے کافی چھینٹتے ہوئے مصروف سے انداز میں اسے آگاہ کیا۔

"جانتا ہوں۔" اس نے اپنے نانا کو اپنی آگاہی سے مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

"تب ہی مجھے اس سے بات کرنے کے لیے ڈراما کرنا پڑا۔" وہ اپنا "کارنامہ" یاد کر کے محظوظ سے انداز میں مسکرایا۔

"میں نے اس سے کہا، میں راہ بھول گیا ہوں، برائے مہانی! مسٹر جوزف کے گھر تک رہنمائی کر دیں۔ میرا خیال تھا وہ استفسار کرے گی "کون مسٹر جوزف؟" مگر آپ تو کافی مشہور شخصیت ثابت ہوئے۔ وہ نہ صرف پہچان گئی، بلکہ گھر تک بھی پہنچا دیا۔"

اس انکشاف پہ ایثار نے چونک کر جوزف انکل کی سمت دیکھا۔

"تو کیا میں جسے اپنی خوش فہمی سمجھ رہی تھی وہ حقیقت تھی؟" اس کے دل کی دھڑکن بری طرح بے ترتیب ہوئی۔

"اس کے حلیہ بتانے پر میں پہچان گیا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔" جوزف انکل اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھے۔ وہ سر جھکائے اپنی بپتا سناتے ہوئے گویا یہ طے کیے ہوئے تھے کہ اسے ہر بات سے آگاہ کرنا ہے۔

"یہ مجھے اس حقیقت سے کیوں آگاہ کر رہے ہیں، جو میری بے کلی میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔" اس کی بے چینی بڑھی۔

"لیکن میں زیادہ فکر مند اس لیے نہیں ہوا کہ یہ اس کی پہلی محبت نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی لڑکیوں سے اس لحاظ سے متاثر ہو چکا تھا، سو میرا خیال تھا، یہ محبت بھی چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ مگر بڑی غلطی پر تھا میں۔" وہ زہر خند ہوئے۔

"اس کا احساس مجھے تب ہوا جب ایک روز اس سے ملاقات کے بعد وہ بڑا مسرور سا لوٹا۔" ان کی نگاہوں کے سامنے ماضی کا وہ منظر پھر چلنے لگا۔

"اس کی محبت میری رگوں میں لہو کی طرح دوڑنے لگی ہے۔ میں اسے پانے کے لیے سنجیدگی اختیار کر چکا ہوں۔ میرے اس ارادے پہ عمل میں، سوائے مذہب کے کوئی اور رکاوٹ نہیں۔ یہ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔ سو دل کی خوشی کی خاطر میرا مذہب بدلنا از بس ضروری ہو گیا ہے۔"

"میرے خدا!" یہ انکشاف اس کی اداسی بڑھانے کا باعث بن رہا تھا۔ کیونکہ یہ سب کچھ اگر اسے اسی وقت پتا چل جاتا تو وہ اسے پانے کی ہر ممکن سعی کرتی۔ مگر وہ تو بنا کسی کوشش کے اس سے دستبردار ہو گئی تھی، اس کا حصول ناممکن سمجھ کر۔

"اس کے ارادے کی پختگی اس کے لفظوں سے ہی نہیں، اس کے لہجے سے بھی ظاہر تھی۔ سو اس کے فیصلے سے شدید اختلاف کے باوجود میں کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا اگلی ملاقات پہ یہ سب کچھ اس کے گوش گزار کرنے کا۔ مگر وہ اپنے اس ارادے پہ عمل نہیں کر پایا۔ کیونکہ اس لڑکی نے جھیل کنارے آنا چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ ڈیوڈ روز، بلاناغہ اس سے ملنے کی چاہ میں وہاں پہنچ جاتا تھا۔ مگر وہ اسے نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں وہ حد درجہ بے چین و مضطرب رہنے لگا تھا۔ وہ دن میں کئی بار ہر اس جگہ سے گزرتا جہاں سے اس کے گزرنے کا امکان بھی ہوتا۔ کئی روز بعد جب ملاقات ہوئی تو حد درجہ خوشی کے سبب وہ اپنے آپے میں نہیں رہا، سو اپنی بے اختیاری حرکت سے اسے ناراض کر بیٹھا۔" انہوں نے نگاہ اٹھا

کر اپنی بات کی اثر انگیزی اس کے چہرے پہ کھوجنی چاہی تو انہیں سوائے بے قراری کے کچھ نہ ملا۔

"کاش۔۔۔ اے کاش! یہ سب اگر مجھے اسی وقت پتا چل جاتا تو زندگی میں یہ اضطراب مقدر نہ ٹھہرتا۔" اس نے لب کاٹتے ہوئے آنسوؤں پہ پابندی لگانے کی سعی کی۔

"پھر تو گویا بے چینی اس کے اندر اپنا مسکن بنا بیٹھی۔ وہ اس سے ملنے کی چاہ میں سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا۔ مگر سب کچھ بے کار جاتا رہا۔ اسی بے چینی کی حالت میں اس نے مذہب اسلام اپنا لیا۔ اس روز قدرے سکون کی حالت میں اس نے مجھ سے کہا۔

"مذہب کی تبدیلی کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا تم سے زیادہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ بڑا پریشان تھا میں اس حوالے سے۔" اس پل میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام اس کے لیے بھی اتنا سہل نہیں تھا۔" بولتے بولتے ان کے لہجے میں تھکاوٹ اتر آئی تھی۔ انہوں نے پانی کا گلاس لبوں سے لگایا۔

"خدا کی دین کا حال بھی عجب ہے۔ وہ، وہ چیزیں نواز دیتا ہے، جہاں تک سوچوں کی رسائی کا بھی امکان نہیں ہوتا۔ آگ کی تلاش میں نکلنے والا بندہ خدا، واپسی پر پیغمبری کی عظیم الشان "روشنی" لیے لوٹتا ہے۔ کبھی نصیحتوں کے انبار بھی "عمر" کو ابوجہل بنانے سے نہیں روک سکتے اور کبھی قتل کے ارادے سے آنے والا "عمر" بہن کی زبان سے فقط چند آیات سن کر ہی۔ "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔" ڈیوڈ کو یوں باآسانی ہدایت مل جانے پر دل چند لمحوں کے لیے ہی سہی اداسی سے کنارہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"اس کی اس حرکت پر میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے اس پر خوب چیخ چلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ میری کڑوی کسیلی سر جھکا کے سننے کے باوجود اپنی من مانی سے باز نہیں آیا تھا۔" یکایک وہ خاموش ہوئے اور اس کے چہرے پہ نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

"جانتی ہو میری سالگرہ والے دن وہ تمہیں یہاں کیوں لایا تھا؟"

اس نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

"تمہیں اپنے ارادے سے آگاہ کرنے کے لیے، اور تمہاری مرضی معلوم کرنے کے لیے۔"

اس نے گہری سانس لے کر نظریں جھکائیں۔ وہ مجھے اس حد تک چاہتا رہا اور میں بے خبر رہی۔ جب اس وقت لاعلم رہی تو یارب! اب اس حقیقت سے آگاہی کیوں ہوئی؟ اب تو یوں لگ رہا ہے جیسے منزل دو گام پر تھی مگر میں اپنی کم عقلی کے سبب خود اسے کھو بیٹھی۔ اسے لگا دل کی سرزمین سے رخصت ہو جانے والا اطمینان اب کبھی لوٹ کے نہیں آئے گا۔

"وہ اس روز بے انتہا خوش تھا۔ مگر تمہاری منگنی کی خبر نے اس کے ارادے بھی ملیا میٹ کیے اور ساری خوشی بھی۔ اس کی شوخی، مسکراہٹ، بے فکری کہیں دور دیس جا کے بس گئیں۔" تو اسے کے اضطراب کا اثر ان کے لب و لہجے پر بھی ہو گیا تھا۔

"اسے یقین تھا کہ وہ اگر اس وقت بھی تمہیں پرپوز کرتا تو تم اپنے کزن کے مقابلے میں اسے ترجیح دیتیں۔ مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ عین منگنی والے روز تمہارا اس طرح کا کوئی بھی فیصلہ تمہارے لیے کئی مشکلات پیدا کر دے گا اور وہ تمہیں کسی بھی طرح کی آزمائش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

اسے ہر بات سے آگاہ کر دینے کے بعد وہ ایک دم خاموش ہو کر کسی سوچ میں ڈوبے۔ خاموشی کا وقفہ جب لمحوں سے منٹوں تک پہنچا تو وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی دل پہ دھرا بوجھ اب آنسوؤں کے ذریعے کم ہونا چاہتا تھا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ چلوں گی اب۔" مڑ کے اس نے دروازے کی سمت قدم بڑھائے۔

"تم جانتی ہو ان سب باتوں سے میں نے تمہیں کیوں آگاہ کیا ہے؟" اس نے اپنے عقب میں ان کی آواز سنی تو ٹھٹک کے رکی۔

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان سب باتوں سے تمہیں لاعلم ہی رکھوں، ورنہ حقیقت جان کر تمہارے

دل کی کسک مزید بڑھ جائے گی۔ اس کے خیال میں بظاہر جس خواہش کا پورا ہونا ناممکن لگ رہا ہو اور پھر ہمیں پتا چلے کہ اس خواہش کا پورا ہونا ناممکن تو کیا' مشکل بھی نہیں تھا۔ بس ہماری لاعلمی اس خواہش کی تکمیل کی راہ میں حائل رہی تو اس وقت کا افسوس ایک "کاش" کی صورت ساری زندگی ساتھ نبھاتا ہے۔ وہ تمہاری زندگی کو اس "کاش" سے بچانا چاہتا تھا۔"

کس قدر درست اندازہ لگایا ہے اس نے۔ یہ ایک "کاش" اب پیچھا چھوڑنے والا نہیں۔ اس نے افسردگی سے سوچا۔

"مگر انہوں نے اس کی ہدایت کے برخلاف مجھے حرف بہ حرف حقیقت کیوں بتادی؟" وہ حیران تھی۔

"اسی لیے میں نے تمہیں تمام حقیقت بتادی۔" وہ اس کی حیرانی بھانپتے ہوئے بولے۔

"دل پہ مت لینا' مگر ایثار! مجھے یہ بات بھولتی نہیں کہ ڈیوڈ نے صرف اور صرف تمہاری وجہ سے اپنا مذہب چھوڑا اور جب تک مجھے یہ بات بھولتی نہیں' مجھے تم پہ غصہ رہے گا۔" انہوں نے اپنی صاف گوئی اور لہجے کا تیکھا پن اس سے چھپانے کی بالکل کوشش نہیں کی۔

"اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے نواسے کی محبت میں بہت خود غرض ہوگیا ہوں۔ میری نگاہوں سے اس کا اداس چہرہ ہٹتا نہیں۔" ان کے لہجے میں وہی بے گانگی اور درشتی سمٹ آئی تھی جو اس نے ان کی سالگرہ والے دن سہی تھی۔

"جس ہستی کے سبب میرے نواسے کا چین و سکون برباد ہوا' اسے پرسکون دیکھنے کا میں خود میں حوصلہ نہیں پاتا تھا۔ اب تم چاہے میری اس حرکت پہ کچھ بھی سوچو' مجھے اس کی پروا نہیں۔" ان کا حسد عروج پہ پہنچ چکا تھا۔ ان کے تیکھے لہجے پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے ایثار کے لبوں پہ چھب دکھلائی اور وہ مڑ کے دوبارہ دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

خدا جانے میں انہیں اتنی پرسکون کب لگی جو یہ مجھے بے سکون کرنے کے لیے کوشش کرنے لگے۔

چہرے پہ چند بوندیں گری تھیں۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔ بادل پانی سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ بالکل اس کے دل کی طرح۔

"مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں جوزف انکل! کہ آپ کی محنت بھی رائیگاں نہیں گئی۔" اس نے تصور میں انہیں مخاطب کیا۔

"آپ کی "محنت" کے "کاش" کا پچھتاوا اب تمام عمر مجھے اپنی کوتاہی یاد دلائے گا۔ میں کیوں اتنی بے خبر رہی؟ مجتبیٰ تو بغیر کہے میرے دل کی بات پالیتا ہے۔ ڈیوڈ میرے جذبات سے باخبر تھا۔ پھر میں ہی کیوں نہ جان پائی؟" برستی بارش کا فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا۔

"کیا میری محبت اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ میں اس کی ان کہی تک بھی بہ آسانی پہنچ پاتی۔" برسات کے پانی میں نمکین پانی گھلتا جا رہا تھا۔

"اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ برسات کے سبب تمہارے آنسو نظروں میں نہیں آسکیں گے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" وہ نہ جانے کب اس کا ہم قدم ہوا تھا' وہ محسوس ہی نہ کرسکی۔

"تمہارے آنسو میری نظروں میں بہنے سے پہلے ہی آجاتے ہیں۔" مجتبیٰ کا یہ دعویٰ نیا نہیں تھا۔

"یہ شخص ہر بات سے آگاہ ہے' سو اس سے کوئی بات مخفی رکھنے کی کوشش بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔" اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

"ایثار!" وہ دو قدم آگے بڑھ کے اس کے مقابل رکا۔ اس نے رک کر نگاہ اٹھائی۔

"تمہارے آنسو مجھے تکلیف میں مبتلا کردیتے ہیں۔"

ایثار نے دھندلی نگاہوں سے سامنے دیکھا اور ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ اس شخص کے لیے، جو اسے شدید اور بے لوث چاہتا تھا۔

Downloaded From

READING
Section

مریم بنت ارشاد

کھارے گلاب

ہوا تھم تھم کر چل رہی تھی۔ گویا نخریلی حسینہ ناز و ادا دکھاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی ہو۔ بلاشبہ یہ شوخی اس پر خوب جچ رہی تھی۔ یک لخت ناچتی، ٹھمکتی قمری کی مانند ہوا کی سرسراہٹ تھمی۔ ہوا کو کسی کا یوں مخل ہونا پسند نہ آیا تھا۔ شاید کھلتی ہوئی بیلے کی کلیوں نے چپکے چپکے اپنی خوشبو کو سمیٹ کر منہ بند کلیوں میں چھپا لیا تھا۔ ماحول میں سبز پتوں کی باس تنہا رہ گئی، اس تنہائی میں قریب آتے قدموں کی چاپ ابھرنے لگی، اڑان بھرتی قمری کو یہ جسارت ناگوار گزری، اور وہ قاسم سے دور ہوتی چلی گئی۔ فضائیں خنکی عود آئی تھی، اس ذی نفس کے رخساروں پر کھارے پانیوں کی سی نمی پھیلتی جاتی جسے فضا نرمی سے اپنے اندر سمیٹے جارہی تھی۔

چوڑے چکلے شانوں والا مرد سر اور شانے جھکائے زمین پر نظر جمائے لڑکھڑاتے انداز میں چلتا جارہا تھا۔ قرمزی پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر قربان ہوئے جارہے تھے۔ قمری ایک الوداعی ناراض نظر اس پر ڈال کر سرو قد اشجار کی فلک بوس ٹہنیوں کو چھوتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سبز پتوں کی باس میں روانی سے گرتے کھارے پانیوں نے شرکت کی، اور ہر طرف اداسی کا راج بڑھنے لگا، اداسیوں نے گھیرے تنگ کردیے۔ تب ہی ایک منظر آنکھوں کی ساکت پتلیوں پر جمنے لگا۔

”ابا میں نے جان بوجھ کر نہیں مارا۔ بس وہ رول توڑ رہا تھا گیم کے ابا وہ۔“ قاسم بھائی کی منت بھری آواز سماعت کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔

”ابا میں تو اس کا سب سے اچھا دوست ہوں۔ ابا جانے مجھے کیوں نہ پتا چلا اور میں نے اس کا سر پر بیٹ دے مارا۔ اف میں نے میں نے۔“ قاسم بھائی سینے پر مکے مارتے۔ ”میں نے اس کا سر پھاڑ دیا۔“

علی کا سارا وجود اینٹھ گیا، کھارے پانیوں سے لبالب بھرے کٹورے اپنی بے بسی پر نوحہ کناں تھے۔ شعور کی تختیوں پر کھدے وہ مناظر ابھی تک سامنے لہرا رہے تھے۔

”تم سائیکو کیس بنتے جارہے ہو ہمارے لیے، ایک ہی دفعہ کیوں نہیں ہم سب کا گلا گھونٹ دیتے تم۔ کتنے جنونی ہو تم، وحشی انسان ابھی اس کا پچھلا زخم ٹھیک نہیں ہوا اور آج تم نے اس کا سر پھاڑ دیا۔“ تایا قاسم کو پیٹتے جاتے اور وہ۔۔ مسکی سی صورت بنائے منمناتا رہتا۔

”ابا چھوڑ دیں بھائی کو، پلیز ابا۔ اگر ہاشم بھائی زندہ بچ گئے ہیں تو آج آپ قاسم بھائی کو مار ڈالیں گے۔ بس کریں۔“ منظر میں رودابہ کی آمد ہوتی اور وہ اپنے نحیف ہاتھوں سے قاسم کو پٹنے سے بچاتی۔

”اس کمینے کو مر ہی جانے دو، اگر یہ زندہ رہا یونہی ہمیں اذیتیں دیتا رہے گا۔ اس کے جنون کو ختم کرنا ہی ہوگا۔“ تایا ابا ہانپتے کانپتے بولتے جاتے۔ اور تب تک ٹھڈوں، اپنی چھڑی سے اور قریب موجود کسی بھی شے سے پیٹتے جب خود نہ تھک کر گر پڑتے۔ اس منظر کے بعد ایک واقعہ اور اس کے سامنے لہرایا۔

”قاسم۔ قاسم نیچے آؤ۔“ تایا ابا دھاڑتے۔ قاسم اترے چہرے کے ساتھ سامنے آکھڑا ہوتا۔

”منہ چھپا کے کیوں پڑے ہو اب وحشی انسان۔ کس کس کو ادھیڑ کر آرہے ہو۔ اور نہیں تو اپنے باپ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

اور اپنی اس جوان بہن کا ہی خیال کرلو۔ کتنا رسوا کراؤ گے ہمیں اور۔" تایا ابا کی آواز ان کی ڈھلتی عمر کی چغلی کھارہی تھی۔ وگرنہ قاسم کسی کو پیٹ کر آتا اور تایا ابا اسے مار مار کر ادھ موانہ کردیتے' یہ بعید از قیاس بات تھی۔

"ابا میں کیا کروں، مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میں جتنی

بھی کوشش کرلوں میں آپے میں نہیں رہتا۔"

یادوں کے مٹتے ہیولے اس کے جسم میں انگارے دوڑانے لگے تھے۔ علی نے شدّت ضبط سے اپنی مٹھیوں کو سختی سے بند کیا۔ سبز پتوں کی باس میں کافور کی بو پھیلنے لگی۔

کڑوا دھواں جو اس کے اپنے جلتے جسم و جاں سے آزاد ہو کر اوپر اٹھتا تھا وہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ آنکھوں میں چبھن بڑھنے لگی۔

"پاگل خانے چھوڑ آتا ہوں پھر تمہیں، میں اب مزید اپنے چھوٹے بھائی کے بچوں کو پٹتے نہیں دیکھ سکتا۔ کب تک وہ تمہاری دیوانگی کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔"

"ابا ایسے نہ کریں۔ ایک بس ایک موقع اور دیں بھائی کو۔ پلیز ابا۔" رودابہ نے تایا ابا کے سامنے دیوار بنتے ہوئے کہا۔

"لے جانے دو، اور ہٹو سامنے سے۔ بلکہ جو کل شام اس نے تمہارا ہاتھ جلایا تھا وہ بھول گئی ہو تم۔"

یادوں کی یلغار نے اسے ادھ موا کر ڈالا تھا۔ وہ اس جال کے شکنجے میں تھا۔ لیکن اس کے بے ربط قدم اسے تھکا ڈالنے کے قریب تھے کہ جب وہ مضطرب اور نڈھال انداز میں بائیں طرف بنی روش پر بیٹھ گیا۔

وہ اگر یہ سمجھتا تھا کہ گھر سے فرار ہو کر حقیقت سے منکر ہو سکتا ہے۔ تو یہ خیال ہی غلط تھا۔ اس کے اعصاب مسلسل دباؤ کی وجہ سے شل ہو رہے تھے۔

"تمہیں رودابہ سے شادی کرنا ہو گی، اسے میرا فیصلہ سمجھو یا حکم، بس تمہیں ہر حال میں ایسا کرنا ہو گا۔" ابو کی پاٹ دار آواز نے اس کا تعاقب کیا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"ابو! آپ جانتے ہیں میں وہاں شادی نہیں کروں گا پھر زبردستی کر کے نہ آپ خوش رہ سکیں گے نہ میں۔" علی کے دو ٹوک لہجے سے ابو ذرا گھبرائے تھے لیکن ظاہر کیے بنا ردِعمل دیا۔

"علی اگر ایسا ہو گا تو میرا بھائی ساری زندگی کے لیے میرا ممنون رہے گا۔ کیا میں اسے اپنے قریب آنے کا موقع نہ دوں۔ تم ہم دونوں کو علیحدہ کر دینا چاہتے ہو کیا؟"

"میں ایسا تو نہیں چاہتا لیکن میں خود کو مجبور پاتا ہوں۔ علی مدافعانہ انداز میں بولا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں یہ، لیکن قاسم اب ذہنی طور پر بالکل تندرست ہے، اگر ہم ہی اسے سپورٹ نہیں کریں گے تو وہ خود کو تنہا محسوس کرے گا۔ تم جانتے ہو وہ تشدد پسند اس لیے بنا کیونکہ بچپن میں وہ اپنی ماں کو تمہارے تایا ابا کے ہاتھوں پٹتے دیکھتا تھا۔ اس کی پرورش اس کی ماں نے ان ہی خطوط پر کی تھی۔"

"لیکن کیوں ابو!" اس نے ان کی ادھوری بات سن کر کہا۔

"بس آگے میں تمہیں کچھ اور نہیں بتا سکتا ہاں اتنا کہوں گا جو زہر اس کی ماں نے اس معصوم کی رگوں میں بھرا تھا۔ وہ اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ ہم مل کے سب ٹھیک کر لیں گے فی الحال ماضی کو چھوڑ کر ہمیں حال میں ایسے اقدام کرنے ہیں جو ہم سب کے روشن مستقبل کی ضمانت ہو سکیں۔ کل شام نکاح کے لیے تیار رہنا۔ میں امید کرتا ہوں تم اس مشکل وقت میں اپنے باپ کو تنہا نہیں کرو گے۔" وہ اس کا شانہ تھپک کر چلے گئے۔ لیکن وہ یہ نہ جان سکے کہ وہ وہیں رک گیا۔ بت بنا، شاید اسے وہاں کھڑے قرن بیت گئے ہوں، پھر وہ ایک دم سے اپنے کمرے سے نکل کر باہر چلا گیا۔ چلتا گیا۔ اس کے ذہن و قلب پر بوجھ تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ تھک کر درد سے چُور ہوتے قدموں کے ساتھ وہ رات کے تیسرے پہر ایک فیصلہ کر کے لاؤنج کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اب وہ قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ شاید ہاں۔۔۔ شاید نہیں۔۔۔ خیر۔

* * *

اگلی رات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ان کے آنگن میں اتری تھی۔ باہر ڈھول کی تھاپ، تالیوں کی گونج اس پر کوئی اثر نہ کر پا رہی تھی۔ علی انتہائی بدلی

سے آئینے کے سامنے کھڑا شیروانی کے بٹن عجلت میں بند کر رہا تھا، لیکن بٹن تھا کہ بند ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس کے ظاہری تاثرات کے ساتھ اس کے اندر کے تاثرات میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔

تاثرات کا درجہ حرارت منفی ڈگری سے نچلے درجوں میں جا چکا تھا جہاں پر سرد ترین، منجمد تاثرات اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت موجود ہوتے ہیں۔ "خوشی" یا "خوش کن احساس" کا خیال بھی اس کے نہاں خانوں میں عنقا تھا۔ ہر سو سفید ذرے اڑے جا رہے تھے۔ جو جذبات کو منجمد کر دینے کے درپے تھے۔ وہ تیزی سے اپنی تیاری کر رہا تھا گویا اس کے پاس وقت کم ہو۔ گیلے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا وہ آئینے میں خود کو اجنبی نگاہوں سے تولتا رہا پھر یکایک ٹھہر کر گردن موڑی۔ نیم وا دروازے کے پار بدھر ہنسی گونجی۔ اس ہنسی میں بلاشبہ کوئی ایسی کھنک تھی جس کے سامنے شاید سارے سُر ہیچ تھے۔ وہ ہنسی سب سُروں میں عروج پر تھی، خوشی کی لہریں اس سے پھوٹتی تھیں۔

علی کی کشادہ پیشانی پر پسینہ اترا، پھر ہتھیلیاں گیلی ہوئیں، چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا پھر دوڑ کر چوکھٹ پار کی۔

"بات سنو رودابہ!" علی نے اونچی آواز میں پکارا۔

"جی!!" رودابہ حیرت سے پلٹی اور سہج سہج قدم رکھتی آگے آئی۔ اس کی سہیلی جب پرے چلی گئی تو علی نے اس کی کلائی کو اتنی سختی سے تھاما کہ رودابہ کو لگا اس کی نسیں کاٹ دی گئی ہوں۔ وہ خوف سے اسے تکنے لگی۔

"بہت خوش ہونا۔ بہت جلد اس خوشی سے بھی چھٹکارا پالو گی تم۔" رودابہ کی سماعت کو سرد آواز سنائی دی۔

بھاری، سخت آہنی گرفت تلے بیلے کی کلیوں اور گلاب کی پتیوں نے احتجاج کیا۔ گھور سیاہ پتلیوں میں کڑوے پانی نے جگہ بنائی اور لہو رنگ سے رنگے ہونٹوں میں فریاد اتر آئی۔

"میرا کیا قصور ہے، آپ کیوں مجھے رُسوا کرنے پر تلے ہیں۔ میرے باپ کے لاغر تن میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ بیٹی کے اجڑنے پر حوصلہ کر لے گا۔ وہ مر جائے گا۔ انہیں مت ماریے پلیز۔"

"تو جاؤ پھر تم خود جا کر سب کے سامنے انکار کر دو کہ تم مجھ سے نکاح نہیں کرو گی۔" سارا وزن اس کے کندھوں پر ڈال کر وہ اس کی کلائی جھٹک کر آگے بڑھنے لگا تو اس کی سماعت کسی آواز سے زنجیر ہوئی۔

"میں کبھی انکار نہیں کروں گی۔ سن لیا آپ نے۔" اس نے مردہ ہوتی ہمّت کو جھٹکے سے سہارا دینا چاہا، لیکن ناکام رہی۔

"تمہارے بھائی نے مجھے بہت زخم دیے ہیں، اب تمہاری باری ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی اگر تم اس کا تاوان بھرنے کو رضا مند ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، میں تمہیں اذیت سے پُر زندگی دوں گا۔ سن لیا تم نے۔" سرد لفظوں نے رودابہ کو ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

ماحول میں باسی "مردہ" پھولوں کی خوشبو رچنے لگی۔ پتیاں جا بجا اس کے گجروں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اس کی ذات بھی یونہی ان بے جان ہوتے پھولوں کی طرح بکھرنے لگی تھی۔

چٹکی ہوئی چاندنی اس کے سراپے پر نظریں ٹکائے نہیں تھک رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سہیلیوں کے ساتھ آئی اور اسے قاسم اور اس کی دلہن کے پہلو میں بٹھایا گیا۔

تایا ابا نے آتے ہی اس کا ماتھا چوما اور اسے دعا دی۔ اتنی دقتوں سے وہ خود کو قابو میں کیے ہوئی تھی کہ اسے حیرت تھی وہ اب تک مری کیوں نہیں۔۔۔ ان الفاظ میں موت جیسا ٹھنڈا اور بے رحم تاثر تھا۔ انتہائی خوف ناک۔ وہ بمشکل لبوں سے مسکراہٹ چپکا کر چہرے کے تاثرات نارمل رکھے ہوئے تھی کہ اس کی نشست پر اس کا اضافہ ہوا۔ درد اس کی کلائی میں پھر سے لوٹ آیا تھا۔ سرمئی نگاہوں میں کڑوے پانی نے امڈ امڈ کر آنے کی جسارت چاہی تھی۔ وہ بے بس بیٹھی رہی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

جانے پھر لمحے کیسے بیتے تھے۔ اس کو کچھ ہوش نہ رہا۔ اس کی سوچوں کو دھچکا تب لگا جب اس نے ابا کو خود سے نکاح کی اجازت لیتے پایا۔ اس کی سماعت نے علی کے اقرار کو من وعن سنا۔ اسے ایک گونہ اطمینان ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور معذرت کرتے ہوئے سب سے دور چلا گیا۔ مروّت تو اس میں نام کو بھی نہ تھی۔ تاروں نے مسکرا کر اسے مبارک باد دی تھی۔ ہواؤں نے سماں باندھ ڈالا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو لوٹ آئی تھی۔ دور کہیں جیسے مور محو رقص تھے۔

روادبہ نے نکاح کے بعد اپنے بھائی قاسم کی مہندی میں بھی حصہ لینا تھا' سو وہ ان تیاریوں میں لگ گئی۔

ادھر علی کمرے میں دائیں سے بائیں چکر کاٹ کاٹ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ "مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ ساحرہ ہے۔ وہ باندھ لے گی مجھے' یہ بہت غلط ہو گیا۔" لامتناہی سوچیں اسے گھیرے میں لینے لگیں۔ پھر اس نے خود کو اس کے سامنے پایا۔ وہ تو یوں مطمئن تھی جیسے اس کا خواب پورا ہوا ہو۔ ادھر وہ جلے پیر کی بلی بنا ہوا تھا۔ اسے شدید طیش کی لہر نے آگھیرا۔ وہ پلٹا' نشست پر اپنی دلہن کے ساتھ براجمان قاسم مسکرا کر اس سے بات کر رہا تھا۔ منظر سے روادبہ غائب ہوئی اور اس کی کنپٹیوں میں لہو ابلنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اضطراری عمل تھا۔ باہر پٹاخوں اور فائر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سب لڑکے ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔

اس کا ہاتھ اٹھا اور قاسم کا نشانہ تاک کر گولی سائلنسر لگے پستول سے نکل کر راستے میں معلق ہو گئی۔ وہ گولی اس کے نہاں خانوں میں موجود کسی جذبے کو جا لگی۔

"ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔ وہی۔۔۔" علی کو لگا گولی اسے لگی ہے۔ چاروں طرف خون کے چھینٹے اڑتے رہے اور اس کو بھگوتے رہے۔ روادبہ کے کندھے سے خون ابلتا دیکھ کر وہ اس کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور روادبہ کی بند ہوتی آنکھوں میں سوائے بے یقینی کے اور کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ ماننے سے ڈرتا تھا۔ خوف کھاتا تھا کہ روادبہ سے اس کا کوئی بھی جذبہ مشترک ہے۔ آج جب خود اسے اپنے ہاتھوں سے گولی ماری تو اس کا یقین اس کے سامنے اژدھے کے روپ میں آن کھڑا ہوا تھا۔

"سب اسپتال میں ہیں۔ تم کہاں ہو' تمہاری بیوی یہاں مر رہی ہے اور تم کہیں اور ہو۔" ابو کی چیختی ہوئی آواز موبائل کے اسپیکر پر گونج رہی تھی اور وہ گونگوں کی طرح بس انہیں سنے جا رہا تھا۔

"آجاؤ اب ورنہ اگر وہ مر گئی تو میں تمہیں اس کا منہ بھی نہیں دیکھنے دوں گا۔" وہ الفاظ نہیں تھے' پگھلا ہوا سیسہ تھے جو اس کی سماعت میں بہہ رہے تھے۔

"اگر وہ مر گئی۔۔۔" اتنے خوف ناک الفاظ اس نے آج تک نہیں سنے تھے۔

"قاسم کو گولی مارتے ہوئے وہ کہیں نہ تھی' اچانک کہاں سے آ گئی تھی۔" وہ خود کلامی کرنے لگا۔ اس کی ذہنی حالت انتہائی مخدوش تھی۔

"ہاں جب وہ لہرا کر گری تھی تو پھولوں کی پتیاں جو اس نے تھام رکھی تھیں اس پر گرتی چلی گئیں۔" اسے وہ منظر پھر سے یاد آیا تھا۔ علی نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں' لیکن ایسا کرنے سے وہ حادثہ نہیں بھول سکتا تھا۔

"علی تم یہاں ہو؟ پلیز چلو۔ تم نہیں جانتے اس وقت اسپتال میں تمہارا ہونا کتنا ضروری ہے۔" ہاشم بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہنے لگے۔ اس کی پریشانی کو روادبہ کی خراب حالت پر محمول کرنے لگے۔

"ایک میں ہی تو غیر ضروری ہوں بھائی۔۔۔ میں نے روادبہ کو گولی ماری۔۔۔ ان ہاتھوں سے۔" ہاشم بھائی بے یقینی سے اسے گھورنے لگے۔

"تم۔۔۔ تم نے روادبہ کی جان لینے کی کوشش کی۔" یک دم ہاشم بھائی نے بپھر کر اس کے چہرے پر چانٹا رسید کیا۔

"اگر اتنی ہی نفرت تھی تو گلا گھونٹ دیتے۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان یوں جھول تو نہ رہی ہوتی' آخر کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا۔۔۔ تم۔۔۔" وہ تیز تیز بولتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں قاسم بھائی کو گولی مارنے لگا تھا۔ وہ شاید زمین پر بیٹھی تھی۔ میں اسے نہیں دیکھ پایا تھا۔ جب میں نے گولی چلائی تو وہ کھڑی ہو رہی تھی۔۔۔ تو۔۔۔ اسے لگ گئی۔" علی کی زبان سارا قصہ سناتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی۔ دور جھینگروں کی آہ و بکا کی آوازیں تھیں، نوحے تھے۔ اس کی ہتھیلی سے پھوٹتی مردہ گلابوں کی خوشبو سرسرانے لگی۔

"تم نے یہ سب کیوں کیا آخر۔۔۔؟" ہاشم بھائی نے اصل وجہ پوچھی۔ جواب میں وہ سب بتاتا چلا گیا۔

"قاسم بھائی نے آپ کا سر پھاڑا تھا۔ میری ناک کی ہڈی توڑی، وغیرہ وغیرہ۔" وہ سب باتیں تحمل سے سنتے رہے۔ پھر بولے تو ان کے لہجے میں ٹوٹتے کانچ کی آواز تھی۔

"تم چھوٹے تھے، حساس بھی، جب ہی کچھ باتوں کی آگہی نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے، اگر تم جان جاتے تو قاسم کو کبھی گولی مارنے کی جسارت نہ کرتے، تائی امی کا کردار ٹھیک نہ تھا۔ جب تایا ان کو روکتے وہ اور باغی ہوتیں اسی سرکشی میں انہوں نے قاسم بھائی کو بھی ورغلایا اسی لیے وہ جنونی ہو گیا۔ بچپن کے نقش اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتے رہے۔ وہ اپنے غصے پر کنٹرول نہ کر پاتا۔ پھر گھر چھوڑ کر تائی بھاگ گئیں۔ پھر بومسخ شدہ شخصیت قاسم نے اپنائی اس میں اس کا تو کوئی قصور نہ تھا۔" ہاشم بھائی کے لہجے میں کھارے پانیوں کی سی نمی تھی۔ علی سر جھکائے سرخ آنکھوں سے ہر طرف لہو کے چھینٹے اڑتے دیکھتا رہا۔ اس کی روح گھائل ہونے لگی۔ جذباتی پن میں اس نے بے وقوفی کی حد پار کر ڈالی تھی۔ وہ از حد شرمندہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"مریضہ کو ہوش آگیا ہے۔ اب آپ ان سے مل سکتے ہیں۔" ڈاکٹر کی آواز خوش کن تھی یا شاید علی کو لگی۔ وہ سنگی بینچ سے جس تیز رفتاری سے اٹھا تھا۔ ویسے ہی پھر بیٹھ گیا۔ وہ کم از کم اس وقت ان بے یقین آنکھوں سے ہم کلام ہونے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ باہر گلابوں کی مہک اسے اندر جانے پر اکساتی رہی مگر وہ چپ کی بکل مارے بیٹھا رہا۔

"اٹھو! دیکھو وہ تمہیں بلا رہی ہے۔" ہاشم بھائی نے علی کے کندھوں پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ فضا میں جلترنگ سی ہنسی گونجی تھی۔ اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا؟ نہیں، وہ اقرار سے ڈرتا تھا۔ پھر اس نے قدموں کو اٹھتے پایا جو چلتے چلتے بے بس ہوئی روولبہ کے بیڈ کے قریب جا کر خود ہی تھم گئے۔ جیسے جانتے ہوں کہ یہی منزل ہے۔

"تم ہر دفعہ کیوں قاسم بھائی کے دفاع میں آگے آجاتی ہو۔" دھیمی آواز میں سلسلۂ کلام جوڑا۔ خاموشی جو سامنے چوبی کھڑکی سے جھانک رہی تھی، مسکانے لگی۔

"وہ میرے بھائی جو ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں۔" وہ نقاہت زدہ آواز میں دھیرے سے بولی۔

علی گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے قریب پڑے صوفے پر ڈھیر ہوا۔ اس کی روولبہ سرخ خون سے رنگی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں تھاما گلاب کی پتیوں کا تھال ایک جھٹکا لگنے سے الٹ گیا تھا۔ پھر وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھکنے لگی۔ جھکتے جھکتے زمین سے جا لگی۔ چہرے کا رخ البتہ علی کی جانب تھا جو اس سارے معاملے پر دم بخود تھا۔ روولبہ کے رنگین شرارے کو جلتے دیوں سے آگ لگنے لگی اور اب علی کے وجود میں شرارے پھوٹنے لگے۔

خاموشی مسکاتے مسکاتے لب بھینچے دونوں کو تکنے لگی۔ پھر رخ پھیر کر دور ہٹتی گئی۔

"سوری روولبہ۔" وہ ہولے سے بڑبڑایا تھا۔ اور یہ بڑبڑاہٹ بہت مشکل سے وہ سن پائی تھی۔ صد شکر تھا کہ وہ مسافر بننے سے پہلے لوٹ آیا تھا۔

وہ دھیرے سے آنکھیں موند گئی۔ گلابوں کا گداز پن اس کے وجود کا احاطہ کرنے لگا۔ گلابوں کی سوندھی مہک اسے کھلتا گلاب بنانے لگی۔

☼

سمیرا حمید

ربّ البشر

"اللہ کی محبت مجوب ہے۔"

لبنان کے پہاڑی گاؤں کے سرنگ نما گھر کے اندھیرے کمرے میں بند سیبل پیاس کی شدت سے صحرا ہوتی جارہی ہے۔ اس کے اندر کی بچی کچی رحم دلی اس صحرا میں کانٹے بن کر ابھر رہی ہے۔ لکڑی کا کواڑ بند ہے' کواڑ سے اگلا کواڑ بھی بند ہے۔ اس کا منہ کس کر باندھ دیا گیا ہے۔ وہ دمے کے مریض کی طرح کھانس کھانس کر اپنی جان دے دینا چاہتی ہے۔ اس کے خون میں نفرت حلول کرتی جارہی ہے کہ اسے یہاں ایسے بے بس کر کے رکھا ہوا ہے۔

"جو ماں کے حصے سے بچ گیا تھا' وہ میرے حصے میں ڈال دیا گیا ہے۔ بے رحمی کا دروازہ ابھی بھی بند نہیں ہوا۔"

اس کا دل اس غم سے ناسور بن گیا اور خیال نے اس کے روم روم کو نئے سرے سے "نافرمان" کردیا۔

"کاش ماں جان لیتی کہ خدا نے باقی ماندہ سزا کے لیے مجھے امریکہ سے یہاں لا پٹخا ہے۔ اپنے اس بندے کے ہاتھوں جو اس کی عبادت کرتا ہے' اس بندے کے

مکمل ناول

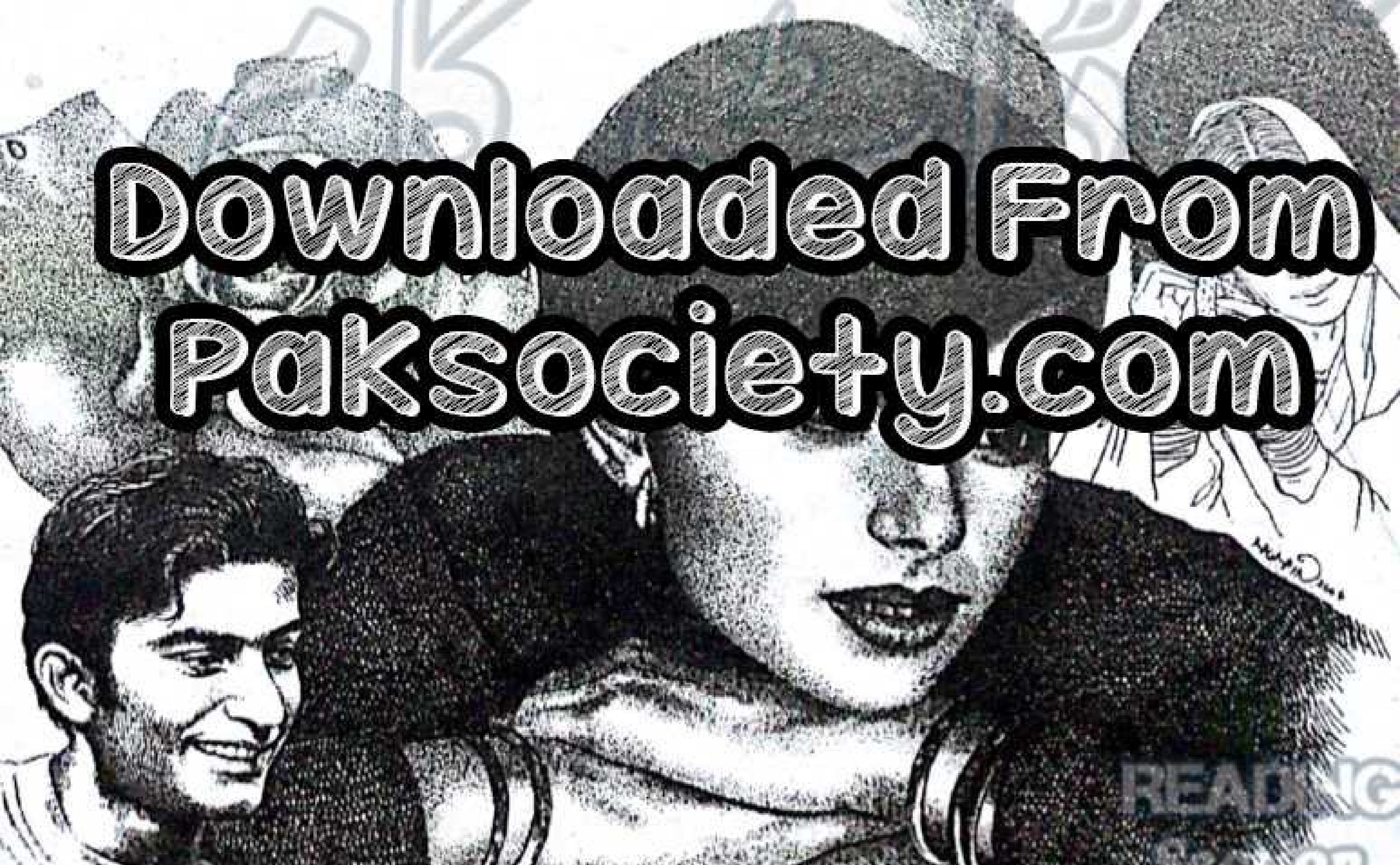

Downloaded From Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

لیے، جو اسے فراموش کرنے کا گناہ کرتا ہے۔"

اس احساس نے یقین ہو کر اس کے اندر آگ لگا دی کہ وہ اس جگہ صرف اس لیے بند ہے، کیونکہ وہ موسی کی شان میں گستاخی کرتی رہی ہے۔ اس کے منہ پر تھپڑ مار چکی ہے، اسے ذلیل کرتی رہی ہے۔ وہ اسے یہاں اٹھا کر لے آیا ہے، کیونکہ وہ اس کا مذاق اڑاتی رہی ہے۔ اس پر لعنت بھیجتی رہی ہے۔

چٹائی پر اوندھی گری وہ شدید نفرت سے نبرد آزما تھی۔ اگر اس کے ہاتھ پیر آزاد ہوتے تو وہ دنیا کو بھسم کر دینے کا اہتمام کرتی۔ اگر اس کا منہ کپڑے میں کسا ہوا نہ ہوتا تو وہ بلند آواز میں چلا کر دنیا کو وحشت زدہ کر دیتی۔ اگر اس کے آس پاس صرف اندھیرا نہ ہوتا تو اس کے واویلے پر حشر بپا ہوتا۔

"اگر میں بددعا دے سکتی تو موسی کو دیتی کہ اس کے دل میں وہ آگ بھڑک اٹھے جو اسے موت سے آشنا تو رکھے لیکن موت عطا نہ کرے۔"

اپنے تنہا ہونے کے یقین نے اس کا سکون تہ و بالا کر دیا۔ نیند میں کئی بار اس کی آنکھ کھلی، کئی بار اس نے خود کو لبنانی گاؤں سے بروکلین میں پایا۔ اندھیرے کی زیادتی اسے بار بار جھنجوڑتی رہی۔

"ہم جو اچھے عمل کرتے ہیں وہ روشنی میں ڈھلتے جاتے ہیں، پھر یہ روشنی موت کے بعد ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ سیبل موت کے بعد میرا سفر اندھیروں کی ہمراہی میں گزرنے والا ہے۔ میں کوشش کر کے بھی اپنے لیے روشنی اکٹھی نہیں کر سکی، لیکن تم تو ضرور کر لینا۔"

ماں روشن موم لیے اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی، وہ ماں، جو مر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

ماں ـــــ

امریکی شہر بروکلین میں طلوع ہونے والا سورج اس دن صبح سے ہی ایسے دل گرفتہ تھا جیسے اسے کسی قبر میں غروب ہونے کا حکم ملا ہو۔"

وہ گھر آئی تو ماں میز پر سر رکھے ایسے بیٹھی تھی جیسے وہ میز سے راز و نیاز میں مصروف ہو۔ چونکہ ماں کو ہر خاص و عام چیز سے راز و نیاز کرنے کی عادت تھی۔ اس لیے اس نے کسی قدر غصے سے ماں کا دیکھا۔ اسے ہر دوسری چیز کی طرح اپنی ماں سے بھی نفرت تھی۔ بلکہ اسے سب سے پہلی نفرت اپنی ماں سے ہوئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خو ماں کو گلا گھونٹ کر مار دیتی۔

کچن کاؤنٹر پر کھانا کھانے کے لیے پلیٹیں اور چمچہ تیار رکھے ہوئے تھے۔ کیا ماں اس انتظار میں تھی کہ وہ آئے اور وہ دونوں مل کر کھانا کھائیں۔ اس نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ وہ اس کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھائے گی۔ کیا وہ بھول گئی کہ بیروت میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اگر وہ بھول بھی گئی ہے تو وہ اسے یاد کرا دے گی۔

برتنوں نے بہت شور کیا مگر ماں نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ آج سے پہلے ایسا ہوا تو نہیں تھا کہ وہ گھر آتی تو وہ یوں میز پر سر رکھے اونگھ رہی ہوتی۔ کیا وہ اتنی ہی گہری نیند سو رہی تھی؟ جب سے وہ لبنان سے بھاگ کر امریکہ آئی ہے، وہ کبھی گہری نیند نہیں سو سکی، اس کا تو یہ ہی کہنا رہا ہے۔ پھر آج کیسے؟ آج وہ جاب پر بھی نہیں گئی؟ کیوں؟ اس کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے!!

کھانا گرم کر کے، پلیٹ اٹھا کر سیبل اپنے کمرے میں آ گئی اور اپنے کمرے کی کھڑکی کے پٹ میں آڑی ترچھی بیٹھ کر کھانے لگی۔ دو گھنٹے بعد اسے گھر سے باہر جانا تھا۔ الارم لگا کر وہ سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے حیرت سے الارم کلارک کی طرف دیکھا۔ وہ بج رہا تھا اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد بج رہا تھا۔ الارم ہاتھ میں لے کر اس نے غور سے دیکھا۔ اس نے تو دو گھنٹے بعد کا الارم سیٹ کیا تھا اور الارم پندرہ منٹ بعد ہی بجنے لگا تھا۔ اس نے الارم کلارک اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

"اس گھر کی ہر چیز بے کار ہے۔"

دوبارہ اسے نیند نہیں آ سکی۔ اپنی اسائنمنٹ کے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

لیے اسے کچھ کتابیں چاہیے تھیں۔ اسے بک اسٹور اور لائبریری جانا تھا' ورنہ وہ رات تک سو سکتی تھی۔ وہ شاور لینے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنے بال خشک کر رہی تھی' جب دیوار سے زخمی ہو کر گرا ہوا الارم پھر سے بجنے لگا۔ اس بار اس نے الارم اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

"اس گھر میں سب سکون برباد کرتے ہیں۔"

جب وہ نیچے آئی تو ماں میز پر سر رکھے ویسے ہی سو رہی تھی۔ اسے حیرت تو ہوئی لیکن ماں کے پاس رک کر پوچھنا کہ وہ میز پر سر رکھے کیوں سو رہی ہے' اس نے اپنی توہین جانا۔ ماں سے کلام نہ کرنے کا عہد وہ کر چکی تھی اور پوری ایمان داری سے اسے نبھا رہی تھی۔

وہ رات کو واپس آئی تو حیرت انگیز طور پر ماں وہیں میز پر اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے ہال کی بتیاں روشن کیں اور کھانے کی میز کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ کر ماں کو دیکھنے لگی اور پیر جھلانے لگی۔ میز کے عین سامنے کی دیوار کی کیل پر لگی لکڑی کے دانوں کی تسبیح ہل رہی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں' ہوا تھی نہ کوئی ارتعاش' پھر وہ تسبیح کیوں ہل رہی تھی؟

"کیا واقعی اس گھر میں میری کی روح بھٹکتی ہے۔" اس نے تمسخر سے سوچا۔

وہ کچن میں آئی اور اس بار اس نے برتنوں کا استعمال پر شور انداز سے کیا۔ پلیٹ کو گر جانے دیا' گلاس ٹوٹ جانے دیا' چمچے کو پین میں زور سے پٹخا' پھر بھی ماں کا سر میز سے نہیں اٹھا۔

"تو یہ چاہتی ہے کہ میں اسے پکاروں' اس سے بات کروں۔ ہونہہ! ڈرامہ کر رہی ہے۔" کھانا نکال کر وہ اوپر چلی گئی۔ کتابیں کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیں' لیکن پھر کتابوں کے صفحے الٹتے اسے بے انت ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اسے لگا کہ کوئی بد روح اس کے پاس کھڑی اس کی گردن میں اپنے دانت گاڑ رہی ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی نیچے آئی۔

"ماں!" اس نے تھوڑا جھنجلا کر کہا' لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ کیل پر لٹکتی تسبیح ابھی بھی ہل رہی تھی۔ وہ ماں کی پشت سے اس کے سر کی طرف جھکی اور یک دم دہشت زدہ ہو کر تیزی سے پلٹی کہ کچن کاؤنٹر پر رکھے کئی برتنوں سے ٹکرا گئی۔ خون کی ایک باریک لکیر ناک سے نکل کر میز پر گر کر جم چکی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر ماں کے کندھے کو ہلایا اور پھر اپنے ہاتھ کو اس کی ناک کے قریب رکھا۔ جس تیزی سے چیخ اس کے منہ سے نکلی تھی' ایسے ہی اس کے پیروں سے جان نکلی۔ پہلے وہ میز کے قریب زمین پر گری' پھر وہ گرتے پڑتے میز سے دور ہوتی گئی۔

"عدینہ مر گئی۔۔۔"

وہ اتنا سہم جائے گی' اسے اندازہ نہیں تھا۔

"میں ایسے مرنا چاہتی ہوں کہ میں ہوں اور خدا۔۔۔ میری موت کی خبر میرا جسم تو دے' لیکن میری روح نہیں۔ اپنی موت میں مکمل تخلیہ میں چاہتی ہوں۔"

"ماں چلی گئی۔" سمبل نے اٹھنے کی کوشش کی اور دیوار کا سہارا لینا چاہا' لیکن وہ اٹھ نہیں سکی۔ اس نے

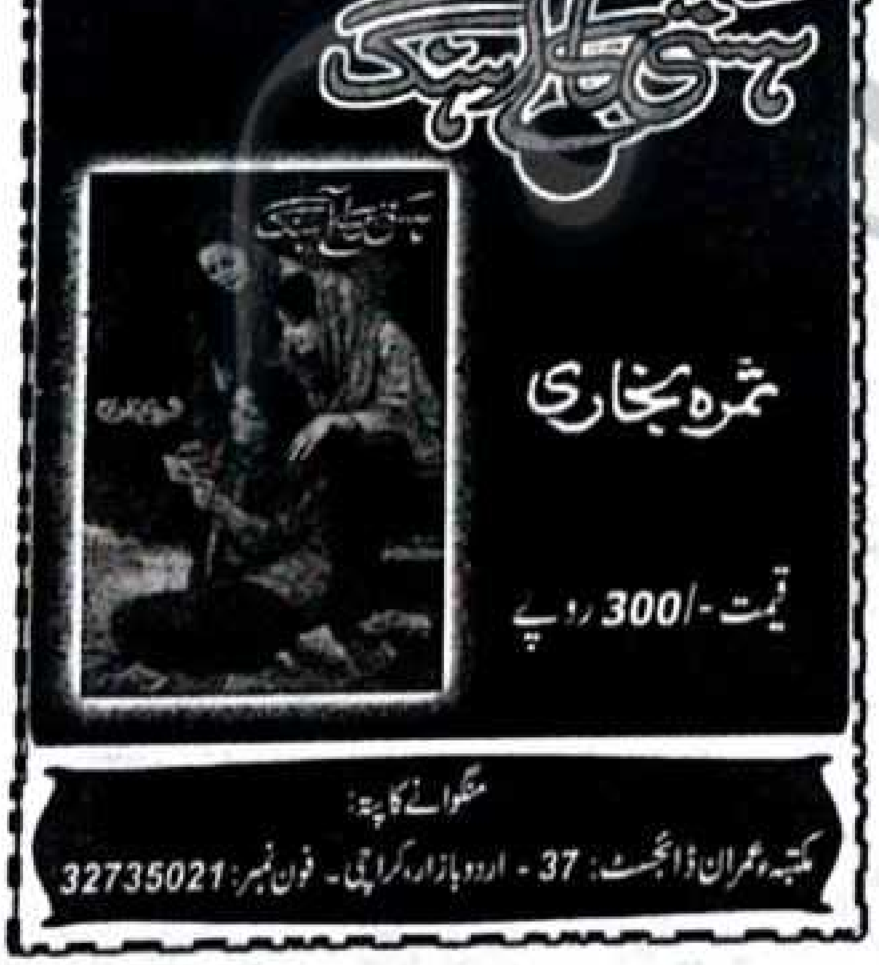
ہستی کا آہنگ

ثمرہ بخاری

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

سر اٹھا کر دیکھا، تسبیح اوپر کیل پر موجود تو تھی، لیکن پیشانی کے محراب کی طرح جامد تھی۔ اس ساری دھوکہ دہی پر اس کا جی کھول گیا اور غصے کی زیادتی اور نفرت کی تیزی کی وجہ سے وہ اٹھ کر میز کی طرف آئی۔ سفید بالوں کی لٹیں جو میز کے تختے پر بکھری تھیں کو اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے پرے کیا اور آنکھوں کو دیکھنا چاہا، آنکھیں بند تھیں۔

"دنیا کے نظاروں سے میرا دل اوب چکا ہے۔ جب دوسری دنیا میں میری آنکھیں کھلیں تو ان میں وہ بینائی نہ ہو جو میں اس دنیا میں رکھتی تھی۔ جو کچھ میں اس دنیا میں دیکھ چکی ہوں، وہ میں اس جہاں میں جاتے ہی بھول چکی ہوں۔"

اب جب اس کی موت کی تصدیق وہ کر ہی چکی تھی تو اس نے اپنی ہمت کو نئے سرے سے مجتمع کیا اور عدینہ کے سر کو اٹھا کر کرسی کی پشت سے لگانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے جب اپنا ہاتھ اس نے ماں کو سر کو اٹھانے کے لیے بڑھایا تو اس کا ہاتھ کسی کاغذ سے ٹکرایا۔ اس نے سر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کاغذ باہر نکال لیا۔

"کاش خدا کو دھوکا دیا جا سکتا۔ کاش اس سے جھوٹ بولا جا سکتا۔ میری کتنی خواہش ہے کہ میں خدا کے سامنے سوانگ بھر کر جاؤں اور وہ میرا یقین کرلے۔ میں کاغذ پر اس کا نام لکھوں اور اسے اپنے اعمال نامے پر سب سے اوپر رکھ دوں اور پھر اس کے ہر سوال پر میں یہ کاغذ اٹھا کر اس کے سامنے کردوں کہ یہ ہی میرا جواب ہے۔ میں تو صرف اسے ہی جانتی ہوں، میں نے اسے ہی پڑھا ہے، اسے ہی دیکھا ہے۔ اسے ہی سنا ہے۔ کاش سمیل ایسا ہوجائے، کاش میں اسے دھوکا دے سکوں، کاش صرف ایک کاغذ میرا اعمال نامہ ہو۔ اے اللہ۔۔۔"

عدینہ کے ہاتھ سے لکھا۔ "اللہ" اب سمیل کے ہاتھ میں تھا۔

"زندگی جس کے حکم سے قائم ہوتی ہے، موت بھی اسی کے حکم سے واقع ہوتی ہے۔ صرف یہ ہی وہ دو حکم ہیں جن کی تکمیل ہم بلا چون و چرا کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو سمیل کے ہم باقی کی ادائیگیوں میں بھی ایسے ہی بے مثال ہوں۔"

وہ کچن میں گئی اور برتن اٹھا اٹھا کر دیکھنے اور سونگھنے لگی۔ کیا ماں نے خودکشی کی ہے، زہر پیا ہے۔

"میں بہت پہلے خود کو ختم کرلیتی، اگر مجھے معلوم نہ ہوتا کہ زندگی سے انحراف خدا کو کس قدر سخت ناپسند ہے۔ انسان کے کھاتے میں یہ گناہ اسے گوارا ہی نہیں۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور فون ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اسے عدینہ کی موت کی اطلاع دینی تھی۔ اسے اپنے پڑوس میں جانا تھا۔ پھر وہ اوپر جا کر سو جائے گی۔ اگلے دن کفن دفن کے لیے اسے قبرستان جانا ہوگا، پھر وہ کالج چلی جائے گی۔

"موت خدا سے قرب کا امکان ہے، لیکن جو دنیا میں خدا کے قرب کی خاک نہ پاسکے، موت اس کے لیے انعام نہیں۔"

اس نے ڈاکٹر کو فون کیا، پھر مسٹر اینڈ مسز پام ہیکی کے گھر جانے کے لیے گھر کے دروازے سے باہر نکلی۔ اس کی اس کارروائی سے بے نیاز عدینہ میز پر ویسے ہی سر رکھے سو رہی تھی۔

"صرف میرا دل جانتا ہے کہ میں نے کسی محبوب کی طرح موت کا انتظار کیا ہے۔ صرف میں یہ جانتی ہوں کہ ہر رات کو میں نے اپنی آخری رات سمجھا ہے۔"

وہ مسٹر پام ہیکی کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔

"اندر آجاؤ سمیل، میں کھانا لگا رہی ہوں۔" مسز پام ہیکی دروازہ کھول کر فوراً" اندر چلی گئیں۔ وہ پیچھے کھڑی رہ گئی۔

"سمیل!" اندر سے مسز پام ہیکی کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کا اندر انتظار کررہی تھیں پھر انہیں باہر آنا پڑا۔

"تم اندر کیوں نہیں آرہیں؟" وہ اس کے ایسے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کھڑے رہنے پر حیران تھیں۔

"ماں جاچکی ہے۔"

پلیٹ کو نیپکن سے صاف کرتے مس پام پیکی کے ہاتھ رک گئے۔

گھر آتے ہی وہ سیدھی اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی اور کمرے کا دروازہ لاک کرکے بیڈ پر آکر سو گئی۔ ساری رات وہ سوتی رہی۔ البتہ دوبار اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک بار اس نے کھڑکی میں میری کو کھڑے دیکھا اور دوسری بار میری اور عدینہ دونوں کو۔ باقی سارا وقت وہ سوتی رہی۔

"وہ رات لمبی بھی تھی اور ٹھنڈی بھی۔"

صبح اٹھ کر اس نے شاور لیا۔ اس کے کمرے کے دروازے پر مسز پام پیکی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹ چسپاں تھی، جس پر انہوں نے کفن دفن کے بارے میں لکھا تھا اور یہ کہ وہ ان کے گھر آکر ناشتا کرلے۔ تیار ہو کر جب وہ ناشتا کرنے کے لیے مسز پام کے گھر جارہی تھی تو نیچے کھانے کی میز پر ماں ویسے ہی میز پر سر جھکا کر بیٹھی تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے "سفید کپڑے" پہن رکھے تھے۔

"وہ دن تسلیم شدہ تھا اس انجام کے ہاتھوں، جسے ابتدا سے ہی طے کردیا گیا تھا۔"

* * *

تابوت میں اس نے اس کاغذ کو رکھوا دیا تھا، جس کے لیے ساری عمر اس کی ماں تڑپتی رہی تھی۔ جس پر سر رکھ کر وہ مرگئی تھی۔ جس کی خاموشی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ جس سے وہ ڈرتی تھی۔ جس سے منہ چھپانے کے لیے اس نے ہر اہتمام کیا۔ جس کے لیے اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی وہ اسے نہیں ملا۔۔۔ اللہ۔۔۔

"جو مشکل سے بھی نہ ملے، اسے آسانی سے چھوڑ دینا چاہیے ماں۔"

"تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے سمبل، مجھے خود سے خوف زدہ نہ کرو۔ جس دائرے سے میں نکل چکی ہوں، اس دائرے میں، میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر اولاد صالح ہو تو وہ اگلے جہاں میں والدین کے لیے آسانیوں کی وجہ بنتی ہے۔"

"والدین صالح نہ ہوں تو اولاد کیسے ہوگی ماں۔ کچھ انسان تاریخ دہراتے ہیں اور کچھ گناہ۔"

"تمہیں گناہ کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے سمبل اللہ کو یہ پسند نہیں۔۔۔"

"آپ کو بھی اللہ کی پسند ناپسند کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔۔۔ اللہ کو آپ پسند نہیں۔"

"میں اسے پسند نہیں بھی ہوں تو بھی میں اسی کا بندہ رہوں گی۔ میرے پاس یہ اعزاز ہمیشہ رہنے والا ہے۔"

"اعزاز کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو ماں۔۔۔ وہ انعام نہیں ہوتا۔"

"جو اعزاز اللہ کی طرف سے ہو، اس سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہوتا سمبل۔۔۔"

"میری ماں ان ہی اعزازوں اور انعاموں کے لیے پاگل ہوگئی۔ وہ جس چیز پر یقین رکھنے کے لیے مجھے کہتی اس پر اپنا ہی یقین کھودیتی۔ پتا نہیں یہ کون سا کیڑا ہے جو انسانوں میں رینگ آتا ہے اور وہ اللہ اللہ چلانے لگتے ہیں۔ میں نے نفرت کی ہے ایسے لوگوں سے۔۔۔ میں نفرت کروں گی ایسے لوگوں سے۔۔۔" قبرستان سے آنے کے بعد اس نے اپنی ویڈیو بلاگنگ کی۔

"یوں اللہ اللہ چلانے والے ابنارمل لوگوں سے میں بے زار ہوں۔ یہ اپنا جینا تو حرام کرتے ہی ہیں، ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ میں ابھی ایسی ہی ماں کو قبرستان چھوڑ کر آئی ہوں۔ اب مجھے گھر کا کچھ حساب کتاب دیکھنا ہے۔ ماں کی ڈائری کا کہنا ہے کہ ان کی محفوظ کی گئی رقم میرے کام آجائے گی۔ انہوں نے ڈائری میں میرے لیے کافی ہدایات لکھی ہیں۔ یعنی انہیں اپنی موت کا علم تھا؟ جس عورت کو ساری زندگی اپنی معافی کا علم نہیں ہوسکا، اسے اپنی موت کا کیونکر علم ہوسکتا ہے؟ جس پر زندگی مشکل سے بھی مہربان نہیں ہوئی، موت آسانی سے کیسے مہربان ہوگئی؟ وہ لمبا عرصہ زندہ رہنے کا عذاب بھگتتی

READING
Section

رہی، پھر اس نے موت کی صورت رحم کی چاہ ہی کیوں کی؟"

* * *

"رحم۔۔۔" میری وہ دوا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں ماں۔۔۔!"

"سمجھ جاؤ گی، یہ بتاؤ سیبل! کیا تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟"

"آپ مجھے اسکول کا ہوم ورک کرنے کے لیے نہیں کہیں گی۔ میں ہفتے کے چھ دن یہ کام کر کے تھک جاتی ہوں، آج چھٹی ہے۔"

"یہ اسکول ورک نہیں، ماں ورک ہے، کرو گی نا؟"

"ماں! میرے کلاس فیلوز کہتے ہیں کہ آپ کی شکل وچ (جادوگرنی) سے ملتی ہے۔"

"ہر گناہ گار کی شکل وچ سے ملتی ہے۔ گناہ وہ جادو ہے جو ہماری شکلیں بگاڑ دیتا ہے۔ مجھے خوشی ہے میری اصلیت نمایاں ہو رہی ہے۔ جس آنکھ سے فرشتے مجھے دیکھتے ہیں، اسی آنکھ سے بچے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"مجھے برا لگتا ہے، میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

"مجھے یہ برداشت ہے۔ مجھے وچ کہلائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ ایک بہتر نام ہے۔"

"میں تو ان کی ماں کو وچ نہیں کہتی، جبکہ مجھے بھی ان کی شکلیں پسند نہیں۔"

"تمہیں خاموش رہنے کی عادت اپنانی چاہیے۔ تم بڑی ہو جاؤ گی تو سب سمجھ جاؤ گی۔"

"آپ بڑی ہیں، آپ سب سمجھ چکی ہیں؟"

"میں بڑی ہوں اور اسی لیے میں سب سمجھ چکی ہوں۔ کیا تم جانتی ہو کہ میں بیمار ہوں؟"

"نہیں۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں۔"

"میں بہت بیمار ہوں سیبل، بہت زیادہ۔۔۔"

"آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔"

"ڈاکٹر کے پاس ہی جانا چاہتی ہوں، لیکن مجھے بہت شرم آتی ہے۔ میرا دل خوف سے کپکپانے لگتا ہے۔ میرا ڈاکٹر مجھے سب کچھ کرتے دیکھ چکا ہے۔ اب اس کے سامنے کس منہ سے جاؤں سیبل؟"

"آپ مجھے ساتھ لے کر جایئے گا۔ آپ کو ڈر نہیں لگے گا۔"

"میں تمہیں اس کے سامنے بھیجنا چاہتی ہوں۔"

"آپ کو بھی جانا ہو گا ناماں۔۔۔ آپ ٹھیک نہیں ہونا چاہتیں کیا؟"

"چاہتی ہوں، ٹھیک ہی تو ہونا چاہتی ہوں، ٹھیک کرو گی مجھے؟"

"میں آپ کو ٹھیک کرنے کے لیے سب کروں گی۔ میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔ آپ کے لیے دوا لے کر آؤں گی۔"

عدینہ نے اس کے سر پر اسکارف باندھ دیا اور پھر اس کے ہاتھ دعا کی صورت اٹھا دیے۔

"کہو، اے اللہ میری ماں عدینہ کو معاف کر دے۔"

"اے اللہ ماں کو معاف کر دے۔"

"اس عدینہ کو جس نے اپنے شوہر کے منہ پر کالک تھوپی اور اپنے بچوں کو ذلت کی زندگی گزارنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ اللہ معاف کر دے کہ اس نے اپنے باپ کی عزت کے سب ہی پردے چاک کیے اور ماں کی شفقت سے بھرے سب ہی جام الٹ دیے۔"

"ڈاکٹر اللہ معاف کر دیں ماں کو۔۔۔" سیبل دہرانے لگی۔

"اور کہو۔" اے اللہ میری ماں نے یعقوب کے ساتھ کیے گئے عہد میں خیانت کی۔۔۔ خیانت کی۔۔۔ خیانت کی۔۔۔ وہ ایمان داری سے اپنی اس خیانت کو تسلیم کرتی ہے۔ اور خدا سے "معافی" کی درخواست کرتی ہے۔

"ماں آپ سے معافی کی درخواست کرتی ہے اللہ، ماں کو رحم کی دوا دے دے۔"

"یامین کے لیے اس نے سب کو بھلا دیا۔ یامین کے لیے اس نے سب کو چھوڑ دیا۔ اے اللہ اب تو اسے نہ بھلا دینا۔ اب تو اسے نہ چھوڑ دینا۔"

"میری ماں کو چھوڑ نہ دینا اے اللہ۔۔۔ میری ماں کو

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مت بھولیے گا.... پلیز...." سہیل نے سب دہرا دیا۔

چھوٹی عمر سے اس نے یہ سب باقاعدہ دہرانا شروع کر دیا۔ پھر اسے یہ ہر رات کرنا پڑتا۔ اکثر دن میں اور رات میں تو کئی کئی بار.... اسے ہر چاکلیٹ، کیک، آئس کریم، گڑیا، کپڑے، جوتے اور ایسی ہی دوسری چیزیں حاصل کرنے سے پہلے ماں کو یہ "دعا" مہیا کرنی پڑتی۔ راتوں کو گہری نیند سے بے دار ہونا پڑتا، ماں کی گود میں بیٹھنا پڑتا، سر پر اسکارف باندھ کر، ہاتھ اٹھا کر دہرانا پڑتا۔

"مجھے بہت خوف آرہا ہے سہیل! دعا کرو۔ خدا سے اپنی ماں کے لیے رحم کی التجا کرو۔" رات کے کسی پہر ماں اسے جگا کر سینے سے لگا لیتی۔

رات کے اسی پہر وہ خدا سے ماں کے لیے رحم کی التجا کر دیتی۔

"میری قبر میں بہت اندھیرا ہے، میں نے ابھی دیکھا ہے۔ میری لیے روشنی لے آؤ سہیل!"

دعا کر کے وہ ماں کے لیے روشنی مانگ لیتی۔

"میں روز حشر سے بھاگتی پھر رہی ہوں۔ منہ چھپانے کے لیے مجھے کچھ میسر نہیں۔ میری پردہ پوشی کے لیے ہاتھ اٹھاؤ سہیل...."

"وہ ماں کی پردہ پوشی کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی۔ دس سال کی عمر تک وہ اس ڈیوٹی کو ورد سر کی طرح دہراتی رہی۔ وہ چڑ جاتی، غصہ کرتی، ماں سے تکرار کرتی، کمرے میں بند ہو جاتی، چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی، گھر سے باہر چلی جاتی ورنہ اپنا منہ سی لیتی۔"

"بس کرو ماں! میں تھک گئی ہوں۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا، تم میرے لیے ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی، تم میری دوا لے کر آؤ گی۔" ماں تڑپ تڑپ کر اس کے سامنے روتی۔

* * *

"روشنی اگر کہیں تھی تو وہ اندھیرے کی دہلیز کے اس پار کھڑی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔"

لکڑی کا کواڑ کھول کر ام ہانی اندر آئی۔ موم بتی کو اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جھک کر اسے دیکھنے لگی۔ نقاہت سے سہیل نیم جان تھی۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر، اس کے منہ پر بندھے کپڑے میں انگلی پھنسا کر وہ پانی کی دھار کو اس کے منہ کے اندر ٹپکانے لگی۔ پانی منہ میں تو کیا جاتا، البتہ اس کے سارے کپڑے بھگو گیا۔ جلدی سے پہلے اس نے خشک کپڑے سے پانی صاف کیا، پھر وہ گیلے کپڑے سے اس کا منہ صاف کرنے لگی۔ یہ یہاں اس کا دوسرا دن تھا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔

"تمہیں بھوک لگی ہو گی، میں تمہارے لیے کھانا لائی ہوں۔ میں پہلے بھی آئی تھی، لیکن تم اٹھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔"

سہیل نے غصے سے سر کو جھٹکا اور بڑھ کر اسے اپنے سر کی ٹکر مارنی چاہی لیکن وہ اس کی پہنچ سے دور چلی گئی۔

"میں تو تمہیں صرف کھانا کھلانا چاہتی ہوں۔" وہ بے چارگی سے اسے دیکھنے لگی۔

سہیل نے اسے ٹکر مارنے کا خیال دل سے نکالا نہیں۔

"تمہارا غصہ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کیا میں ظالم ہوں۔ میں بے چین ہو جاتی ہوں۔"

اس کی گردن میں اپنے دانت گاڑ کر سہیل اسے بتا سکتی تھی کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون....

"مجھے موسی کا انتظار تھا، لیکن وہ آج بھی نہیں آیا۔ تم کھانا کھا لو۔" چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر وہ اس کے منہ میں ڈالنے لگی اور شہادت کی انگلی کی طرح اس نے دوسری انگلی کو بھی اپنے دانتوں میں اس سختی سے لے لیا کہ اگر وہ انگلی کٹی نہیں تھی تو بھی ساری زندگی کے لیے بے کار ہو چکی تھی۔

اس بار ام ہانی کھڑی ہو کر اپنی انگلی دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "تمہاری شکر گزار ہوں میں...." کہہ کر وہ کتنی ہی دیر تک کچھ اور نہیں بول سکی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ کوئی انجان لڑکی آئے گی اور وہ مجھے میرے گناہ یاد کروائے گی۔ ایسے لوگ خاص ہوتے ہیں۔ تم بھی میرے لیے خاص ہو۔" اتنا کہہ کر اس نے برتن سمیٹے اور موم بتی لے کر چلی گئی۔

ام ہانی کے خون کا ذائقہ اس کے دہن میں اترنے لگا۔ تو اس نے انسانی خون بھی پی ہی لیا۔ موسی کی بہن کا تو موسی کا کیوں نہیں۔ اچھا ہوتا اگر وہ موسی کے منہ ہی نہ لگتی۔ چھوٹے شہروں اور گاؤں کے لوگ بہت شدت پسند ہوتے ہیں۔ یہ جتنے اچھے ہوتے ہیں، اتنے ہی اوچھے۔ جتنے مومن اتنے ہی کافر۔۔۔

وہ ایک ہفتہ پہلے فریڈرک کے ساتھ لبنان کے پہاڑی گاؤں کزائیہ آئی تھی۔ گو اسے لبنان سے نفرت ہو چکی تھی، کیونکہ یہیں سے اس کی ماں اپنے گھر والوں کو ذلیل کر کے بھاگی تھی اور یہیں سے اسے بھی لاتیں گھونسے مار کر بھگا دیا گیا تھا، لیکن فریڈرک کو اپنے کام کے لیے یہاں آنا تھا اور سیبل اسے آنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ خود کو بھی اس کے ساتھ آنے سے روک نہیں سکی تھی۔ ایک وہی تو تھا جسے وہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔

"تم مجھے بور کر رہے ہو، کہاں لے آئے ہو مجھے؟"

"تم نے وعدہ کیا تھا، تم کوئی سوال نہیں کرو گی۔"

"میرا خیال تھا تم بیروت شہر میں رہو گے، پر تم تو ان پہاڑوں میں آ گئے ہو۔"

"میرا کام ان ہی پہاڑوں میں ہے۔۔۔"

"ایسے ترقی یافتہ وقت میں پہاڑ ابھی بھی کام دیتے ہیں۔۔۔" وہ ہنس دی، لیکن وہ خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں خاموش رہنا ہے۔ یہ اس کی اچھی عادت تھی جو اس وقت بری ہو جاتی، جب سیبل اسے سننے کے لیے بے تاب ہو جاتی تھی۔ اس نے ساری زندگی اپنی ماں کی باتیں اتنی زیادہ سنی تھیں کہ اب وہ کسی اور کو سننا چاہتی تھی۔ جبکہ فریڈرک کبھی کبھی اتنا خاموش ہو جاتا تھا کہ سیبل کو باقاعدہ اس سے درخواست کرنی پڑتی تھی کہ وہ چند جملوں کو استعمال کرنے کی زحمت ضرور کرے اس سے اسے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔

وہ مسکرا دیا۔ "نقصان مجھے ویسے بھی کبھی نہیں ہو گا۔"

"تھوڑا بہت نقصان تو ہم سب کو کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتا ہے۔"

"مجھے نہیں ہو گا۔ میں اپنے نقصان کو فائدے میں بدلنا جانتا ہوں۔"

"میں بھی سیکھنا چاہوں گی ایسا کرنا۔"

"اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ رہنا ہو گا۔ میں باقاعدہ لیکچر نہیں دوں گا۔ تمہیں خود مجھے نوٹس کرنا ہو گا، ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔۔۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

وہ اس کا کالج فیلو تھا، جس سے اس کی تھوڑی بہت ہیلو ہائے تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد ایک دن وہ اس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ "ٹھیک ہو نا تم سیبل؟"

"ہاں!" اس نے فوراً" کہا۔ اسے اس کا یوں آنا اور ایسے پوچھنا بہت اچھا لگا تھا۔ پھر وہ خود اس کے پاس جانے لگی۔ وہ چائے، کافی ایک ساتھ پینے لگے۔ ایک دو بار وہ اس کے ساتھ لنچ پر بھی گئی تھی۔ کسی لڑکی نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم فریڈرک کو ڈیٹ کر رہی ہو۔" تو اس نے تردید نہیں کی تھی۔ وہ اسے پسند کرنے لگی تھی، جسے کم ہی لوگ پسند کرتے تھے۔

فریڈرک کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ اپنے سوتیلے باپ کی وجہ سے چھوٹی عمر سے ہی گھر سے بھاگ آیا تھا۔ البتہ کچھ کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی سوتیلی بہن کو اتنا زیادہ زخمی کر دیا تھا کہ اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ اسے کالج سے بھی نکال دیا جاتا، اگر وہ کچھ لوگوں کی ہمدردیاں نہ خرید چکا ہوتا۔ وہ کیا کام کرتا ہے، اس بارے میں کافی طالب علم کافی کچھ جانتے تھے۔ خاص کر یہ وہ منشیات فروش ہے اور خفیہ طور پر خاص لوگوں کی جاسوسی کرتا ہے، پھر انہیں بلیک میل کرتا ہے۔ ایک دن سیبل نے مذاقاً" اس سے پوچھ لیا۔

"کیا واقعی میں تم ڈرگ سپلائیر ہو؟"

"ہاں!" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" سیبل کو حیرت ہوئی بھی تو

اس نے ظاہر نہیں کیا۔

”کیسا ڈر..... ؟“

”پولیس سے..... موت سے..... ؟“

”پولیس کو میں دوست رکھتا ہوں اور موت میں اپنی جیب میں رکھ کر گھومتا ہوں۔“

”تم جیل چلے جاؤ گے؟“

”جیل جانا میرے لیے اچھا رہے گا‘ میرا کاروبار بڑھے گا اور میں نامی گرامی ڈیلر بن جاؤں گا۔“

”لیکن ڈرگز ہی کیوں؟“

”ڈرگز ہی کیوں نہیں؟“

”اس پر پابندی ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے کتنے لوگ اسے یوز کرتے ہیں؟ جب اس کے اتنے زیادہ یوزر ہیں تو ہم اس کا باقاعدہ بزنس کیوں نہیں کر سکتے۔ مجھے اس کے استعمال پر لگی پابندی کی سمجھ نہیں آتی۔ جب یہ کسی بھی سوفٹ ڈرنک سے زیادہ استعمال کی جا سکتی ہے تو اسے سوفٹ ڈرنک کی طرح سیل کیوں نہیں کیا جا سکتا۔“

”تم بلیک میلنگ بھی کرتے ہو؟“

”کبھی کبھی تبدیلی کے لیے.....“ ہنس کر اس نے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا۔

تمہیں یہ ڈر نہیں ہے کہ میں کسی کو بتا دوں گی؟

”نہیں!“ وہ ہنسا..... ”تم بھی میرے جیسی ہو سہیل۔ مجھ جیسی نہ ہوتی تو میرے ساتھ بھی نہ ہوتی۔“

”کیسی ہوں میں.....“

اس نے قہقہہ لگایا۔ ”تمہیں بھی ہر ایک سے‘ ہر چیز سے نفرت ہے۔ میری طرح تمہیں بھی کسی کی پروا نہیں ہے‘ قانون کی..... مذہب کی..... اور..... خدا کی بھی.....“

”خدا کی بھی.....“ اس نے زیر لب دہرایا۔

”ہاں خدا کی بھی..... کیا میں نے غلط کہا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

نہیں! اس نے اپنی ماں کی سرگوشیوں سے جان چھڑا کر کہا۔

ایک صرف فریڈرک ہی ایسا تھا‘ جس کے ساتھ وہ بہت مطمئن رہتی تھی۔ وہ آزاد خیال اور جرأت مند تھا‘ تو وہ بھی ایسی ہی ہونا چاہتی تھی۔ اسے اس سے اپنا ماضی چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یہ ڈر بھی نہیں رہتا تھا کہ وہ اسے خبطی ہونے کا طعنہ دے گا۔ وہ اس کی باتوں پر کیوں اور کیسے جیسے سوال نہیں اٹھاتا تھا۔ کالج میں نشر ہونے والا اپنا ویڈیو کلپ اس نے ایک دن اسے دکھانا چاہا۔

”تم نے دیکھا ہے اسے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”میں نے ضرورت نہیں سمجھی سہیل.....“ کینٹین کی میز کے اوپر بیٹھے اپنی انگلیوں کو اس کی ٹھوڑی سے گال تک لے جاتے اس نے کہا۔

”تم اب دیکھ سکتے ہو۔“

سہیل کا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے تھپکا۔ ”دیکھو سہیل! یہ تمہاری زندگی ہے اور تمہارا اس زندگی پر پورا پورا حق ہے۔ تم وہ سب کرو‘ جو کرنا چاہتی ہو حتیٰ کہ اگر تم کسی کو قتل کرنا چاہتی ہو تو وہ بھی کرو۔ یہ مت سوچو کہ دوسرے کیا کہیں گے‘ قانون کیا کہتا ہے۔ کوئی بھی قانون ہم سے ہمارا حق نہیں چھین سکتا۔ ہماری خوشی پر ہماری پسند کا اطلاق ہونا چاہیے بس.....“

”تم میری خوشی کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”میں تمہاری خوشی کے لیے کچھ نہیں کروں گا‘ البتہ اگر تم میری خوشی ہو تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔“

”تم خود غرض ہو.....“

”تم بھی ہو جاؤ..... زندہ رہو اپنی پوری سانسوں کے ساتھ‘ آدھی پابندیوں اور پورے قانون کے ساتھ نہیں۔“

وہ اس کی بات اچھی طرح سے سمجھ چکی تھی اور اسے بھی..... دونوں میں ایک چیز مشترک تھی کہ اگر وہ اپنی ماں کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتی تھی تو اسے بھی اپنی ماں کا تذکرہ پسند نہیں تھا۔ وہ آج کی بات کرتا تھا‘ آج ابھی کی۔ وہ گزرے کل اور آنے والے کل کی بات

سوچنے اور سننے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اسے یہ تک گوارا نہیں تھا کہ اس سے پوچھا جائے کہ کل وہ کیا کر رہا ہے۔ پہلے سیبل اس کے ساتھ ساتھ رہا کرتی تھی، پھر وہ سیبل کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنے لگا تھا۔ ایک دن شاپنگ کے دوران اس نے کھڑے کھڑے ایک انگوٹھی لی اور اسے سیبل کی انگلی میں پہنا دیا۔

"مجھے یہ رنگ اچھی لگ رہی ہے اور تمہاری انگلی میں اچھی لگ رہی ہے، تمہیں کیسی لگی؟"

سیبل نے اپنے دل کو انگوٹھی پہنی انگلی میں دھڑکتے سنا۔ "بہت اچھی۔۔۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کو سوٹ کرتے ہیں۔" انگوٹھی سمیت اس نے اس کی انگلی کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ مختصر ہی سہی۔۔۔ سیبل چاہتی تھی وہ اس سے اپنی محبت کا اقرار کرے۔

"فی الحال محبت میں صرف خود سے کرتا ہوں۔۔۔"

اور مجھ سے۔۔۔؟

"تم سے بھی کرنے کی کوشش کروں گا۔" وہ مسکرا دیا۔

"میں تمہارا کام نہیں ہوں فریڈرک! جس کے لیے تم کوشش کرو گے۔"

وہ مسکرا دیا۔ "مجھے شکایات پسند نہیں، تم میری رنگ واپس کر سکتی ہو۔"

وہ بھی مسکرا دی۔ "یہ اب میری ہے، میں اپنی شکایت واپس لے سکتی ہوں۔"

اس بار اس نے قہقہہ لگایا۔ "محبت نہیں، لیکن میں تمہاری ایسی باتوں کو پسند کرتا ہوں، تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

"تم بھی وہ واحد انسان ہو جو مجھے اچھے لگے ہو۔۔۔" سیبل انگوٹھی پر انگلی پھیرنے لگی۔

اکثر سیبل کو اپنی ماں موم بتی لیے گھر میں گھومتی ہوئی دکھائی دیتی۔

"میں نے تو دعا کی تھی کہ خدا تمہیں میری طرح بھٹکنے سے بچا لے۔" وہ اس پر جھک کر اس کے کان میں کہتی۔

"تم نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری کوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔" وہ چلا اٹھی۔

☼ ☼ ☼

پہاڑی گاؤں کزائیہ چھوٹا تھا، لیکن خوب صورت تھا۔ گاؤں کے واحد ہوٹل میں ان کا قیام تھا جس کی عمارت ایسے غار سے مشابہ تھی جسے پتھروں اور لکڑی سے ہوٹل بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ غار پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا، جس کے سامنے سے ایک ہی سڑک نکلتی تھی۔ وہ رات کو یہاں پہنچے تھے اور فریڈرک آتے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ اسے اکیلے ہی کھانا کھانا پڑا۔

صبح اس نے فریڈرک کے کمرے میں جھانکا تو وہ پھر سے جا چکا تھا۔ وہ یہاں اپنے کام کے لیے آیا تھا، اسے گھمانے نہیں۔ وہ اسے پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا کہ وہ اسے وقت نہیں دے سکے گا، اسے بہت سے لوگوں سے ملنا ہے اور لمبے لمبے سفر کرنے ہیں۔ اسے آئندہ زندگی فریڈرک کے ساتھ ہی گزارنی تھی۔ وہ ابھی سے ان سب باتوں کی عادی ہونا چاہتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ ہوٹل کی نیم تاریک راہ داری سے چل کر باہر آ رہی تھی کہ اسے آواز سنائی دی۔

"گناہوں کی زمین پر دیکھو تو کون اترا ہے۔۔۔ خدا کا پیارا موسیٰ۔۔۔ کیا کلام کے لیے تمہیں بھی کوئی کوہ طور مل گیا ہے، جو اچانک غائب ہو جاتے ہو۔"

"ماں نے بلایا تھا، بیمار تھیں وہ۔۔۔"

"تمہارا کاروبار بھی کافی ہے۔ برکت کے لیے دعا کرتے رہنا۔"

"خدا رزق کے ذرائع میسر کرے۔" (آمین)

خدا کے پیارے کو دیکھنے کے لیے وہ رک چکی تھی، اب وہ اس کی طرف پلٹی۔ مغربی مصوروں کے موقلموں سے فن پاروں میں اترے عیسیٰ کی شبیہہ جیسا تھا وہ موسیٰ۔ نیالے سرمئی رنگ کا موٹے کپڑے کا کرتا پہنے، وہ بھیڑوں کے ریوڑ کا رکھوالا لگ رہا تھا۔ ہوٹل کے ایک نیم اندھیرے کمرے میں کچھ سامان

نکال نکال کر وہ باہر رکھ رہا تھا۔ جب وہ سیبل کے قریب سے گزرنے لگا تو سیبل نے اس کا راستہ روک لیا اور تمسخر سے اسے دیکھنے لگی۔ کریٹ ہاتھ میں لیے وہ سیبل کی رکاوٹ میں پھنس کر رہ گیا۔

"تو تم ہو خدا کے پیارے، جسے ڈھونڈنے کے لیے میری ماں مجھے بھیجا کرتی تھی۔"

وہ اسے ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے ریوڑ کی کوئی بھیڑ ہو۔

"کوئی عیسیٰ جو اس کے زخموں کو مندمل کر دیتا، کوئی موسیٰ جو اس کے لیے خدا سے کلام کرتا۔"

"السلام علیکم!" اس نے معصومیت سے کہا۔

"جب تک وہ زندہ رہی خدا نے تمہیں چھپائے رکھا، تاکہ تم اس کی مدد نہ کر سکو۔" اس کی ہنسی آتشی ہو گئی۔

"میں تم پر سلامتی بھیج رہا ہوں۔"

"میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں۔" اس نے اس قدر چلا کر کہا کہ ہوٹل کا عملہ اپنی اپنی جگہ پر رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارا رویہ حیران کن ہے، کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" کریٹ کو نیچے رکھ کر اس نے مئودب ہو کر پوچھا۔

"میری ماں مر چکی ہے اور مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔" حقارت سے کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

"کیا تم بھی مردہ ہو چکی ہو؟"

تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف جاتی وہ رکی۔ چھوٹے گاؤں کے آدمی کی جرأت نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ وہ سوال کیسے اٹھا سکتا ہے؟ وہ اس کی پشت پر بولنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے؟ جو زندہ اس کے سامنے جلال دکھا گئی ہے، اس سے مردہ ہونے کا کیسے پوچھ سکتا ہے؟

"اگر میں بھی مردہ ہو چکی ہوں تو؟" چمڑے کے اونچے جوتوں میں ٹھک ٹھک کرتی وہ واپس اس کے قریب آئی اور اپنی آنکھوں کا طیش اس پر الٹ دیا۔

"حکمتوں میں سے بہترین حکمت سے اللہ تمہیں حیات عطا کرے۔" (آمین) کریٹ کو زمین سے اٹھا کر وہ چلا گیا۔

"مجھے تمہاری دعا نہیں چاہیے۔" وہ اس کی پشت پر چلائی۔

"دعا سب کو چاہیے ہوتی ہے۔" اس نے پلٹے بغیر کہا۔

"مجھے کیا چاہیے اور کیا نہیں، یہ بتانے والے تم کون ہوتے ہو۔"

"موسیٰ..."

غصہ، شدید ناپسندیدگی کے احساس میں بدلنے لگا، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے خود ہی موسیٰ پر حملے میں پہل کی تھی اور جیسے اس معمولی آدمی کے منہ لگی تھی۔ اسے کم سے کم اپنے امریکی پاسپورٹ کی عزت کا ہی خیال کرنا چاہیے تھا۔

پہاڑوں پر گھومنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو ہوٹل میں لنچ کرنے کے لیے آ گئی۔ فریڈرک کا شام تک واپس آنے کا ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ جب وہ کوئی خاص کام کرتا تھا تو اپنا ذاتی نمبر بند کر دیتا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ پھر سے باہر آ گئی اور دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی۔ راستے میں اسے پھر موسیٰ نظر آیا۔ وہ سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ کے نیچے کباب لگا کر کھڑا تھا۔ اس کے دائیں طرف پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ چھوٹا سا میز تھا، جس پر اس نے اپنا "کباب خانہ" کھول رکھا تھا۔ ہاتھ میں چھوٹا سا قرآن تھا، جسے وہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی کباب لینے آتا تو وہ قرآن کو جیب میں رکھ کر کباب بنا کر دینے کے بعد جیب سے قرآن نکال کر پھر سے پڑھنے لگتا۔

استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے وہ اس کے پاس آئی۔

"کتنے کے ہیں کباب؟" وہ صبح والی بات کے اثرات کے اس کے چہرے پر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے مزید زچ کرنے آئی تھی۔

موسیٰ آیت ختم کر کے جواب دینا چاہتا تھا کہ اس نے گردن کو خم دے کر بورڈ پر لکھی قیمت پڑھ لی۔

"اتنے سستے؟" ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔

"میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہارے لیے خدا ہی کافی ہے؟" پہلے قہقہہ لگایا' پھر کہا۔

"میں اللہ کو کافی اور ناکافی نہیں بنا سکتا' وہ پیمانوں سے بالاتر ہے۔"

"اوہ! تم تو واقعی خدا والے نکلے۔"

"یہ کہنا ٹھیک نہیں....."

"کام کرتے ہوئے قرآن پڑھنا' اتنے سستے کباب بیچنا اور ایسے گھسے پٹے لباس میں ملبوس رہنا' خدا کا پیارا نظر آنے کے لیے تم نے تو سارا اہتمام کیا ہوا ہے۔"

"تمہیں کس چیز نے یوں مجھ سے اتنی نفرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟" قرآن کو بند کر کے وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے خدا کے پیاروں سے نفرت ہے۔"

"پھر تو تمہیں خود سے بھی نفرت کرنی چاہیے۔"

"مجھے خدا کا پیارا بننے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

"تمہیں اپنا پیارا بنانے کا ارادہ ضرور خدا کا ہو گا۔"

"اوہ! تو تم خدا کے ارادوں کے ترجمان ہو؟"

وہ مسکرا دیا۔ "تم بھی بن سکتی ہو۔"

"تم تو مجھے خدا کی طرف سے جاب بھی آفر کر رہے ہو؟"

اس بار وہ خود کو کھل کر مسکرانے سے روک نہیں سکا اور اس نے ہاتھ میں پکڑے قرآن کے پیچھے اپنا منہ چھپا لیا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟" اسے اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔

"میں نے ایسا نہیں کیا۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"تم ہنسے کیوں؟"

"میں چھوٹا تھا تو جتنے لوگ نماز پڑھتے تھے' میں ان سب سے حسد کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا صرف میں ہی نماز پڑھوں' صرف میں ہی خدا کی عبادت کروں۔ کوئی اور کیوں کرے؟ کوئی اور نماز پڑھے گا تو خدا اس کی طرف متوجہ ہو گا۔ میں چاہتا ہی نہیں تھا کہ میرے علاوہ خدا کسی اور کو دیکھے' کسی اور کو سنے' کسی اور پر بھی توجہ دے۔ وہ صرف میرا ہو' صرف میرے پاس ہو۔ وہ میرے علاوہ کسی کی سنے بھی نہ۔ اسے میری ہی باتیں اچھی لگیں' وہ صرف میری ہی باتوں کے جواب دے۔ تم بھی یہ ہی چاہتی ہو نا کہ خدا صرف تم پر ہی توجہ دے۔ وہ صرف تمہارا ہی رہے۔ تم مجھ پر کسی دشمن کی طرح حملہ آور ہوئی ہو' کیونکہ تمہیں لگتا ہے میں نے سارے کا سارا خدا لے لیا ہے۔" قرآن کی آنکھوں سے لگا کر اس نے جیب میں رکھ لیا۔

"مجھے اس کی ساری بے توجہی مل چکی ہے' اب اس کی توجہ کی پروا کسے ہے۔ تم سارے کا سارا خدا رکھو۔ مجھے سارا چاہیے نہ تھوڑا۔" اس نے اتنی سختی سے جتایا کہ جواب میں وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا اب تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں؟ خدا کا کوئی اور ارادہ جس کے تم ترجمان بن سکو؟"

"خدا تم پر اپنی مہربانیاں کرتے رہنا پسند کرے۔ آمین۔" جیب سے قرآن نکال کر وہ پھر پڑھنے لگا۔

رات کو ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے اس نے موسیٰ کو آتے دیکھا۔ وہ اپنے کباب کا سامان لا کر ہوٹل کے اندر رکھ رہا تھا۔ وہ نیچے تھا اور وہ کھڑکی میں اوپر..... ایک بار میز کو اندر لے جاتے اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور میبل نے اپنی نظروں کو اس سے ہٹایا نہیں وہ ساری نافرمانی لیے اسے گھورتی رہی اور وہ سارا ایمان اپنی آنکھوں میں بسائے اپنی آنکھیں جھکا کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پانی چھڑک کر ہوٹل کے سامنے کی زمین صاف کرنے لگا۔ کرسیاں اور میزیں صاف کیں اور اندر سے کھانے کی چیزیں لا لا کر باہر رکھنے لگا۔ دو چھوٹی کاریں سڑک سے آتی نظر آئیں۔ کچھ غیر ملکی سیاح وہاں آ گئے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں موجود واحد سیاح لڑکی "میبل" کو بھی باہر ڈنر کی دعوت دی گئی' لیکن اس نے کھانا کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ وہ موسیٰ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور دوسرا وہ اپنی شکل موسیٰ کو دکھانا نہیں چاہتی

تھی۔

* * *

فریڈرک کے کام ختم ہونے کے آثار معدوم ہی رہے۔ رات گئے جب وہ آیا تو سیبل سو چکی تھی۔

"مجھے چند دن لگیں گے واپس آنے میں۔" صبح اسے نیند سے جگا کر وہ بتا رہا تھا۔

"کتنے دن؟" اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، صبح ابھی تک رات کے خوان پر موجود تھی۔

"دو یا تین دن... زیادہ سے زیادہ چار دن..."

"میں چار دن یہاں کیا کروں گی؟"

"تم آس پاس کے چند گاؤں گھوم سکتی ہو۔"

"یہاں کے سب گاؤں ایک جیسے ہیں۔"

"تو پھر سب ایک جیسے گاؤں دیکھ ڈالو۔ کم سے کم تمہیں یہاں زبان کا مسئلہ نہیں ہے۔ عربی تمہاری مادری زبان ہے نا؟"

"یہ میری ماں کی زبان تھی، میری نہیں۔ میری زبان انگلش ہے۔" وہ برا مان گئی۔

"تم غصے میں ہو، کیا ہوا ہے؟"

"مجھے یہاں کے لوگ پسند نہیں ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"سب لوگ۔" وہ موسیٰ کا نام نہیں لے سکی۔

"اگر تمہیں کوئی تنگ کرے تو تم اس کا استعمال کر سکتی ہو۔" فریڈرک نے بیگ سے پستول نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

"تم یہ یہاں بھی ساتھ لے آئے ہو؟"

"اسے ساتھ رکھنا ضروری ہے، خاص کر ان علاقوں میں۔ تم باہر جایا کرو تو اسے اپنے ساتھ رکھ لیا کرو۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہوں تمہارے ساتھ۔ ہوٹل کا عملہ بے ضرر ہے، تم بے فکر ہو کر رہو یہاں۔ تمہیں کچھ ہو بھی گیا تو تم جانتی ہو میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔"

وہ مسکرا دی۔ "تم بہت مصروف ہو، مجھے اپنا کچھ وقت دے دو۔"

"یہاں سے ہم بیروت چلیں گے، وہاں تم انجوائے کرو گی۔"

"تم جانتے ہو میں بیروت نہیں جاؤں گی۔"

"اوہ! سوری میں بھول گیا تھا۔ چلو جہاں تم کہو گی وہاں چلیں گے۔"

فریڈرک چلا گیا تو وہ کتنی ہی دیر تک کھڑکی میں کھڑی رہی۔ اب اسے نیند نہیں آسکتی تھی۔ ماں کی طرح اس کی نیند بھی کبھی گہری نہیں ہو سکی تھی۔ کھڑکی سے باہر اسے ہوٹل کا عملہ نظر آیا۔ وہ کچھ سامان ہوٹل کے اندر لا رہے تھے۔ موسیٰ نے اپنے شانوں پر لکڑیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔

"یہ لکڑہارا بھی ہے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لا رہا ہے۔ اسے یہ سوٹ بھی کرتا ہے۔" اسے لکڑہارا بنے دیکھ کر سیبل کو خوشی ہوئی۔

ناشتے کے بعد وہ رات آنے والے سیاحوں کے ساتھ قریبی گاؤں آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ وہاں رہی تو یہ اس کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ موسیٰ کو دیکھتے ہی بھڑک جاتی ہے اور پھر اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں موسیٰ نظر بھی ایسے آتا ہے جیسے اس کی پانچ کاپیاں ہوں اور ہر کاپی ہر جگہ نہ سہی تو کوئی ایک جگہ موجود ہے۔ کوئی سڑک پر چل رہی ہے، کوئی کھڑکی کے نیچے کھڑی ہے، کوئی درختوں کے جھنڈ میں موجود ہے، کوئی ہوٹل کی راہ داری میں عملے سے مصروف گفتگو ہے، کوئی چھوٹے سائز کا قرآن ہاتھ میں پکڑے کبابوں کے پاس براجمان ہے، کوئی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا رہی ہے۔

شام سے پہلے وہ سب واپس آچکے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ چائے لے کر کھڑکی میں آئی تو اسے کچھ سیاح موسیٰ سے باتیں کرتے ہوئے نظر آئے۔ موسیٰ درختوں، پہاڑوں، پہاڑی نالوں، پرندوں وغیرہ کی طرف اشارے کر کر کے باتیں کر رہا تھا۔ سب اتنے انہماک سے سن رہے تھے جیسے وہ سائنس پر کوئی لیکچر دے رہا ہو۔ کسی نے اس کی پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا تو اس نے قرآن نکال کر دکھایا۔ سیاح

عورت نے قرآن کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا تو اس نے قرآن کھول کر اور پڑھ کر سنا دیا اور واپس رکھ لیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم نے دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے پورا پورا اہتمام کر رکھا ہے۔" وہ پیچھے اس کے پاس آئی۔ سیاح جا چکے تھے اور وہ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور کتاب کا صفحہ پلٹ کر انہماک سے پڑھنے لگا۔

سیبل کو پہلی بار معلوم ہوا کہ..... "برا" ہی سہی پر سوال کا جواب آنا چاہیے' ورنہ بہت برا لگتا ہے۔ منہ توڑ اور دل توڑ ہی سہی' طنز کا جواب دیا جانا چاہیے۔ ورنہ بہت سبکی ہوتی ہے۔ آپ کی موجودگی کی "ہاں" نہ ہو تو "ناں" ضرور ہونی چاہیے۔

"میں کوئی جواب نہیں دیتا تو بھی تمہیں برا لگتا ہے۔" اس نے کتاب سے سر اٹھا کر اس سے کہا۔

حیرت کا پتلا اس کے اندر تیز تیز سانسیں لینے لگا۔ اس نے اپنا رخ اس سے پھیر لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے چہرے پر حیرت زدگی کے آثار دیکھے' جبکہ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اس کا سر بدستور جھکا ہوا ہے اور وہ کتاب پڑھ رہا ہے۔ اسے موسیٰ کا یہ انداز چیلنج کرتا ہوا لگا اور اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔

* * *

وہ خدا کا پیارا تھا' تو وہ خدا کی نافرمان.....

کباب کھاتی سیاح عورت شاید اسے کوئی کہانی سنا رہی تھی' جسے وہ سر جھکائے انہماک سے سن رہا تھا۔ عورت چلی گئی تو وہ جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔ وہ موسیٰ کے کبابوں کے پاس آئی اور اس نے چلا کر کہا۔

"تم نماز پڑھ رہے ہو اور تمہارے کباب بے یار و مددگار پڑے ہیں۔ انہیں کوئی بھی اٹھا کر کھا سکتا ہے' پھینک سکتا ہے۔"

موسیٰ نماز پڑھتا رہا۔

اس نے چند کباب کھائے' چند پھینک دیے۔ پھر اس نے سارے کباب ایک ایک کر کے پھینکنے شروع کر دیے۔ رک کر وہ اس کے نقصان کا تخمینہ لگانے لگی' جو کافی کم نکلا۔ نقصان ہو تو پورا ہو' زیادہ سے زیادہ ہو۔ اس نے ایک ایک کر کے اس کی باقی کی چیزیں بھی پھینکنی شروع کر دیں۔ اس کا چولہا' تیل' مسالا' برتن اور آخر میں اس نے میز بھی الٹ دیا۔ جب موسیٰ نے سلام پھیرا تو تھوڑا سا چونکا۔

"یہ سب میں نے کیا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر فخر سے کہا۔

موسیٰ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

"تم خدا کی طرف متوجہ تھے۔ تمہارا خدا کہاں متوجہ تھا۔ وہ تمہاری چیزوں کی حفاظت نہیں کر سکا۔"

موسیٰ نے دعا مانگی اور اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ وہ میز سیدھی کرتا' چیزیں اس پر واپس رکھتا۔ سیبل چیزیں پھینکتی' میز پھر سے الٹ دیتی۔ وہ میز سیدھی کرتا رہا' چیزیں اس پر رکھتا رہا' وہ میز کو چیزوں سمیت الٹتی رہی۔

دن شام میں ڈھل گیا' شام رات میں سمٹ آنے کے لیے تیار ہو گئی اور وہ بار بار یہ ہی کرتی رہی۔ پلٹ پلٹ کر کرتی رہی۔ جب وہ تھک گئی اور واپس جانے لگی تو اس نے اپنے پیچھے موسیٰ کی آواز سنی۔

"حادثات مجھے تمہاری طرح تھکا کر چور ہی کیوں نہ کر دیں' وہ مجھے خدا سے متنفر نہیں کر سکیں گے۔ میں اپنی مصیبتوں سے خدا کی محبت کا وزن نہیں کرتا' تم بھی نہ کیا کرو۔"

لفظ..... "تمہاری طرح" زہر میں بجھا تیر تھا جو اس کے دل میں پیوست ہوا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اپنے ہاتھ کی قوت کو آزمایا۔

"اور اس ذلت کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے تھپڑ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کتنی ہی دیر بے یقینی سے سیبل کو دیکھتا رہا۔

"برا لگا؟" اس نے آنکھوں کو طنز سے گھما کر کہا۔

"اب تم کیا کرو گے؟ مجھے مارو گے؟ گالیاں دو گے؟"

اپنی بے یقین آنکھیں سیبل کے چہرے سے ہٹا کر وہ پھر سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ جب وہ اپنی ساری

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

چیزیں سمیٹ چکا تو ایک بار پھر سے سیبل نے انہیں زوردار ٹھوکر سے زمین بوس کر دیا۔

"اگر تم اپنی حد کا تعین نہیں کر سکتے تو میں نے کر دیا۔" سیبل نے ہاتھ سے اس کے گال اور بکھرے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور وہ بھی تن کر اسے دیکھنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے۔ سیبل جس کے ہاتھ میں میزان ہے اور موسیٰ جو پیمانوں کا قائل نہیں۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں ڈرا کر میں تمہیں اپنا نقصان پورا کرنے کے لیے کہوں گا تو تمہیں اپنی خوش فہمی دور کر لینی چاہیے۔"

"بہت فیاض ہو تم؟"

"بہت فیاض خدا ہے۔۔۔"

"اوہ! تو اس نقصان کے لیے تم خدا سے کہو گے کہ وہ تلافی کر دے۔۔۔"

"میں اس نقصان کے فائدے کے لیے خدا سے کہوں گا۔" موسیٰ نے سیبل کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کسی کا نقصان ہوں، نہ فائدہ۔۔۔" وہ بھڑک گئی تو چلانے لگی۔

"کسی کا نہیں۔۔۔ خود اپنا۔۔۔"

رات بھر وہ خود کو پر سکون رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اگلے دن وہ سیدھی موسیٰ کے پاس گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ جان لے کہ وہ اس سے ڈرتی نہیں ہے۔ جو للکار اس کی آواز میں ہے وہ اس کی ذات میں بھی ہے۔ وہ قرآن کو ہاتھ میں لیے پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ میز سے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا کہ وہ پھر سے اپنا شوق پورا کر لے۔ سیبل نے اپنے نچلے ہونٹ کو سختی سے اپنے دانتوں کے نیچے دبا لیا۔ اگر وہ مسکرا دیتی تو اسے تکلیف دینے میں مزہ نہ آتا۔ ہاتھ میں پکڑی لمبی سوکھی شاخ کو ہنٹر کی طرح لہراتی، گھٹنوں تک لمبے جوتوں میں چلتی وہ اس کے قریب آئی اور فاصلہ کم کرتی عین اس کے چہرے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

موسیٰ چند قدم پیچھے ہٹا۔

"تم مجھ سے ڈر رہے ہو؟"

"مجھے انسانوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہتھیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں لیا۔

وہ مسکرا دیا۔ "تم مجھے مارنا چاہتی ہو؟ صرف اس لیے کہ میں نے سارے کا سارا خدا لے لیا۔"

سیبل نے گو صرف دکھانے کے لیے پستول باہر نکالا تھا، لیکن اس بات پر اس کا دل چاہا کہ وہ پستول کو سچ مچ چلا دے اور اس کی دونوں آنکھوں کے عین درمیان چلائے۔ "آج میرا ارادہ تمہیں تنگ کرنے کا نہیں ہے۔ شکل سے ویسے بھی تم کافی غریب لگتے ہو۔"

"میں غریب نہیں ہوں، تم چاہو تو اپنا شوق پورا کر سکتی ہو۔" اس نے اتنے اطمینان سے کہا کہ سیبل کو شک ہوا کہ سکون جس گودام سے نکال نکال کر انسانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے وہ اس گودام کا محافظ ہے۔

پیر سے ٹھوکر مار کر سبیل نے اس کی فرمائش اور اپنا شوق پورا کر لیا۔ میز اپنی تمام چیزوں کے ساتھ زمین پر آگرا۔ شور سے درختوں پر بیٹھے پرندے ایک ساتھ اڑے۔

"اس اجاڑ گاؤں میں تم میرے لیے تفریح سے زیادہ کچھ نہیں ہو۔" سوکھی شاخ لہرا کر سبیل نے اس کے شانے پر رکھی۔

"تفریح کی دلدادہ اس دنیا میں تم میرے لیے قابل احترام ہو۔"

کیونکہ میں لڑکی ہوں اور خوب صورت بھی ہوں اور یہ دونوں چیزیں خاص بھی ہیں اور مطلوب بھی۔"

"خاص "رضائے الٰہی" ہے اور مطلوب بھی یہی ہے۔"

"تمہیں لگتا ہے، تمہاری تبلیغ سے میں مرعوب ہو جاؤں گی؟"

"مجھے یقین ہے تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔۔۔" اس کی گھنی بھنوئیں رکوع سے قیام میں آئیں اور اس پر ٹھہر گئیں۔

"مجھے یقین ہے میں غلط نہیں ہوں۔"

"غلط کو کیسے لگے گا کہ وہ غلط ہے؟"

"تم ایک اچھے استاد بن سکتے ہو۔"

"تم اس استاد کی ابتداء ہو سکتی ہو۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور مسکرایا بھی۔ خون سبیل کی رگوں میں ساکن ہو گیا۔ اسے اس کے انداز کی سختی سے خوف بھی آیا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ "لوح نافرمان" ہو اور وہ اس پر لکھی تحریر پڑھ رہا ہو۔ اپنی نظر سے 'اپنے انداز سے۔

"تم جیسے شدت پسندوں کی فوج بڑھتی ہی جا رہی ہے' ٹھیک کرتے ہیں وہ جو تم پر کتے چھوڑ دیتے ہیں۔" اس کی نظر کا مقابلہ اس نے اس انداز میں کیا۔

"تو کیا تم شدت پسند نہیں؟"

"یہ فیصلہ تم کرو گے کہ میں کیا ہوں..... کس بنا پر؟"

"عقل اور مشاہدے کی بنا پر۔"

"عقل اور مشاہدہ؟ تم جیسے گڈریے میں؟"

"گڈریا ہونے میں برائی ہے؟"

"مجھ سے دو بدو لڑنے میں بھی اچھائی نہیں ہے۔ تمہیں ان سیاحوں کو ہی متاثر کر کے اپنا کام چلانا چاہیے' مجھے نہیں۔"

"تمہیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔" موسیٰ کی آواز سرسبز پتوں میں استراحت کرتی ہوا کے سنگ اس کے سامنے آٹھہری۔

"تمہارے باپ کا گاؤں ہے یہ' جو مجھے یہاں سے جانے کے لیے کہہ رہے ہو؟"

"میں تمہیں خدا کے پاس لوٹ جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" وہ زمین پر جھکا اور میز کھڑی کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

شام کو وہ ہوٹل کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے فرنچ سیاح عورت کو موسیٰ کے ساتھ چہل قدمی کرتے دیکھا۔ موسیٰ کا کباب خانہ بند ہو چکا تھا۔ صبح ہی وہ اس کا اتنا نقصان کر چکی تھی کہ شاید ہی اب وہ چند دنوں کے اندر کھل سکے۔ وہ دونوں کے پاس پہنچ گئی۔

"تمہیں ایسے لوگوں سے بچ کر رہنا چاہیے یہ تمہارے لیے کافی خطرناک ہو سکتے ہیں۔" اس نے موسیٰ کی طرف اشارہ کر کے انگلش میں کہا۔ عورت سوالیہ نگاہوں سبیل کو دیکھنے لگی اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی ہے۔ موسیٰ نے سبیل کی بات کا ترجمہ فرنچ میں کر کے اس عورت کو بتایا۔ عوت نے سبیل کو دیکھا اور فرنچ میں جواب دیا۔

"یہ پوچھ رہی ہیں کس طرح کے خطرناک؟" موسیٰ نے عورت کی فرنچ کو عربی میں ترجمہ کر کے سبیل سے پوچھا۔

"یہ تمہیں مار سکتا ہے۔ تمہیں بیچ سکتا ہے۔ تمہیں لوٹ سکتا ہے۔" سبیل نے موسیٰ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

موسیٰ کے بتانے پر عورت حیرت سے سبیل اور موسیٰ کو دیکھنے لگی۔ پھر اس نے قہقہہ لگایا۔

"میں اس سب کے لیے تیار ہوں۔ کیا تم بھی تیار ہو۔" عورت کے کہنے کے بعد موسیٰ نے ترجمہ کیا۔

سبیل کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے موسیٰ کو دیکھا اور اپنے دل میں اتر آنے والے خوف کو دبا دینا چاہا۔ رات کو وہ واپس امریکہ جانے کے لیے تیاری کر چکی تھی۔ اس نے پیکنگ مکمل کی تو فریڈرک کو فون کیا۔

"میں واپس جا رہی ہوں۔"

"ایک دم سے اچانک؟"

"میں بور ہو چکی ہوں یہاں....."

"میں آ رہا ہوں' تین چار گھنٹے میں تمہارے پاس ہوں گا' کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا واقعی تم آ رہے ہو یا مجھے ٹال رہے ہو؟"

"میرا کام ختم ہو چکا ہے میں آ رہا ہوں سبیل! تم کھانا کھا لینا۔"

رات کا کھانا کھا کر وہ سو گئی۔ پھر بہت سی چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو گئیں۔ وہ گہری نیند میں تھی اور اسے

اپنی نیند کی گہرائی پر حیرت تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا۔ بجلی کی طرح نیند اس کی آنکھوں سے ذرا سی جھٹکی۔ کسی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا، تب وہ گہری نیند سے دھند میں لپٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ اسے اٹھا کر کندھے پر لاد کر گاڑی میں پٹخا گیا۔ اس کا سر کھڑکی سے ٹکرایا اور وہ درد سے کراہ اٹھی۔ وزنی کمبل کو اس نے اپنے اوپر محسوس کیا۔ پھر پتا نہیں کیا کیا اس پر آن گرا کہ بوجھ سے وہ دب گئی۔ سانسوں کی بے ربطی سے اس کا سینہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی گہری نیند نہیں سوئی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اور اس کے موم بتی لے کر بدروح بن کر گھر میں گھومنے سے تنگ آکر اگر وہ نیند کی گولیاں کھا بھی لیتی تھی تو بھی وہ گہری نیند نہیں سو پاتی تھی، تو پھر آج کیسے؟

گاڑی تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں پر اچھل رہی تھی۔ اس کی آنکھ تو کھلتی رہی، لیکن اس پر اتنا ڈھیر تھا کہ نہ وہ اسے پرے کھسکا سکی نہ ہی کسی کو دیکھ سکی۔ رات اپنی ساری سیاہی لیے اس کے گرد اپنا جال بنتی چلی گئی اور اسے قیدی بنا کر ہی دم لیا۔

* * *

اس کی پشت زمین سے ٹکرائی اور اس کی آنکھیں وا ہوئیں تو بھی اسے اپنے آس پاس اندھیرا ہی نظر آیا۔ تین لوگوں کی سرگوشیاں اس کے کانوں تک تو آئیں، لیکن اس کے دماغ کو مطلب نہیں سمجھا سکیں۔ وہ نیند سے ڈوب کر پھر ابھری تو اندھیرے میں موم بتی کی روشنی میں دو آنکھیں نظر آئیں، وہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھیں۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر ان کی آنکھوں کو پرے کرنا چاہا، لیکن اس کے ہاتھ حرکت نہیں کر سکے۔ وہ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے جان توڑ کوشش کی کہ وہ جاگی رہے لیکن اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ وہ اتنی وزنی ہو رہی تھیں، جیسے اس نے نیند کی کئی سو گولیاں پھانک لی ہوں یا ماری جوانا کے کش بھر لیے ہوں۔

"کون ہے یہ؟" عورت کی آواز آئی۔

"ہماری مہمان ہے۔"

"مہمان اور ایسے اس طرح۔۔۔؟"

"یہ ایسے ہی رہے گی، کچھ بھی ہو جائے، ام ہانی اس کے ہاتھ پیر نہ کھولنا۔"

"تم اسے یہاں لائے کیوں ہو۔۔۔؟"

"میں جلدی میں ہوں، جا رہا ہوں۔۔۔ ہرگز اس کا منہ نہ کھولنا، ورنہ یہ چلائے گی۔ تم اسے قابو میں نہیں رکھ سکو گی۔ یہ تمہیں مار دے گی۔"

اس نے مرد کی آواز کو پہچان لیا تھا۔۔۔ وہ موسی تھا۔

"گناہوں کی زمین پر موسی ایک اور گناہ میں اضافہ کر رہا ہے۔" نیند کے ساتھ یہ خیال سبیل کے ساتھ ساتھ رہا۔

اگلے دن جب وہ ہوش میں آئی تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے اور اغوا کرنے والا موسی ہے۔ راتوں رات اسے ہوٹل سے اٹھا کر یہاں لا کر پھینکا گیا ہے۔ اسے ان علاقوں کے جرائم سے تھوڑا بہت آگاہی تھی۔ وہ جانتی تھی دیکھتے ہی دیکھتے گاڑیاں کیسے غائب ہو جاتی ہیں، سیاحوں کو کیسے لوٹ لیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تو یہ ہی ہونا تھا، خاص کر اس صورت میں جب اس نے خود موسی کو دشمنی کی دعوت دی تھی۔ اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ موسی نے یہ کیا ہے۔ اس کی مردانہ غیرت جاگ گئی تھی۔

کمرے میں اتنا اندھیرا تھا کہ اسے گمان ہوا کہ دنیا میں کہیں روشنی باقی بچی ہی نہیں ہے۔ اناج کی بو اس کے نتھنوں میں گھس کر اسے بے چین کر رہی تھی۔ وہ چٹائی پر پشت کے بل بائیں رخ پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں زمین میں گڑے ایک کنڈے کی رسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور اتنے ہی ڈھیلے تھے کہ وہ دائیں بائیں کروٹ لے سکے۔ کپڑے سے اس کا منہ سختی سے باندھ کر پیچھے کو بھینچا گیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد ام ہانی کواڑ کھول کر اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں موم بتی تھی۔

”تمہیں بھوک لگی ہوگی، مجھے موسی نے سختی سے منع کیا ہے کہ تمہارا منہ نہ کھولوں، تم چلانے لگو گی۔ میں کب سے سوچ رہی ہوں کہ تمہیں کھانا کیسے کھلاؤں۔ میں تمہیں چند نوالے کھلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں اتنی دیر تک تمہیں بھوکا کیسے رکھ سکتی ہوں۔“

اس نے اس کے منہ پر بندھے کپڑے کو کچھ ڈھیلا کیا، لیکن پورا کھولا نہیں اور چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ ان نوالوں کو جیسے تیسے اندر کرنے کے بعد اس نے آخری نوالے پر عورت کی شہادت کی انگلی کو اپنے دانتوں میں شکنجے کی طرح کس لیا، پہلی بار... پہلی انگلی کو...

اپنی انگلی اس کے دہن سے بمشکل آزاد کروانے کے بعد ام ہانی کتنی ہی دیر زمین پر گر کر اپنی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اگر سیبل کا منہ کھلا ہوتا تو وہ قہقہہ لگاتی اور اس سے پوچھتی۔ ”کیسا رہا؟“

زمین سے اٹھنے کے بعد موم بتی ہاتھ میں لے کر ام ہانی دہلیز سے باہر جانے لگی تو اس نے گردن موڑ کر اس سے کہا۔

”یقیناً میں بری عورت ہوں گی، لیکن میں تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کروں گی۔“

* * *

”میں ایک بری عورت ہوں سیبل، سب سے پہلے میں نے اپنے باپ کے ساتھ برا کیا اور پھر کسی کو نہیں چھوڑا۔ میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔“

عدینہ، یعقوب عبدہ کے نکاح میں تھی، جو ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھا، خوب صورت تھا اور اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی، اس وقت تک جب تک موسم بہار نہیں آگیا اور اسے اپنی خالہ کے پاس پہاڑوں پر جا کر رہنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ دو ماہ رہنے کے لیے آئی تھی اور دو سال رہ کر گئی۔ جب جب بابا اسے لینے آتے وہ ٹال جاتی، کبھی بیمار ہو کر، کبھی ضد کر کے، کبھی بہانے بنا کر، کبھی منت کرکے۔ موسم خزاں میں بابا اسے زبردستی اپنے ساتھ لے آئے۔ جب تک یامین اس کے پیچھے شہر آیا اس کی رخصتی طے ہو چکی تھی۔ وہ گھر سے بھاگ رہی تھی، جب بابا نے اسے پکڑ لیا۔

”میں نے تمہیں پہاڑوں کی سیر کے لیے بھیجا تھا عدینہ، تم نے پستیوں کا رخ ہی کیوں کیا؟ تم جانتی تھیں تم کسی سے منسوب ہو۔ تم نے کسی اور مرد کی طرف توجہ دی؟ تم نے یہ بے ایمانی کیسے کی عدینہ؟“

”محبت کوئی بے ایمانی نہیں ہوتی بابا۔“

”محبت سب سے پہلے انسان کو ”لامذہب“ بناتی ہے۔ بے دین رکھتی ہے۔ پہلے وہ بے شرم ہوتا ہے، پھر جھوٹ بولتا ہے، اور پھر بے ایمانی کرتا ہے۔ انسان وہ سب کرتا ہے جو پہلے نہیں کرتا۔ وہ کفر کا کلمہ بھی پڑھ لیتا ہے، جس پر پہلے وہ توبہ استغفار کرتا ہے۔“

”اگر آپ نے میری رخصتی کر دی تو بھی میں اسی کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔“

”پھر تم بھاگتی ہی پھرو گی عدینہ... میں نے تم پر کبھی سختی نہیں کی۔ میری نرمی کا کچھ تو اجر دو مجھے۔“

”میں اسے نہیں بھول سکتی...“

”انسان سب سے پہلے خدا کو بھولتا ہے، کیونکہ وہ انسان کو یاد کر لیتا ہے اور یہیں سے اس کے شرک کی ابتدا ہوتی ہے۔“

”آپ مجھ سے زبردستی کریں گے۔“

”دنیا کا کون سا باپ ہوگا جو اولاد کو گڑھے میں گرنے سے روکنے کے لیے سختی نہیں کرے گا۔ میں بھی کروں گا۔ مت بھولو کہ تم یعقوب کے نکاح میں ہو...“

”اب میں یامین سے نکاح کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم اپنے شوہر کو فراموش کر سکتی ہو تو یامین کو بھی کر سکتی ہو۔ میری عزت کا جنازہ نہ نکالو، ورنہ اس جنازے پر فاتحہ میری موت ہوگی عدینہ...“

”میرے باپ نے میرے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس کا سر کس قدر وزنی تھا۔ اتنا وزنی تھا۔ اتنا وزنی کہ میرے قدموں میں بیڑیوں کی طرح ایسے پڑا کہ میں ایک قدم نہیں ہلا سکی۔ کاش

اگلی بار بھی یہ ہی بیڑیاں مجھے روک لیتیں سمبل۔۔۔"

"اگر یہ میری آزمائش ہے تو میں اس میں سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔ تم اللہ سے معافی مانگو' اس وقت تک جب تک تمہارے دل میں اطمینان ایسے نہ بھر جائے جیسے صراحی میں پانی اور تم خدا کی نظر کرم سے ایسے نہ بھیگ جاؤ جیسے وضو سے نمازی۔" بابا نے یعقوب کو سب بتا دیا تھا اور وہ اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھا رہا تھا۔

"میں خدا سے معافی مانگ چکی ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔ پھر وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتی رہی اور یامین سے بھی ملتی رہی۔ یامین کی محبت سے اس کا دل ایسے بھرا ہوا تھا جیسے دوات میں سیاہی۔ اس کی محبت میں وہ ایسے بھیگی ہوئی تھی جیسے نشے میں شرابی۔

وہ کب تک خود پر جبر کرتی۔ اسے گھر سے بھاگنا پڑا۔ یامین پہلے ہی سب انتظام کر چکا تھا۔ پہلے وہ عمان گئے' پھر سریا اور پھر وہ امریکہ آگئے۔ امریکہ آنے کے بعد یامین نے یعقوب سے طلاق منگوائی جو یعقوب نے فوراً" بھیج دی۔ طلاق کے کاغذات پر اس کے گھر سے بھاگنے کے اگلے ہفتے کی تاریخ درج تھی۔ طلاق کے کاغذات پر اس کے باپ کی لکھائی میں پنسل سے ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

"میں دیکھوں گا' تم کس منہ سے خدا کا سامنا کرو گی۔"

چند دن وہ اپنا منہ آئینے میں دیکھنے سے کتراتی رہی۔ چند راتیں وہ اپنے منہ پر کپڑا ڈال کر سوتی رہی۔ شادی کے بعد دونوں نے چند سال رات دن صرف کام کیا' اپنا گھر بنایا اور پھر سمبل ہوئی۔

"اب ہماری زندگی مکمل ہے۔" یامین نے کہا اور عدینہ نے اپنے دل میں وحشت کو اترتے دیکھا۔

"ہمیں دعائیں دینے والا کوئی نہیں ہے۔ بابا اور۔۔۔"

"تمہیں کن دعاؤں کی ضرورت ہے؟"

"سمبل کو دعائیں چاہیے ہوں گی یامین۔۔۔"

"ہم ہیں اس کے لیے دعا کرنے کے لیے۔۔۔"

"ہم۔۔۔ لیکن ہم دعا کیسے کر سکتے ہیں؟"

یامین اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"پتا نہیں! بس میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ہم کیا کریں گے' اگر ہمیں دعا کی ضرورت درپیش ہوئی تو۔۔۔"

"تو کرلیں گے ہم۔۔۔" یامین چلا اٹھا۔

"لیکن بابا نے کہا' وہ دیکھیں گے میں کس منہ سے خدا کا سامنا کروں گی' پھر میں کس منہ سے دعا کر سکتی ہوں۔"

"بکواس بند کرو عدینہ۔۔۔"

"اگر سمبل بیمار ہو جائے تو۔۔۔؟"

"تو ہم ڈاکٹر کے پاس جائیں گے۔"

"ساری بیماری ڈاکٹر دور نہیں کیا کرتے' تم جانتے ہو۔"

"میں یہ جانتا ہوں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے' تم آرام کرو۔"

"کچھ گھنٹوں میں وہ ٹھیک ہو گئی' پھر مہینوں اسے "تمہیں آرام کرنے کی ضرورت ہے۔" کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک دن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "بابا مر چکے ہیں' اب میرے لیے بددعا کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ یامین نے اپنے کچھ رابطوں سے معلوم کروایا۔ وہ واقعی مر چکے تھے۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مر چکے ہیں۔" چند دنوں بعد اس نے پوچھا۔

"تم سے نفرت نے۔۔۔"

"مجھ سے نفرت؟ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟ تم واقعی میں پاگل ہوتی جا رہی ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا دل چاہا میں تمہیں جان سے مار دوں' سمبل کو کسی گڑھے میں دبا آؤں۔ میرا دل چاہا میں تم سے دور بھاگ جاؤں اور بابا کے قدموں میں گر جاؤں۔"

"تم ان سے اتنی ہی محبت کرتی تھیں تو یہ سب کیوں کیا۔" وہ ہفتوں بیمار رہی تو یامین نے چڑ کر کہا۔

"میں ان سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اب پتا نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

کیوں ان کی محبت سے میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ اب یہ محبت کہاں سے آ گئی۔ اب یہ محبت کیا کرنے آئی ہے۔ بھلا باپ سے بھی کوئی ایسی محبت کر سکتا ہے کہ اس کے بغیر سانس نہ آئے، دم گھٹنے لگے۔ وہ زندہ تھے تو مجھے یاد بھی نہیں آئے، اب وہ مر گئے ہیں تو میرے اعصاب پر سوار ہو گئے ہیں۔ یہ کیسا عذاب ہے یامین جوان کی محبت کی صورت مجھ پر نازل ہوا ہے۔"

"تم نو سال ان کے بغیر سانس لیتی رہی ہو۔"

"کیسے؟ کیسے لیتی رہی ہوں یہ سانس ان کے بغیر.... اب تو حلق میں میری جان اٹک گئی ہے۔ جو نو سال تمہارے ساتھ گزارے وہ جھوٹ ہے یا جوان کے بغیر گزار دیے وہ سچ ہے۔ جب تم میرے پاس نہیں ہوتے تھے تو میں سوچتی تھی کہ کبھی میں تمہارے بغیر بھی رہ سکوں گی؟ اب تم میرے پاس ہو تو میں سوچتی ہوں میں تمہارے ساتھ کیسے رہ رہی ہوں۔"

"میں تمہاری تیمارداری کے لیے تیار ہوں، لیکن تم جسمانی نہیں، ذہنی بیمار ہو۔ سیبل کا خیال رکھنا بھی بھول گئی ہو۔"

"ہم سیبل کو کیا بتائیں گے کہ ہمارے رشتے دار کہاں ہیں؟"

"تمہارا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ ہم نے سب طے کر لیا تھا۔"

"وہ تو ہم نے طے کیا تھا، ہم سیبل کو کیسے بتائیں گے کہ ہم نے یہ طے کیا تھا۔"

"اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب وہ بڑی ہوگی تو میں سب دیکھ لوں گا۔"

"اور جو سب دیکھ رہا ہے؟ وہ... وہ کیا کرے گا...؟"

"کون دیکھ رہا ہے؟"

"خدا... کچھ تو اس نے بھی طے کیا ہوگا۔"

"تمہارا باپ مولوی تھا نہ تمہارا سابقہ شوہر عالم... اب تمہیں یہ باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اب تم ایسی باتیں کرنے لگی ہو۔ اگر تمہیں خدا کے دیکھنے کی اتنی ہی فکر تھی تو تم میرے ساتھ آئی ہی کیوں تھیں؟ مجھ سے چھپ چھپ کر ملتی کیوں تھیں؟ میری محبت کا دم کیوں بھرتی تھیں؟"

وہ بے چارگی سے یامین کو دیکھتی رہی "ہاں! یہ خدا اب کہاں سے آ گیا۔ پہلے تو میں کسی خدا کو نہیں جانتی تھی۔ مجھے تو پروا ہی نہیں تھی کہ مجھے خدا کی پروا بھی کرنی ہے۔ میں خود نہیں جانتی یامین یہ سب باتیں کیسے میرے ذہن میں آنے لگی ہیں۔ میں تھک گئی ہوں ان باتوں سے لڑتے لڑتے۔ ان کا جواب دیتے دیتے۔ یہ خیالات میرے دل و دماغ پر قابض ہیں۔ انہوں نے مجھے قید کر لیا ہے۔"

"سیبل کا آنا منحوس ہے۔ پہلے تو تم ٹھیک تھیں۔"

"ہاں! سیبل کا آنا ٹھیک نہیں رہا۔ میں جب جب اس کی طرف دیکھتی ہوں مجھے لگتا ہے میں خود کو دیکھ رہی ہوں۔"

"ماں کو بیٹی میں اپنا آپ ہی نظر آتا ہے عدینہ...."

"خدا نہ کرے وہ مجھ جیسی ہو۔"

"اور تم کیسی ہو عدینہ؟" غصے سے یامین کو چلانا پڑا۔

"میں گناہ گار ہوں یامین، بدکار ہوں میں...." وہ بھی پوری قوت سے چلا اٹھی۔

* * *

ایک ہی گھر میں رہتے اُس نے یامین کو طلاق کا نوٹس بھجوا دیا۔ صدمے سے زیادہ حیرت سے اس نے عدینہ کو دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟ کیسا مذاق ہے یہ عدینہ؟"

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے، اگر تم نے مجھے طلاق نہ دی تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔ تم منت کرو یا اپنی محبت کے واسطے دو، میں تم سے الگ ہونے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔"

یامین نے بہت بحث کی، بہت کچھ یاد کروایا، وہ چپ چاپ سنتی تو رہی، لیکن بولنے پر آمادہ نظر نہ آئی۔

"یہ صلہ دے رہی ہو تم مجھے میری محبت کا۔ دھوکا

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دے رہی ہو مجھے، جواب دو مجھے؟"

"مجھے طلاق چاہیے..... ہر صورت چاہیے۔"

"تم اپنے پہلے شوہر سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ تم بدچلن، فاحشہ، میں نے تمہارے لیے اپنی ساری زندگی برباد کردی۔ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟"

"جو کیا برا کیا، ہم دونوں نے کیا۔"

اس کے گھر آنے سے پہلے وہ کمرے کا دروازہ بند کرلیتی۔ وہ کمرے کے دروازے پر دستک دے دے کر تھک جاتا۔

"تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا عدینہ....." تھک کر وہ دروازے کے پاس ڈھیر ہو جاتا۔

"میں نے خود کو بھی کہیں کا نہیں چھوڑا۔ جاؤ..... چلے جاؤ..... مجھے بھی جانے دو....."

"میں تم سے محبت کرتا ہوں، تم سے الگ نہیں رہ سکتا۔" دکھ کی شدت سے وہ گڑگڑا رہا تھا۔

"میں اب تم سے محبت نہیں کرتی۔ تم سے الگ رہنا چاہتی ہوں۔" وہ بھی گڑگڑانے لگی۔

"پہلے تم مجھ سے محبت چاہتی تھیں۔ اب معافی چاہتی ہو۔"

"اور کیا کیا چاہتی ہو تم....." یامین دروازے کو توڑ ڈالنا چاہتا تھا۔

"معافی..... رحم..... رحم کرنے والا خدا..... مجھ سے سب کچھ چھن جائے، یہ بھی چاہتی ہوں۔ میرا سب کچھ چلا جائے یامین، اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ دیکھو مجھ پر ہر چیز کی حقیقت کھل گئی ہے۔ یہ ہی میری سزا ہے یامین۔ جس جس چیز کے پیچھے میں بھاگی وہ میرے لیے مٹی کے ڈھیلوں سے بھی کم قیمت نکلی۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں جب تمہیں دیکھتی ہوں، کراہیت میری نس نس میں دوڑنے لگتی ہے۔ میرا خون میرے جسم میں ایسے ہو جاتا ہے جیسے زخموں میں پیپ ہو جاتی ہے۔ میں تمہارے لیے گھر سے نکلی تھی۔ میرے بیٹے احمت نے تمہیں اور مجھے اپنی معصوم آنکھوں سے پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے اس کی وہ آنکھ نہیں بھولتی یامین، اس کی آنکھ کے ساتھ مجھے خدا کی آنکھ یاد آتی ہے۔ تم نہیں جانتے سمبل چھ ماہ کی تھی جب میں نے اسے چھپا دیا تھا۔"

"سمبل گناہ نہیں ہے ہمارا، بیوی ہو تم میری....."

"ہاں..... گناہ نہیں ہے ہمارا، پھر بھی یامین..... پھر بھی..... اگر ایسا ہی نیک کام ہوتی تو مجھے اسے چھپانے کا خیال کیوں آتا۔"

"تم پر اب نیک بننے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اچھا چلو آؤ ہم دونوں مل کر خدا سے توبہ کریں، ہم خدا سے معافی مانگیں۔"

"کس منہ سے؟ معافی مانگنے کے لیے بھی تو منہ چاہیے۔"

"وہ توبہ قبول کرتا ہے، کیا تم جانتی نہیں۔"

وہ ہنس دی..... "اگر تمہیں یہ معلوم تھا تو یہ کیوں نہیں معلوم تھا کہ پہلے وہ گناہ سے روکتا ہے، توبہ کا درجہ تو دوم ہے، اول تو گناہ سے باز رہنا ہے۔"

یامین چکرا گیا۔ "تم درجوں تک پہنچ گئی ہو؟"

"اپنا درجہ معلوم ہوا تو دوسرے درجے یاد آئے۔ نچلے درجے پر آئی تو اوپر کے درجوں کو گنوا دینے پر رونا آیا۔"

"تم کسی عالم کی طرح باتیں کرنے لگی ہو۔ تمہیں اتنا مومن بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"گناہ گار بن گئی ہوں..... اب مومن کیسے بنوں گی؟"

"ہم نے کیا گناہ کیا ہے؟ کوئی گناہ نہیں کیا؟ محبت کرتے تھے ہم، شادی کرلی۔ غلطی تمہارے بابا نے کی۔ کیوں نہیں کی ہماری شادی؟"

"ہاں اتنی سی بات تھی کہ میں تم سے محبت کرتی تھی، پھر اس اتنی سی بات کے لیے میں خود کو کہاں سے کہاں لے آئی۔ ایک اتنی سے بات کے لیے میں نے اپنے ساتھ کیا کیا؟! اتنی سی چیز محبت کے لیے "اتنا" کچھ کردیا۔ ایک محبت ہی تو تھی۔ اگر ہم نے غلطی نہیں کی تو اب وہ محبت کہاں گئی جو مجھے تم سے تھی۔"

"اب تم پچھتا رہی ہو؟"

"میں تڑپ رہی ہوں۔"

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"تم نے اپنے ذہن پر بہت بوجھ ڈال لیا ہے۔ میں تمہیں کچھ ہفتوں کے لیے اکیلا چھوڑتا ہوں، تم آرام سے سوچنا۔"

"تم مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو یامین....."

چند ہفتوں بعد وہ واپس آیا تو اس کا فیصلہ وہیں کا وہیں تھا۔ "خود سے الگ کر کے تم مجھے کیوں سزا دے رہی ہو؟"

"میں خود کو سزا دے رہی ہوں۔ آج سے شروع کروں گی تو کچھ کمی کروا پاؤں گی۔ رائی کے دانے کے برابر ہی سہی۔"

"میرے بدلے اب تمہیں رائی کا دانہ چاہیے۔"

"مجھ سمیت ہر چیز کے بدلے..... اسے معمولی نہ سمجھو یامین۔"

وہ اپنی بات پر سختی سے قائم رہی۔ یامین بھی کسی صورت اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے ڈرانے کے لیے، پرانی محبت یاد دلانے کے لیے ایک دن اس نے تیز دھار بلیڈ اپنی گردن پر رکھ دیا۔

"میں خود کو مار لوں گا، تمہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔"

"تم ایک اور غلطی کرو گے۔"

"تم سمجھتی ہو میں مذاق کر رہا ہوں۔"

"میں سمجھتی ہوں تم وقت برباد کر رہے ہو۔"

"تم نے اکیلے ہی میرے اور اپنے لیے فیصلہ کر لیا۔ میں کیا کروں گا؟"

"وہی جو میں کروں گی۔"

اس کے ایسے رویے نے یامین کو اس قدر دل برداشتہ کیا کہ اس نے بلیڈ کو سختی اور تیزی سے اپنی گردن پر رگڑ دیا۔ جس وقت وہ فرش پر گرا اور اس کا خون پھیلنے لگا، اس وقت عدینہ کو احساس ہوا کہ اپنی جان دے دینا کس قدر بڑی قربانی ہے۔

"پھر میں نے یہ قربانی "یامین" کے لیے کیوں دی۔"

یامین گردن کے کٹنے سے تو نہیں مر سکا، لیکن عدینہ کے رویے کی سختی نے اس کا دل پاش پاش کر دیا اور وہ دماغ کی نس پھٹ جانے سے مر گیا۔

"شاید یامین خوش نصیب رہا۔" یامین کے مرنے کے بعد وہ اکثر کہہ دیتی۔

* * *

سہیل نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ گھر میں اس کی ایک بھی تصویر نہیں تھی۔ ہاں دعا میں وہ اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کیا کرتی تھی۔

"جب تم تھوڑی سی بڑی ہو جاؤ گی تو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا؟" عدینہ اس سے اکثر کہتی۔

"میں آپ سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میں کروں گی۔ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"

"اگر میں مر جاؤں تو میں نے لاکر میں ریکارڈنگ کر کے رکھ دی ہے، تم وہ لے لینا۔"

"میں وہ لے لوں گی اور آپ کا کام کروں گی۔"

اسکول سے آنے کے بعد سہیل کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس گھر میں واپس آئے۔ اسے اپنی ماں سے کوفت ہوتی تھی۔ وہ عام ماؤں کی طرح نہیں تھی۔ وہ ہر وقت اس سے اپنا کوئی نہ کوئی کام کرواتی رہتی تھی، کچھ نہ کچھ پوچھتی رہتی تھی۔

"تم نے کل رات خواب میں کیا دیکھا؟"

"میں نے دیکھا کہ میں ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوں۔ درخت کے سبز پتے میری جھولی میں گر رہے ہیں۔"

"اچھا... پھر کیا ہوا؟"

"خواب ختم ہو گیا۔"

"نہیں! تم یاد کرو وہاں کہیں قریب ہی میں بھی ہوں گی۔ سبزہ خوش حالی کی علامت ہوتا ہے۔ یاد کرو کوئی پتا میری گود میں بھی گرا ہو گا۔"

"مجھے یاد ہے، آپ وہاں نہیں تھیں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔"

اس کی ماں کو وہم تھا کہ خدا فرشتہ صفت "سہیل" کے ذریعے اسے اپنی معافی کا کوئی اشارہ دے گا۔ خواب کے ذریعے خیال یا الہام کے ذریعے۔ وہ سہیل کی باتوں کو غور سے سنتی۔ اسے کریدتی، سوال پر سوال کرتی۔

ایک بار اس نے اس کے لیے لنچ بنایا اور وہ اسے اتنا اچھا لگا کہ اس نے کہہ دیا۔ “آپ بہت اچھی ہیں ماں۔”

کچن میں کام کرتی وہ جھٹکے سے پلٹی۔ “تمہیں کیسے پتا؟”

“کیا ماں۔۔۔”

“کہ میں اچھی ہوں۔۔۔”

“آپ نے مجھے اتنا مزے دار لنچ بنا کر دیا ہے اس لیے۔۔۔”

“تو تم یہ کہہ سکتی تھیں کہ لنچ اچھا ہے۔ تم نے یہ ہی کیوں کہا کہ میں اچھی ہوں۔ کس نے کہا تم سے مجھ سے یہ کہنے کے لیے۔”

“کون کہے گا؟” اس نے حیرت سے منہ کھول کر دیکھا۔

“خدا۔۔۔ وہ بچوں کے ذریعے بہت کچھ کہلوا دیتا ہے۔ فرشتے بچوں کے کانوں میں خدا کے پیغامات اتارتے ہیں۔”

“کیسے پیغامات؟”

“وہی پیغامات جو ہمیں چاہیے ہوتے ہیں۔ بچپن میں میری چھوٹی بہن بابا کو کہا کرتی تھی۔ ”وہ آپ کو بلا رہا ہے۔“ وہ آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہتی تھی۔ بابا سمجھے ان کی موت آنے والی ہے، لیکن دراصل خدا انہیں اپنے گھر مہمان نوازی کے لیے بلا رہا تھا۔”

“آپ بھی خدا کے گھر جانا چاہتی ہیں؟ آپ بھی مہمان بننا چاہتی ہیں؟”

“مہمانوں کی فہرست سے اپنا نام میں خود کٹوا چکی ہوں سیبل۔”

وہ سوتے میں نظر آنے والے اپنے خوابوں کی تعبیروں کو کتابوں میں کھنگالتی پھرتی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ تعبیروں کو پڑھتے اس کے چہرے پر چمک آئی ہو۔

“آپ خدا کو چھوڑ دیں۔ بھول جائیں۔”

“اب اس نے چھوڑ دیا۔ پہل میں نے کی۔”

اس کا گھر میں رہنا اور عدینہ سے باتیں کرنا ایک عذاب سے کم نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ کوشش کرنے لگی کہ کم سے کم گھر میں رہے۔

“تم مجھ سے دور بھاگ رہی ہو نا؟”

“میں تنگ آچکی ہوں آپ کی باتوں سے۔ میرے دوست ہنستے ہیں آپ کی باتوں پر۔۔۔”

“میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ پر ہنسیں، سب مجھ پر ہنسیں، شاید پھر میرا بوجھ کم کر دیا جائے۔”

“آپ میرے دوستوں سے بھی کہتی ہیں کہ وہ خدا سے آپ کی سفارش کریں۔ آپ ان سے بھی ایسی باتیں کرتی ہیں۔”

“آخر اس میں برائی کیا ہے؟”

“اس میں اچھائی بھی کیا ہے؟”

“دعا کرنا اچھا ہوتا ہے سیبل۔۔۔!”

“تو پھر یہ اچھا کام آپ خود کریں۔”

“تمہیں اپنی ماں کے درد کو کچھ تو سمجھنا چاہیے۔”

“میری ماں کو بھی میری حالت کو سمجھنا چاہیے۔ مجھے آپ کی یہ الٹی سیدھی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔”

“تمہیں اپنی ماں ہی پسند نہیں ہے۔”

“آپ نے بھی کوشش ہی نہیں کی کہ میں آپ کو پسند کروں۔ آپ مجھے ہر رات عجیب و غریب کہانیاں سناتی ہیں۔ آپ کو کیوں یہ لگتا ہے کہ مجھے آپ کے ماں باپ میں دلچسپی ہوگی۔ آپ کی پہلی زندگی میں؟ آپ کے بھائیوں بہنوں میں؟ آپ کے بیٹوں میں؟”

“وہ تمہارے نانا، نانی ہیں، تمہارے بھائی ہیں۔”

“ماں! رشتے ناموں سے گنوا کر یاد نہیں کروائے جا سکتے۔ میں اور آپ اس گھر میں اکیلے رہتے ہیں، یہ ہی حقیقت ہے۔ اگر مجھے کسی میں دلچسپی ہے تو اپنے باپ میں ہے۔ بابا کی تصویر تک تو آپ مجھے دکھاتی نہیں ہیں۔ آپ سب کے بارے میں بتاتی ہیں ایک سوائے بابا کے۔۔۔”

“میں نے زندگی میں تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ جیسے جیسے تم بڑی ہوتی جاؤ گی، میں تمہیں سب بتاتی جاؤں گی۔”

“مجھے کچھ بھی جاننے میں دلچسپی نہیں رہی۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ آپ بابا کی تصویر مجھے کیوں نہیں دکھاتیں۔”

”میں تو تمہیں اپنی شکل بھی نہیں دکھانا چاہتی۔ ہم دونوں تمہارے گناہ گار ہیں سبیل۔ ہم اندھے ہوگئے تھے۔ ہم نے تمہیں دنیا میں اکیلا کردیا۔ اگر ہم گھر سے نہ نکلتے تو تم اچھے شریف خاندان میں پیدا ہوتیں۔ تمہاری اچھی تربیت ہوتی، تمہیں رشتے دار ملتے، تمہیں ان کی نیک تمنائیں ملتیں۔ تم دس سال کی ہونے والی ہو اور تمہیں آج تک کسی کی طرف سے نیک دعائیں نہیں ملیں۔“

”جب آپ دس سال کی تھیں تو کیا آپ کو ملی تھیں؟“

”میری ماں اٹھتے بیٹھتے کہا کرتی تھی کہ خدا تمہیں سرسبز و شاداب رکھے۔“

عدینہ کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ”اور ایسا ہوا... جب تک میں اپنے باپ کے گھر میں تھی ایسا ہی ہوا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوا۔ ایسا ہوتا تو آپ سنکی نہ ہوجاتیں۔ ثابت ہوا کہ نیک تمناؤں یا دعاؤں سے فرق نہیں پڑتا۔“

”دعائیں کبھی رد نہیں ہوتیں۔ کیا پتا یہ سبزہ مجھے دوسرے جہاں میں مل جائے۔“

”اگر آپ اتنی ہی پرامید ہیں تو مجھے کیوں آدھی آدھی رات کو اٹھا کر کہتی ہیں کہ میں آپ کے لیے دعا کروں۔ آپ اپنی ماں کی دعاؤں کے سہارے وقت کیوں نہیں گزار لیتیں۔ آپ نے بابا سے شادی کی، یہ آپ کا فیصلہ تھا، اس فیصلے پر قائم رہیں۔ ہماری ٹیچر کہتی ہیں کسی بھی پروجیکٹ کی کامیابی کا انحصار اس پر کیے جانے والے اعتماد پر ہے۔ آپ کو اپنے کام پر یقین نہیں ہے تو آپ ناکام ہیں۔“

”جب تک مجھے میرے ٹھیک ہونے کا یقین تھا میں کامیاب تھی، جب میں نے حقیقی یقین پالیا، میں ناکام ہوگئی۔“

”پھر آپ ایسے حقیقی یقین کو بھول جائیں جو آپ کو ناکام کررہا ہے۔“

”یہ بھی میں نے اب جانا ہے سبیل۔ حقیقی یقین جب حاصل ہوجائے تو پھر کچھ اور تمنا نہیں رہتی۔ سب دھواں نظر آنے لگتا ہے، سب گھاس پھوس ہوجاتا ہے۔“

”آپ اپنے ساتھ میری زندگی بھی برباد کررہی ہیں۔ میری عمر دس سال ہے، لیکن آپ نے مجھے وقت سے پہلے بڑا کردیا ہے۔“

”میں کسی بھی وقت تمہیں چھوڑ کر جاسکتی ہوں۔ تمہیں بڑا کررہی ہوں تاکہ تم اکیلے زندگی گزار سکو۔“

”میں اکیلے زندگی گزارنے سے نہیں ڈرتی۔ میں آپ جیسی زندگی گزارنے سے نالاں ہوں۔“

”اللہ نہ کرے تمہیں مجھ جیسی زندگی گزارنی پڑے۔“

”آپ سمجھتی نہیں... میں اپنی زندگی میں کچھ بھی کروں گی، آپ کی طرح واویلا نہیں کروں گی۔“

”تمہیں واویلا نہ کرنا پڑے سبیل۔ کاش میں دعا کا حق رکھتی، کاش میں اپنا حق نہ گنوا دیتی تو میں تمہارے لیے دعا کرتی۔ میں دعا کرتی کہ... خدا سبیل کو اپنے پیاروں میں رکھے۔ خدا سبیل کو اپنا پیار عطا کرے۔“

”یہ دنیا دعاؤں پر چلتی ہے نا، میری زندگی چلے گی۔“

”یہ دنیا دعائیں قبول کرنے والے کی مرضی سے ضرور چلتی ہے۔“

* * *

اسے اپنی ماں کے رویے کی جتنی عادت ہوچکی تھی اتنا ہی وہ اس سے عاجز آچکی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنی ماں سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔ اپنے کمرے میں رہتی یا باہر، اپنے دوستوں کے ساتھ... ماں جاب سے آنے کے بعد کھانا بناتی اور خود بھی باہر نکل جاتی۔ وہ کانفرنسوں میں شریک ہوتی، اسکالرز کے لیکچرز سنتی، کتابیں پڑھتی، باقاعدگی سے لائبریری جاتی۔ ایسی کسی بھی کانفرنس سے آنے کے بعد وہ کچھ دن تو بہت پرسکون رہتی یا کسی اسکالر سے ملنے کے بعد وہ چند راتیں سکون سے سوتی۔

”وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ گناہ گار موجود ہیں۔ گناہوں کی زیادتی سے گھبرانا نہیں چاہیے،

خدا کی رحمت پر یقین رکھنا چاہیے۔"

وہ گنگناتے ہوئے کھانا پکاتی، کھانا کھاتی، اپنے بال بناتی، اچھے کپڑے پہنتی، دونوں خریداری کے لیے جاتیں، یا لنچ باہر کرتیں اور پھر چند دنوں بعد وہ پھر سے اسی حالت میں آجاتی۔ کمرہ بند کرکے روتی رہتی۔ کھانا پینا بھول جاتی اور سبیل کو دعا کرنے کے لیے کہتی۔

"آپ اپنے لیے خود ایک مصیبت بن چکی ہیں۔" سبیل چڑ کر کہتی۔

"یہ میرے بس میں نہیں سبیل!"

"تو کریں نہ بس میں اپنے... اپنا علاج کریں۔"

"بیمار تو میں نے خود کو کرلیا ہے، لیکن علاج میرے ہاتھ میں نہیں ہے... تم میرے لیے شفا مانگ لاؤ سبیل..."

"پلیز مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں... آپ چاہتی ہیں میں آپ کا گھر چھوڑ دوں؟"

"میں نے سب کچھ چھوڑ دیا تو مجھے بھی چھوڑا جانا بنتا ہے، چھوڑ دو مجھے..."

اس نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ فوسٹر ہوم چلی جائے گی، لیکن وہ جا نہیں سکی۔ کچھ بھی تھا لیکن اسے اپنی ماں سے ہمدردی تھی۔ تھوڑی سی ہی سہی لیکن وہ اپنی ماں سے محبت کرنے پر مجبور تھی۔

"آپ بھول کیوں نہیں جاتیں جو کچھ ماضی میں ہوا۔" ایک دن وہ اپنی ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہہ رہی تھی۔

"تم دعا کرو میں بھول جاؤں..."

"ہر کام دعا سے نہیں ہوتا ماں..."

"دعا سے سب کام ہوجاتے ہیں۔"

"آپ گلٹ کا شکار ہیں۔ ایسا ہوجاتا ہے، لیکن اس کے لیے آپ اپنی اور میری زندگی برباد کررہی ہیں، آپ نارمل نہیں ہیں۔"

"سبیل! تم میرے دل کی حالت نہیں جانتیں۔"

"جانتی ہوں، آپ کمرے میں بھی خود کو بند کرلیتی ہیں۔"

"ہاں... ! کمرے میں وارڈ روب میں، کپڑوں کے ڈھیر میں، میں خود کو چھپالیتی ہوں۔"

حیرت سے منہ کھولے وہ اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔ یہ بات اسے پہلی بار معلوم ہوئی تھی۔ "آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"میں خدا سے چھپ جانا چاہتی ہوں۔ میرا باپ میری طرف اشارے کرکرکے خدا کو بتاتا ہوگا کہ دیکھو یہ ہے میری وہ بیٹی، جس کے پیدا ہوتے ہی میں نے اپنا منہ اس کے کان سے لگا کر "اللہ اکبر" کہا تھا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتا ہوگا اور پھر شرم سے منہ موڑ لیتا ہوگا۔"

"آپ خود تو پاگل ہو ہی چکی ہیں۔ آپ کا ارادہ مجھے بھی پاگل کردینے کا ہے۔ آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا۔"

"تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا سبیل!"

"مجھے آپ پر غصہ آتا ہے ماں...!"

عدینہ نے بے چارگی سے سبیل کو دیکھا۔ "آئندہ سے میں خاموش رہا کروں گی۔"

سبیل جانتی تھی کہ اس کی ماں جھوٹ بول رہی ہے، وہ کچھ دن خاموش رہنے کا تکلف ضرور کرے گی، لیکن پھر وہ پہلے سے بھی بدتر ہوجائے گی۔ جیسے ہی سبیل اسے میسر آئے گی وہ اس کے کانوں پر اپنی زبان کھول دے گی۔

"آپ شادی کرلیں۔" تیرہ سال کی عمر میں سبیل نے اپنی ماں کو مشورہ دیا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے اپنی ماں سے ایسی بات کرتے ہوئے۔"

"آپ کو زندگی کے ساتھی کی ضرورت ہے، جو آپ کے دکھ درد کو محسوس کرے۔"

"تم چاہتی ہو میں ایک اور گڑھے میں گر جاؤں۔"

"ایسا کوئی گڑھا نہیں ہے، جس میں آپ گری ہوئی ہیں، سب آپ کا وہم ہے۔"

"میں دودھ پینے والے احد اور اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر مسجد جانے والے احمت کو پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہورہے ہیں، میرا گڑھا بڑا ہوتا جارہا

ہے۔"

"آپ کسی اسکالر کے پاس جائیں اور سب قبول کرلیں' آپ کے دل کو اطمینان ہو گا۔"

"ایسا میں کئی بار کرچکی ہوں۔ اب تو جب تک میں زندہ ہوں مجھے یہ سب بھگتنا ہی ہو گا۔"

"تو پھر خاموشی سے بھگتیں' آپ یہ کیوں چاہتی ہیں کہ میں بھی بھگتوں؟"

✡ ✡ ✡

خاموشی وہ واحد چیز تھی جس کی ان دونوں کو اشد ضرورت تھی۔ سمبل خاموش رہتی' لیکن وہ عدینہ کو خاموش رہنے پر مجبور کرنے سے قاصر تھی۔ عدینہ اگر اس سے بات نہیں کرتی تھی تو پتا نہیں کن کن لوگوں کو پنج یا جائے پر گھر بلا کر ان کے سامنے روتی رہتی۔ ان سے لمبی لمبی باتیں کرتی۔ کبھی کبھی تو وہ انجان لوگوں کو اپنے گھر میں رکنے کی اجازت بھی دے دیتی اور رات دن ان کی خدمت گزاری میں ایک کردیتی۔ جیسے وہ لوگ اس کے نجات دہندہ ہوں۔ ان کے گھر میں ایک ہی کمرہ تھا' دوسرا کمرہ جو سمبل کا تھا وہ کمرے کے نام پر خاصا بڑا دھبا تھا۔ جب کوئی ایسا مہمان ان کے گھر آتا تو عدینہ اسے اپنا کمرہ دے دیتی اور خود وہ سمبل کے کمرے میں آجاتی۔ سمبل اب اس کی موجودگی میں سو نہیں سکتی تھی۔ جب وہ نو سال کی ہوئی تھی' تب سے ہی اس نے عدینہ کے ساتھ ایک ہی بیڈ پر سونے سے انکار کردیا تھا۔ وہ عدینہ کی حرکتوں سے تنگ آچکی تھی' اب وہ مزید انہیں نہیں جھیل سکتی تھی۔

عدینہ کو پارٹیشن لگوا کر بیٹھک کا کچھ حصہ اس کے کمرے کے طور پر مختص کرنا پڑا۔ سات آٹھ ماہ بعد عدینہ سمبل کے کمرے کو لینے کی ضد کرنے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے کمرے میں پوری طرح سے اس کی نحوست کا قبضہ ہو چکا ہے' ایک سمبل کا ہی کمرہ بچا ہے جو ایسی نحوست سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ سمبل کو اور کیا چاہیے تھا وہ اپنے چھوٹے سے کمرے کو چھوڑ کر عدینہ کے بڑے کمرے میں آگئی۔ کچھ عرصے بعد عدینہ نے وہ گھر بیچ دیا اور نیا گھر لے لیا۔ یہ ان کا اب تک کا چوتھا گھر تھا جو انہوں نے بدلا تھا۔ درمیان میں وہ کئی کرائے کے گھروں میں بھی رہتی رہی تھیں۔ سمبل اس صورت حال سے پریشان تھی۔ لیکن وہ عدینہ کو باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ کمرے کی طرح جب گھر میں بھی اس کی نحوست در و دیوار میں سما جاتی تو وہ گھر بدل لینے پر بضد ہو جاتی۔

گھر بدلتے بدلتے شاید وہ سارا امریکہ چھان لیتی اگر اسے یہ ڈر نہ ہوتا کہ ایک دن وہ اچانک مر گئی تو سمبل کہاں جائے گی۔ اسے سمبل کے لیے گھر لینا ہی پڑتا۔ آج کل وہ جس گھر میں رہ رہی تھیں یہ انہیں اس لیے سستا مل گیا تھا' کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ آسیب زدہ ہے اور پچاس سال پہلے یہاں ایک جوان لڑکی کا قتل ہو گیا تھا۔ جس کا قتل ہو گیا تھا وہ بد روح بن کر گھر میں گھومتی تھی۔ یہ بد روح کسی جوان لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑتی۔ پچاس سالوں میں بمشکل چند کرائے دار گھر میں آئے' وہ بھی مستقل نہیں رہ سکے تھے۔ گھر اتنا بڑا تھا کہ تین تو صرف بیڈ روم ہی تھے۔ گھر کے اطراف جو کھلی جگہ تھی اس کے اطراف باڑ لگی ہوئی تھی۔ باڑ کے اس طرف لگے درخت "میری" کے قاتل کے انتظار میں تھے۔ کھڑکیوں سے ٹکرا کر آنے والی ہوائیں "میری" کی آخری سانسوں کی بو سے بوجھل تھیں۔

سمبل کو کسی بد روح سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی' وہ خود ایک بد روح کے ساتھ رہتی رہی تھی۔ جب ڈیلر نے اس گھر کے بارے میں بتایا اور انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ بہادر اور روشن خیال ہیں تو اس مکان کو فوراً" خرید لیں۔ عدینہ تلخی سے مسکرا دی۔

"میں تو چاہتی ہوں کہ یہ آسیب زدہ ہو۔ یہاں بد روح آباد ہو۔"

اس کی ماں نے اس گھر کو خریدنے میں اتنی جلدی کی اور اتنے جوش کا اظہار کیا کہ ڈیلر تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ماں کو تو ایک قیمت میں دو چیزیں مل رہی تھیں۔ گھر بھی اور مفت میں بد روح بھی۔ اب وہ اکثر رات کو

ساری بتیاں بجھا کر موم بتی ہاتھ میں لے کر گھر کے چکر لگایا کرتی۔ ایک دن سہیل نے ماں کو تہ خانے میں موم بتی کو فرش پر رکھے اندھیرے میں زمین پر بیٹھے دیکھا۔ وہ ہولے ہولے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"میں میری کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"آپ اس کا انتظار کیوں کر رہی ہیں۔ وہ مر چکی ہے، بلکہ قتل ہوئی ہے۔"

"اگر وہ واقعی بد روح ہے تو وہ مجھے بھی بہت کچھ بتا دے گی۔"

"آپ بد روحوں کو تو چھوڑ دیں، آپ انہیں بھی میرے جیسا بنانا چاہتی ہیں۔"

"جیسے انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں، وہ بھی باقی کی روحوں سے ملتی ہوگی، وہ بابا سے ملی ہوگی۔"

"ہم ان انسانوں سے ملتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں، وہ آپ کے بابا کو نہیں جانتی۔"

"میں اسے بابا کے بارے میں بتاؤں گی، وہ جان جائے گی۔"

"ہاں جان جائے گی، اگر وہ اجرت پر کام کرنا چاہتی ہو یا وہ آپ کے کام آنا چاہے۔ اگر وہ سمجھ دار ہوئی تو وہ آپ کے پاس آنے کی غلطی ہرگز نہیں کرے گی۔"

وہ واقعی سمجھ دار نکلی تھی اور اس نے عدینہ کے پاس آنے کی غلطی نہیں کی۔ پھر بھی عدینہ اکثر اسے راتوں کو تلاش کیا کرتی تھی۔ اس کے کان ہر وقت کھڑے رہتے اور اسے لگتا کہ میری اب آئی کہ اب آئی۔ اس نے میز پر موم بتی جلا کر کچھ لکیریں کھینچ کر بھی اسے بلانا چاہا، لیکن وہ نہیں آئی۔

"تم نے دیکھا ایک بد روح بھی مجھ سے دور بھاگتی ہے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ یہاں کوئی بد روح رہتی ہے۔"

"ہاں یقین ہے۔ جیسے میں اس دنیا میں رہتی ہوں۔"

"آپ بد روح نہیں ہیں۔"

"اس سے بہتر بھی نہیں ہوں۔"

سہیل کے جو چند ایک دوست تھے، اب وہ انہیں اس گھر میں نہیں لا سکتی تھی، البتہ وہ اکثر ان کے گھر جایا کرتی تھی۔ دوسروں کے گھروں کا ماحول اسے اپنے گھر سے اور بددل کر دیتا تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر اس کے گھر کا ماحول بھی نارمل ہوتا۔ اس کی ماں جاب سے آتی، میز پر کھانا لگاتی، وہ مل کر ٹی وی دیکھتیں اور پھر سو جاتیں۔

* * *

وہ سو رہی تھی کہ ام ہانی نے اسے جگایا۔ "میں تمہارے پاؤں کی رسّی ڈھیلی کر دیتی ہوں، تم کونے میں موجود اس بھوسے کے اندر دبک جاؤ۔"

اس نے رسی ڈھیلی کر دی تب بھی وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ سہیل نے ام ہانی کی دو انگلیاں بے کار کر دی تھیں۔ اس نے ہاتھ پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ بالآخر وہ خود ہی اسے بھوسے کے ڈھیر کی طرف گھسیٹنے لگی، جبکہ وہ خود کو اس ڈھیر سے دور رکھ رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خود تو ہانپنے ہی لگی تھی، سہیل کا بھی تکلیف کے مارے برا حال تھا۔

"تم میرے ہاتھ کھولو، میں تمہاری دونوں ٹانگیں بھی بے کار کر دوں گی۔" سہیل نے دل میں سوچا۔

"آخر کار اسے اس کے گرد اجناس کی بوریوں کا ڈھیر لگانا پڑا۔ کچھ بوریاں وہ گھر کے دوسرے حصے سے گھسیٹ کر لائی، کچھ اور سامان اور بستر بھی۔"

"میرا شوہر کام کے لیے باہر ہے، بچوں کو تمہارے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ میں اکیلی یہ سب نہیں کر سکتی ہم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔"

تھوڑی بہت حرکت سے وہ جتنا کر سکتی، اتنا وہ کر رہی تھی۔ وہ اس کے لائے سامان کو گرا رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم موسیٰ تمہیں یہاں کیوں لایا ہے۔ اپنی دو انگلیاں میں تمہارے منہ سے شہید کروا چکی ہوں۔ آگے بھی مجھے نظر آرہا ہے کہ تم کم سے کم میرا ایک ہاتھ تو بے کار کر کے ہی جاؤ گی، لیکن پھر بھی میں تمہیں نوالے بنا کر کھلانے کے لیے تیار ہوں۔"

میں سارا دن، اور میرا شوہر ساری رات اپنے گھر کا پہرہ دیتے ہیں۔ میں دن بھر گھر کے دروازے پر کھڑی ہو کر دیکھتی رہتی ہوں کہ کوئی آ نہ جائے۔ جیسے ہی کوئی گاڑی یا اجنبی مجھے آتا ہوا نظر آتا ہے میرا دل پتے کی طرح کانپنے لگتا ہے۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا کہ میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتی۔ ایک گاڑی دو گھنٹے سے گاؤں میں گھوم رہی ہے۔ میں نے سوچا تمہیں چھپا دوں۔"

اسے یقین آگیا کہ وہ اسے نقصان پہنچانا نہیں چاہتی، کیونکہ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ موسیٰ اسے وہاں کیوں چھوڑ کر گیا ہے۔ وہ تو جانتی ہی نہیں تھی کہ موسیٰ اور اس کے درمیان کیا چلتا رہا ہے۔ فریڈرک اسے ڈھونڈ رہا ہوگا اور جب تک فریڈرک یہاں ہے موسیٰ یہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ لبنان کی ساری پولیس فریڈرک نے اکٹھی کرلی ہوگی۔ وہ زیادہ دن تک اس کمرے میں بند نہیں رہ سکے گی۔

رات کو وہ اس کے لیے کھانا لائی اور اس کے منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈالنے لگی اور اس کی دو کی طرح تیسری انگلی بھی سیبل نے اپنے دانتوں میں دبالی، اس بار پہلی دو سے زیادہ شدت سے۔ ام ہانی اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لپیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ اس نے اپنی گود میں رکھ لیے۔ سیبل مزے سے ام ہانی کو دیکھ رہی تھی، تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"جب تم نے میری پہلی انگلی اپنے منہ میں لی تھی تو مجھے یاد آیا تھا کہ جب میں چھوٹی تھی تو میں نے ایک کتے کو اتنے پتھر مارے تھے کہ وہ بلبلا کر وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے اپنا یہ گناہ یاد نہیں تھا۔ جب تم نے میری دوسری انگلی اپنے منہ میں لی تو مجھے یاد آیا کہ ایک دن میں پہاڑ پر، درخت کے سائے میں بیٹھی تھی کہ میں نے دور سے ایک ضعیف راہ گیر کو آتے دیکھا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتی رہی تھی جب تک وہ گڑھے میں گر نہیں گیا۔ میں جانتی تھی اس راستے میں گڑھا ہے۔ میں اس انتظار میں تھی کہ بوڑھا کب اس گڑھے میں گرتا ہے اور اسے گرتا دیکھ کر میں کیسے لطف لیتی ہوں۔ بوڑھے کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور میں کافی لطف اندوز ہوئی تھی۔ آج تم نے میری تیسری انگلی اپنے دانت سے چبائی ہے اور مجھے یاد آرہا ہے کہ میں زمین پر بیٹھ کر چیونٹیوں کو اپنی انگلیوں کے نیچے مسلا کرتی تھی، تم نے بھی ٹھیک ویسے ہی میری انگلی کو اپنے دانتوں سے مسلا ہے۔"

سکوت اگلے حکم تک کمرے کا دربان رہا۔

"میں اپنے اور گناہ یاد کرنا چاہوں گی۔ میں صبح تمہیں پھر کھانا کھلانے آؤں گی۔"

سیبل کو اگلی صبح کا انتظار تھا، وہ اس کی چوتھی انگلی جڑ سے اکھاڑ پھینکے گی اور اسے یاد آئے گا کہ اس نے سیبل کو اغوا کرنے والے کی مدد کا گناہ کیا ہے۔

* * *

بحر سیاہ میں نیند خانہ بدوش بنی، خواب چشم کو اکھاڑنے پر کمربستہ رہی۔

اس حالت میں وہ اتنی دیر سے تھی کہ اگر اب اسے کھول دیا جاتا تو اسے کافی وقت لگتا اپنے جسم کو درست حالت میں لانے میں۔ آنکھیں کھولتے ہی اسے روشنی کا احساس ہوا۔ اس نے سر کو گھمایا تو اس کے عین پیچھے دیوار سے کمر لگا کر بیٹھا، موسیٰ نظر آیا۔

"السلام علیکم۔۔۔" اس کے متوجہ ہونے پر اس نے کہا۔

اس نے نفرت سے اپنی گردن واپس موڑلی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر بیٹھی اور دیوار سے کمر لگا کر سانس درست کرنے لگی۔

"میں تم پر سلامتی بھیجتا ہوں۔" اسے موسیٰ لب بھینچے ہنستا ہوا نظر آیا۔ وہ ہنس سکتا تھا، لطف لے سکتا تھا، یہ سب اس نے اسی لیے تو کیا تھا، تاکہ وہ ایک ایک بات اس کے منہ پر واپس مار سکے۔

موسیٰ افسوس کرنے کے لیے تیار تھا کہ اس کا منہ بندھا ہوا ہے اور وہ دوبدو جواب نہیں دے سکتی۔

"یہ پانی پی لو۔۔۔ میں تمہارا منہ کھول دیتا ہوں، لیکن

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

شور نہ کرنا، پھر کچھ کھا لینا۔"

اس نے اپنا سر ہلا کر رضامندی دی کہ وہ چلائے گی نہیں، لیکن اس نے جیسے ہی اس کا منہ کھولا، اس نے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ اسے جلدی سے پھر سے اس کا منہ باندھنا پڑا۔

"اسی لیے ہوٹل میں بھی تمہارا منہ بند کرنا پڑا تھا۔ ضد کبھی بھی سودمند نہیں ہوتی۔" وہ تاسف سے بولا۔

"میں نے تمہیں یہاں رکھا ہوا ہے، تمہارے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں، تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ تمہیں میری بات مان لینی چاہیے۔ اپنا غصہ اور ضد مجھے نہیں دکھانی چاہیے۔"

اس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ اگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ اسے بتاتی کہ بات ماننا کسے کہتے ہیں۔

"خدا تو بندے کو ایسے بے بس نہیں کرتا، نہ وہ ہاتھ باندھتا ہے، نہ منہ سیتا ہے، نہ سماعت چھینتا ہے اور نہ بینائی۔ وہ تو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ پھر بھی ہم اسے اپنی اکڑ دکھاتے ہیں۔" رک کر اس نے سیبل کو دیکھا جو اسے کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"صیام فہمی اور تمہارا دوست فریڈرک تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ تم انہیں اتنی شدت سے مطلوب ہو کہ تمہارے لیے وہ چند لوگوں کے سر قلم کرنے کے لیے بھی تیار ہیں، ہر انسان اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو مارنے کے لیے تیار ہے۔ ہر انسان اپنی طلب میں اندھا ہے۔ انہوں نے ہوٹل میں بھی کافی توڑ پھوڑ کی۔ ہوٹل کا مالک کافی زخمی ہے۔ میں بھی اسی لیے یہاں نہیں آسکا کہ انہیں مجھ پہ شک نہ ہو جائے۔ تمہارے کمرے کی کھڑکی سے بستر کی چادر باندھ کر لٹکا دی گئی تھی۔ گاؤں سے شہر جانے والے راستے پر تمہاری کچھ چیزیں پھینکی گئیں۔ تمہارا پاسپورٹ اور باقی کاغذات میرے پاس ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے انہیں یہ بتایا کہ انہوں نے تمہیں رات کے اندھیرے میں شہر کی طرف جانے والے راستوں پر دیکھا تھا۔ تمہیں ان سے چھپانے کی میں نے پوری کوشش کی ہے اور ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

میری بہن ام ہانی بہادر عورت تو ہے، لیکن جلد تھک جاتی ہے۔ وہ تھک کر تمہاری ذمہ داری میں کوتاہی نہ کر دے۔ اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا۔ تم نے اس کی تین انگلیاں زخمی کر دی ہیں۔ انسان کو دوسروں کو اتنی ہی تکلیف دینی چاہیے جتنی وہ وقت پڑنے پر خود بھگت لے۔ میں تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں، اس لیے تم اپنا غصہ مجھ پر نکال سکتی ہو۔ ام ہانی کو اپنے تین بچوں کے لیے کھانا بنانا ہوتا ہے اور ایک ہاتھ سے معذور شوہر کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ جب میں تمہارا منہ اور ہاتھ کھول دوں گا تم میری ساری انگلیاں چبا جانا میری گردن نوچ لینا، میری ٹانگیں توڑ دینا۔"

"ہاں یہ ایسا کہہ سکتا ہے، کیونکہ کبھی وہ نوبت آئے گی ہی نہیں کہ میرے ہاتھ کھلے ہوں گے اور میں اس کی گردن نوچ رہی ہوں۔"

"اگر تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو تو میں تمہارا منہ کھول سکتا ہوں، لیکن اگر تم چیخیں تو پھر میں سختی کر سکتا ہوں۔"

اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ منہ کھول دے۔ اس نے منہ کھولا تو اس نے اس پر تھوک دیا۔

"تم تو مومن ہو، مجھ جیسی غلاظت کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے، یہ بتاؤ کن غلیظ ہاتھوں میں مجھے دینے والے ہو؟"

موسیٰ نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ "تم سمجھتی ہو کہ جو تم سمجھتی ہو وہی ٹھیک ہے۔ یہ ہی تمہارا سب سے بڑا قصور ہے، خود کو ٹھیک سمجھنا۔" کہہ کر وہ چلا گیا۔

دن میں اس کی بہن پھر کھانا لے کر آئی اور اس کے تین بچوں اور معذور شوہر کے بارے میں جاننے کے باوجود اس نے اس کی چوتھی انگلی کو اپنے جبڑے میں پھنسا لیا اور اس بار وہ اس کے سامنے ہی گھٹنوں کے بل جھک کر زار زار رونے لگی۔

"میں دنیا کے دھندوں میں الجھی ہوئی ہوں اور آرام کی اتنی عادی ہو گئی ہوں کہ خدا کی راہ میں بیٹھ کر اسے پانے کے لیے تیار ہی نہیں، کیسی گناہ گار ہوں

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں۔"

"اقرارِ خدا رسیدہ تھا... ساعت ادائے نماز..."

مبیل چپ چاپ ام ہانی کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عدینہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔ وہ مبیل سے بھی کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ مبیل کو تشویش ہوئی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ کچھ دنوں سے آپ بہت خاموش رہنے لگی ہیں۔"

"میں بہت خوف زدہ رہنے لگی ہوں مبیل..."

کپکپاتی آواز میں عدینہ نے کہا اور پھر خاموش ہوگئی۔

مبیل کو عدینہ پر بہت ترس آیا۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جارہی تھی۔ کھانا بھی برائے نام کھاتی تھی۔ سودا سلف کی خریداری بھی مبیل کو کرنی پڑتی تھی۔ ایک دن وہ سارا دن بستر پر پڑی رہی، نہ منہ دھویا، نہ کچھ کھایا، مبیل نے زبردستی چند نوالے کھلائے تو وہ بھی اس نے اگل دیے۔ "آپ بیمار بھی نہیں ہیں، پھر اس سب کا کیا مطلب ہے؟"

"دیکھو میں بیمار بھی نہیں ہوتی، دو دن سے کچھ نہیں کھایا، پھر بھی بیمار نہیں ہوئی۔"

مبیل نے کو وقت سے اسے اکیلا چھوڑ دیا، لیکن آخر کب تک، وہ پھر اس کے پاس آئی۔

"ایک ہفتے سے آپ اپنی جاب پر نہیں گئیں، گھر میں بند ہیں، وہ آپ کو کام سے نکال دیں گے تو مجھے جاب کرنی پڑے گی، آپ میرے مستقبل کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں۔"

عدینہ ٹکٹکی باندھ کر مبیل کو دیکھتی رہی۔ "تم میرا ایک کام کردو گی مبیل؟"

مبیل نے سہم کر عدینہ کو دیکھا۔ "میں دعا کردیتی ہوں۔ بس یہ ہی کروں گی، وہ بھی یہیں بیٹھ کر..."

"ہاں! تم دعا کرو میرے لیے، اپنی ماں کے لیے، تم دوسرے لوگوں سے بھی کہو..."

"میں اپنی دوستوں کو اپنے گھر نہیں لاؤں گی، وہ اب تک میری تذلیل کرتی ہیں۔"

"تمہاری دوستیں نہیں! اللہ کے بندے..."

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"مبیل! تم اپنا ایک دن مجھے دے دو، میں تمہاری منت کرتی ہوں، تمہاری ماں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہے۔"

"ماں! رونا بند کریں۔ میری جان چھوڑدیں اب۔"

وہ اس ایک دن کا مطلب جانتی تھی۔ جب وہ سات سال کی تھی تب بھی اس نے یہ ایک دن اپنی ماں کو دیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے چند جملے ازبر کرادیے تھے اور ایک مصروف شاہراہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بورڈ تھا جس پر لکھا تھا۔ "اسٹاپ! لسن می پلیز!" وہ جس کے پاس جاکر کھڑی ہوتی وہ رک جاتا اور جھک کر اس کے پاس بیٹھ جاتا۔

"کہو میں سن رہا ہوں۔"

"مسٹر! میری ماں بہت بیمار ہے، خدا ان سے ناراض ہے، آپ ان کے لیے دعا کردیں۔"

"خدا تمہاری ماں سے راضی ہو۔"

"مس میری ماں کو خدا کی مہربانی چاہیے، آپ دعا کردیں۔"

"خدا تمہاری ماں پر مہربان ہو۔"

"سر! ماں کو خدا دوست بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آپ دعا کریں خدا ماں کا دوست بن جائے۔"

"خدا تمہاری ماں کو دوست رکھے۔"

کچھ لوگوں نے اس کے گالوں پر پیار کیا اور... کچھ لوگوں نے اس سے باقی کی تفصیل پوچھنی چاہیے۔ کچھ نے اس کی ماں کو گالیاں دیں جو ایک بچی سے یہ کام لے رہی تھی۔ دو گھنٹے بعد ماں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آئی اور اسے کھانے کے لیے اس کی پسند کا کیک دیا۔

چھ سال بعد وہ پھر سے اسے وہی سب کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"میں انکار کرتی ہوں، اب آپ مجھ سے مزید نہیں کھیل سکتیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ خدا کے بندے بھیس بدل کر

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

انسانوں میں چلتے پھرتے ہیں، خدا ان کی دعائیں رد نہیں کرتا۔"

"کیا آپ خدا کا بندہ نہیں ہیں؟"

"بندہ تو ہوں، لیکن پیارا نہیں۔"

"میں انکار کرتی ہوں، صاف انکار۔" وہ کہہ کر چلی گئی۔ وہ کب تک اپنی ماں کے ہاتھ میں کھلونا بن سکتی تھی۔ اس کی ماں تو کہیں بس ہی نہیں کر رہی تھی۔ اگر اس کا کوئی دوست اسے دیکھ لیتا تو؟ کتنی قابل شرم بات تھی کہ وہ سڑک پر راہ گیروں کو روک روک کر یہ کہے کہ وہ اس کی گناہ گار ماں کی بخشش کے لیے دعا کریں۔ وہ اپنا تماشا بنوائے اس سے بہتر ہے، وہ دریا میں چھلانگ لگا دے۔

خاموشی عدینہ کو دیمک بن کر کھوکھلا کرنے لگی۔ اس نے کھانا پینا تقریباً" ترک کر دیا۔ ایک دن وہ اسکول سے آئی تو اس نے اسے مردہ لوگوں کی طرح بے حس و حرکت پایا۔ وہ ماں کی اس حالت پر بلبلا اٹھی۔

"کیسا خدا ہے ماں آپ کا؟ وہ آپ کو اتنی تکلیف میں دیکھ رہا ہے؟"

"کیسی تکلیف؟ مجھے تو کبھی کوئی تکلیف نہیں ملی۔ جب سے میں امریکا آئی ہوں میں کسی بھی مسئلے سے دوچار نہیں ہوئی۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوئی۔ لوگ حیران ہوتے ہیں جب میں انہیں یہ بتاتی ہوں۔ مجھے اچھی سے اچھی جاب ملی ہے۔ کبھی میرے پاس پیسے ختم نہیں ہوئے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے ٹھنڈ لگی ہو، فلو ہوا ہو، میرے سر میں درد ہی ہوا ہو۔ مجھے تو امریکا کی نیشنلٹی بھی آرام سے مل گئی۔ مجھ پر کوئی تو مصیبت آئے کہ مجھے معلوم ہو کہ مجھ پر آزمائش آئی ہے۔ دیکھا تم نے اب میں آزمائش کے قابل بھی نہیں ہوں۔"

"آپ خدا کو بھول کیوں نہیں جاتیں؟"

"بھول ہی تو گئی تھی میں۔ اب وہ میرے دل پر ایسے قابض ہو گیا ہے کہ مجھے کسی پل چین نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں خدا سے اتنی محبت کرنے لگوں گی۔ وہ میرے لیے اتنا خاص ہو جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ مجھے اس کی اتنی پرواہ ہو جائے گی، مجھے پتا ہوتا تو میں سب کچھ کر لیتی بس ایک اسے ناراض نہ کرتی۔ دیکھو خدا کی محبت مجھ پر کب آشکار ہوئی، جب میں محبت کرنے والوں کے دائرے سے ہی نکل گئی۔ جب میں خالی ہاتھ ہو گئی۔ کیا تم میرا کام کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"نہیں... ہرگز نہیں..."

"پہلے تو ماں نے درخواست گزار انداز سے سیبل کو دیکھا، پھر وہ اٹھی اور کرسی پر بیٹھی سیبل کے پاس آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اپنا سر سیبل کے قدموں میں رکھ دیا۔ "مجھے معافی دلوا دو سیبل۔ میرے لیے کوئی خدا کا بندہ ڈھونڈ لاؤ۔ مجھے کوئی خدا کا پیارا تلاش کر دو جس کی بات خدا رد نہ کرے۔ میرے لیے اسے ڈھونڈ لاؤ سیبل۔ میرے لیے وہ دعا کروا دو جسے مقبول نہ کیا جائے۔ میرے لیے کوئی عیسیٰ جیسا لے آؤ کہ وہ میرے زخم مندمل کر دے، کوئی موسیٰ جو خدا سے میرے لیے کلام کرے، میرے لیے درخواست کرے۔"

کھڑکیاں کھل گئیں، میری کی آخری سانسوں سے معمور ہوا سیبل کے کانوں سے ذہن میں گھس گئی۔ اس کی ماں کا سر اتنا وزنی ہو گا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی ماں کے آنسو اتنے طاقتور ہوں گے اسے معلوم نہیں تھا۔ "خدا کا پیارا؟ عیسیٰ، موسیٰ؟" اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ تیزی سے گھر سے باہر بھاگی اور دور بہت دور تک بھاگتی رہی۔ تھک گئی تو سڑک کے کنارے بیٹھ کر ہانپنے لگی۔

"کیا تم ٹھیک ہو؟" ایک بوڑھا جھک کر اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میری ماں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ماں چاہتی ہے کہ اس کے لیے دعا کی جائے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسے خدا سے معافی دلوا دی جائے، آپ میری ماں کے لیے دعا کر دیں۔"

"خدا تمہاری ماں پر رحم کرے..."

اس نے خود کو کھڑا کیا اور اپنے قدموں کو چلنے پر

READING
Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مجبور۔

"میری ماں بہت تکلیف میں ہے، اس نے جوانی میں اپنے شوہر اور دو بچوں کو چھوڑ دیا تھا، وہ گھر سے بھاگ آئی تھی، اپنے گناہوں پر اسے خدا سے شرم آتی ہے، اس کا ماننا ہے کہ اسے معافی نہیں ملے گی، آپ خدا سے اس کے لیے دعا کردیں۔"

"خدا اسے معاف کرے....."

وہ روتی جا رہی تھی اور اپنی آنکھیں پونچھے بنا جو ملتا جا رہا تھا اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

"سر پلیز، ایک منٹ میری بات سنیں۔" "میری ماں کا کہنا ہے کہ اللہ کے پیارے بھیس بدل کر ہم انسانوں میں گھومتے ہیں، اگر آپ وہ پیارے ہیں تو پلیز میرے گھر چلیں، میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر اسے خدا کا پیار دلوا دیں۔"

"کون خدا، میں کسی خدا کو نہیں جانتا، میں دعا نہیں کرتا، دفعان ہو جاؤ۔"

"مس! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی، میری ماں کا نام عدینہ ہے، وہ میرے باپ سے محبت کرتی تھیں اور اس محبت میں انہوں نے سب چھوڑ دیا، اب انہیں لگتا ہے کہ خدا نے انہیں چھوڑ دیا، انہیں اب خدا واپس چاہیے، دعا کیجیے خدا انہیں واپس مل جائے۔"

"کیا تم پاگل ہو، جاؤ کسی پادری کے پاس....."

"میری ماں کا ماننا ہے کہ اس پر عرصے سے کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی، اس کی آزمائش نہیں کی گئی، دعا کیجیے کہ اس پر کوئی آزمائش آجائے، وہ اس کے لیے بھی تیار ہے کہ اسے کینسر ہو جائے اور وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے۔ آپ دعا کیجیے۔"

"تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔"

دن برگزیدہ ہو گیا..... شام اعتکاف سے نکل آئی۔

بروکلین کی سڑکوں کو اپنے قدموں سے روند کر وہ پیچھے چھوڑتی رہی۔ اس نے ان سڑکوں پر چلنے والا ایک راہ گیر بھی نہیں چھوڑا۔ اس نے سب کو روکا۔ وہ آج خدا کا وہ بندہ ڈھونڈ کر ہی رہے گی جس کی بات خدا رد نہیں کرے گا۔ جو خدا سے دعا کرے گا۔ جو خدا سے کلام کرے گا۔

"مجھ پر مہربانی کیجیے، میرے ساتھ میرے گھر آئیں، میری ماں کو صالح موت دلوا دیجیے۔"

"تمہیں اور تمہاری ماں کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"خدا آپ پر مہربان ہو، میری ماں پر مہربانی کی دعا کیجیے۔"

"دیر ہو چکی ہے ہم سب نے خدا کو ناراض کر دیا ہے....."

"آپ کا چہرہ جس سکون سے منوّر ہے میری ماں اس سکون کے لیے ترستی ہے۔ دعا کیجیے اس کا چہرہ بھی ایسا ہی روشن ہو جائے۔"

"خدا تمہاری ماں کو بھی ایسا ہی سکون عطا کرے۔"

"کیا آپ وہ ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی، میری ماں کے لیے ایک "مقدس" دعا کردیں۔"

دن رخصت ہوا شام رات کی میزبان ہوئی۔

"کیا آپ خدا کے بندے ہیں؟"

"کیا آپ خدا کے پیارے ہیں؟"

"کیا خدا آپ کی دعائیں قبول کرتا ہے؟"

"کیا آپ اصحاب الیمین ہیں؟"

شام خرقہ پوش ہو چکی..... رات "محب رب" رہی۔

آخری وقت تک وہ تھک کر وہ چور ہو چکی تھی۔ لیکن وہ بس نہیں کر رہی تھی، وہ سارے شہر میں، ساری دنیا میں خدا کا بندہ ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھی۔ لوگوں کی بھیڑ میں اس نے ایک ایک کو الگ الگ کیا۔ اونچی نیچی عمارتیں اس کی اس تلاش کی گواہ تھیں۔ اندھیرے کو روشن کرتی روشنیاں اس کی ادا پر فدا تھیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں کی مٹی اس پر نثار تھی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو اسے یاد آیا کہ وہ تیورا کر کہیں گر گئی تھی۔ جہاں وہ گری تھی اگلے دن وہ وہیں پائی گئی تھی۔ وہ اپنے گھر سے بہت دور آچکی تھی۔ راہ گیر سے مانگ کر اس نے پانی پیا اور گرتی پڑتی گھر واپس

آئی۔ اپنے پیٹ میں جلدی سے کچھ انڈیلنے کے بعد وہ اوپر ماں کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کی ماں اسی انداز میں بیڈ پر موجود تھی جس حالت میں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ اسے ماں کے انداز پر حیرت ہوئی۔ کیا اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ رات بھر گھر نہیں آئی اور اس کے لیے بروکلین کی شاہراؤں پر خدا کا پیارا ڈھونڈتی رہی ہے۔

"میں نے خدا کے کئی پیارے ڈھونڈ لیے ماں! انہوں نے آپ کے لیے دعا کی۔" وہ چلا اٹھی۔

عدینہ بیڈ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی "کب؟"

"میں بہت سارے لوگوں سے ملی' انہوں نے آپ کے لیے دعا کی۔ میں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ خوش ہو جائیں اب۔"

"تم سچ بول رہی ہو؟"

"آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں رات بھر گھر نہیں آئی؟"

"رات؟ رات آئی تھی؟ رات گزر بھی گئی؟"

"ماں اب ٹھیک ہو جاؤ۔ بس اب ٹھیک ہو جاؤ۔"

وہ اپنی ماں کے پیروں میں بیٹھتی چلی گئی۔

"مجھ سے اپنی اولاد ہونے کا اتنا زیادہ خراج نہ لو۔ جس خدا نے تمہیں چھوڑ دیا ہے' مجھے اس خدا کو چھوڑ دینے پر مجبور نہ کرو۔"

* * *

وہ اللہ کا کوئی پیارا نہیں ڈھونڈ سکی تھی۔ بروکلین کے بازاروں اور فٹ پاتھوں پر بھیس میں چھپا اسے کوئی نہیں ملا تھا۔ اگر ڈھونڈ لیا ہوتا تو سب ٹھیک ہو چکا ہوتا۔ اس کے کچھ دوستوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ کلاس میں مل کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ **انجلین** کلاس کو باقاعدہ پرفارم کر کے دکھا رہی تھی کہ وہ اونچی عمارتوں کے سائے میں چلتی کیسے لوگوں کو روک روک ان کی منت کر رہی تھی۔ وہ قلم کی نوک سے اپنی انگلیاں ادھیڑنے لگی۔

پرنسپل نے اسے آفس میں بلایا۔ وہ دیر تک اس سے کئی طرح کے سوالات کرتے رہے لیکن اس نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ تھک کر انہوں نے اسے اسکول کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ ڈاکٹر نے بھی اس سے ہزار طرح کے سوالات کیے لیکن وہ خاموش رہی۔

"تم تعاون نہیں کر رہیں' ایسے پھر تمہارے مسئلہ کیسے معلوم ہو گا۔"

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"کیا تم جانتیں نہیں اسکول میں کیا بات ہو رہی ہے؟"

"وہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"تمہاری تصویریں اور ویڈیو بھی جھوٹ بول رہی ہیں؟"

"میں اپنی ذاتی زندگی میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ مجھ سے پوچھ پڑتال نہ کریں۔"

"کیا تمہاری ماں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟ تم رپورٹ کر سکتی ہو' اگر وہ ذہنی طور پر۔۔۔۔"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میری ماں کو پاگل نہ کہیں۔ اگر آپ کو اسکول کی ریپوٹیشن کی فکر ہے تو مجھے اسکول سے نکال دیں۔"

اسے اسکول سے نکالا تو نہیں گیا لیکن اسکول میں ہی رکھ کر عجوبہ بنا دیا گیا۔ وہ چلتی پھرتی' باتیں کرتی' خاموش رہتی تو بھی سب اسے تشویش سے دیکھتے۔ وہ سر جھکا کر کوئی کتاب پڑھتی تو کوئی نہ کوئی ضرور جھک کر دیکھتا کہ وہ کون سی کتاب پڑھ رہی ہے' وہ گھر سے باہر ہوتی تو کوئی نہ کوئی اس کا چھپ کر پیچھا کرتا' ہاتھ میں موبائل آن رکھتا۔ اس کے جو چند ایک دوست تھے وہ بھی اس سے دور دور رہنے لگے تھے۔ پھر وہ خود ہی ان سے دور ہو گئی۔

"آپ نے مجھے تنہا کر دیا۔" وہ گھر آ کر ماں پر چلانے لگی۔

"ہم سب تنہا ہیں سمبل۔"

"کیا حاصل ہوا آپ کو مجھ سے یہ سب کروا کر؟"

"کاش تم سمجھ سکتیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"مل گئی آپ کو معافی؟ آگیا آپ کو سکون؟ اب دوبارہ مجھ سے کسی کو ڈھونڈ کر لانے کے لیے مت کہیے گا۔ آپ مجھے خودکشی پر مجبور کر رہی ہیں۔"

عدینہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔ "میں اب تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ دوبارہ خودکشی کا نام نہ لینا۔"

"مہربانی ہو گی آپ کی۔ اگر آپ میری اچھی سرپرست نہیں بن سکتیں تو مجھے فوسٹر ہوم میں رکھوا دیں۔ آپ کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ آپ کو بس اپنا ذہنی معائنہ کروانا ہو گا اور وہ مجھے رکھ لیں گے۔"

اس دن کے بعد سے سب ٹھیک ہو گیا۔ جب تک سیبل گھر ہوتی، عدینہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی، اسے کھانا دیتی، اس سے چند ضروری باتیں کرتی۔ سیبل نہیں جانتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ کیا کرتی ہے۔ کس سے ملتی ہے، کس سے کیا کیا کہتی ہے۔ موم بتی لے کر گھر کے کتنے چکر لگاتی ہے، تہہ خانے میں بیٹھ کر کس کا انتظار کرتی ہے، جاب پر جاتے، شاپنگ کرتے، سفر کرتے وہ کتنے لوگوں کو آس سے دیکھتی ہے۔ اس لیے کہ کوئی خدا کا بندہ اس کے پاس آئے گا اور کہے گا۔ "ڈرو نہیں، اللہ تمہیں معاف کر چکا ہے۔"

اللہ کا یہ بندہ کبھی اس کی زندگی میں نہیں آیا۔ اس نے جتنی آس سے اس بندے کا انتظار کیا۔ جتنی بھی دعائیں اس بندے کے آنے کے لیے مانگیں۔ ضرورت کے علاوہ وہ اپنے کپڑے، جوتے اور دوسری استعمال کی چیزیں خیرات کر دیتی اور پھر بھی رات کو کمرہ بند کر کے روتی یا گھر کے اطراف موجود درختوں کے سایوں میں کھڑے ہو کر راز و نیاز کرتی۔ وقت ایسے گزرنے لگا جیسے دو اجنبی لوگ ٹرین کے ایک ہی ڈبے میں بیٹھے سفر کر رہے ہوں اور جن میں سے ایک اندھا اور دوسرا گونگا ہو۔ اندھی سیبل تھی گونگی عدینہ ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سیبل کالج جانے لگی تھی۔ وہاں اس کے پرانے اسکول فیلوز نہیں تھے اور وہ چند دوست بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ ان کے ساتھ گھومتی، پھرتی، مزے کرتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان سب کو یہ بھنک بھی پڑے کہ وہ ان جیسی نارمل زندگی نہیں گزارتی رہی ہے۔ وہ ایک سے ایک نیا فیشن کرنے لگی۔ نت نئے انداز سے بال کٹواتی اور رنگواتی۔ وہ جاب کرتی تھی اور اپنے سارے پیسے وہ اپنے کپڑوں، جوتوں، میک اپ، پرفیومز پر لگا دیتی تھی کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ساری زندگی اس نے کس عذاب میں گزاری ہے۔ نارمل نظر آنے کی تگ و دو میں وہ اور ابنارمل ہونے لگی۔

ایک دن کالج میں اس کا اپنے اسکول فیلو سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے سر سے پیر تک دیکھنے لگا۔

"یہ تم ہو سیبل؟"

"تم کون ہو؟" سیبل نے ببل گم چباتے ہوئے پوچھا، جبکہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔

"میں...؟" اسے سیبل کا انداز برے سے زیادہ ہتک آمیز لگا۔

چند دنوں بعد اس کے نئے دوستوں نے اسے ایک ویڈیو دکھائی۔ "یہ تم ہی ہو نا سیبل...؟"

"پلیز، میری ماں کے لیے دعا کریں، وہ ایک گناہ گار اور بھٹکی ہوئی عورت ہے۔ وہ اب سیدھا راستہ چاہتی ہے۔"

سیبل نے اپنی ہتھیلی کو اس سختی سے بند کیا کہ اس کے لمبے ناخن اس کی زندگی کی لکیر میں پیوست ہونے لگے۔

"میرے ساتھ گھر چلیں، ایک بار صرف ایک بار، جھوٹ ہی سہی، اس سے کہہ دیں کہ اسے معاف کیا جا چکا ہے۔"

"کیا ہوا تھا تمہیں؟ یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو؟ کیا ہے یہ سب؟" اس کے دوست پوچھ رہے تھے۔

سیبل خاموشی سے اٹھ گئی اور پھر وہ پرانے دوست بچا سکی، نہ نئے دوست بنا سکی۔ سب ختم... وہ نئے انداز سے ماں سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن پھر

ایک اور بار محبت اپنے سب عہد گم کر کے نفرت کے بھیس میں التجائیہ آئی۔۔۔ اس بار' آخری بار۔۔۔

* * *

مرگی کے مریض کی طرح عدینہ زمین پر بے دم ہو کر پڑی ہوئی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی وہ بری طرح سے ڈر گئی۔ جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے اس کے حلق میں چند قطرے پانی کے ڈالے اور اسے اٹھا کر صوفے پر ڈالا۔ عدینہ نے سیبل کا ہاتھ پکڑ لیا اور سیبل نے باڑ کے اطراف لگے درختوں کی قاتل' مقتول سے متعلق سرگوشیاں سن لیں۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔ وہ اب اپنی ماں کی کوئی فرمائش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی' وہ اوپر اپنے کمرے میں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ ماں کو ہی چھوڑ جانا چاہتی تھی۔

"میں نے آج اپنی ایک رشتے دار خاتون کو دیکھا' وہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ ہمت کر کے میں نے اس سے احمت اور احد کے بارے میں پوچھا۔ احمت نے ابھی تک شادی نہیں کی' وہ کسی بھی عورت کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتا۔ احد بھی شادی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ دونوں۔۔۔ وہ۔۔۔ میرے بیٹے۔۔۔ سیبل وہ۔۔۔"

سیبل بھاگ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خود کو بند کر لیا اور سر پر تکیہ رکھ کر سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو رات ابھی تک باقی تھی۔۔۔ اتنی لمبی رات۔۔۔ اتنی لمبی زندگی۔۔۔ اتنی لمبی آزمائش۔۔۔ اس نے پھر سونے کی کوشش کی' لیکن رات ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی اب اس کی ماں اس سے کیا چاہتی ہے۔ وہ اپنے بچوں سے ملاقات چاہتی تھی۔

صبح اٹھ کر وہ نیچے آئی تو اسے یہ اندازہ لگانے میں وقت نہیں لگا کہ ماں رات بھر اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔

"میں آپ کے گھر نہیں جاؤں گی۔" اس نے چلا کر کہا' ماں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں خود جا رہی ہوں' واپس آ گئی تو ٹھیک' ورنہ سمجھ لینا مر گئی۔"

دو دن بعد وہ اپنا سامان پیک کر کے چلی گئی اور وہ دو دن بعد ہی واپس آ گئی۔

"میں سارا دن اور رات گھر کے آس پاس بھٹکتی رہی اور اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی۔" سیبل کو دیکھتے ہی وہ زار و قطار رونے لگی۔

"میں نے ان دونوں کو گھر سے نکلتے دیکھا اور میں نے ڈر کر اپنا رخ پھیر لیا۔" وہ سیبل کو بھینچے کراہ رہی تھی۔

"سیبل۔۔۔ میری سیبل۔۔۔ میری پیاری سیبل۔۔۔"

حکم رائج الوقت رہا۔۔۔ سیبل کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ وہ یک ٹک اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔ اس کی سماعت ماں کی گویائی پر درد کناں ہوئی۔۔۔ وہ جانتی تھی کیا کہا جانے والا ہے۔

"سیبل! مجھے معافی لا دو۔۔۔ سیبل! اپنی ماں کا ایک آخری کام کر دو۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔" سیبل نے انکار بھی کیا اور گھر چھوڑ کر بھی چلی گئی۔ اس بار وہ اپنی ماں کے ہاتھ آنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک ہفتہ گھر سے دور رہنے کے بعد وہ گھر آئی تو اپنی ماں کو پہلی بات دہراتے ہی سنا۔

"سیبل۔۔۔ میری سیبل۔۔۔ صرف آخری بار سیبل۔۔۔ ایک آخری بار۔۔۔ وہ میری شکل دیکھتے ہی مجھے گھر سے دھکے دے کر نکال دیں گے۔ تم انہیں سب بتانا۔۔۔ ان سے معافی مانگنا' پھر میں ان کے پاس جاؤں گی۔"

"مجھے اور کتنا ذلیل کروانا چاہتی ہو ماں؟"

"تم مجھے اور کتنی تکلیف میں دیکھ سکتی ہو سیبل؟ میں فیصلہ تم پر چھوڑتی ہوں۔ اس بار میں تمہارے قدموں میں اپنا سر نہیں اپنی تکلیف رکھتی ہوں۔"

تکلیف اس کی ماں کے سر سے کہیں زیادہ وزنی نکلی۔ "ماں! اس سے بہتر تھا' تم مجھے پیدا ہوتے ہی مار دیتیں۔"

"اس سے بھی اچھا ہوتا کہ میری ماں ایسا کر دیتی۔"

READING
Section

اس نے کہا اور وہ سیبل کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

وہ دونوں ایک دن پہلے لبنان کے شہر بیروت آچکی تھیں اور اب سیبل اس سڑک پر کھڑی تھی، جس کے کنارے اس کی ماں کے پہلے شوہر کا گھر تھا اور جہاں اس کے دو بیٹے رہتے تھے۔

”وہ تمہیں کچھ بھی کہیں، تم اپنی بات پوری کر کے آنا۔ وعدہ کرو مجھ سے تم میرے لیے معافی لے کر آؤ گی۔“ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہا۔

”وعدہ کرتی ہوں ماں! یہ آخری کام میں اپنی ساری جان لگا کر کروں گی۔ پھر میں مر جاؤں گی یا تمہیں مرنا ہو گا۔“

Downloaded From

اسے گھر کے اندر بٹھا دیا گیا تھا۔ خوشیاں گھر میں تھیں اور خاموشی راست باز... دیواریں ایک عرصہ ماتم کناں رہنے کے بعد اب خود میت بن چکی تھیں۔ دو شکستہ چہرے اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ ان پر بڑھاپا آئے ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ اس نے اپنے تعارف میں یہ کہا تھا کہ ”وہ امریکہ سے آئی ہے۔ ان کے والد کے دوست کی بیٹی ہے اور ان سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔“

چائے پینے کے دوران وہ بار بار ذہن میں اپنے تیار کردہ فقرے دہراتی رہی۔

”اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو معاف کر دیتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ احمت نے چونک کر اسے دیکھا، وہ پہلے ہی اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”وہ ہمیشہ آپ کو یاد کرتی رہیں۔ آج بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ آپ کے لیے نیک خواہشات رکھیں، وہ آپ کو یاد کر کے روتی ہیں۔ انہیں معاف کر دیں، اپنی ماں سمجھ کر نہیں تو ایک انسان سمجھ کر، جیسے خیرات میں فقیر کی جھولی بھر دی جاتی ہے، انہیں بھی ایسا ہی جان کر ان کی جھولی میں معافی کے سکے ڈال دیں۔ سنگین غلطیوں پر معاف کرنے والا کا بڑا درجہ ہوتا ہے۔ اپنے درجے بڑھالیں۔“

اس کے کندھوں پر احد کا ہاتھ آیا اور جھٹکے سے اسے اٹھا کر کھڑا کیا۔ ”کون ہو تم؟“

”وہ ماں ہے آپ کی... اس نے رات دن اپنے گناہ کی فصل کاٹی ہے۔ اب اسے اطمینان کا پھل دے دیں۔“ احد کے ہاتھ کی درشتی کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ بولتی چلی گئی۔

اسے بری طرح سے جھنجھوڑا گیا۔ ”بکواس بند کرو اپنی، کیا کرنے آئی ہو یہاں... نکلو یہاں سے...“

”میں معافی لینے آئی ہوں۔ معاف کر دیں اسے، اس نے اجالوں کو سیاہ کیا، اللہ کو اور آپ کو تڑپ تڑپ کر یاد کیا۔“

”اس ذلیل عورت کا نام میرے باپ کے گھر میں لینے کی جرأت کیسے کی تم نے...“ احمت نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر کمرے سے باہر دھکا دیا۔

”وہ آپ کے قدموں میں گرنے کے لیے تیار ہے۔ وہ قبروں پر سر رکھنے کے لیے بھی تیار ہے۔“ دھکا کھا کر وہ پھر واپس ان کی طرف پلٹی۔

”وہ اپنا سر قلم کروانے کے لیے تیار ہو تو بھی...“ احد چلایا۔

”آپ بیٹے ہیں ان کے، وہ ماں ہے آپ کی...“ سیبل نے منت سے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ہم یعقوب عبدہ کے بیٹے ہیں، کسی فاحشہ کے نہیں...“

”وہ محبت میں اندھی ہو چکی تھیں۔“

”ہم نفرت میں اندھے ہیں اور بہرے بھی...“ احد کا سخت ہاتھ اس کی طرف آیا اور اسے بیرونی دروازے کی طرف لے جانا چاہا۔

”اگر آپ اللہ کے ہی بندے ہیں تو اللہ کے لیے... صرف اللہ کے لیے...“ اس نے دروازے کی دہلیز پکڑ لی۔

”جاؤ... پھر اللہ سے ہی معافی لو اس کے لیے... نکلو یہاں سے...“

”وہ روتی ہے، چلاتی ہے۔“ روتی ہوئی سیبل نے

READING
Section

آگے بڑھ کر احمت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہم روئے بھی، چلائے بھی اور ذلیل بھی ہوئے۔" احمت نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ جھٹکے سے چھڑوایا۔

"گناہ کیسا بھی ہو، ایک دن اس کی سزا ختم ہو ہی جاتی ہے۔"

"اگر ہماری نہیں ہوئی تو اس کی کیسے ہوگی۔" احمت نے چلا کر کہا اور دھکا دے کر اسے دروازے سے باہر پھینکا۔

"اگر میں اپنی ماں کی تکلیف پر تڑپ سکتی ہوں تو کیسی اولاد ہو تم دونوں... اس کی تکلیف کا کچھ تو خیال کرو..." سڑک پر گری وہ پوری قوت سے چلائی اور دکھ سے رو بھی دی۔ دروازہ بند کرتے احمت کے ہاتھ رک گئے اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔

"تم یامین کی اولاد ہو؟" اس نے اتنی سختی سے پوچھا کہ سیبل کے دانت سختی سے بھینچ گئے۔

"تم اس کتے کی اولاد ہو؟" وہ اس کے سر پر کھڑا پورا زور لگا کر دھاڑا۔

سیبل سہم کر زمین سے جڑ کر رہ گئی۔ ماں نے کہا تھا کہ وہ انہیں نہ بتائے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔

"تو اسی کمینے کا خون ہے جو میرے باپ کے گھر میں تیری ماں سے ملنے آتا تھا۔" سڑک پر گری سیبل کے سر پر اس نے پوری قوت سے اپنا پاؤں وزنی جوتے سمیت مارا۔

آگ کی نمائندگی کرتا سورج سارا کا سارا سیبل پر اُمڈ آیا۔ اب وہ اس کے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا، اس کا گلا دبوچ رہا تھا، اسے گھسیٹ رہا تھا، اس پر لعنت بھیج رہا تھا، اس کا خون پی جانا چاہتا تھا۔ سڑک پر لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔

"کمینہ باپ، بدچلن ماں... اولاد، تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہمارے پاس آنے کی۔" کمینے باپ اور بدچلن ماں کا سارا بدلہ وہ اس سے لے لینا چاہتا تھا۔

"اللہ کی خوشنودی کے لیے انہیں معاف کردیں۔"

"اپنی گندی زبان سے اللہ کا نام لینا بند کرو... تم جیسوں کے لیے ہی اللہ نے جہنم تیار کر رکھی ہے۔"

جب وہ اپنی جان چھڑا کر بھاگی، تب بھی سورج نار لیے اس کے پیچھے بھاگا دنیا میں ہر شخص صرف اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ صرف اسی کا تماشا لگا تھا۔ صرف اسی کے ساتھ یہ ہوا تھا۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ تھک گئی تو زمین پر گر گئی۔

"سیبل... میری سیبل..." اسے اپنی ماں کی روتی ہوئی آواز اپنے قریب سنائی دی۔ اس نے نفرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا چاہتی ہو اب؟" وہ پوری قوت سے چلائی۔ جتنے لوگ سڑک پر چل رہے تھے، وہ رک کر اسے دیکھنے لگے۔

"تمہارے ہر گناہ کی سزا میں نے بھگتی ہے۔ کیا چاہتی ہو اب مجھ سے؟" سڑک پر بیٹھے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا۔

"آؤ واپس چلیں!" ماں نے اس کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے اور ان پر اپنا سر ٹکا لیا۔

"کہاں؟ تمہارے ساتھ جہنم میں؟" وہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں چلائی۔ لوگ سمٹ کر ان کے قریب آ گئے۔

"جہنم تمہارے لیے نہیں۔"

"اگر تمہیں اللہ اتنا ہی پیارا تھا تو تم نے یہ سب کیوں کیا؟"

"مجھے معاف کردو سیبل!" لوگوں کے مجمع میں ماں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"معاف؟" وہ کھڑی ہو گئی اور جتنے لوگ کھڑے تھے، ان کی طرف اٹھ کر بڑھی۔

"اب یہ عورت مجھ سے معافی مانگ رہی ہے۔ اس کے سگے بیٹے اسے فا کہتے ہیں اور مجھے حرامی اور یہ معافی مانگ رہی ہے۔"

"سیبل!" ماں سسک کر اس کے قریب آئی اور وہ جلدی سے پرے ہو گئی۔

"مجھ سے تمہیں معافی نہیں ملے گی ماں! جیسے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تمہیں اپنے باپ سے نہیں ملی۔ جیسے تمہیں اللہ سے نہیں ملی۔ مجھ سے بھی نہیں ملے گی۔"

"میری سیبل... پیاری سیبل... آؤ چلیں..."

"چھوڑ دو مجھے ماں! جیسے تم نے اپنے باپ کو' شوہر کو' بچوں کو چھوڑا تھا... مجھے بھی چھوڑ دو..."

"مجھے معاف کردو سیبل!"

"کس کس سے معافی مانگو گی؟ کس کس گناہ کی؟ تم کس معافی کی بات کرتی ہو؟ کس معافی کی؟ بھول جاؤ معافی کو... بھول جاؤ خدا کو... جیسے وہ تمہیں بھول چکا ہے۔ بھول جاؤ اسے... وہ تمہیں تکلیف میں دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مجھے بھی تکلیف دے رہا ہے' پھر بھی تمہیں وہ چاہیے..."

"وہ ہم سب کو چاہیے... وہ خدا ہے میرا..."

"کیسا خدا ہے ماں تمہارا... کیسا خدا ہے ماں..." وہ سڑک پر بیٹھ کر رونے لگی۔ زارو قطار رونے لگی۔

"سیبل... ایسے..." ماں اس کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔

"وہ تمہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں... کیسا خدا ہے ماں تمہارا..."

"وہ تمہارا بھی خدا ہے سیبل..."

"اگر خدا ایسا ہے تو وہ میرا نہیں ہے... میرا خدا نہیں ہے وہ..."

* * *

مرنے سے پہلے اس کی ماں نے جس کی سب سے زیادہ پروا کی' وہ اس سے سب سے زیادہ لاپروا ہو گئی... خدا سے...

بیروت سے آنے کے کچھ ہی ہفتوں بعد ماں اسی خدا کو پیاری ہو گئی' جسے وہ کبھی پیاری نہیں رہی تھی۔ ماں کے مرنے پر اس نے سکھ کا سانس لیا۔ گھر میں اس نے دو پے انگ گیسٹ لڑکیاں رکھ لی تھیں۔ جو یو کرائن سے تھیں اور جنہیں میری سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ ماں کی بچت تھی جو اسے مل گئی تھی۔ اسے فی الحال اپنے گزر اوقات کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ البتہ آسیب زدہ گھر میں میری کے ساتھ اب علینہ بھی رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی سوتے ہوئے اسے اپنے اوپر کوئی جھکا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ اس کی ماں ہوتی جو موم بتی ہاتھ میں لیے اس پر جھکی ہوتی۔

"مر کر بھی مجھے چین نہیں لینے دو گی۔" وہ نیند میں چلا اٹھتی۔

"تم بھٹک رہی ہو سیبل؟" وہ اپنے کان میں سنسناہٹ محسوس کرتی۔

"میں بھٹک رہی ہوں تو بھی میں تمہاری طرح بھٹکتی ہوئی نہیں پھروں گی۔ مجھے معافی چاہیے نہ خدا۔" وہ اپنی مری ہوئی ماں سے بھی بحث میں باز نہ آتی۔

وہ باقاعدگی سے کالج جانے لگی' ڈانس کلاسز لینے لگی' ویک اینڈ گھومنے پھرنے میں گزارتی۔ پھر بھی اگر وقت بچ جاتا تو مٹی گوندھ کر اس کا ایک بڑا سا بت بناتی' اس پر بھورے بالوں کی وگ رکھتی' ٹھوڑی کے نیچے تل لگاتی' دل کی جگہ ایک دو تین کتنے ہی سوراخ بناتی اور سرخ نیل پالش سے دو آنسو بناتی جو بہہ کر دل کے سوراخوں تک آتے۔ چند دن یہ بت اس کے کمرے میں رہتا' پھر وہ کوڑے کے ڈھیر میں پھینک آتی۔

فریڈرک کے ملنے کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ اس نے یہ بت بنانے کم کر دیے تھے۔ وہ زیادہ وقت اسی کے ساتھ ہوتی تھی۔ فریڈرک کے ساتھ میل جول کی وجہ سے کئی کالج فیلوز اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے' لیکن اسے ان کی پروا نہیں تھی۔ وہ دنیا میں ایک خود کو جانتی تھی' ایک فریڈرک کو اور بس۔ تیسرا کوئی دنیا میں تھا نہ اسے چاہیے تھا۔ پہلے یہ ہی کالج فیلوز تھے جو مزے لے لے کر اس کی ویڈیو دیکھتے تھے۔ اسے خبطی اور پاگل سمجھتے تھے۔ دنیا کا کیا ہے' برا کہنے کے لیے اسے تو بہانا چاہیے۔ سیبل دنیا کو یہ بہانے مہیا کرنے کے لیے تیار بھی تھی اور رضامند بھی۔ اگر اس کی ماں تھوڑی دیر اور زندہ رہنے کا تردد کر لیتی تو اس بار وہ اسے سکھاتی کہ زندہ کیسے رہا جاتا ہے۔

* * *

زندہ رہنا اس کے لیے اتنا بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ موسیٰ جیسے انسان کی منت کرتی۔ اس نے سوچ لیا تھا اگر وہ بچ کر نہ نکل سکی تو موسیٰ کے بھی کسی کام کی نہیں رہے گی۔ وہ خود کو ختم کرلے گی۔ موسیٰ چاہے بھی تو یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ کس حد تک جاسکتی ہے۔

ام ہانی کھانا لے کر آئی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"بائیں ہاتھ سے نوالہ نہ کھاتے ہیں، نہ کھلاتے ہیں، یہ رزق کے احترام کے لیے کہا گیا ہے۔ اب یا تم بائیں ہاتھ سے نوالہ کھالو یا تم میرے دائیں ہاتھ کی پانچویں انگلی چھوڑ دو۔ میرے لیے گھر کے کام کاج مشکل ہوجائیں گے۔"

سمبل کو اس عورت کی ہمت پر رشک آگیا۔ وہ بھی اسی اطمینان کی مالک تھی جس کا موسیٰ نظر آتا تھا۔ **سمبل** یہ ہی سکون تباہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آنکھوں اور سر سے اشارہ کیا کہ وہ بے فکر ہو کر اسے کھانا کھلائے۔ اس کا ایسا تسلی بخش اشارہ پا کر وہ نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ آخری نوالے پر جب **سمبل** اس کی پانچویں انگلی کو بھی چبا ڈالنا چاہتی تھی، اس خیال سے کہ اگر واقعی اس کا ہاتھ بے کار ہوگیا تو اس کے لیے کھانا کون بنائے گا، وہ رک گئی۔ جب کبھی بھی وہ مرنا چاہتی تھی، کم سے کم بھوک سے نہیں چاہتی تھی۔

ام ہانی ٹرے اٹھا کر جانے لگی تو رک کر **سمبل** کو دیکھنے لگی۔

"جب ہم دوسروں پر مہربانی کرتے ہیں تو دراصل ہم خود پر مہربانی کرتے ہیں، جیسا کہ جب ہم دوسروں پر ظلم کرتے ہیں تو دراصل خود اپنے لیے ظلم بنتے ہیں۔"

"سب کو وعظ کا خبط ہے۔" **سمبل** نے دل میں سوچا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ دن کے وقت کمرے میں دہلیز سے روشنی کی بہت ہلکی سی روشن لکیر آجاتی تھی، رات کو یہ بھی نہیں آتی تھی۔ اسے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا تھا، بس اسے اندھیرے میں اس کی موجودگی سے کوفت ہوتی تھی۔

فریڈرک نے سارا لبنان اپنے سر پر اٹھا رکھا ہوگا۔ **ایمبیسی** اس وقت اسے تلاش کررہی ہوگی۔ موسیٰ جیسا معمولی آدمی کب تک اسے یہاں چھپا کر رکھ سکتا ہے۔ اس کی بہن اسے بوریوں کے ڈھیر میں چھپا دے یا بھوسے کے، پولیس کے کتے اس کی بو پالیں گے۔ پولیس سے پہلے فریڈرک موسیٰ کی کھوپڑی کو کھول کر رکھ دے گا۔

شام ڈھلنے لگی تو دروازہ کھول کر موسیٰ اندر آیا، پیچھے ام ہانی بھی تھی۔

"تم نے آج میری بہن پر بہت رحم کیا۔ اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟" موسیٰ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس کا منہ بند تھا، وہ کیا کہتی۔

"یعنی تم ٹھیک ہورہی ہو؟ اور موسیٰ نے کہا تو اس کے دل کا شک مضبوط ہوگیا کہ وہ شدت پسند اسے سیدھے راستے کی طرف لانا چاہتا ہے۔ وہ اس کا استاد بنا ہوا ہے اور یوں منہ ہاتھ باندھ کر اسے اپنا شاگرد بنا لیا ہے۔

"میری بہن تم سے خوش ہے، اس کا کہنا ہے کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا اور اسے دیکھ بھی رہا تھا، جس کے چہرے کے تاثرات صاف صاف یہ بتا رہے تھے کہ میرے ہاتھ کھولو، میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں کتنی اچھی لڑکی ہوں۔

"غصہ اسی لیے حرام ہے، کیونکہ یہ انسان کی عقل کو اندھا کردیتا ہے۔ جبکہ عقل وہ کل ہے جو انسان کی محافظ ہے۔ سوچو ذرا اگر محافظ ہی اندھے ہوجائیں گے تو حفاظت کون کرے گا؟"

سمبل کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔ گہری سرمئی پتلیاں تیر میں کمان کی طرح موسیٰ کی طرف نشانہ بند ہوگئیں۔

ام ہانی جا کر واپس آئی اور جھک کر اس کے سامنے کھانا رکھا اور چلی گئی۔

"یہ تمہارا آج آخری کھانا ہے۔ میری بہن نے آج کافی دل لگا کر تمہارے لیے اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہارے ہاتھ پیر کھول دوں، تاکہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تمہیں مہمان کی طرح تھوڑی دیر اپنے پاس رکھ سکے۔ وہ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ تمہیں ہماری باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ جو چیز اچھی نہ لگے، وہ تکلیف دیتی ہے۔ میں تمہیں تھوڑی سی تکلیف دوں گا، زیادہ نہیں۔ تمہارے ہاتھ میں کھول دوں گا، لیکن پہلے میری کچھ باتیں سن لو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا، پھر قدرے توقف سے بولا۔

"تمہارا دوست فریڈرک ڈرگ ڈیلر ہے۔"

سیبل طنز سے ہنس دی کہ وہ جانتی ہے کہ فریڈرک کیا ہے۔ وہ ایسی خوف ناک اطلاع اسے سنا کر چونکا نہیں سکتا۔

"صیام فہمی دوسرا بڑا ڈیلر ہے۔ اس علاقے میں وہ کافی جانا جاتا ہے، بلکہ یہ سارا علاقہ اسی کے قبضے میں ہے۔ تمہارا دوست اسی سے لین دین کے لیے آیا تھا۔ اب تک جو تھوڑی بہت بات معلوم ہو سکی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے لین دین میں کوئی کمی بیشی ہوئی تھی۔ سنا ہے کہ ان دونوں میں تکرار بھی ہوئی تھی اور صیام فہمی نے فریڈرک کو مارا بھی تھا۔ تمہارے دوست کے پاس مطلوبہ رقم کی کمی تھی اور اسے ہر صورت میں مطلوبہ ڈرگ ساتھ لے کر جانی تھی۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ لین دین میں کمی بیشی ہو گئی تھی اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے "تمہارا دین" کر دیا۔ اس لیے وہ تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہا تھا۔"

موسی نے سیبل کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی طنزیہ تاثرات ہی تھے۔

"ہوٹل کا مالک اچھا آدمی ہے، لیکن وہ صیام فہمی سے ڈرتا بھی ہے۔ اسے صیام فہمی کا فون آیا تھا کہ "وہ تمہیں کھانے میں بڑی مقدار میں نیند کی دوا دے اور اس کے آدمی کے آنے سے پہلے تم پر نظر رکھے اور تمہیں کہیں جانے نہ دے۔" اس نے تمہیں کھانے میں نیند کی دوا دے دی، کیونکہ اسے اپنی جان اور اپنا ہوٹل دونوں پیارے تھے، لیکن وہ اللہ کو منہ بھی دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے اور چند لوگوں کو بتا دیا۔ میں اور ہوٹل کا ہی ایک آدمی مل کر تمہیں یہاں چھوڑ گئے۔ ایک یہ ہی ٹھکانا ایسا تھا جہاں میں تمہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ گاؤں کرانیہ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا اور ہم صیام کے آدمی کے آنے سے پہلے وہاں واپس پہنچ بھی سکتے تھے۔"

سیبل کی آنکھوں میں تمسخر گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ موسی اس تمسخر کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

"یہ پہاڑی علاقہ ہے، اس گاؤں سے ایک ہی سڑک شہر جاتی ہے جس پر آسانی سے نظر رکھی جا سکتی تھی۔ تم فی الحال یہاں سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتی تھیں۔ شہر بھی نہیں۔ پولیس ان کا فی الحال کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میں تمہیں ایمبیسی چھوڑ آنا چاہتا تھا، لیکن یہ ناممکن رہا۔ تمہارا دوست صیام کے آدمیوں کے ساتھ خود آیا تھا تمہیں ہوٹل سے لینے۔ تم نہیں ملیں تو انہوں نے یہ سمجھا کہ اس نے ہی تمہیں پہلے اطلاع دے کر وہاں سے نکال دیا۔ تمہارا دوست ہوٹل کے مالک پر شک کر رہا تھا۔ اس نے ہوٹل کے مالک کو زخمی کر دیا اور صیام کے آدمیوں نے تمہارے دوست کو۔ وہ بھاگ گیا تو ان کا شک یقین میں بدل گیا ہے کہ اس نے تمہیں پہلے ہی مطلع کر کے نکال دیا ہے۔ فی الحال وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اب میں تمہیں یہاں سے لے جا رہا ہوں۔"

اس نے اس کا منہ کھول دیا اور پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا۔

"میرے ہاتھ بھی کھولو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ اس نے ہاتھ بھی کھول دیے اور ہاتھ کے کھلتے ہی اس نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"یہ جھوٹی کہانی کسی اور کو سنانا..... تو یہ تھی تمہاری اصلیت..... یہ چاہتے تھے تم، یہاں مجھے بند کر کے اپنا مقصد پورا کرنا۔ میرا لین دین کتنے میں کیا ہے تم نے؟ کس کے ہاتھ بیچا ہے تم نے؟ تمہیں لگتا ہے میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گی۔" اس نے زور، زور سے چلانا شروع کر دیا اور دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

ام ہانی بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ "موسی! یہ کیا ہو رہا ہے۔ بچے جاگ جائیں گے۔ انہیں خبر ہو گئی تو وہ باہر

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سب کو بتا دیں گے۔" پیچھے ہی ایک ہاتھ سے معذور مرد بھی آیا۔ وہ تشویش سے دونوں کو دیکھنے لگا۔

"تم سب ملے ہوئے ہو۔ میں تم سب کی رپورٹ کروں گی پولیس میں۔ امریکن ہوں میں... سمجھے..."

موسیٰ نے انہیں باہر جانے کے لیے کہا اور اس کے ہاتھ باندھ دیے، منہ میں کپڑا ڈھونس دیا۔

* * *

"دیکھو، اب تم اپنے فائدے پر کیسے واویلا کر رہی ہو۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں، اللہ پر اعتبار نہیں۔ ام ہانی سے میں نے کہا تھا کہ رات اور دن میں وہ تمہیں ایک وقت کا کھانا دے، تاکہ تمہاری قوت کمزور ہوجائے۔ تاکہ تم کسی شدت کا مظاہرہ نہ کرسکو۔ تمہارے بڑے فائدے... "تمہاری جان اور آبرو" کے لیے مجھے تمہیں چھوٹی تکلیف دینی پڑی۔ تمہیں بھوکا پیاسا رکھنا پڑا۔ بڑے فائدوں کے لیے کبھی کبھی چھوٹی تکلیفیں دینی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی ہمارے فائدے کے لیے اللہ کو ہمیں بھوکا پیاسا رکھنا پڑتا ہے۔ ہاتھ، پیر باندھنے پڑتے ہیں۔ گونگا کرنا پڑتا ہے۔ بے بس کرنا پڑتا ہے، تاکہ ہم خود کچھ نہ کرسکیں صرف خدا ہی سب کرے۔ ہر انسان پر یہ اس کا دورانیہ آتا ہے۔ ہر اس انسان پر جسے فائدہ دینا ہو۔ جسے نقصان سے بچانا ہو۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے میری کسی بھی بات کا یقین نہیں کیا۔ تمہیں مجھ پر یقین کرنا ہی نہیں تھا۔ ورنہ میں تمہیں پہلے ہی دن بتا دیتا اور تم کم سے کم سکون سے یہاں رہتیں، لیکن میں جانتا تھا، تمہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم میری بہن کو قتل کردیتیں اور یہاں سے بھاگ جاتیں۔ میں تمہارا منہ پھر سے کھول رہا ہوں، لیکن چلانا نہیں۔" موسیٰ نے پھر سے اس کا منہ کھول دیا۔

"رات تارک الدنیا ہے... آگاہی بارگاہ پروردگار..."

"میرا ایمان جگانے کے لیے تم نے یہ سب کیا۔ تم اس حد تک جاسکتے ہو، کس لیے، کیوں...؟"

"میں کون ہوتا ہوں ایمان جگانے والا۔"

"تم نے کہا تھا، تم میرے استاد بننا پسند کروگے۔"

"یہ میں نے دعا کی تھی، تمہیں دھمکی نہیں دی تھی، اللہ کو یہ پسند نہیں۔"

"کس اللہ کو؟ جس نے میری ماں کو دو حرفی معافی نامہ نہیں بھیجا۔ وہ اللہ جس نے میری ماں کو اس کے گناہوں کی پوری پوری سزا دی۔ وہ اللہ کا ایک بندہ ڈھونڈتی رہی اور..."

"وہ کیوں اللہ کا بندہ ڈھونڈتی رہیں؟ وہ خدا کو کیوں نہیں ڈھونڈتی رہیں؟ وہ معافی کے لیے کیوں چلاتی رہیں، وہ اس کی محبت کی طلب گار کیوں نہیں رہیں۔"

"اللہ میری ماں سے محبت کیسے کرتا، وہ تو بدچلن تھی، وہ تو مومنوں سے محبت کرتا ہے۔"

"اگر وہ صرف مومنوں سے محبت کرے گا تو وہ رحیم نہیں رہے گا۔"

"اللہ، اللہ کرنا بند کرو... مجھے کچھ نہیں سننا..."

"تم اللہ سے ناراض ہو... تم اللہ سے ناراض ہوسکتی ہو، اس سے جدا نہیں۔ کسی بھی انسان کے پاس اللہ سے الگ ہونے کا اختیار نہیں، اس نے یہ اختیار کسی کو دیا ہی نہیں۔ ہم سب اس کے ہیں اور اسی کے ہیں۔ تم بھی اس کی ہو... سبیل... لوٹ جاؤ واپس..."

"الفاظ پاک ہیں... ادائیگی پاک تر..."

"تمہاری آنکھیں، تمہاری آواز، تمہارا انداز اس تکلیف سے معمور ہیں جسے تم چھپائے پھرتی ہو۔ تم نے اللہ کو چھوڑ دیا اور یہ جدائی تم پر گراں ہے۔ تمہیں اللہ سے بچھڑ جانے کا دکھ ہے۔ تمہیں مجھ جیسے ہر انسان پر غصہ ہے جو اللہ کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ تمہیں غصہ ہے کہ اللہ نے تمہیں خود سے دور ہوجانے دیا، تم مجھ سے حاسد ہو۔"

"بند کرو اپنی نصیحتیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ چلائی۔

”ایسا نہیں ہوگا‘ لیکن اس سے الگ بھی نہیں ہوگا۔ جب انسان ایک لمبے عرصے تک دکھ سہتا ہے تو وہ تلخ ہوجاتا ہے۔ جب وہ بار بار اللہ کو بلاتا ہے‘ جب وہ بار بار اللہ سے مانگتا ہے تو وہ بے صبرا ہوجاتا ہے۔ مصائب انسان کو کمزور کرتے چلے جاتے ہیں اور ایک دن وہ ٹوٹ کر گر جاتا ہے۔ جو گر کر اٹھتا ہے‘ درجہ اسی کا بلند ہوتا ہے۔ سب راستے اللہ کی طرف جاتے ۔۔ ہر انسان کا ایک الگ راستہ ہوتا ہے۔ اللہ کو پانے کا۔ ہر راستے کی اپنی مشکلیں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ کچھ دکھ سہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں‘ کچھ دکھ سہ کر پیچھے پلٹ آتے ہیں۔ کچھ ان رکاوٹوں سے خائف ہوجاتے ہیں‘ کچھ ان رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ تم بھی خائف ہوچکی ہو۔“

”میں کھانا کھانا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا تو موسیٰ نے اٹھ کر اس کے ہاتھ کھول دیے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کمرے میں خاموشی پیام امن کی طرح پھیل گئی۔ ناکافی روشنی ”کیفیت“ کے زیر اثر تھی۔ موسیٰ سر جھکا کر بیٹھا موم بتی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کھانا کھا چکی تو اس نے موم بتی کی روشنی گل کردی۔

”تم دیکھ سکتی ہو کہ کس قدر اندھیرا ہوگیا ہے۔ جب انسان بھٹک جاتا ہے تو وہ خود کو ایسے ہی اندھیرے کے سپرد کردیتا ہے۔ ایمان کمزور ہوجائے تو یہ اندھیرا چار اطراف سے گھیر لیتا ہے۔ پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا‘ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ انسان خود کو بھی نہیں دیکھ سکتا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کررہا ہے۔ کسی بھی چیز سے الجھ کر گر جاؤگی‘ کسی گڑھے میں خود کو پھنسالوگی۔ اس اندھیرے کا سراسر نقصان صرف تمہیں ہی ہوگا۔“

موسیٰ نے موم بتی کو روشن کردیا۔

”دیکھو روشنی کتنی ہی مدھم ہو وہ اندھیرے کو شکست دیتی ہے۔ تم جتنی روشنی بڑھاتی جاؤگی‘ اتنی ہی تمہاری بینائی کام کرتی جائے گی۔ ایمان روشنی ہوتا ہے سمبل یہ ہم پر ہر حقیقت واضح کرتا ہے۔ میں شدت پسند ہوں نہ میرا تبلیغ کا ارادہ تھا۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ تمہارے ہوش میں آنے پر تمہیں فریڈرک کے بارے میں یہ سب فوراً نہیں بتادیا۔ تمہیں یقین آتا نہ آتا مجھے بتادینا چاہیے تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم حالات کو اپنے لیے جتنا سنگین سمجھ لوگی‘ ان کی حقیقت کھلنے پر تم اتنا ہی سکون محسوس کروگی۔ آئندہ تم شکوک و شبہات کا شکار ہونے سے پہلے حقیقت کو جاننے یا حقیقت کے کھل جانے کا انتظار کروگی۔ تم واویلا نہیں کروگی۔ متنفر نہیں ہوگی۔ مجھے حق تو نہیں لیکن یہ میری‘ تمہارے لیے حکمت عملی تھی۔ جو کچھ میں اب تک کہہ چکا ہوں وہ سب سچ ہے۔“ گڈریے کے سے حلیے والا موسیٰ نظریں جھکائے کہہ رہا تھا۔

”اگر تمہارا وعظ ختم ہوگیا ہے تو تم یہاں سے جاسکتے ہو۔ اگر یہ سب سچ ہوا تو بھی تمہاری مدد لینے سے بستر میں مرنا پسند کرتی۔“

”تم نے میری مدد نہیں لی۔۔۔ خدا نے تمہاری مدد کی ہے۔“

”میں دیکھنا چاہوں گی تمہاری حقیقت کیا ہے۔“

”ہماری حقیقت یہ ہے سمبل! کہ ہم خدا کے بندے ہیں۔ اچھے یا برے‘ مومن یا کافر۔۔۔ ہر حال میں اس کے ہیں۔ وہ ”رب البشر“ ہے اور ہم صرف بشر۔ وہ ہمارا مالک ہے اور ہم اس مالک کے۔ یہ ہی حقیقت ہے۔ ہمیں اس حقیقت کی فرماں برداری کرنی چاہیے۔“

”مجھے خاموشی چاہیے۔“

”رات گہری ہونے پر تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں اپنی بہن کے گھر انہیں نہیں بلاسکتا تھا۔ اس علاقے میں ان کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گی۔“

”کن کے آنے کی؟“

* * *

”پہاڑوں اور درختوں پر مسلط رات اصحاب الیمین کی عبادت کی گواہ تھی۔“

موسیٰ گاڑی چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ آگے ایک

اور آدمی بیٹھا تھا، جسے وہ ہوٹل میں دیکھ چکی تھی۔ انہوں نے ایک بار پھر سے سیبل پر کچھ کمبل ڈال دیے تھے اور اس پر کچھ سامان رکھ دیا تھا، جس کے نیچے وہ دبی ہوئی تھی۔

"بڑے مصائب سے بچانے کے لیے کبھی چھوٹے مصائب سے گزارا جاتا ہے۔ پہاڑ نہ آگرے اس لیے مٹی کے ڈھیلوں کو سر پر اٹھانا پڑتا ہے۔"

جب گاڑی رکی تو اُسے جلدی سے باہر نکال کر دوسری گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ موسیٰ بھی آگے آکر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی میں امریکی سفارت خانے کے لوگ تھے۔ ایک آفیسر نے موسیٰ کا بیان لینا شروع کر دیا۔ پھر اس نے موسیٰ کی تصویر بنائی۔ راستے میں وہ گاڑی سے اُتر گیا۔

"تم میری انگلیاں چبانا چاہتی تھیں، میری گردن دبوچنا چاہتی تھیں۔" گاڑی سے اترنے سے پہلے اس نے پیچھے گردن موڑ کر سیبل سے کہا۔ سیبل نے منہ پھیر لیا اور وہ گاڑی سے اتر گیا۔

سامان کے نام پر اس کے پاس ام ہانی کا دیا ایک سوٹ تھا۔ سفارت خانے کی رہائش گاہ کے واش روم میں اس نے کافی وقت لگایا اور ام ہانی کا دیا سوٹ پہن لیا۔ سفارت خانے نے ضروری کارروائی کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر اسے واپس بھیج دیا۔ موسیٰ اس کے کاغذات انہیں دے گیا تھا۔ امریکہ میں اس کے لیے نسبتاً "محفوظ رہائش کا بندوبست کر دیا گیا تھا" کچھ عرصہ اسے وہیں رہنا تھا۔ فریڈرک امریکہ آیا ہی نہیں تھا۔ وہ اب پولیس کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ وہ جتنا کچھ فریڈرک کے بارے میں جانتی تھی، اس نے سب متعلقہ اداروں کو بتا دیا تھا۔ اس نے اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا تھا۔ چند مہینے وہ ان مسائل میں گھری رہی، پھر حالات ٹھیک ہونے لگے۔

کچھ عرصے بعد اس نے واپس اپنے گھر جانا چاہا اور متعلقہ ادارے نے اسے اجازت دے دی۔ اس نے یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ یوکرائنی لڑکیاں چلی گئیں تو اس نے کسی اور کو کرایہ دار نہیں رکھا۔ وہ گھر کو ویسا ہی دیکھنا چاہتی تھی جیسا وہ پہلے تھا۔ اس نے گھر کی دیواروں کو پھر سے پہلے جیسا کرنا شروع کر دیا۔ ہفتے کے اختتام پر وہ ان دیواروں پر سفید پینٹ کرتی۔ کبھی کبھی وہ رات کو گھر کی روشنیاں گل کر کے صرف ایک موم بتی روشن کر کے بیٹھ جاتی، وہ ماں کا انتظار کرتی۔ گھر کے اطراف چہل قدمی کرتی اور ان درختوں کے پاس خاموش کھڑی ہو جاتی جن سے کبھی ماں نے راز و نیاز کیے تھے۔ مٹی کے بت بنانے اس نے چھوڑ دیے تھے۔ کبھی کبھار رات کو وہ مسز پام ہیکی کے پاس چلی جاتی، ان سے باتیں کرتی، وہ اسے کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دیتیں۔ دونوں مل کر ٹی وی دیکھتیں۔ ان کے بیٹے کے ساتھ وہ ویڈیو گیم کھیل لیتی۔ فارغ وقت میں اس نے کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں۔ پبلک لائبریری میں اس کے کچھ نئے دوست بننے لگے تھے۔ کبھی کبھی وہ قبرستان ماں کے پاس جانے لگی تھی۔ ماں نے بھی موم بتی لے کر بد روح بن کر آنا چھوڑ دیا تھا۔

"موسم بہار آگیا۔"

اس نے احمت اور احد کے نام دو الگ الگ خط لکھے، جس میں اس نے ماں کے بارے میں سب لکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی ویڈیو ریکارڈنگ کی اور انہیں بھجوا دی۔ اس نے پھر سے ان سے ماں کے لیے معافی مانگی تھی۔ اس نے ان سے ایک اور ملاقات کی درخواست کی تھی۔

"ایک گناہ گار کو معافی اتنی شدت سے مطلوب ہے تو خدا کو معاف کر دینے کی قدرت رکھنے والے کی نیکی کس قدر عزیز ہو گی۔ ماں کے گناہ کو معاف کرنے کا اختیار آپ کے پاس ہے تو اس کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کے اجر کو سمیٹ لیں۔"

اس نے خط کے آخر میں لکھا اور ویڈیو کے آخر میں کہا۔

دیوار کی کیل سے لٹکتی ماں کی نشانی (جو اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی) کو ایک بار اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور ہونٹوں سے چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اس حالت میں اس نے کئی گھنٹے گزار دیے اور پھر وہ پھوٹ

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پھوٹ کر رونے لگی۔

"ماں... میری ماں... پیاری ماں..."

ماں کے مرنے پر وہ اب روئی تھی۔ تین دن سوگ کا اہتمام اس نے اب کیا تھا۔ صبح سے شام تک وہ گھر میں جگہ بدل بدل کر روتی رہی۔ اس میز پر اس نے اپنا سر رکھ لیا، جس پر ماں اپنی آخری سانسیں لے چکی تھی۔

"وہ دعائیں مجھے ہی مانگنی تھی ماں.... بار بار مانگتی تھی... مجھ پر فرض تھا اور تمہارا حق تھا۔"

اسی میز کے ساتھ بیٹھ کر وہ ہاتھ اٹھا کر ماں کے لیے دعا کرتی۔

"ایسا ہو نہیں سکتا کہ اللہ سے توبہ کی جائے اور وہ معاف نہ کرے۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ گناہ پر شرمندہ ہوا جائے اور گناہ پھر بھی اپنی جگہ اسی حالت میں موجود رہے۔"

"موسم بہار نے موسم خزاں کے لیے نشست خالی کردی۔"

اس نے احمت اور احد کو پھر سے خط لکھے۔

"جتنا برا ماں نے کیا، اس سے کہیں زیادہ برا انہوں نے بھگت لیا۔ ماں اپنے پیاروں کے ساتھ نامہربان ہوئی تو وہ خود کے ساتھ بھی مہربان نہیں رہ سکی۔ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک کر روئی کے گالے بن کر اڑ جائیں گے۔ پھر توبہ کرنے پر گناہ کیسے قائم رہ سکیں گے؟ سمندر گناہوں سے سیاہ ہو جائیں تو بھی توبہ کے دھارے میں بہہ کر نور ہو جائیں گے۔"

جو چند نئے دوست اس نے بنائے وہ ان کے گھر جانے لگی، انہیں اپنے گھر بلانے لگی۔ انہیں ماں کے بارے میں بتاتی۔ ماں سے سنی کچھ باتیں انہیں سناتی۔

"جب تک ہم خیر کے دائرے میں رہتے ہیں، ہم ہر چیز سے برکت حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی ہم دائرے سے نکلتے ہیں، ہر چیز بے برکتی کر دیتے ہیں۔"

ایک چیز جو اس گھر میں موجود نہیں تھی، وہ تھی ماں کی تصویر۔ ماں نے کبھی تصویر نہیں بنوائی تھی۔ وہ تو شیشے میں اپنی شکل بھی نہیں دیکھتی تھی۔

"میرے ماں باپ میرے خواب میں آنا پسند نہیں کرتے، گھر سے بھاگتے ہوئے ان کی تصویر ساتھ لانا میں نے پسند نہیں کیا۔ تم اپنی ماں کو اچھی طرح سے دیکھ لو سہیل! ہو سکتا ہے پھر تم تو مجھے دیکھنا چاہو، لیکن میں تمہیں کہیں نظر نہ آؤں۔"

مرنے سے چند دن پہلے ماں نے اس کے کمرے میں آکر کہا تھا اور اس نے ماں کو کمرے سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ اب وہ مسز پام پیکی کے پاس گئی۔ چند سال پہلے کرسمس پارٹی پر ان کے بیٹے نے اتفاقیہ ایک تصویر بنالی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد مسز پام پیکی اسے وہ تصویر دکھانے لائی تھیں، لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ان کے پاس گئی اور ان سے تصویر کو دیکھنے کی درخواست کی۔ جب وہ تصویر اس کے ہاتھ میں آئی تو وہ اس پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

"ماں... میری ماں..."

عقیدت روپوشی سے نکل آئی اور ماں پر جھک جھک گئی۔ محبت گوہر نگار ہوئی اور "ماں" پر نثار ہوئی۔ ماں کو سینے سے لگا کر اس پر سر رکھ کر وہ دیر تک راز و نیاز کرتی رہی۔

"اپنے تنہا رہ جانے کے احساس نے مجھے تکلیف کے ان بیابانوں سے روشناس کروا دیا ہے، جس میں تم بھٹکتی رہی تھیں ماں..."

ایک دن وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ دیوار پر ٹنگی ماں کی تسبیح ہلنے لگی۔ ہوائیں بارش کی آمد کا پیام ارسال کرنے لگیں۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ آسمان نے قاصد بننا پسند کیا اور بوندوں کے سپرد الہام کیا۔ وہ رونے لگی، حق الیقین... بھیگنے لگا۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

"ہاں...! میرا دل ٹوٹ گیا تھا کہ تکلیف میں مجھے خدا نے اکیلا چھوڑ دیا۔ خدا نے مجھے دور ہو جانے دیا۔ خدا نے مجھے بچھڑ جانے دیا۔"

اشک آسمان کے سینے سے جا لگے۔

"جو بھٹک جاتا ہے، وہ اپنی روشنی بجھا دیتا ہے۔"

ایک دن یونی ورسٹی میں وہ گھاس پر بیٹھی کچھ نوٹس

پر کام کر رہی تھی کہ اس کا قلم رک گیا اور کاغذ اس کے گھٹنوں پر پھڑپھڑانے لگے اور وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"ہاں موسیٰ! مجھے ہر اس انسان پر غصہ تھا جو اللہ کو سینے سے لگائے ہوئے تھا' کیونکہ وہ انسان میں نہیں تھی۔"

خزاں رخصت ہو گئی۔

* * *

اس نے نوکری شروع کر دی تھی۔ وہ کافی مصروف رہنے لگی تھی۔ یونی ورسٹی سے وہ نوکری کے لیے چلی جاتی تھی۔ ہفتے کے اختتام پر کسی نہ کسی دوست کے ساتھ چلی جاتی یا انہیں بلا لیتی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو اپنے ماضی کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہ انہیں گزائیہ گاؤں میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بھی بتا چکی تھی۔ اسے اب تکلیف دہ چیزوں سے بھاگنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ ڈرتی بھی تھی تب بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اگر وہ سچ نہیں بول سکتی تھی تو وہ جھوٹ بھی نہیں بولتی تھی۔ وہ خاموش ہو جاتی تھی۔ اس کی زندگی مختلف طریقے سے شروع ہوئی تھی' بہت سارے لوگوں کی ہوتی ہو گی' بہتر تو یہ ہی تھا کہ وہ ابتدا کو ہی انجام نہ مان لے۔ ماں جن لوگوں کو اکثر گھر بلا لیتی تھی ان میں سے کئی لوگوں کو وہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے ان لوگوں کو ماں کی طرح ہی گھر بلا کر ان کی میزبانی کی اور انہیں ماں کی موت کے بارے میں بتایا۔ ماں جن اسکالرز کے پاس اکثر جایا کرتی تھی' وہ بھی ان کے پاس جانے لگی۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے احمت کے گھر فون کیا۔ فون کسی عورت نے اٹھایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ احمت کی بیوی ہے۔

"اللہ آپ کے نکاح کو بابرکت رکھے اور دونوں کے تعلق کو محبت کی فراخی نصیب کرے۔ آمین۔"

کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ایک دن وہ اپنے لیے ناشتا بنا رہی تھی کہ اس کی شہادت کی انگلی جل گئی اور

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلن پو/ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ بھاگ کر اس نے ٹوتھ پیسٹ اپنی انگلی پر لگایا۔ پھر کتنی ہی دیر وہ اپنی انگلی کو دیکھتی رہی۔ سر کھڑکی سے باہر نکال کر اس نے کھلے آسمان کو دیکھا اور کہا۔

"جب ہم دوسروں پر ظلم کرتے ہیں تو دراصل خود اپنے لیے ظلم بنتے ہیں۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "میں اللہ سے اپنے ظلم کی معافی چاہتی ہوں۔"

اس موسم بہار کو رخصت ہونے سے بھی کوئی نہیں روک سکا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کا متبرک سکون پردہ پوش ہو جاتا اور اس کی روحانی بینائی ریوڑ کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی۔ دنیا دھواں ہو جاتی، برو کلین جنگل ہو جاتا۔ ٹھنڈی ہوائیں اس کے دل پر قابض ہو گئیں اور وہ اپنا سینہ مسلنے لگتی۔ رات کو وہ نیند سے اٹھ کر ——— اندھیرے کمرے میں موم بتی جلا کر بیٹھ جاتی۔ کھانا کھاتے وہ نوالہ اپنے منہ تک لے جانا بھول جاتی۔ بس میں بیٹھ کر وہ اترنا بھول جاتی۔ کئی کئی دن تک اسے کپڑے بدلنے کا خیال نہ آتا۔ وہ راتوں کو جاگ کر گزار دیتی اور دن کو مصروف رہ کر۔۔۔ کتنی ہی بار دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی اور پھر رونے لگتی۔ پھر بھی خزاں ویسے ہی قائم رہی۔ مسکراہٹیں خوابیدہ رہیں۔

"دھوپ کی قزح پر قوس کا ہر رنگ بے رنگ تھا۔ پھول پتے سب کے سب خزاں کی فرماں برداری میں مصروف تھے۔"

ایک دن وہ ایک اسکول کے باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں بہت سے غبارے تھے۔ اس نے چھٹی کے وقت نکلنے والے کئی بچوں کو روک کر اپنے پاس کھڑا کر لیا۔

"کیا تم میرے لیے دعا کر سکتے ہو؟" اس نے غبارہ دے کر ایک بچے سے کہا۔

"ہاں! لیکن پھر میں دو غبارے لوں گا۔"

"دعا کرو میری یاد اسے ایسے آئے کہ وہ فراموش نہ کر سکے۔" اس نے تین غبارے آگے کر دیے۔

"کون ہے وہ۔۔۔؟"

"دعا کرو بھول جانے کے لیے ہی سہی اسے میرا نام یاد کرنا پڑے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"دعا کرو جو اچھا ہے، وہ مجھ بری کو بھی پسند کرنے لگے۔"

"آپ بری ہیں کیا؟"

"مجھ سے ملاقات کا خیال اس کے دل میں آئے اور وہ اس سے غافل نہ ہو سکے۔"

"کس سے۔۔۔؟"

"دعا کرو۔ آخری بار ہی سہی۔ موسیٰ، سیبل کے پاس آجائے۔"

کتنی ہی بار غبارے لے کر وہ بچوں کے پاس گئی۔ ایک بار اس خیال سے وہ رونے لگی کہ وہ شادی کر چکا ہو گا اور اپنے بچے کو ہوا میں اچھالتا ہو گا۔ اس خیال نے اس پر بڑا ظلم کیا اور وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔ وہ لبنان جا سکتی تھی، ہوٹل سے اس کے بارے میں پوچھ سکتی تھی، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ یہ خیال اس کے دل پر کندہ ہونے لگا کہ خدا کے پیارے موسیٰ کو سیبل یاد نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے پسند نہیں کر سکتا۔ اس یقین نے اسے اتنا زخم خوردہ کر دیا کہ اندھیری راتوں میں اسے دن کے اجالے کی تمنا نہ رہی۔

* * *

روشنی فانوس تھی جو دھوپ میں جلوہ نما تھی۔ جب یونی ورسٹی سے نکلتے اس نے اپنے پیچھے موسیٰ کی آواز سنی۔

"السلام علیکم۔۔۔ میں تم پر سلامتی بھیجتا ہوں سیبل۔۔۔!"

ہاتھ میں پکڑی کتابیں یکدم ہی اس کے ہاتھ سے پھسل گئیں۔ وہ ایکدم سے اس کے پاس آ کر انہیں اٹھانے لگا۔

"وعلیکم اسلام۔۔۔ میں تمہاری سلامتی کا جواب سلامتی سے دیتی ہوں۔"

اس کی کتابیں ہاتھ میں لے کر وہ اس کے سامنے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کھڑا تھا۔ سیبل یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہارے گھر گیا تھا۔ سفارت خانے والوں نے تمہارا پتا مجھے دے دیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہی آفیسر مجھے مل گئے تھے جو تمہیں وہاں سے لے کر آئے تھے۔ میں کافی دیر تک تمہارے گھر کے باہر تمہارا انتظار کرتا رہا لیکن تم آئی نہیں۔ تمہارے گھر کے ساتھ والے گھر سے ایک خاتون باہر آئیں اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ تم اس وقت یونیورسٹی میں ہوتی ہو۔ رات کو بھی دیر سے واپس آتی ہو۔ انہوں نے یونیورسٹی کا نام اور پتا لکھ کر مجھے دے دیا کہ میں تم سے جا کر مل سکتا ہوں۔ یہ دیکھو یہی ہے نا؟ اس نے یونیورسٹی کے نام اور جگہ کے نام والا کاغذ اس کے سامنے کیا۔

سیبل مسکرا دی۔ "تم یونیورسٹی کے سامنے کھڑے ہو۔ یعنی یہ ایڈریس درست ہے۔"

"اوہ! وہ گھبرا رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی رکوع پذیر بھنوؤں سے دعائیہ کلام کی لہریں ورد بتاتی نکلیں۔

سیبل کسی تاثر کے بغیر اسے دیکھ رہی تھی اور وہ ہاتھ میں پکڑی اس کی کتابوں کو دیکھنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

"تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟"

"تمہیں ڈھونڈنے کے لیے تمہیں گم کرنا ضروری تھا۔"

"پھر مجھے تم سے یہ پوچھنا چاہیے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو موسیٰ؟"

"شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں خود کو یہاں آنے سے روک سکوں۔ میں جانتا ہوں تم مجھے پسند نہیں کرتیں لیکن میں آخری بار ہی سہی تمہیں دیکھنے کی خواہش سے خود کو نہیں روک سکا۔"

زمین کی تہوں کی ساری کشش سیبل کے قدموں میں آ کر جامد ہو گئی۔

"جتنا میں نے تمہیں بھولنے کی کوشش کی، اتنا ہی تمہارا نام مجھے یاد ہوتا چلا گیا۔ تمہارے نام نے مجھ میں ایسے قیام کیا کہ ہر چیز پر میرا اختیار قائم رہا سوائے اس نام کو فراموش کرنے کے۔ تم سے ملنے سے خود کو روکنے کے لیے میں نے خود کو کسی درخت سے باندھ لینا چاہا، کسی غار میں چھپ جانا چاہا اور پھر بھی بے اختیار رہا۔"

سیبل نے اس کے ہاتھ سے اپنی کتابیں لے لیں۔ اسے اپنے ساتھ بینچ پر لے کر بیٹھ گئی۔

"میں نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ میرے لیے دعا کرے کہ میں ایسے شخص کو بھولنے میں کامیاب ہو جاؤں جو مجھے پسند نہیں کرتا۔ جسے یہ گوارا نہیں ہو گا کہ دعاؤں میں موسیٰ اس کا نام لیتا ہے۔ میں نے ام ہانی سے کہا۔ اپنے دونوں بھائیوں سے کہا۔ ان بھائیوں کے بچوں سے کہا۔ میں اپنے استاد کے پاس گیا ان سے دعا کی گزارش کی۔ پھر ایک ایک کر میں نے اپنے سب دوستوں سے کہنا شروع کر دیا۔ اور پھر کزائیہ گاؤں میں کوئی ایسا آدمی نہیں بچا جس نے میرے لیے دعا نہ کی ہو۔ میں نے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر خدا کو پکارنا چاہا، میں نے اس کے سامنے تمہارا نام لینا چاہا۔۔۔"

"کیا تم نے اللہ کے سامنے میرا نام لیا؟"

"ہاں لیا۔ سیبل کیا تم نے مجھے کوئی بد دعا دی تھی؟"

"ہاں دی تھی لیکن اس سے پہلے میری ماں نے مجھے ایک دعا دی تھی۔۔۔"

"کیا؟" موسیٰ نے اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہا۔

"اللہ، سیبل کو اپنے پیاروں میں رکھے۔ اللہ! سیبل کو اپنا پیار اعطا کرے۔" سیبل نے جواب دیا۔

* * *

Downloaded From

ماڈل ---------- نیلم منیر
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ---------- موسیٰ رضا

ہاجرہ ریحان

جگنو

وہ گیلی گھاس پر مسکین سا بیٹھا، بکھرے ہوئے کباب سمیٹ رہا تھا۔۔۔ چائے کا کپ بھی ایک طرف الٹا پڑا تھا۔۔۔ جبکہ وجیہہ بھائی کسی ولن کی طرح قہقہہ لگاتے جا رہے تھے۔۔۔ میں جو تھوڑی ہی دیر پہلے اپنی بلی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے لان تک آئی تھی پوری واردات کی چشم دید گواہ بن کر حیران کھڑی رہ گئی تھی۔۔۔ وجیہہ بھائی سے تو ویسے بھی مجھے چڑ تھی۔۔۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔۔۔ خاندان میں ہر کسی کا نام رکھا ہوا تھا۔۔۔ میں ناشتے میں زیادہ تر ڈبل روٹی کھاتی تھی جس کے باعث وہ مجھے کالی انگریز پکارتے۔۔۔ مگر آج تو انہوں نے حد ہی کر دی۔۔۔ امی نے ان کو شامی کباب اور چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر اس کو لان میں لے جا کر دینے کا کہا تھا۔۔۔ وجیہہ بھائی نے پہلے تو ٹرے اس کے سامنے لہرائی۔۔۔ وہ ایک پودے کی مٹی کھودتا ہوا جھٹ سے ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا اور جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹرے لینا چاہی وجیہہ بھائی نے ٹرے نیچے گرا دی۔۔۔ گرم اور خستہ کباب اب گیلی گھاس پر گھومر بنے پڑے تھے اور چائے کا کپ بھی لڑھک کر دور چلا گیا تھا۔۔۔ اسی اثناء میں وجیہہ بھائی قہقہہ لگاتے کہنے لگے۔۔۔

”لے تو تو ہے ہی کیڑا۔۔۔ یار اٹھا کر کھا لے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔“

پتا نہیں کیوں وجیہہ بھائی نے اس کو کیڑا کہنا شروع کر دیا تھا۔۔۔ شاید یہ میری ہی غلطی تھی۔۔۔ میں گو کے اس کے بارے میں کچھ خاص تو نہیں جانتی تھی مگر امی کو ایک دوبار چھوٹی پھوپھی سے اس کے بارے میں بات کرتے سن چکی تھی کہ کس طرح اس کے والدین بنگلہ دیش میں پھنسے رہ گئے ہیں اور وہ بیچارہ بن ماں باپ کے، یہاں اپنی رشتے کی خالہ کے ہاں رہتا ہے۔۔۔

”تم دیکھو کہ یہاں اسے کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں مگر بیچارہ بچہ حد سے زیادہ ہی بھوکا ہو جاتا ہے تب ہی آتا ہے۔۔۔ سارا دن خالہ اس سے کیا کیا کام نہیں کرواتیں مگر مجال ہے جو کبھی شکایت بھی کی ہو۔۔۔ میں پیسے دیتی ہوں، وہ بھی نہیں لیتا۔۔۔ بس اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔۔۔ ماں باپ جلد آ جائیں۔۔۔“

امی اس کی تعریف کرتے کرتے نہ تھکتیں۔۔۔ یہ سن لینے کے بعد ہی سے میں نے اس کو عزت دینی شروع کر دی تھی۔۔۔ مگر پھر بھی میں اس وقت ایک بچی ہی تھی لہٰذا اکثر اس کے آنے جانے کی مجھے خبر تک نہ ہوتی۔۔۔ وہ ہمارے گھر جب بھی آتا کوئی نہ کوئی کام کرنے میں لگ جاتا۔۔۔ امی کے لان میں پودوں کو امی ہی سی محبت اور دلجوئی سے پانی دیتا۔۔۔ دادا ابا کی کمر میں تیل کی مالش کرتا۔۔۔ لو چلتی دوپہر میں بھی بڑی باجی جو بھی منگواتیں وہ لا کر دیتا اور امی کے ساتھ ساتھ کچن میں سبزی کاٹتا یا برتن وغیرہ تک دھو دیتا۔۔۔ اس کا ہر کام میں یوں پیش پیش رہنا ہی وجیہہ بھائی کے لیے ایک نیا مذاق بنتا تھا۔۔۔ ایک دن میں امی کو سنانے کے لیے علامہ اقبال کی نظم ”ہمدردی“ زور و شور سے اور لہک لہک کر پڑھ رہی تھی، وجیہہ بھائی۔۔۔ بڑی پھوپھی کے بیٹے تھے اور کیونکہ ان کا کالج ہمارے گھر کے قریب تھا تو اکثر ہی

کالج سے ہمارے گھر آجاتے تھے... وہ بھی میز پر اپنی کچھ کتابیں جمائے پڑھنے میں مصروف تھے.... میں بار بار کچھ مصرعوں پر اٹک رہی تھی... "سن کر بلبل کی آہ و زاری...

جگنو کوئی پاس ہی سے بولا.....
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے....
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا۔

اب کچھ یوں تھا کہ آہ و زاری پر میری زبان لڑکھڑا جاتی جبکہ جگنو اور کیڑے کی جگہ میں الٹ پلٹ کر دیتی.... اسی دوران وہ کچن سے چھلے ہوئے مٹر ایک بڑے سے پیالے میں لے کر نکلا.... اور امی کے پاس آکر یہ پوچھنے کے لیے کھڑا تھا کہ اب اس مٹر کو کہاں رکھنا ہے کہ ایک دم وجیہہ بھائی نے اس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"اف کالی انگریز... ایسے سمجھو کے جیسے یہ جگنو ہے اور گویا بیچارا ذرا سا کیڑا ہے مگر ہر کام میں پیش پیش رہتا ہے.... تو بس یہی یاد رکھو... جگنو.... کیڑا.... جگنو.... کیڑا... کیا سمجھیں؟"

Downloaded From Paksociety.com

READING Section

امی نے غصے سے وجیہہ بھائی کو گھورا تو وہ نظریں جھکا کر بیٹھ گئے مگر جیسے میرے حلق میں کچھ پھنس گیا تھا... مجھے ایک دم اس کی کم مائیگی کا جو احساس ہوا تو میری آنکھ بھر آئی... اور اسی لمحے میری اور اس کی نظریں شاید پہلی بار ملیں... میں نے خود کو سمیٹا اور سر جھٹک کر کچھ اور دیکھنے کی کوشش میں اس کی نیکر سے باہر نکلتی ہوئی پتلی پتلی کالی ٹانگوں پر نظر پڑی تو دل پر بوجھ بڑھ گیا... امی بھی شاید سمجھ گئی تھیں اسی لیے میرے کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ جانے پر ان کی طرف سے کوئی بازپرس نہیں ہوئی... وہ تھوڑی ہی دیر میں جو بھی کام امی نے اس کو دیے تھے۔ ختم کر کے چلا گیا مگر پھر وجیہہ بھائی نے اس کا نام "ذرا سا کیڑا" ہی رکھ دیا اور اس حد تک اس کو کیڑا کہہ کر پکارا کے چند دن میں باقی سب بھی اس کو کیڑا پکارے جانے کے عادی ہو گئے۔

اس کو ہمارے گھر پر بابا جانی ہی لے کر آئے تھے کیونکہ بابا جانی اس کے والد کے اسکول دوست تھے اور جیسے ہی ان کو پتا چلا کے وہ کسی نہ کسی طرح بارڈر کراس کر کے پاکستان آگیا ہے' اس کی تلاش میں سرگرم ہو گئے تھے اور بڑی تگ و دو کے بعد آخر کار اس کو ڈھونڈ نکالا تھا... اس کے بعد وہ اکثر ہی ہمارے گھر آتا مگر بقول امی کے صرف اس وقت جب حد سے زیادہ بھوکا ہوتا... امی اس سے کوئی کام کروانا نہیں چاہتی تھیں مگر وہ خود ہی ہر کام میں ایسا پیش پیش رہتا کہ کام کر کے ہی دم لیتا... آخر میں کھانا کھا کر وہ احسان مند ہو کر چلا جاتا... وجیہہ بھائی سے تو سب ہی عاجز تھے' دادا ابا بھی ان کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے مگر آج ان کی اس حرکت کے بعد تو میرے دل میں ان سے باقاعدہ نفرت نے جڑ پکڑ لی تھی...

میں جھٹ دور سے ہی چلائی... "شیم آن یو' وجیہہ بھائی!" وہ ایک جھٹکے سے مڑے اور دو ایک لمحے کے لیے انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا... پھر ان کا قہقہہ اور بلند ہو گیا...

"لو جی ابھی کیڑے سے نمٹے نہیں تھے کہ کالی انگریز تشریف لے آئیں۔"

وجیہہ بھائی نے قہقہے کے دوران بات مکمل کی... میں کچن کی طرف بھاگی کہ وجیہہ بھائی کی اس کریہہ حرکت کے بارے میں امی کو بتا سکوں اور جب تک امی کو لے کر لان میں پہنچی' نہ وجیہہ بھائی تھے نہ ہی اس کا کچھ پتا تھا... وجیہہ بھائی کو تو خیر بعد میں چھوٹی پھوپھی... دادا ابا اور امی نے خوب سنایا تھا مگر امی اس کے لیے بڑی اداس ہو گئی تھیں... آخر کار چھ مہینوں بعد جب بابا جانی آئے تو امی نے سارا معاملہ ان کے گوش گزار کیا... بابا جانی بھی وجیہہ بھائی کو خوب سنا کر ان کو لے کر اس کی خالہ کے گھر اس کو منانے گئے تو معلوم ہوا کہ اس کے والدین آچکے ہیں اور ایک چھوٹے سے گھر میں رہائش پذیر ہیں... بابا جانی نے گھر کا پتہ معلوم کیا اور پھر ایک دن امی کے ساتھ اپنے دوست سے ملنے گئے... اور پھر بابا جانی جب بھی پاکستان آتے ان لوگوں سے ملنے ضرور جاتے... مجھے امی کی ہی بات چیت سے معلوم ہوتا رہا تھا کہ وہ پڑھنے میں بڑا مگن رہتا ہے اور کسی گارمنٹ فیکٹری میں بھی شام کو کام کرتا ہے... اس کے بعد وہ کبھی ہمارے گھر نہیں آیا... آیا بھی تو... جب...

* * *

"دنیا میں ہر غم کی... ہر دکھ کی تعزیت ہے... افسوس تو بس یہی ہے کہ دل جیسے نازک آبگینے کے ٹوٹنے کی کوئی تعزیت نہیں ہوتی... اللہ تعالی آپ کو اس اذیت سے بچائے... خوش رہیں!" میں گاڑی میں پیچھے دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کی ڈیوٹی مجھے بیوٹی پارلر سے لے کر شادی ہال چھوڑنے کی تھی... ساتھ میں منجھلے بھیا تھے جو کہ راستے میں اتر کر ایک پھول والے سے ہار پھول لے رہے تھے اور اسی تنہائی میں اس نے بس اتنا ہی کہا تھا... میں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئی تھی... اور پھر نکاح نامے پر دستخط کرنے تک میرے حواس پر صرف اور صرف یہی الفاظ سوار رہے تھے... ہمارے گھر میں اب وہ انسانوں کی بھیڑ کہاں رہی تھی... میری شادی تک تو آدھے سے زیادہ لوگ

بیرون ملک سدھار چکے تھے اور سب ہی مہمان بن کر میری شادی میں تشریف لائے تھے۔۔۔ ایک دن امی نے اس کو فون کر کے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ کیا وہ اب بھی ناراض ہے۔ کیا اب، جب اس کی واقعی ضرورت ہے تو وہ ہمیں سہارا نہیں دے گا۔۔۔ اس کے دوسرے دن سے ہی اس نے باقاعدہ شادی کے تمام انتظامات سنبھال لیے تھے۔۔۔ سارا دن بھاگ دوڑ کرتا رہتا۔۔۔ میں اپنے کمرے سے اکثر اس کی امی سے گفتگو سنتی رہتی تھی۔۔۔ کبھی کبھی دل میں خواہش ہوتی کہ ایک نظر اس کو دیکھ تو لوں۔۔۔ آواز میں تو خوب بھاری پن آگیا تھا۔۔۔ اور بات کرنے کا انداز بھی رعب دار تھا۔۔۔ رات گئے جب وہ لان میں کھڑا، کسی مزدور یا ملازم کو ہدایات دے رہا ہوتا تو اس کی گمبھیر سی آواز دور تک گونجتی محسوس ہوتی۔۔۔ اور مجھے اس کا وہی بچپن کا لمبا دبلا سا ڈیل ڈول یاد آجاتا۔۔۔ وہ نیکر سے نکلتی ہوئی پتلی پتلی کالی ٹانگیں۔۔۔ بیچارا ذرا سا کیڑا۔۔۔ نہیں۔۔۔ کیڑا نہیں۔۔۔ جگنو۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں اس کا نام دھیرے سے پکارا۔۔۔

* * *

زندگی ہمیں کیسے کیسے راستوں سے گزار کر کہاں کہاں لے جاتی ہے۔۔۔ مجھے اپنے سسرال میں چند ایک روز رہ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ امی بری طرح دھوکا کھا گئی ہیں۔۔۔ یہ لوگ وہ نہیں، جو نظر آرہے تھے۔۔۔ گھر میں ایک طوفان بدتمیزی برپا تو رہتا ہی تھا، ایک دوسرے سے ہاتھا پائی بھی خوب زوردار قسم کی، کسی بھی وقت ظہور پذیر ہو جاتی تھی۔۔۔ میں اس حد تک ڈر گئی تھی کہ امی کے ہاں جانے سے کترانے لگی تھی کہ کہیں میرے منہ سے کچھ نکل نہ جائے۔۔۔ ایک دو بار جو میری بڑی نند اور بھاوج نے آستینیں چڑھا کر آنکھیں نکال نکال کر باتیں کیں تو مجھے اپنا آپ کہیں دفن ہوتا محسوس ہونے لگا۔۔۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے اس طرح کے رویے نے مجھے بزدل بنا دیا۔۔۔ میں میکے جانے کے نام سے کانپنے لگتی۔۔۔ امی اگر فون کر کے خیریت معلوم کرتیں تو ان کو بھی گول مول جواب دے کر فون جلد از جلد بند کر دیتی کہ میری ساس اور گھر کے باقی لوگ ہر ایک حرکت پر نظر رکھتے۔۔۔ شوہر صاحب کے کام کا اب تک پتا نہیں چلا تھا۔۔۔ وہ اکثر ہی رات کو خوب دیر سے تشریف لاتے اور آتے کے ساتھ ہی ایک سیشن سب خاندان والوں سے لڑائی اور ہاتھا پائی کا ہوتا اور پھر کھانا کھا کر پڑ کر سو جاتے۔۔۔ مجھے اب تک ان کے کاروبار کی نوعیت ہی سمجھ نہیں آسکی تھی۔۔۔ شادی کو چھ مہینے ہو چکے تھے۔۔۔ اور ان چھ مہینوں میں ہی انہوں نے مجھے گھر کی ملازمہ میں تبدیل کر دیا تھا۔۔۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ جب بھی میرے میکے سے کوئی آتا سب ان کے سامنے ایسے بچھ جاتے اور کچھ یوں مجھ سے عزت سے پیش آنے لگتے کہ میں حیران ہی رہ جاتی تھی۔۔۔ بات کرتی بھی تو کس سے کرتی۔۔۔ ایک منٹ کی بھی تنہائی نہ ملتی۔۔۔ میں یوں بھی ان لوگوں کی ہاتھا پائی کی عادت سے ایسی ڈری ہوئی تھی کہ ہر وقت بھیگی بلی بنی رہتی کہ کہیں کسی دن طیش میں آکر سب مجھے ہی نہ پیٹنے لگیں۔۔۔ ایک دن حسب معمول میں صبح دودھ لینے باہر نکلی تو ایک کالی بڑی سی گاڑی چند قدموں کے فاصلوں پر نظر آئی۔۔۔ میں نے اب تک محلے میں رات کو گھروں کے باہر پارک ہونے والی گاڑیوں کو پہچان لیا تھا۔۔۔ اس علاقے کے مکینوں کے پاس اس قدر اعلا معیار کی گاڑی ہونا بھی انوکھی بات تھی۔۔۔ لہذا اس نئی گاڑی کو دیکھ کر تھوڑی حیرت ہوئی۔۔۔ اور پھر دو تین دن تک مسلسل وہی گاڑی ہمارے گھر کے تھوڑے فاصلے پر صبح کو نظر آنے لگی۔۔۔ ایک دن تو میں حد سے زیادہ خوف زدہ ہو گئی جب دودھ والے نے رازدارانہ لہجے میں مجھے بتایا کہ کل گوالا دودھ دے کے جا رہا تھا تو اسی کالی گاڑی سے ایک صاحب نے اس سے میرے بارے میں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کس حیثیت سے رہتی ہوں۔۔۔ ایک تو سسرال والوں سے ویسے ہی ڈر لگا رہتا تھا، اوپر سے یہ نئی افتاد۔۔۔ صبح سب کے سب سو رہے ہوتے تھے، کسی اور سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ دودھ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

لے لے۔۔۔ اور پھر اپنے باہر نہ نکلنے کی وجہ کیا بتاؤں؟ اب تو میں، جو دوپہر یا شام میں کبھی سبزی یا گھر کا کوئی سودا سلف لینے نکلتی تھی ڈر سے وہ بھی نکلنا بند ہو گیا تھا۔۔۔ مگر پھر چند روز بعد ہی کالی گاڑی غائب ہو گئی۔۔۔ دو تین دن تک تو میں کسی انہونی کا انتظار کرتی رہی مگر جب سب کچھ ویسا ہی رہا تو میں پھر سے اپنی زندگی پر غور و فکر میں لگ گئی۔

اور پھر وہی ہوا جس سے میں ڈرتی آئی تھی۔۔۔ چھٹی کا دن تھا اور گھر کے کام دیر سے شروع ہوئے تھے۔۔۔ آدھے سے زیادہ لوگ تو ابھی بھی اپنے اپنے کمروں میں سوئے ہوئے تھے۔۔۔ میں کیونکہ چھٹی کے روز ہی کپڑے دھلواتی تھی تو ملازمہ کو صبح جلدی بلا لیا کرتی تھی اور ابھی اس کو میلے کپڑے دھونے کے لیے دے کر کچن میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی۔۔۔ کہ میری ساس صاحبہ غیض و غضب دکھاتی مجھ سے آن ٹکرائیں۔۔۔ اور باتیں سنانے لگیں کہ ابھی تک ان کو چائے کیوں نہیں دی۔۔۔ میں ابھی ان کو وضاحت دے ہی رہی تھی کہ میری بڑی نند اپنے ہی بچے کا بلا اٹھا لائیں اور ساس صاحبہ کو پکڑایا اور ان کو اکسایا کہ اب اس کی دھنائی کا وقت آگیا ہے یہ ایسے قابو میں نہیں آئے گی۔۔۔ میں حد سے زیادہ ڈر گئی۔۔۔ اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگنے لگی۔۔۔ مگر ساس صاحبہ کو طیش آچکا تھا۔۔۔ انہوں نے بلا خوب کس کر مجھے مارنے کے لیے اٹھایا ہی تھا کہ اچانک غسل خانے سے کپڑے دھوتی ملازمہ باہر نکل آئی۔۔۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور تقریباً "گھسیٹتی" ہوئی مجھے گھر سے باہر لے جانے لگی۔۔۔ ملازمہ نئی تھی۔ ابھی چند دن پہلے ہی پرانی والی اس کو اپنی جگہ رکھوا گئی تھی۔۔۔ ساس صاحبہ ہکا بکا اپنی جگہ کھڑی رہ گئیں جبکہ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ مجھے کہاں گھسیٹ کر لے جا رہی ہے۔۔۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے میں نے اس سے کچھ پوچھنا ہی چاہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ہمارا دروازہ پہلے ہی سے بھاڑ سا کھلا پڑا تھا اور سامنے ہی وہ کالی بڑی گاڑی' دھوپ میں چمچماتی کھڑی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے سن سی ہوئی مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔۔۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ملازمہ نے دھکا دے کر مجھے گاڑی کے اندر دھکیل دیا۔۔۔

چند لمحوں تک ایک عجیب وحشت اور ڈر طاری رہا' اس کے بعد میں نے اپنے ارد گرد دیکھا۔۔۔ میرے برابر میں ہی ملازمہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔ میں ہمت ہی کرتی رہ گئی کہ اس سے کچھ پوچھوں۔۔۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی کرختگی تھی کہ میں چاہ کر بھی منہ نہ کھول سکی اور چند منٹوں میں ہی مجھے امی کے گھر کے سامنے اتار کر کالی گاڑی تیزی سے پھر غائب ہو گئی۔۔۔ میں دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہمارے گھر کے دروازے پر جیسے میرے ہی منتظر امی اور دادا ابا کھڑے تھے۔۔۔ امی نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔۔۔ اور ہم خاموشی سے گھر کے اندر آگئے۔۔۔۔

امی نے میرے حواس بحال ہونے پر بتایا کہ میرے سسرال پر اس وقت ایف آئی اے نے چھاپا مارا ہے۔۔۔ اور ابھی تک میرے شوہر سمیت گھر کے باقی مردوں اور عورتوں کو بھی حراست میں لے لیا ہو گا۔۔۔ میں حیران رہ گئی جب مجھے پتا چلا کہ میرے شوہر صاحب اور ان کے گھر والے ایک منظم اغوا برائے تاوان کا گروہ ہے اور دکھانے کو ان لوگوں نے سائٹ ایریا میں فیکٹری لگا رکھی ہے۔۔۔ امی نے یہ بھی بتایا کہ مجھے وہاں سے نکالنے میں جس کی محنت تھی وہ سی ایس ایس کا امتحان دے کر اب پولیس میں ایس پی کی نوکری کر رہا تھا اور ایف آئی اے کے لیے اس نے ہی اس سارے کیس میں بھاگ دوڑ کی تھی اور چھاپے سے چند دن پہلے ہی وہ امی کے پاس آکر میرے بارے میں پوچھ کر گیا تھا۔۔۔

اس نے مجھے چھاپے سے پہلے وہاں سے نکالنے کی تدبیر کی اور وہ بھی کچھ یوں کہ نہ تو میرے سسرال میں کسی کو خبر ہو اور نہ ہی ایف آئی اے والوں کو کچھ پتا چل سکے۔۔۔ کیونکہ چھاپے کے دوران اگر میں بھی وہاں ہوتی تو گرفتار کر لی جاتی پھر یہ بعد کی بات تھی کہ میری بے گناہی ثابت ہوتی یا نہیں۔۔۔ اور اسی سلسلے میں وہ ملازمہ آنے لگی تھی۔ جس نے گھر کے تمام حالات نوٹ کر کے اسے بتائے تھے۔۔۔ اس نے یہ سب کچھ اس

طریقے سے کیا تھا کہ چھاپہ پڑنے سے صرف چند لمحوں پہلے اس نے ملازمہ کو ہدایات دیں کہ مجھے لے کر نکل پڑے۔۔۔ کیونکہ اس کے ڈپارٹمنٹ میں بھی کسی کو اس بارے میں علم نہیں تھا لہٰذا اگر ملازمہ کو ذرا بھی دیر ہوتی یا ہم یوں بھاگتے ہوئے پکڑے جاتے تو اس کی نوکری بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔۔۔ مجھے چند ہی دنوں میں شوہر صاحب کی طرف سے طلاق نامہ بھی موصول ہو گیا جو کہ انہوں نے جیل سے ہی روانہ کیا تھا اور یقیناً" اس میں بھی اس کا ہی ہاتھ تھا۔۔۔ ورنہ یوں اتنی آسانی سے تو شوہر صاحب مجھے چھوڑنے والے تھے نہیں۔۔۔ میں ایک بہت بڑے حادثے سے بچ تو گئی تھی مگر پھر بھی طوفان کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھنور میں چکر کھا کر کنارے پر تھکے ہارے گرنے پر۔۔۔ مجھ میں سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔۔۔ اور میں سارا دن سوگوار سی کمرے میں پڑی رہتی۔۔۔

عدت کے بعد میری کچھ بچی کچی دوستوں نے باہر ملنے کا پروگرام بنایا گو میرا دل تو نہیں تھا مگر ایک دوست زبردستی مجھے گھسیٹ کر لے گئی۔۔۔ سڑکوں پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں اور بازاروں میں کندھے سے کندھا ٹکراتے رش نے جیسے میرے اندر کے ارتعاش کو تقویت دے دی۔۔۔ میں اور بھی وحشت زدہ سی ہو گئی۔۔۔ دنیا میں سب کی زندگی کا مقصد ہے "ایک میں ہی بیکار ہوں۔۔۔ میں ہی ناکام۔۔۔ نالائق۔۔۔ تف ہے مجھ پر۔۔۔ میں دوستوں کے اصرار کے باوجود محفل کو بیچ میں ہی چھوڑ کر خود اکیلی ہی گھر واپس آ گئی۔۔۔ اور پتا چلا کے امی کے ساتھ کوئی ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنی گمبھیر اور بارعب آواز میں باتیں بنا رہا ہے۔۔۔ ساتھ میں وجیہہ بھائی کے قہقہے بھی وقفے وقفے سے سنائی دے رہے تھے۔۔۔ وجیہہ بھائی اب شادی شدہ ہو کر دو بچوں کے ابا بن جانے کے باوجود ہمارے گھر باقاعدگی سے آتے تھے۔۔۔ اس بارعب اور گمبھیر آواز کو سن کر دل اور بھی بوجھل ہو گیا تھا اور میں شام گئے تک اپنے کمرے کی تنہائی میں آنسو بہاتی رہی۔۔۔ شکر تھا کہ امی آج مصروف تھیں ورنہ مجھے اس طرح دیکھ کر ان کو بھی تکلیف ہوتی۔۔۔ رات کے کھانے پر مجھے جانا ہی پڑا کہ امی رات کے کھانے کا ناغہ بالکل بھی برداشت نہیں کرتی تھیں۔۔۔ مجھے اور بھی وحشت ہونے لگی جب بات بات پر وجیہہ بھائی قہقہہ لگاتے جاتے۔۔۔ اچانک انہوں نے امی سے کہا۔۔۔

"ممانی جان۔۔۔ اس "ذرا سے کیڑے" کی تو کایا پلٹ ہی ہو گئی۔۔۔ کہاں وہ پتلا مدقوق کیڑا اور کہاں یہ بارعب پولیس انسپکٹر۔۔۔ ہیں جی۔۔۔ میں تو حیران ہی رہ گیا۔۔۔" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔۔۔

خلاف معمول امی خوش دلی سے بولیں۔۔۔ "اب اس کو کیڑا کہا نہ تو حوالات کی سیر کرا دے گا تم کو ذرا سنبھل کر رہنا۔۔۔" وجیہہ بھائی پھر قہقہہ لگانے لگے۔

"ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔ وہ آخر میں کیا کہہ رہا تھا۔۔۔ مجھے تو لگا کوئی کوڈ ورڈز میں اس نے کسی کو خاص پیغام بھیجا ہے۔۔۔ ویسے یہ کالی انگریز بڑی خاموش ہے۔ اس سے ہی پوچھتا ہوں۔۔۔ کیوں کالی انگریز۔۔۔؟"

میں آج کسی بھی قسم کے جھگڑے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا اسی طرح منہ نیچے کیے پلیٹ میں پڑے چاولوں کو چمچے سے کرید رہی تھی۔۔۔ وجیہہ بھائی پھر گویا ہوئے۔۔۔

"سن رہی ہو نا۔۔۔ وہ کہہ گیا ہے کہ بلبل اندھیری رات سے پریشان نہ ہو۔۔۔ کیڑا راہ دکھانے کو حاضر ہے۔۔۔"

پلیٹ پر دائیں بائیں چلتا میرا چمچہ ایک دم رک گیا۔ میں نے نظریں اٹھا کر امی کی طرف دیکھا جو مسلسل مسکراتی، مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔۔۔ وجیہہ بھائی ایک لحظہ کو خاموش ہو کر پھر سے قہقہہ لگانے لگے۔۔۔

"او ہو! میں تو بھول ہی گیا۔۔۔ اب وہ بیچارا ذرا سا کیڑا کہاں رہا۔۔۔ اب تو وہ جگنو بن گیا ہے۔۔۔"

* * *

Downloaded From

سائرہ رضا

محبت پیاس کا موسم

مکمل ناول

عبدالعزیز اور ان کی بیگم کے لیے یہ خبر ایک دھچکا تھی کہ عبدالعزیز کی رشتے کی بہن پھوپھی بھولی نے پروفیسر اللہ دتا ریاض کا سمیرا سے رشتہ توڑ دیا ہے اور اس کی جگہ حمیرا کے لیے رشتہ دے دیا ہے۔

سمیرا کا رشتہ اللہ دتا ریاض عرف اے ڈی ریاض سے بچپن سے طے تھا۔

سمیرا عبدالعزیز کی بیٹی اور حمیرا ان کی بھتیجی تھی۔ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی عبدالمجید کو پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اسے صرف گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ اس نے اپنے اس شوق کی خاطر ڈرائیوری کا پیشہ منتخب کیا۔ عبدالعزیز کو یہ بات پسند نہ تھی لیکن وہ خاموش ہو گئے۔ عبدالمجید نے ایک لڑکی صفیہ کو پسند کیا۔ عبدالعزیز رشتہ لے کر گئے تو لڑکی والوں

READING
Section

Downloaded From Paksociety.com

نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن عبدالمجید نے اس بات کو تسلیم نہ کیا اس نے صفیہ سے بات کی۔ صفیہ نے اس کی خاطر اپنا گھر چھوڑ دیا اور گھر والوں کی مرضی کے خلاف عبدالمجید سے شادی کرلی۔

عبدالعزیز کو یہ بات پتا چلی تو وہ سخت ناراض ہوئے اور عبدالمجید کو گھر چھوڑنے کے لیے کہہ دیا۔

عبدالمجید اپنا حصہ لے کر چلا گیا اور کرائے پر گھر لے کر صفیہ کے ساتھ اپنی دنیا بسالی۔

حمیرا دس سال کی تھی جب عبدالمجید ایک حادثے میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ صفیہ کے گھر والے اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ صفیہ بے سہارا تھی۔ گھر بھی کرائے کا تھا۔ ایسے میں عبدالعزیز نے بھاوج اور بھتیجی کے سر پر ہاتھ رکھا اور انہیں اپنے گھر لے آئے۔ صفیہ کو اپنی بچی کے مستقبل کی فکر تھی کہ لوگ اسے ماں کے طعنے دیں گے۔

عبدالعزیز نے ان کے اطمینان کی خاطر اپنے بیٹے معید سے حمیرا کا رشتہ طے کر دیا۔

صفیہ کو عبدالعزیز کی بیوی ناہید اور بیٹی سمیرا کے غیر معمولی حسن سے شدید حسد محسوس ہوتا تھا لیکن انہوں نے اسے چھپائے رکھا تھا۔ یہ حسد نکالنے کا موقع اس وقت ملا جب ناہید نے انہیں پھوپھی بھولی کے پاس سمیرا کی شادی کے لیے عندیہ لینے بھیجا۔ صفیہ نے سمیرا اور ناہید کی برائیاں کر کے پھوپھی بھولی کو شدید بدظن کر دیا۔

حمیرا بہت سادہ مزاج اور محبت کرنے والی طبیعت کی مالک تھی لیکن وہ ذہین بھی بہت تھی۔ اے ڈی ریاض نے اس کی ذہانت کو بھانپ کر اس کی پڑھائی میں مدد کی اور اس نے ایم اے کر کے جاب کرلی۔ اس کی اعلا پوزیشن اور بھاری تنخواہ نے پھوپھی بھولی کا ذہن بھی بدل دیا۔

پھوپھی بھولی اس وقت بیوہ ہوئی جب اس کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا بہت چھوٹی عمر کے تھے۔ پھوپھی بھولی کا اکلوتا بیٹا اے ڈی ریاض بہت ذہین اور پڑھائی میں اچھا تھا۔ گاؤں کے ماسٹر نے مشورہ دیا کہ پھوپھی بھولی شہر میں شفٹ ہو جائے اور اللہ دتا ریاض کو تعلیم دلائے۔ پھوپھی بھولی نے عبدالعزیز سے مدد لی۔ عبدالعزیز نے انہیں اپنے گھر کے برابر میں گھر دلا دیا۔ پھوپھی بھولی نے سلائی کڑھائی کر کے اے ڈی ریاض کو تعلیم دلائی۔

سمیرا اور اے ڈی ریاض بچپن سے اپنے رشتے سے واقف تھے اور دونوں کے درمیان خاموش محبت کا رشتہ بھی استوار تھا

حمیرا اور معید بھی اپنے رشتے سے واقف تھے۔ حمیرا معید کے لیے گہرے جذبات رکھتی تھی۔ لیکن معید کے ساتھ پیش آنے والے ایک حادثے نے حالات کا رخ یکسر بدل دیا۔

دوسری اور آخری قسط

"میں نے سوچا تھا تمہیں پائلٹ بناؤں گی۔" ناہید کی نگاہیں آسمان پہ اڑتے جنگی جہاز کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ وہ آج بیٹے کے ساتھ ٹہلنے آئی تھیں۔ ابو کو کسی ضروری کام سے صبح صبح نکلنا تھا۔ اس نے تو باپ سے کہا تھا کہ وہ اکیلا چلا جائے گا یا پھر نہیں جاتا، مگر ابو اور امی دونوں ہی اس کا ناغہ نہیں چاہتے تھے۔ سو ناہید چادر لپیٹ کر اس کے ہمراہ آگئیں۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔" جہاز کا شور کم ہوا تو ناہید نے بیٹے کو دیکھا۔ وہ دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ پل جاتے جب دوسرا جہاز نمودار ہو جاتا۔ جنگی مشقیں کرتے جہاز۔۔۔ وہ بھی یہی سوچا کرتا تھا، مگر اب اس موضوع پر بات کرنا بھی کس قدر تکلیف دہ تھا۔

"وہ دیکھیں، آموں پر بور آنے لگا ہے، کچھ دن بعد آپ اچار بنانے کے لیے کمر کس لیں گی۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے آموں کے باغ کی سمت اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ شگفتہ تھا، مگر ناہید کی نگاہیں دوسرے جہاز پر تھیں۔ یہ نظر آیا۔۔۔ سر سے گزرا۔۔۔ زوں ں ں ں اور غائب۔

"بادلوں کو چیر دینے والے انسان۔۔۔ میں چاہتی تھی تمہیں ہواؤں میں اڑنے والا بنا دوں۔" ناہید کی

www.Paksocietu.com

خاص دھیان میں چلی گئی تھیں۔ اس کا موضوع بدلنا بے سود ثابت ہوا۔ ”تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو ان شاء اللہ۔“

”میں زمین پر چلنے کے قابل نہیں رہا۔ آپ ہوا میں اڑانے کی بات کرتی ہیں۔“ وہ اسے ملامتی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

”کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ... میں آپ لوگوں کے لیے صرف دکھ کا باعث ہوں۔“ اس نے دل کی بات کہی۔ چھوٹی سی بات، مگر کہتے ہوئے جو جبر خود پر کیا اور جو قہرماں پر ڈھایا۔ اُف خدا۔

ہاں وہ اس کے لیے دکھی تھیں۔ ساری دنیا سے زیادہ... مگر وہ خود بھی تو اپنے... لیے دکھی تھا۔ ہاں اظہار بہت کم کرتا تھا۔ انہیں لگا وہ پھوٹ کر رو دیں گی۔

”میری طرف سے کوئی خوشی نہیں ملی آپ کو...“ وہ کہہ رہا تھا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو میرے چاند...!“ ناہید نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا، انہیں ایڑیاں اٹھانی پڑی تھیں۔ ان کا اونچا لمبا بیٹا، مگر... سسکی کو دبانا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ آہ... کو... ہاہا سے بدلنا۔

”تم تو میرا جشن ہو، جسے میں ہر روز مناؤں تب بھی دل سیر نہ ہو۔ میرے پیارے بیٹے...!“ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”اوہو۔ ہو امی۔ کیا کرتی ہیں۔ ہم روڈ پر کھڑے ہیں۔“ اس نے سٹپٹا کر چاروں طرف دیکھا۔ دور مسجد کے گنبد تھے۔ آموں کا باغ... اور کھیت... دور چلتا ٹریکٹر... اسکول کو جاتی ننھی بچیوں نے حیرت سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ اور جو نہیں دیکھ پائی تھیں انہیں اشارے سے بتایا تھا، دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

سمیرا کو سجنے سنورنے کا شوق تھا۔ اور سردیوں کا یہ موسم اس شوق کو جلا بخشنے کا خوب موقع فراہم کرتا تھا۔ ابھی موسم کی پہلی ہوا ہی چلی تھی۔ اور ہلکے رنگوں کو پسند کرنے والی سمیرا نے کچھ شوخ لباس معمولات میں شامل کر لیے تھے۔

اور اس وقت اے ڈی کے سرہانے پر اس نے بے ساختہ گردن جھکا کر خود کو دیکھا۔

”تم پر یہ رنگ بہت سج رہا ہے۔“

ہلدی رنگ کے پلین سوٹ پر سیاہ ہلکی شال۔ سیاہ پمپ شوز۔ قمیص کے گلے اور آستین پر سیاہ کڑھائی اور ننھے شیشے ٹکے تھے۔ اس کے ہاتھ کی گھڑی کا پٹا زرد تھا۔ اسے اپنے آپ پر پیار آیا۔ صبح آئینے نے بھی یہی کہا تھا۔ وہ سج رہی تھی۔ اسکول میں کتنے ہی کولیگز نے سراہا۔ مگر دل میں ویسی خوشی نہ ابھری جیسی کہ ابھی۔

”صرف یہی رنگ...؟“ اس کے لہجے میں مان آگیا۔

”نہیں سارے رنگ۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

ایک تھی شال

رخسانہ نگار عدنان

مکمل ناول کتابی شکل
میں شائع ہو گیا ہے

قیمت -/500 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر:
32735021

"پر کبھی کہا تو نہیں۔"

"ابھی کہہ رہا ہوں ناں۔"

"آپ کو نہیں لگتا۔ بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔"

وہ دونوں بہت آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ جواب کے لیے بیچ راستے رک گئی۔ اے ڈی کو بھی رکنا پڑا۔ یہ سمیرا کا اسکول تھا۔ وسیع رقبے پر پھیلی عمارت اور میدان اور عمارت سے مین گیٹ تک پارکنگ کے لیے پیدل آنا پڑتا تھا۔

اس وقت رش نہیں تھا۔ مگر پھر بھی چیدہ چیدہ آتے جاتے لوگ۔۔۔ سمیرا کے لبوں کی شریر مسکان۔۔۔ یہ اس کی اپنی گلی تھی۔ یہاں وہ شیر تھی۔ ٹھیک ہے ایسے تو پھر ایسے ہی سہی۔

"دیر لگی آنے میں ہم کو۔ شکر مگر ہم آئے تو۔"

اے ڈی ریاض نے شعر کو اپنے مرضی کی شکل میں ڈھالا۔

سمیرا ہنس پڑی، کتنی ہی نقرئی گھنٹیاں بجنے کا گماں ہونے لگا تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائی۔

"شکر ہے آپ منیر نیازی کے پیروکار نہیں نکلے۔" اس نے ذو معنی بات کی۔

"ہاں!" اے ڈی ریاض نے بلند قہقہہ لگایا۔ "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں"۔

"جی۔" وہ شعر بوجھ لینے پر شگفتگی سے مسکرائی۔

ہوا سے اڑتے بالوں کو بار بار جمانا پڑتا تھا۔ اس نے سر پر شال کو اچھی طرح جمایا اور قدم بڑھائے۔

اے ڈی ایک قدم پیچھے تھا اس نے سر اٹھا کر آسمان سے ہم کلام پیڑوں کو دیکھا ہوا شاخوں کو جھولے دے رہی تھی۔ ہاں ذرا اور زور سے۔۔۔ بس اتنا کہ شال دوبارہ ڈھلک جائے اور وہ صبیح چہرے پر زلفوں کی اٹکھیلیوں سے نبرد آزما ہوتا اسے دیکھ سکے اور پھر اپنی خدمات پیش کر دے۔ انہیں سمیٹ دے بار بار۔۔۔ کئی بار۔

"آپ رک کیوں گئے۔" سمیرا نے پلٹ کر اسے پکارا تھا۔

"آں۔۔۔ نہیں آرہا ہوں۔" اے ڈی جست بھر کے اس کے ہم قدم ہو گیا۔

"آج ادھر کیسے؟" وہ دوبارہ ہم قدم تھے۔

"بس یوں ہی ادھر کسی کام سے آیا تھا۔ سوچا، تمہیں دیکھ لوں تو ساتھ چلیں گے۔" وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا۔ سمیرا نے مسکراہٹ کو قابو میں کیا۔

"ایک بات کہوں۔"

"ہوں۔"

"برا تو نہیں مانیں گے۔" اس نے پیش بندی چاہی، نجانے کیا پوچھنا تھا۔

"بالکل نہیں۔" وہ اس کی بات کا برا کیسے مان سکتا تھا۔

"آپ صاف بات کیوں نہیں کر لیتے۔"

"صاف بات کون سی؟" اے ڈی واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"یہی کہ آپ ساتھ چلنے کی خواہش کو بہانے میں چھپا کے لے آئے ہیں۔"

"سمیرا" اب کی بار اے ڈی ریاض بیچ راستے میں رک گیا تھا۔

"سب کچھ جانتے بوجھتے بھی سوال پوچھنے والے لوگوں کو قیامت کے دن سخت گناہ ہو گا۔" اے ڈی نے اپنی بلا کی پرکشش آنکھوں میں شکوہ بھر کے اسے دیکھا۔ سمیرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ صاف بات کیا کریں کہ۔" سمیرا کا لہجہ متبسم تھا۔ مگر بیچ میں اٹک گئی۔ یہ کیسے کہتی کہ پندرہ دن سے زیادہ آپ مجھے دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔

"ہاں ہاں۔۔۔ بات پوری کرو" وہ شرارت کے موڈ میں آگیا تھا۔

"نہیں بس اتنی ہی تھی۔"

"ناں بات پوری کرو۔ ورنہ میں یہیں کھڑا ہوں۔" اس نے دھمکی دی۔

"میں چلی جاؤں گی۔" اس پر دھمکی کارگر نہ ہوئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"میں کل صبح تمہیں یہیں ملوں گا۔ اسی طرح کھڑا۔"

"مشکل ہے۔" اس نے بیگ کو اپنے کندھے پر جماتے ہوئے کہا۔ "پھپھی بھولی نے سارے شہر کو دوڑا دینا ہے۔ کہ میرا اے ڈی پتر کہاں رہ گیا ہائے لوکو ڈھونڈو۔" اسے ہنسی آرہی تھی۔

"نہیں... وہ ڈھونڈنے کا نہیں کہیں گی۔ سیدھی یہاں آکر رکیں گی۔ انہیں پتا ہے کہاں جاکر بیٹا پتھر کا ہوجاتا ہے۔ راستہ بھول جاتا ہے۔"

"پھپھی کی ایک دھاڑ سے پتھر پگھل جائے گا سر جھکا کر ان کے پیچھے۔" وہ اے ڈی کو اس کی فرماں برداری یاد کروارہی تھی۔

"ان کے پیچھے تو مجھے ہمیشہ سر جھکا کر ہی چلنا ہے سمیرا!" اے ڈی کا چہرہ متبسم تھا اس پر ماں کے لیے محبت واحترام کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ "کیونکہ انہوں نے مجھے چلنا سکھایا ہے۔ وہ میری ماں ہیں۔ اور وہ یہ جانتی ہیں۔ میں قدم سے قدم ملا کر کس کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔"

سمیرا نے اے ڈی کے جملے کی گہرائی کو دل سے محسوس کیا۔ بڑی گہری بات کہہ دی تھی اے ڈی نے اور اس سے زیادہ گہرائی سے وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"انہوں نے آپ کے کان پکڑ لیے ہیں۔ ہائے اللہ دتہ کالج کے منڈوں کو کڑیوں کے اسکول کالج کے پھیرے لگاتے دیکھا تھا۔ تو اتنا وڈا پروفیسر ہو کر یہ کام کرتا ہے۔ ہائے ہائے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ بھی ملتی جائیں گی۔"

"میں تمہیں پک کرنے آیا تھا۔ کہاں بس کے دھکے کھاتیں۔"

"میں وین میں آتی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"رہنے دو، یہاں نیکی کرنا یعنی گناہ کرنا۔ میں تمہارا بھلا چاہ رہا تھا۔ وین میں اتنا رش ہوتا ہے۔"

"آپ صاف بات کیوں نہیں کرلیتے اے ڈی!" وہ وہیں آکر اٹک گئی۔

"ٹھیک ہے۔" اے ڈی نے گھڑی میں وقت دیکھا۔

"سامنے بیٹھ جاؤ... وہاں بینچ پہ... میں آج تمہیں صاف صاف بات بتا ہی دیتا ہوں۔"

"پلیز..." اس کی ساری طراری اڑن چھو ہوگئی۔ "ہائے اس کا اسکول... کوئی دیکھے گا تو... اف" اس نے دو قدم سرکتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"بس اتنی ہمت تھی۔" وہ جتا رہا تھا۔

"ہاں اتنی ہی تھی۔" اس نے ہار مان لی۔ اے ڈی ہنس دیا۔ ہراساں ہو کر وہ اور پیاری لگی تھی۔

* * *

امی کو منانے کے لیے اس نے سچ مچ جان ماری تھی۔ صحن میں جھاڑو بھی دی گھس گھس کر پونچھا لگایا... سارے گھر کی جھاڑ پونچھ بھی کردی۔ دوپہر کے کھانے میں امی کو دکھا کر سلاد کا پیالہ کھالیا۔ شام کو چائے کے ساتھ پاپے کھاتے ہوئے دل کی حالت وہ جانتی تھی۔ مگر بھوک کی نقاہت چہرے سے بھی عیاں ہونے لگی۔

ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ صفیہ خود اٹھیں آلو گوشت کے سالن سے تری ہٹا کر ایک نرم پھلکا بھی بنا لائیں۔

"رہنے دیں سارے دن کی محنت برباد ہو جائے گی۔ میں گزارا کرلوں گی۔" اس نے پاپے کی تھیلی سے ایک پاپا اور نکالا۔

حمیرا کھانے سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔ صفیہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ ماں تھیں اس کا برا تو نہیں چاہتی تھیں۔

"تم نے صفیہ! بلاوجہ ہی بچی کو اتنا سنا دیا۔ جتنا وہ کل میرے ساتھ بازار میں گھومی پھری۔ ساری انرجی تو خرچ ہوگئی۔ اس ایک شوارمے یا کولڈ ڈرنک سے کیا فرق پڑنا تھا۔" بڑی امی نے کہا۔

"بھئی، آج کل ٹی وی میں یہی تو بتاتے ہیں ناں۔ کیلوریز خرچ کرنا پھر اس حساب سے کھانا۔ جسم پر نہیں لگتا۔" انہوں نے وضاحت دی۔ "یہ بھی ٹی وی

والے ہی بتاتے ہیں۔ کہ سونے سے تین چار گھنٹے پہلے رات کا کھانا کھالینا چاہیے۔ ہمارا تو مذہب بھی مغرب کے بعد کھانا کھالینے کی ترغیب دیتا ہے۔ عشاء پڑھیں گے تو سب ہضم... وزن بھی نہیں بڑھے گا۔ اسے کھانا ہی تھا تو کم از کم رات نو تک کھالیتی۔"

"یہ تو آپ اب کہہ رہی ہیں۔ میں اگر نو بجے کھانے لگتی۔ تو آپ کوئی دوسری تقریر کرتیں۔"

"اور چھپ کر کیوں کھایا؟" صفیہ کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔

"دکھا کر کھاتی تو آپ چھین کے پھینک دیتیں۔" حمیرا کے شکوہ بھرے جواب پر صفیہ نے نظریں چرا لیں۔ وہ ایک بار اس کے ہاتھ سے سموسے چھین چکی تھیں۔

"کھانا کھالو..." صفیہ کھڑی ہو گئیں۔ "اسے کھلا دیں بھابھی! میری تو یہ سنے گی نہیں۔" اس کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔ صفیہ کو جیٹھانی سے کہنا پڑا۔

"میں نے کہا تھا ناں تمہاری ماں کو پتا لگ گیا تو ناراض ہوگی۔"

"آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔ مجھے ہی سنائیں ساری۔" وہ لقمہ بناتے ہوئے بولی۔ کیا خوشبو اٹھ رہی تھی آلو گوشت کے سالن سے۔

"یہی تو بات ہے وہ مجھے کچھ نہیں کہتی... ایک بات بتاؤ تمہاری ماں کیا ہمیشہ ایسی ہی تول تول کر بولنے والی ہے۔" انہوں نے کئی بار کا کیا ہوا سوال دہرایا۔

"...کوئی نہیں..." حمیرا کا سر نفی میں ہلا۔ "باتیں کرتی تو ہیں۔ بلکہ ایسے ایسے پوائنٹ مارتی ہیں کہ بندے کے پاس کوئی جواب ہی نہیں رہتا۔"

"ہاں۔ تم سے تو کرتی ہے باتیں وہ... مگر دیکھو ناں کتنے سال ہوگئے اسے یہاں آکر رہتے ہوئے مگر ہم بس ضروری بات چیت ہی کر رہے ہیں کوئی ناراضی بھی نہیں۔ کبھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ مگر اس نے اپنے گرد ایک دائرہ سا کھینچ رکھا ہے۔"

ان کا لہجہ دلگیر سا ہو گیا۔ ایک ہی گھر میں رہتے افراد کے درمیان ان دیکھے فاصلے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ صفیہ کا اول روز سے بہت نپا تلا انداز تھا۔ شروع میں اس رویے کو جھجک کہہ کر نظر انداز کیا گیا۔ لیکن! تھوڑا وقت اور گزرا تب نئی چیز پتا لگی۔ صفیہ محلّہ پڑوس اور خاندان میں بہت ملنسار اور بے تکلف نظر آنے لگیں۔ وہ دکھ درد بھی سنتیں۔ خوشی غمی میں جایا کرتیں، مشورے بھی دیتیں، مددگار بھی نظر آتیں۔ مگر بس جیٹھانی سے ایک حد فاصلہ برقرار رکھا۔

"رہنے دیں بڑی امی! آپ کو اس دائرے کے اندر آکر کرنا بھی کیا ہے۔ کچھ نہیں رکھا اندر۔" حمیرا انگلیاں چاٹ رہی تھی۔ "میں رہتی ہوں ناں اس دائرے کے اندر... اوف..." اس نے جیسے پناہ مانگی۔ "یہ کرو... وہ نہ کرو... یہ اچھا ہے وہ برا ہے۔ یہ کھاؤ اور یہ بالکل مت کھاؤ ایسے چلو... ایسے بولو لو جی کیا میں نے ایف ایم میں کام کرنا ہے۔ یا کیٹ واک کرنی ہے۔ ہر وقت کی روک ٹوک۔"

بڑی امی ہنستی رہیں۔

"ماں کو ناراض نہیں کرتے۔"

"تو جی میں نے کب کیا۔ بلکہ راضی کرنے کے لیے کتنے کشٹ اٹھائے۔ آپ تو گواہ ہیں بڑی امی۔" اس کا اشارہ صبح سے اب تک کیے جانے والے اپنے کاموں کی طرف تھا۔

"تمہاری ماں نے مجھ سے کہا ہے۔ ماسی کو چھٹی دے دوں۔ تم سے کراؤں سارے گھر کے کام خصوصاً "جھاڑو پوچا" "آٹا گوندھنا وغیرہ۔"

"اتنے پر ہی اکتفا کیوں۔ گلی کے دو چار گھر اور بھی لے دیں صفائی کے ساتھ کپڑے بھی دھو دوں گی۔ اچھا ہے میں بھی چھٹیوں میں چار پیسے کمالوں گی۔" اس کی تو جان جل کر خاک ہو گئی۔ گوشت آلو کا مزا کرکرا ہو گیا۔

"اللہ نہ کرے، تم کوئی ماسی ہو۔"

"پر امی تو چاہتی ہیں ناں۔ انہیں میں موٹی بطخ لگتی ہوں۔ کہتی ہیں آواز بھی بطخ جیسی ہے۔" وہ آزردہ نظر آنے لگی۔ (بڑی اداکاری... اسے اپنے آپ سے بڑا پیار تھا۔ اپنی ہر چیز اچھی لگتی تھی۔)

"کیا میں واقعی ایسی ہوں جیسا امی کہتی ہیں۔" اس

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نے گال پھلا کر منہ اونچا کیا۔

"بطخ جیسی۔" بڑی امی کو زور سے ہنسی آگئی۔ مگر حمیرا سنجیدہ اور رنجیدہ نظر آئی تھی۔ جواب دینا لازمی تھا۔

"غلط کہتی ہے صفیہ۔۔۔ تم چڑیا ہو۔ گدگدی سی چڑیا جو ذرا سے پر پھیلا کر بیٹھی ہو۔ اور آواز بھی چڑیا جیسی ہے۔"

"سچ۔۔۔" اس نے فوراً" یقین کرلیا۔ خوشی سے تالی پیٹی اور کھڑی ہوگئی۔

"اب کہاں جارہی ہو۔ ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے ماں ناراض ہو۔"

"نہیں نہیں۔۔۔" اس نے قطعیت سے انکار کیا۔ "میں تو کہانی لکھ رہی ہوں۔"

"کہانی؟ وہ کس لیے۔؟"

"کس لیے کیا مطلب۔۔۔ کہانی کس لیے لکھتے ہیں؟ پڑھنے کے لیے۔"

"مطلب۔۔۔" ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یعنی پہلے لکھو گی پھر پڑھو گی؟" تو اتنی مشکل میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنی ڈھیر کتابیں سمیرا نے اکٹھی کر رکھی ہیں انہیں پڑھو۔ کوئی مصیبت پڑی ہے کہ پہلے لکھنے میں سر کھپاؤ گی پھر پڑھنے بھی خود بیٹھ جاؤ گی۔"

"اوہ بڑی امی۔!" اس نے تاسف سے سر پر ہاتھ مارا۔ "مجھے تو پڑھنا پڑے گا ناں۔ میں خود اپنے لکھے کو ریسپکٹ نہیں دوں گی تو کسی اور سے کیا امید۔"

* * *

"سمجھ میں نہیں آرہا۔ ہیروئن کے سوٹ کا رنگ کیا رکھوں اور کون سا کٹ ہو۔" قلم کی نوک ہونٹوں میں دبائے وہ واقعی مصنفہ لگ رہی تھی۔ پر سوچ چہرہ۔ خلا میں ٹکی نگاہیں، سنجیدگی کمال کی۔۔۔ سمیرا بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"فرنچ کٹ لکھ دو۔" معید کی بلند آواز اندر تک آئی۔

"فرنچ کٹ۔۔۔ کس چیز کا؟" اس نے بھی ہانک لگائی۔

"داڑھی کا۔"

"داڑھی۔!" اس کے منہ سے قلم پھسل گیا۔ "میں ہیروئن کی بات کررہی ہوں معید! اس کے ڈریس کا کٹ۔"

"اوووہ۔!" کھڑکی میں اس کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ "میں سمجھا ہیرو ہے۔" "میرا ہیرو کوئی فرنچ کٹ وٹ نہیں رکھے گا۔"

"کوئی زبردستی ہے۔" معید نے کہنی چوکھٹ پر ٹکائی۔ موضوع دلچسپ تھا۔ "ہوسکتا ہو وہ رکھنا چاہتا ہو اسٹائل ہے ناں یار۔"

"خوامخواہ اسٹائل ہے، میں شیو کردوں گی منٹ کے اندر۔" وہ زمین پر جھک کر قلم اٹھا رہی تھی۔ "قلم سے۔"

سمیرا کو ان دونوں کو دیکھ کر ہنسی آنے لگی۔

"پاگل ہو دونوں۔" اس نے فیصلہ دیا۔

حمیرا کی نگاہیں سمیرا کے سراپے پر ٹک گئیں۔

"لو خوامخواہ کی مصیبت پالنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے تیزی سے قلم اٹھایا۔ "گہرا جامنی پرنٹڈ دوپٹا قمیص۔ بسکٹی آستین اور بسکٹی پاجامہ، پیروں میں دو پٹی۔ نفاست سے تراشے ناخن۔۔۔ اور۔" اس نے جھک کر سمیرا کے پیر دیکھے "اس وقت نیل پالش نہیں لگا تھا۔ اس نے وہ بھی لکھ دیا۔ مطمئن ہوگئی۔ "مجھے کیا ضرورت ہے دماغ کھپانے کی۔۔۔ تم جو کپڑے روز روز بدلو گی بس میں وہی لکھتی رہوں گی۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"بات سنو۔۔۔ تم نے ہیروئن کیسی بنائی ہے۔ پیاری تو ہے ناں؟" سمیرا نے پوچھا۔

"مجھے بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ بنی بنائی مل گئی۔" اس نے ماؤں والے انداز میں سمیرا کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ گھمایا۔

"ہائیں!" سمیرا پیچھے کھسکی۔ "مطلب؟"

"مطلب بی بی یہ ہے کہ مجھے بنانے اور ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ پڑی، سیدھی سیدھی سمیرا کی تشریح

لکھ دی۔ سنہری آنکھیں گلابی رنگت۔ پیارے بال پیارے ہاتھ۔۔۔ پیارا چہرہ۔ پیارا۔"

"بہت اچھے۔۔۔!" معید نے ہاتھ جھاڑے' ساتھ ہی بہن کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا تو چپ سا ہو گیا۔ وہ واقعی اتنی پیاری تھی کہ اسے ہیروئن بنایا جاتا۔

"اور ہیرو۔" سمیرا نے لگے ہاتھوں یہ بھی جاننا بہتر سمجھا۔

"ہاں۔" حمیرا کا چہرہ اترا۔ "وہ نہیں ملا۔"

"کمال ہے۔" معید کی بلند خفا آواز ابھری۔ "تمہیں میں نظر نہیں آیا۔"

"تم۔!" وہ رجسٹر رکھ کے دھاڑی۔ شہادت کی انگلی اٹھائی "تم اور ہیرو۔"

"میں ایک ہٹ ناول لکھنے والی ہوں سمجھے ہتم نے ایسا سوچا بھی کیسے معید۔؟" معید کا چہرہ پھیکا پڑا مگر اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔

"ہاں ہٹ ناول' جسے ایڈیٹر اپنے پیر کی ہٹ سے دفتر سے باہر اڑا دے گی۔"

"کیا؟" وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ "تم یہ میرے ناول کے بارے میں کہہ رہے ہو۔

"نکلو۔۔۔ فوراً" نکلو ادھر سے۔۔۔ اسے نکالو سمیرا اپنے کمرے سے۔"

اسے تو گویا پتنگے لگ گئے تھے۔ سمیرا نے جبڑے بھینچے اسے زور کی ہنسی آرہی تھی۔

"میں تو کہیں نہیں جانے والا۔۔۔ میری بہن کا کمرہ ہے۔"

"اچھا۔۔۔!" اس نے اپنا منہ کھڑکی سے باہر نکالا۔ "تایا ابو۔۔۔ تایا ابو! اس معید کو بلائیں یہ لڑکیوں میں گھس کر بیٹھا ہے۔ تنگ کرتا ہے ہمیں' بلائیں اسے۔"

"لگاتی رہو آوازیں' ابو گھر پر نہیں ہیں۔" معید بے فکر تھا۔

"میں گھر آچکا ہوں صاحبزادے۔۔۔ باہر آجاؤ۔" تایا ابو کی آواز پر حمیرا نے خوشی سے تالی پیٹی اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کہ باہر نکل جاؤ۔

"معید۔۔۔!" ابو نے دوسری آواز لگائی۔

"تم سے میں آکر نبٹتا ہوں۔" وہ دھمکاتا نکلا۔

"ہو جاؤ شروع۔" اس نے کاغذ قلم سنبھالا۔

"میں کیا بتاؤں۔" سمیرا گڑبڑائی۔

"ایسا کرو۔ وہ تمام کوالٹیز بتاتی جاؤ جو ایک ہیرو میں ہونی چاہئیں اگر مجھے مناسب لگیں تو لکھ لوں گی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سمیرا کو یہ کام ذرا آسان لگا۔ اس نے ہونٹ پر شہادت کی انگلی ٹکائی۔ سوچنے کا حسین انداز۔۔۔ حمیرا نے اس ادا کو نوٹ کیا۔ لکھ لیا۔

"سانولے رنگ پر گھنی سیاہ مونچھیں۔ لبوں پہ مدہم مہربان مسکراہٹ۔ ہنسے تو آنکھیں بھی مسکرائیں۔ سیاہ گھنے بالوں کا ایک گچھا سا ماتھے پر ڈھلک آئے جیسے وہ تہذیب سے دوبارہ جمالے۔" سمیرا کو ہیرو جیسے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"قد لمبا۔۔۔ کم از کم چھ فٹ سے اوپر۔"

"سات فٹ لکھ دوں۔" حمیرا کا قلم رکا۔ اسے شاید حلیہ پسند نہیں آرہا تھا۔ "؟میں نے ہیرو بنانا ہے یا واپڈا کی سیڑھی۔" وہ قلم چھوڑ پڑتال والا کلرک بن گئی۔

"بھئی کہانی میں ایسے ہی ہیرو کو ڈسکرائب کیا جاتا ہے۔" سمیرا سالوں سے کہانیاں پڑھتی رہی تھی۔

حمیرا نے ان سنی کرتے ہوئے اپنے لکھے کو با آواز بلند دہرانا شروع کر دیا آواز باہر تک جانے لگی "یہ حلیہ تو کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔" اس نے مشکوک نگاہ سے دیکھا۔

سمیرا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر اس سے پہلے حمیرا کے نعرے نے اس کا منہ بند کر دیا۔

"یہ تو بھائی ریاض کا حلیہ ہے۔ پورا کا پورا پروفیسر اے ڈی ریاض۔" اس نے کاغذ قلم پٹخا اور گال بھی پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر جما لیے سمیرا نے ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبایا۔ حمیرا کو اور غصہ آیا۔

"بھائی ریاض تمہارے ہیرو ہوں گے۔۔۔ میرے نہیں ہو سکتے آئی سمجھ۔"

"کیوں کیا برائی ہے ان میں؟" سمیرا کو بھی غصہ آیا۔

"اچھائی کیا ہے۔" حمیرا نے ہاتھ نچایا "سب سے پہلے تو ان کا نام ہی ہیرو والا نہیں ہے۔"

"اے ڈی ریاض... یعنی ہیرو اللہ دتہ ریاض... نو۔" (سب سے بڑا اعتراض)

"اچھا!" سمیرا کے ہاتھ — کمر پر ٹکے۔ "تو خیر سے اپنے ہیرو کے بارے میں بھی بتادو۔"

"میرا ہیرو...!" حمیرا نے گردن شاہانہ انداز سے اٹھائی۔ "وہ تو جب تم دیکھو گی۔ تو پتا لگے گا۔ ویسے بائی داوے تمہیں بھائی ریاض واقعی اچھے لگتے ہیں۔ یا پھر بچپن کی بات طے ہے تو اس لیے مجبوری میں۔"

"مجبوری کیوں؟ وہ اچھے ہیں۔"

"کتنے؟" حمیرا کو مزا آنے لگا۔ صفائی دینے کے چکر میں حال دل معلوم ہو رہا تھا۔

"بہت زیادہ۔"

"کتنے زیادہ؟"

"ساری دنیا سے زیادہ۔"

"اوہو... کیسے اگلوالیا۔" حمیرا کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ "ورنہ تو ایسی پاکیزہ محبت ہے۔ پرانے زمانے والی۔ مجال ہے، جو ذرا چوری پکڑی جاسکے۔"

"جی نہیں... وہ ہیں ہی اتنے متین اور بردبار' ایسے چھچھورے کام نہیں کرتے۔"

"بات یہ نہیں ہے۔" حمیرا نے تالی کے انداز سے ہاتھ مارے۔

"وہ جس ماں کے بیٹے ہیں ناں' وہ انہیں کسی بھی کام سے باز رکھ سکتی ہیں محبت سے بھی۔"

"خوامخواہ۔" سمیرا انکاری تھی۔

"مان لو سمیرا! پروفیسر اللہ دتہ ریاض محبت بھی اپنی امی سے پوچھ کر کرنے والوں میں سے ہیں۔"

"پھپھی پہلے ہی مجھ سے پیار کرتی ہیں۔" سمیرا کا لہجہ طمانیت سے بھرپور تھا۔

"تم بتاؤ اپنا ہیرو۔" سمیرا نے مصنوعی خفگی سے دھمکایا۔

"بتاؤں کیوں؟ میرے پاس بھی ہے ہیرو۔" اس کے لہجے میں زعم تھا۔

"اچھا۔" سمیرا کے لیے یہ نئی خبر تھی۔ "یہ کب ہوا۔"

"ہم سے چھپاؤ گی۔" سمیرا نے مان سے کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے رخ پھیرا۔ وہ شاید اب خود سے لکھنے لگی تھی۔ سمیرا نے دیکھنے کی کوشش کی تو اس نے بالکل جھک کر چھپالیا۔ دونوں میں چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔ ہنسی بھی آنے لگی۔ سارے گھر میں گونجنے لگی۔ حمیرا کی تایا ابو کی شکایتی پکاروں پر بڑی امی کچن سے اٹھ کر آگئی تھیں۔ وجہ تو پتا چلے۔ کیا ہوا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ بجاتے ہوئے رک سی گئیں موضوع دلچسپ تھا۔ ہنستی مسکراتی شوخیاں جملے... مگر بات ختم ہونے تک سوچ کے دروازے کھول گیا۔

سنجیدگی' فکر... بیٹی کے حال دل کی کچھ خبر تو تھی۔ مگر بات اتنی آگے پہنچ چکی تھی کہ فقط نام لینے سے لہجے میں چاشنی گھل جائے۔ آواز میں کھنک آجائے۔ یہ نہیں معلوم تھا اور اب جبکہ اپنے کانوں سے سن لیا تو فکر دوبارہ جاگ گئی جیسے پٹاری میں بیٹھا سانپ سر اٹھائے۔ پر سوچ ذہن... اور تھکے قدموں سے واپس پلٹی تھیں۔ دونوں کے ہنسنے کی آواز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

* * *

"آپ بھولی آپا سے بات کریں گے یا میں خود کہہ دوں؟" لڑکیوں کے کمرے سے بڑی امی اٹھ کر سیدھا عبدالعزیز کے سر ہوگئیں۔

"تم بیٹی کی ماں ہو۔ اپنے منہ سے کہتی اچھی لگو گی کیا؟"

"میں اپنے اچھے برے منہ کو دیکھوں۔ یا بیٹی کا مستقبل سوچوں۔ پہلے ہی دیر ہوچکی' ہمارے اپنے مسائل۔ آپ میری بات سن رہے ہیں ناں"

عبدالعزیز اپنے چشمے کی ڈنڈی درست کر رہے تھے۔ ہاتھ روک کر پوری طرح بیوی کی جانب متوجہ ہوگئے۔

"مجھے تو آج تک وہ لمحہ نہیں بھولتا۔ جب پہلی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ملاقات کی پہلی نگاہ میں بھولی کے منہ سے وہ بے ڈھنگا جملہ نکلا۔"

انہیں سب یاد تھا بھولی اپنی چار بیٹیوں اور بیٹے اللہ دتا ریاض کے ہمراہ ان کے گھر آئی تھی۔ وہ گاؤں سے شہر شفٹ ہوگئی تھی۔ عبدالعزیز نے اپنی ہی گلی میں سامنے سے دو گھر چھوڑ کر مکان کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ خود بھی خوش تھیں۔ دور کا ہی سہی ایک رشتہ دار قریب آکر رہنے لگے گا۔ سو دکھ سکھ خود ان کے میکے کے آدھے لوگ جہلم اور باقی ماندہ کشمیر میں رہتے تھے۔ خوشی غمی میں ہی ملنے کا آسرا ہوتا تھا۔ سسرال میں ایک دیور تھا' وہ الگ کہانی... بھولی کا نام سن رکھا تھا۔ ایک آدھ بار کی سرسری ملاقات تھی۔

وہ اپنے حیران آنکھوں والے بچوں کے منہ میں نوالے دے رہی تھی۔ جب سمیرا اسکول سے لوٹی تھی ______ سنہری آنکھوں اور سنہرے بالوں والی بچی... دھوپ سے آئی تھی کشمیری سیب سے گال قندھاری انار بنے ہوئے تھے۔ سب کی نگاہیں اس پر ٹک گئیں۔ بھولی نے تیزی دکھائی اسے اپنی طرف گھسیٹا۔ چٹاچٹ گال چومے "اپنی حیران آنکھیں لیے بیٹھی بیٹیوں کو دیکھا۔ سلونی' بھولی بھالی بچیاں... اور ساتھ بیٹھا اللہ دتا ریاض جو ٹکٹکی باندھے بس اسے دیکھے ہی جاتا تھا۔ سمیرا کچھ شرمائی سی۔

"اتنی سوہنی بچی عبدالعزیز... اسے تو بس اپنے اللہ دتہ کے لیے لوں گی۔ کیوں اللہ دتا کیسی ہے؟"

بھولی نے فیصلہ سنایا تھا اور رائے اپنے بیٹے سے مانگی۔ عبدالعزیز خفیف ہوگئے۔

ہاں وہ گاؤں کی سادہ دل سادہ مزاج عورت تھیں۔ سادگی آمیز بے اختیاری۔ لیکن سمیرا کی امی کو شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ یہ کوئی طریقہ تھا بات کہنے کا۔

"جاؤ سمیرا! کپڑے بدل کر آؤ۔ پھر کھانا کھانے بیٹھنا۔" ان کے چہرے پر تناؤ آگیا۔

"ہاں ہاں جاؤ بچی۔" بھولی نے تائید کی۔ سمیرا کمرے سے نکل گئی۔ وہ پیچھے گئیں۔

"کپڑے بدل لو تو یہیں کچن میں کھانا کھالینا... کمرے میں مت آنا دوبارہ۔"

سمیرا کی آنکھوں میں حیرت پھیلی۔ پر اس نے تابع داری کا مظاہرہ کیا۔ بیٹی کو تو محدود کرنا مگر خود ایک اچھا میزبان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بڑھ چڑھ کر مہمان داری میں پیش پیش رہیں لیکن وہ جو ایک طیش کی لہر ابھری تھی۔ وہ ماتھے پر سلوٹ بن کر ٹھہر گئی۔ پھپھی بھولی کا نام بھولی ہی تھا۔ مگر وہ کوئی سچ مچ کی بھولی تھوڑی تھی۔

"لگتا ہے بھابھی کو میری بات بری لگ گئی۔" وہ عبدالعزیز سے مخاطب ہوئی۔

"ارے نہیں بھولی آپا!"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھولی آپا۔" مجھے واقعی برا لگا۔ اتنے چھوٹے بچوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" ان کے لہجے میں بھی ناراضی عود کر آئی تھی۔

"ہاہاہا۔!" بھولی نے قہقہہ لگایا۔ "یہ شہری باتیں۔ ہوہوہو۔ میری سکینہ' مہینہ کی منگنیاں طے ہیں اور ان کو پتا بھی ہے۔ کیوں سکینہ! بتا اپنی مامی کو "تو کس کی مانگی ہوتی ہے۔"

"اپنی خالہ کے وڈے بیٹے خورشید سے۔" ترنت جواب آیا۔ بچی سلیقے سے نوالے لے رہی تھی۔ چہرے پر پھیلی بے نیازی اور سکون... وہ ششدر رہ گئیں۔

"تو بھی بتادے مہینہ۔!" بھولی نے دوسری کو اشارہ کیا۔ ان کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "رہنے دو بیٹا کھانا کھاؤ۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔" بچی سر جھکا کر کھانے لگی۔

"وہاں گاؤں میں ایسا ماحول ہوگا آپا... مگر ادھر شہر میں... پلیز آپ دوبارہ یہ بات زبان پر مت لائیے گا۔ ایسی باتیں اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہیں۔ آپ بھی کچھ کہیے ناں۔" انہوں نے مدد کے لیے شوہر کو پکارا۔ یہ کس قسم کی احمقانہ گفتگو پہلی باضابطہ ملاقات کے دوسرے ہی گھنٹے میں شروع ہوگئی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے سمیرا کی ماں آپا... یہاں شہر

میں یہ بچوں کے پڑھنے لکھنے کا وقت ہو ہے۔ ایسی باتیں بری سمجھی جاتی ہیں لوگ مذاق بناتے ہیں اور ویسے بھی ابھی تو آپ آئی ہیں۔ بڑا وقت پڑا ہے ایسی باتوں اور کاموں میں۔"

شوہر کے مختصر مگر بامعنی جواب سے ان کی ہمت بڑھی، چہرے پر سکون آگیا۔

"اب آپ شہر آگئی ہیں آپا۔ شہری انداز سے رہنا ہوگا۔ نئے ڈھنگ سے۔"

"اوئے۔" ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ بری طرح چونک بلکہ ذرا سہم کر پیچھے کو سرکیں۔ بھولی نے بڑھک مارتے ہوئے ہاتھ سر سے اوپر کی طرف اٹھادیا تھا پھر ہاتھ نیچے آیا تو شہادت کی انگلی کھڑی تھی اور چہرے کی طرح نفی میں دائیں بائیں ہلتی تھی۔

"بھولی نہیں ہے وہ عورت جس پر شہر کا رنگ چڑھے گا۔ میں اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنے والی کبھی نہیں۔ میں نے جو کرنا ہے وہی کرنا ہے۔ اب تمہارے ساتھ ہوں بھابھی! دیکھ لینا بیس سال بعد بھی جو بھولی ذرا بدلے۔"

اور پھر وقت نے واقعی بتادیا تھا۔ بھولی نہیں بدلی۔ وہ ویسی کی ویسی رہی۔ وہی اس کے اپنے اصول..... اور اپنی من مانیاں۔

ان کے صاف منع کردینے کے باوجود نجانے کیسے یہ بات زبان زدعام ہوگئی۔ کہ یہ جو بھائی عبدالعزیز کی وڈی بہن گاؤں سے ادھر شفٹ ہوئی ہے۔ وہ ہی کل کو سمدھن بھی بنے گی۔ سب کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھر آئی۔

عبدالعزیز کی مکھن ملائی بیٹی..... ؟؟ بھولی کا سوکھا سا سانولا بیٹا..... جو زیادہ کھلتا ملتا نہیں تھا۔ ہر وقت کتابوں کے ڈھیر میں غرق..... اور بھولی جو سوگی سے شوہر کے مرنے کے بعد پیدا ہوجانے والے شگاف بھرنے کی کوشش میں دن رات ایک کرتی تھی۔ نوعمر بچیوں کو بھی ساتھ لگالیا تھا۔

"بھائی عبدالعزیز کیا پاگل ہوگیا ہے۔ جو اکلوتی بیٹی کو ایسے گھر میں دے گا۔" گلی کی عورتیں واقعی حیرت زدہ تھیں اپنی حیرت ان کے آگے آکر بیان کردی۔ اور وہ ہکابکا رہ گئیں۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جو بات انہوں نے خود سے بھی نہیں دہرائی تھی کہ اس قدر بھونڈی بات کا سوچنا بھی بے وقوفی ہے۔ وہ ایسے سوال بنا کر ان کے منہ پر ماری جارہی تھی۔

"بھولی کا دماغ خراب ہے۔" وہ پھٹ پڑیں۔ یہ اتنی لمبی سالوں پرانی منگنیاں انہیں سخت ناپسند تھیں۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بھولی اس وقت تو خاموش ہوگئی تھی۔ مگر بعد میں اپنی خواہش ہر آئے گئے کے آگے بیان ضرور کردی تھی۔

یہاں تک کہ وہ دن آگیا جب اللہ دتا ریاض نے میٹرک میں پورے صوبے میں پہلا نمبر لے کر اپنی ماں کو بھی حیران کردیا اور سمیرا کی ماں کو بھی۔

"وہ واقعی اتنا جینیس تھا؟" بڑی امی ہکابکا تھیں۔

وزیر اعلی نے اسے گولڈ میڈل دیا تھا اور آگے پڑھائی کا سارا خرچا حکومت اٹھائے گی چاہے تو ملک سے باہر جاکر پڑھ لے۔

"ہائے!" پھپھی بھولی گولڈ میڈل کو ہاتھ میں لے کر تولتی پائی گئی (چلو جی اسے تڑوا کر سکینہ کے لیے جھمکے بنوالے گی ایک لڑکی کے کان تو ڈھکے گئے واہ جی واہ بعد میں وقت نے اس چیز کو ثابت بھی کیا۔ اے ڈی ریاض کے پاس صرف یادگاری تصاویر نہیں یا وہ فیتہ جس میں میڈل پرویا گیا تھا۔ سونا پھپھی نے ٹائم سے ہی سنبھال لیا تھا وہی چار لڑکیوں کے کان، ناک، گلا، بازو..... اللہ دتا میڈل لاتا رہا۔ پھپھی بھولی کے ارادے بڑھتے گئے)

عبدالعزیز مٹھائی کے ڈبے، پھولوں کے ہار اور تحائف کے ساتھ مبارکباد کے لیے پہنچے سمیرا بھی ساتھ تھی صفیہ اور حمیرا بھی۔

پھپھی نے موقع شناسی کا مظاہرہ کیا۔ دو سال پرانا سوال ایک بار پھر دہرادیا، بڑی امی کے حساب سے اب بھی ایسی باتوں کا وقت نہیں تھا مگر پھپھی اپنی ہی سنارہی تھیں۔

"دیکھ بھائی عزیز! تم دونوں صرف دو بھائی۔ ایک اللہ کو پیارا ہوگیا پیچھے چھوڑی بیٹی..... ادھر تیرے

سوریے (سسرال) میں بھی تیری بیوی سب سے بڑی بیٹی تھی تو اس کے بھانجے بھتیجے، سمیرا سے کتنے کتنے سال چھوٹے ہیں صاف نظر آتا ہے، جب تو نے بیٹی بیاہنے کھڑا ہوتا ہے تو باہر والوں کا ہی منہ دیکھنا ہے یا پھر خاندان برداری کو پھولے گا (چھانٹا) تو یہ بہتر نہیں ہے میرے اللہ دتا پر ہاتھ رکھ دے۔ اب بیٹا میرا بھی پڑھا لکھا ہے (میٹرک فرسٹ ڈویژن گولڈ میڈل) تیری لڑکی بھی پڑھتی ہے تو کیوں نہ ہم دونوں کرلیں ان کا رشتہ آپس میں... منہ زبانی ہی... شادی کے ٹیم (ٹائم) ڈھول واجے کرلیں گے۔ ویسے بھی میرا حق سب سے زیادہ ہے۔ تم دونوں بھائیوں کے کلیے کلیے (اکلوتے) تائے کی کلی کلی نشانی میں ہی تو ہوں۔ ایک ہی گھر کے جم پل (پیدائش، پرورش) ہیں ہم... تم دونوں پیدا ہوئے تو میں گھر گھر جا کر بتاتی تھی۔ میرے بھائی پیدا ہوئے ہیں اپنے ہاتھوں تم دونوں کو ہی اللہ بخشے عبدالمجید کو... نہلاتی تھی۔ دھلاتی تھی، تیل سر لگا کر تیار کرکے سارے دن کچھڑ لیے (کمر پر ٹکائے) پھرتی تھی۔ منہ سر چوم کے رکھتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر ڈالے میں نے تمہارے منہ میں... تو پھر مجھ سے زیادہ حق کس کا ہے۔ بتاؤ۔"

وہ حق دق رہ گئیں۔ احسان جتاتے سنا تھا، مگر یہ انداز اور بدل میں کیا مانگ رہی تھیں۔ ان کی نظریں اللہ دتا ریاض پر ٹک گئیں۔ سانولا، پرکشش، دبلا پتلا لڑکا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی گہری چمک تھی، مگر ایک لو جو بہت مدھم تھی وہ سمیرا پر نظر پڑنے سے جھلملاتی تھی۔

"اوہ..." انہوں نے لمبا سانس لیا، ماں اور بیٹا ہم خیال تھے ان کی نگاہ سمیرا پر اٹھ گئی۔ وہ اسی محفل کا حصہ تھی، مگر ذرا پرے ہو کر اس گولڈ میڈل کو دیکھ رہی تھی جو اللہ دتا ریاض لایا تھا۔

وہ اللہ دتا کی بہنوں اور حمیرا کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ بچوں کا دھیان نہیں تھا ہاں، مگر وہ اللہ دتا کے آنکھوں کی جھلملاتی روشنی... اور بھولی کا لجاجت آمیز انداز... وہ باقاعدہ جھولی پھیلا چکی تھی۔ صفیہ کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ ان کے اعصاب تن گئے۔ عبدالعزیز نے بھولی کی جھولی کو سمیٹ دیا اور بندھے ہاتھوں کو نرمی و احترام سے کھولتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔

"ابھی ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ بھولی آپا... بچوں سے بھی پوچھنا پڑتا ہے اور پھر۔"

"تو پوچھنے کا کیا مطلب میرا اللہ دتا راضی ہے کیوں اللہ دتا؟" بھولی نے اللہ دتا کا ہاتھ جھپٹ کر جھنجھوڑ دیا۔

"جی... جی اماں...!" وہ گڑبڑایا اور اثبات میں سر ہلا دیا اب پتا نہیں ماں کی پکار کا جواب دیا تھا یا ہاں کہی تھی۔ بڑی امی نے سر ہاتھ پر گرا لیا۔ بھولی نے ذرا توجہ نہ دی (وہ بھائی سے مانگ رہی تھی، بھابھی کا کیا ہے؟ بڑی آئی شہزن)

ادھر عبدالعزیز انکاری نہیں تھے ان کے انداز کی لچک سے پتا چل رہا تھا، مگر وہ مان کے بھی نہیں دیتے تھے۔

"اچھا چل ٹھیک ہے۔" بھولی نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "تو باقاعدہ اعلان نہ کر، مگر یہ کہہ دے کہ تیری بیٹی پر پہلا حق میرا ہے۔"

"میں کیسے؟ کیا مطلب؟" عبدالعزیز نے بیوی اور بھاوج کو دیکھا۔

"جب بھی تو بیٹی بیاہنے لگے گا، پہلے مجھ سے پوچھے گا۔"

"اوہ...!" بڑی امی کا چہرہ پرسکون ہوگیا۔ بھولی سے اتنی عقل مندی کی امید نہیں تھی۔ تھوڑا سا متوازن رویہ... درمیانی راستہ شکر... اور ان کے چہرے پر پھیلا سکون شوہر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" سب ہی چونک اٹھے۔

"جب وقت آئے گا تب کے حالات، بچوں کی پسند دونوں کا ایک دوسرے کے لیے مناسب ہونا، سب چیزیں دیکھتے ہوئے بات کی جائے گی۔"

"ہاں جی اس میں شرط کی کیا بات ہے۔" بھولی نے

لمحوں میں مان لیا۔

سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا' مگر اس کا کیا کرتے کہ بھولی نے اگلی صبح ہی اس بات کو سارے خاندان محلّہ جان پہچان والوں سب میں پھیلا دیا۔ شرط بھی بتادی اور یہ بھی کہہ دیا میرا بیٹا اتنا قابل ہے وہ مامے کی ساری شرطوں پر پورا اتر جائے گا اور یہ کہ "میرے اللہ دتا کو ناپسند کر کون سکتا ہے۔ شہزادہ ہے میرا پتر۔۔۔ اور قابل اتنا کہ حکومت پیسے خود گھر بھیج رہی ہے۔"

وہ شوہر کو دیکھ کر رہ گئیں۔ دیگ کا ایک دانہ چکھتے ہیں دو ڈھائی سالوں میں انہیں اللہ دتا ویسے بھی اچھا لگا تھا۔ سلجھا ہوا' تمیزدار لڑکا جسے صرف اپنی پڑھائی اور ماں کی تابعداری سے مطلب تھا۔ وہ یا تو پڑھتا لکھتا پایا جاتا یا پھر ماں بہنوں کے بنائے کڑھائی بنائی کے نمونوں کو سائیکل پر مطلوبہ جگہ تک پہنچا کر آتا (پھپھی بھولی کو بوتیک سے آرڈر ملنے لگے تھے۔ شہر آکر ان کے ہنر کو چار چاند لگ گئے تھے۔ گاؤں کے ماسٹر جی نے بالکل درست مشورہ دیا تھا)

مگر ایسے کیسے چودہ پندرہ برس کی لڑکی جو کھیل تماشوں سے نکل کر اب پڑھائی لکھائی میں داخل ہو رہی تھی۔ اسے ایک نئے رشتے سے متعارف کروا دیا جاتا جبکہ ان کے سمیرا کے حوالے سے بہت سے خواب تھے' اعلا تعلیم' خود مختار ہو بلکہ ملازمت بھی کرے' اپنے پیروں پر کھڑی ہو اور ایسے میں اگر دماغ میں پہلے ہی خناس بھر جائے تو۔۔۔

انہوں نے شعوری کوشش سے اسے ہمیشہ یہ باور کروایا کہ یہ ایک بات ہے اسے سر پر سوار کرنے کی قطعاً" ضرورت نہیں' دل میں لانے کا تو سوال ہی کیا؟ اور سمیرا کا ٹارگٹ۔۔۔ صرف اپنی تعلیم ہونا چاہیے اور ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے اور۔۔۔ اور یہ۔۔۔ اور۔۔۔ سمیرا ماں کے خیالات و نظریات سے واقف تھی۔

خود اس کے اپنے دل میں بھی بہت سارا پڑھنے اور قابلیت حاصل کرنے کا شوق تھا۔ (وہ پڑھائی میں اچھی تھی اور کچھ خاص پڑھنا چاہتی تھی' نام کمانا چاہتی تھی) مگر پڑھائی کے شائق دل کے اندر سانولے چہرے اور سیاہ گہری آنکھوں کی چمک نے ایک درز بنادی' ذرا سا روزن۔۔۔ روزن شگاف بن جاتے ہیں۔

اور بات اگر دل کی ہو تو۔۔۔ درزیں۔۔۔ دروازے ہو جاتی ہیں اور دروازے شاہراہ بن جاتے ہیں جہاں محبت شان سے چہل قدمی کرتی ہے۔ محبت کی شاہراہ کے دونوں اطراف گھنے درخت اگ آتے ہیں اور جن پر انوکھے رنگوں کے پھول کھلتے ہیں' انجانی مسحور کن خوشبوئیں اٹھتی ہیں' قدموں کے نیچے پھول بچھ جانے کا گمان ہوتا ہے' تاحد نگاہ رنگ۔۔۔ چہچہاہٹیں' گنگناہٹیں۔۔۔

اور یہی سب سمیرا کے ساتھ بھی ہوا۔۔۔ کب ہوا۔ پتا ہی نہ چلا' لیکن ماں کے خیالات' تربیت' ماحول' مزاج کا حصہ بن گئے تھے۔ اظہار بھی نہیں ہوا نہ کوئی چوک۔۔۔ مگر اک نگاہ کی چوری۔۔۔ ایک مسکراہٹ دبی دبی سی۔۔۔ ایک خوشی جو دل میں یوں پھوٹتی تھی جیسے برسات میں کھمبی۔۔۔ خود رو بوٹی۔۔۔ جگنو کا لپکا۔۔۔ پل بھر کو۔

اتنا سب ہوگیا۔ سمیرا کو پتا ہی نہ چلا۔ دل کی دھڑکن۔ اے ڈی ریاض کے نام کی محتاج ہوگئی۔ ہائے۔۔۔ خدا دشمن کو بھی اس تکلیف سے دور رکھے۔ وہ سوچتی تھی' پہروں' گھنٹوں۔۔۔ راتوں کو جب نیند دور کھڑے ہو کر للچاتی تھی۔

اور بڑی امی۔۔۔ وہ ماں تھیں' بیٹی کی آنکھ کا رنگ نہ پہچانتیں تو کس بات کی ماں۔۔۔

اور کتنا وقت گزر گیا تھا ان سب باتوں کو۔۔۔ اب تو وہ وقت بھی گزر گیا تھا جو عبدالعزیز نے طے کیا تھا۔ پسندیدگی' مناسبت۔۔۔ حالات' وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے یوں مناسب تھے جیسے سرخ کے ساتھ سنہرا رنگ' پسندیدگی ایسی تھی جیسے چاند کے گرد چکوری۔۔۔ برسات کے لیے مورنی کی دیوانگی جیسی۔۔۔ ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔ حالات۔۔۔ حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ لیکن حالات کا رونا ان کی طرف سے تو تھا پر پھپھی بھولی کی طرف تو نہیں تھا۔

ان کا بیٹا ان کے گمان کی حد سے زیادہ قابل و

کامیاب نکلا تھا۔ سارے ولدر دور ہوئے۔ وہ بیٹیوں کو بالخصوص اے ڈی سے چھوٹی والی سکینہ مسبہنہ کو پہلے بیاہنا چاہتی تھی۔ آج انہیں اپنے گھروں کا ہوئے ہوئے بھی سالوں کی گنتی ہونے لگی تھی۔

بڑی امی کو بھی چار کنواری نندوں کے سر پر بیٹی نہیں بھیجنی تھی۔ اچھا ہوا وہ صحیح وقت پر عزت سے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔

لیکن اب تو بھولی نے نمبر تین والی ذکیہ کی دن تاریخ بھی رکھ دی تھی اور عطیہ کی بات بھی طے ہو گئی تھی تو... اللہ دتا ریاض کب تک... اب بھولی کے لیے کیا امر مانع تھا۔

وہ خود تو کیا... عزیز رشتے دار بھی ان سے اور بھولی سے پوچھنے لگے تھے پر بھولی چپ تھی' انہوں نے بہت دیر سے سہی' مگر نوٹ کرنا شروع کر دیا تھا بھولی کے انداز کی محبت تو پہلے جیسی ہی تھی' مگر... وہ رشتے کے حوالے سے بات نہیں کرتی تھی شاید... عبدالعزیز کی تنبیہہ یاد ہو۔

"وقت آنے پر..."

مگر... پہلے تو وہ وقتاً" فوقتاً" کسی نہ کسی انداز سے کوئی جملہ ایسا کہہ دیتی تھی جو "رشتے" کو نمایاں کرتا تھا۔ لیکن...

اور یہ سب اس وقت بھی شوہر سے کہنے کے بعد وہ چاہتی تھیں وہ خود بھولی سے بات کریں کہ کب... کوئی اشارہ کوئی پیغام۔

"وہ کہہ رہی تھیں' گھر بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

"تو یہ اچھی بات ہے۔" ان کا دل مضبوط ہوا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے لہجے کی بے ساختگی اور سادگی میں سچائی نہیں لگی۔"

"تمہیں ہمیشہ سے ان کے انداز پر اعتراض رہے ہیں۔"

"وہ اپنی جگہ درست ہے... خیر... گھر والی بات بھی درست ہے' مگر یہ گھر کب تک بنے گا؟" انہوں نے خود کو انتظار کے لیے تیار کیا۔

"بن جائے گا' گھر بنانا کوئی آسان کام ہے۔" عبدالعزیز نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔

* * *

کتنی بڑی خوشی کا دن تھا ناہید کے لیے... ان کا بیٹا آج کالج کے لیے نکل رہا تھا اتنی خوشی تو اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن اسے پہلی بار نرسری کلاس کے لیے تیار کیا تھا جتنی کہ آج... ایکسیڈنٹ کے بعد زندگی کی امید نہیں تھی... زندگی کے بعد بحالی کی اور بحالی کے بعد دوبارہ فعال ہو جانا تو اس وقت دیوانے کا خواب لگتا تھا کیا وہ دوبارہ زندگی کو جی سکے گا۔ ویسے جیسے کہ زندگی کو جینے کا حق ہے یا طریقہ ہے اور آج اس خواب کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔

ہاں وہ ہم اپنے عمروں سے ہم جماعتوں سے پیچھے رہ گیا تھا' لیکن کوئی بات نہیں... زندگی شرط ہے۔ نمبروں کا کیا ہے' آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں۔

وہ اس کے لیے ڈھیر سارے ناشتے کے لوازمات سجائے بیٹھی تھیں اور وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا شہزادہ؟ لیکن نہیں شہزادے عام شکل و صورت کے بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کا بیٹا یوسف ثانی لگ رہا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے یہ ان کے دل کی گواہی تھی۔

بس ایک بار جسم پر بوٹی چڑھ جائے۔ وہ اب بھی بہت دبلا سوکھا تھا' لیکن پیلا پن ختم ہو گیا تھا چار سال کی بیماری... لاچاری... میٹرک کا رزلٹ نکلا تھا' وہ خوشی میں دوستوں کے ساتھ بائیک لے کر نکل گیا تھا اور کبھی بھی وہ چھوڑا نہیں تھا' مگر نجانے کیسے موٹر سائیکل کی اسپیڈ زیادہ ہو گئی اور اور... اس کے بعد بائیک ایسے پچکی ملی تھی جیسے کاغذ کی بنی تھی اور کسی نے کاغذ کو ہاتھوں سے نچوڑ دیا ہو اور سوار... اوہ خدا..." ناہید نے جھرجھری لی۔

مگر آج ان کا بیٹا دوبارہ سے عملی زندگی میں قدم رکھ رہا تھا۔ قدرے سست رفتار سہی' مگر جیت بھی تو کبھی کچھوے کو ملی تھی تو طے ہوا برق رفتاری اتنی بھی بڑی خوبی نہیں۔

"میں جہاز تو نہیں اڑا سکا امی!" وہ دروازے تک

اسے خدا حافظ کہنے آئی تھیں۔ آج پہلے دن ابو نے پک اینڈ ڈراپ کی اسپیشل سروس فراہم کی تھی۔

"لیکن جہازوں کو زمین پر سے کنٹرول کرنے والا افسر ضرور بن کر دکھاؤں گا۔"

"سچ...!" ناہید کی آنکھیں چمکیں۔

"مچ...!" اس نے اپنے ہونٹ ماں کی پیشانی سے چپکا دیے۔

* * *

"کتنی دنوں بعد سورج نے شکل دکھائی ہے۔ ورنہ زندگی ایک رضائی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔" اتنی گہری بات حمیرا امجید کے علاوہ اور کون کہہ سکتا تھا۔

شدید دھند نے ساری زمین کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ سردی کے کیا کہنے... سارا شہر سی سی 'ہی ہی' ہو ہو ہو گیا تھا پر اب جو یہ سورج نکلا' نرم گرم سی دھوپ... اتنے دنوں سے چبھتی ہوائیں بھی اب شرارت کے موڈ میں تھیں' وہ دونوں موسم کی اس نئی ترنگ سے لطف اٹھانے کے لیے چھت پر چلی آئی تھیں' ساتھ میں کنوؤں کی ٹوکری بھی لائی تھیں۔ پیچھے پیچھے دونوں کی امیاں بھی آگئیں اور وہ کوئی اکیلی نہیں تھیں۔ تقریباً" ہر گھر کی چھت پر عورتیں موجود تھیں۔ دھوپ سینکی جا رہی تھی' سبزی بن رہی تھی۔ ہر چھت کی منڈیر پر لحاف ڈال دیے گئے تھے بستر بھی دھوپ مانگنے لگے۔

"اوخدا...!" حمیرا نے دونوں ہاتھ آپس میں بھینچ کر جیسے سورج کی بلائیں لیں۔ عین اس کے سامنے یہ بڑا روشنی کا منبع... پیروں سے موزے اتار کر وہ ننگے پیر سورج کی سمت منڈیر تک آگئی۔

"کہاں تھے تم اتنے دنوں سے...؟ ہر روز اس امید پر چھت پر آتی تھی کہ تم ملو گے' مگر تم نہیں ملے۔ دھند سے ڈر کر ایسا بھاگے۔ مئی جون میں تو بڑی مردانگی جھاڑتے ہو۔ دسمبر جنوری میں کیا بزدل ہو جاتے ہو میرے آفتاب...."

وہ سورج سے ہم کلام تھی۔ دونوں بانہیں ٹائی ٹینک کے ہیروئن انداز میں وا کرلی تھیں۔ چہرہ سورج کی طرف کیے وہ روٹھی محبوبہ کی طرح شکوہ کناں تھی۔

صفیہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ اگر کوئی سن لے تو کیا کہے صفیہ کی بیٹی کا کس آفتاب سے چکر ہے جسے وہ ایسے ایسے طریقے سے پکارتی ہے کہ سر شرم سے جھک جائے۔

بڑی امی کھلے منہ سے سن رہی تھیں وہ ایک گدا لیے نیچے بیٹھی تھیں ڈورے ڈالنے تھے۔ سمیرا نے پلیٹ بھر کے کنو چھیل لیے تھے۔ وہ حمیرا کے پاس چلی گئی پر حمیرا نے دھیان نہ دیا۔ وہ ہم کلام ہونے کے اس مرحلے میں تھی جہاں سے ہم کو خود ہماری خبر نہیں آتی۔

"اس سے یہ بھی کہو اس کے ہجر نے ہمیں سوکھی لکڑی کی طرح چٹخا دیا تھا۔ سارا روپ رتن کھو گیا؟" سمیرا نے پھانک منہ میں رکھی اور اپنے ہاتھ کی جلد دکھائی لاکھ احتیاط کے باوجود سخت سردی نے ساری نمی چھین لی تھی۔

"ہاں۔" حمیرا نے سن لیا' مگر گردن نہ موڑی۔

"سارے سر میں خشکی بھی ہوگئی۔"

"بالکل ٹھیک...." سمیرا نے سراہا۔

"میں سورج مکھی ہوگئی تھی میرے ندیم.... نہ تم نکلے نہ میں.... نکلی میرا مطلب ہے کھلی۔"

"ابھی تو تم آفتاب کہہ رہی تھیں۔" سمیرا نے ٹوکا۔

"ہاں ہاں میرے آفتاب...."

"اسے یاد کروا دو بائیں والے پڑوسی کا نام ندیم ہے۔ ابھی اس کی بیوی دندناتی ہوئی پہنچ جائے گی اور دائیں والے کے دادا کا نام چوہدری آفتاب ہے۔ کہیں وہ خود ہی گرتا پڑتا نہ آجائے کہ دھیوں میتوں کنے سوبا۔" (بیٹیوں مجھے کس نے بلایا)۔

سمیرا کے منہ سے کینو کے بیج پھو کر کے نکلے اس نے بمشکل خود کو اچھو لگنے سے بچایا تھا' اپنی امی سے ایسی بذلہ سنجی کی امید نہیں تھی۔

جبکہ صفیہ کے صبر کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ذرا جھک کر اپنے پیر سے جوتی اتاری۔ ٹھاہ... دوسری ٹھاہ... اور

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

ساتھ ہی حمیرا کی ہائے۔۔۔ اور پھر ہائے ہائے۔ ماں نے مغرب کی طرف سے جوتا برسایا تھا اور نشانہ کیا خوب تھا سیدھا کمر پر۔۔۔

"کوئی اپنی بیٹی کو ایسے مارتا ہے' لے کر میری ریڑھ کی ہڈی ہلا دی ہائے میری کمر۔۔۔"

"کمر نہیں کمرہ۔۔۔ بلکہ پورا ایک کلہ (ایکڑ)۔" صفیہ کی جان جل کر خاک ہو چکی تھی۔ حمیرا کی پشت اس کے سامنے تھی۔ سمیرا اس کے پیچھے ذرا سا جھکی قمیص میں ہاتھ ڈال کر شانے والی جگہ کو سہلا رہی تھی۔ اس کی لمبی چوٹی آگے آکر گر گئی۔ اس کی نازک کمریا۔۔۔ ایک بالشت سے کیا زیادہ ہوگی اور وہ۔

"حمیرا۔۔۔" صفیہ نے دانت پیسے۔ حمیرا قطعی موٹی نہیں تھی' مگر سمیرا کے آگے لگتی تھی اور سمیرا اللہ کے بنائے ان چند لوگوں میں سے تھی جس کے آگے باقی سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

"امی کا بس چلے تو مجھے چھری لے کر چھیلنا شروع کر دیں۔ یہاں سے کم یہاں سے زیادہ۔" حمیرا نے لمبی چھوڑی۔

"تو اپنے آپ کو تم نے دیکھا ہے۔ خمیری روٹی کی طرح پھولتی جا رہی ہو۔"

"آپ مجھے برا بھی کہہ سکتی تھیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" صفیہ کی ناراضی کے پیش نظر سمیرا نے گھورا حالانکہ متبسم چہرہ گدگدی کی ترجمانی کر رہا تھا۔

"تھوڑی ماڈرن لک آجاتی یار۔۔۔!" اس بار تو بڑی امی کی ہنسی بھی نکل گئی پھر صفیہ کی سنجیدگی کو دیکھ کر فوراً گدے پر جھک گئیں۔

"اپنا جسم سنبھال لو حمیرا۔۔۔" صفیہ کی دھمکی فیصلہ کن تھی۔

"رہنے دو صفیہ۔۔۔! اتنا مت ٹوکو۔۔۔ اس عمر میں بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں دو چار سال گزریں گے تو خود بخود متناسب ہو جائے گی۔ کالج کی پڑھائی کی محنت سب کھایا پیا جلا دیتی ہے۔"

بڑی امی کا تجزیہ و تبصرہ بالکل درست تھا' صفیہ کہاں کسی کی سنتی تھیں۔

"بس ہو گیا فیصلہ۔۔۔ تم کل صبح سے واک پر جاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے' چلی جاؤں گی۔" حمیرا نے سر ہلایا۔

"سامنے والے پارک میں نہیں۔" صفیہ کی نگاہیں اپنی حد نظر پر جمی تھیں۔

"تو پھر کہاں؟" حمیرا چونکی۔

"وہ۔۔۔ وہ جو سامنے درخت نظر آرہا ہے۔"

"سامنے؟" حمیرا نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے تو کوئی درخت نہیں تھا۔ سامنے آسمان پر سورج تھا یا پھر کھیت۔۔۔ دراصل یہ ان کے گھر کا پچھلا حصہ تھا چوڑی گلی اور پھر باؤنڈری وال جو کھیت اور رہائشی علاقے کو الگ کرتی تھی۔ یہاں تو کوئی درخت نہیں تھا۔ کپاس اتاری جا چکی تھی۔ کھیت میں جگہ جگہ کپاس کے سوکھے پودوں کو کاٹ کر جلانے کے لیے گٹھڑ کی صورت جمع کیا گیا تھا۔ کہیں کہیں جانوروں کے لیے پٹھے (گائے بھینسوں کی خوراک) لگے تھے یا پھر سرسوں کے پودے۔۔۔ درخت کہاں تھا۔۔۔ حمیرا نے ماں کی انگلی دیکھی۔ پھر اشارے والی جگہ پر۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔ وہ او۔۔۔ او۔۔۔ او درخت ہائے اس کے دل پر ہاتھ پڑا' بے یقینی سے ماں کی صورت دیکھی' سمیرا ابھی ہنس رہی تھی۔ اسے درخت نظر آگیا تھا۔

"جو درخت مجھے نظر اتنی مشکل سے آرہا ہے میں اس تک جاؤں گی کیسے۔" اس نے دہائی دی۔

"ہائے۔۔۔" اسے غش آگیا۔ سمیرا کے کندھے پر جا گری۔ اب ہائے کرنے کی باری سمیرا کی تھی۔

"اتنی دور کیوں بھیج رہی ہیں' پارک ٹھیک ہے نا۔" سمیرا نے صفیہ کو دیکھا۔

"وہاں جا کر یہ بنچ پر بیٹھ کر آجاتی ہے۔ یہاں سے میں اسے مسلسل دیکھوں گی۔"

"اوہ!" حمیرا کے ڈیلے باہر کو ابلے۔ کیا امریکی تھنک ٹینک سوچتے ہوں گے جیسی دور کی کوڑی صفیہ لائی تھیں۔

"اتنی ٹینشن مت لیں صفیہ چچی۔۔۔ اسے میرے

ساتھ صبح واک پر بھیج دیں میں اسے کہیں بیٹھنے نہیں دوں گا۔" اوپر آتے معید نے تھوڑی بہت گفتگو سن لی تھی، اپنی خدمات پیش کر دیں۔

حمیرا کے چہرے کا رنگ واپس لوٹا۔ فوراً" جا کر اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"یہ ٹھیک ہے۔ میں معید کے ساتھ چلی جایا کروں گی۔"

بڑی امی اور سمیرا نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ کیسے فوری مان رہی تھی وہ۔

"نہیں..." صفیہ کی آواز ابھری۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"میں روز جاتا ہوں... یہ بھی چلی چلے۔" **معید** نے وضاحت کی۔

"میں نے کہا نا یہ نہیں جائے گی۔" حمیرا نے آنکھیں چندی کر کے ماں کو دیکھا۔ ایسے کیوں بولی تھیں وہ... حرج ہی کیا تھا جب کہ بڑی امی اور سمیرا کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔ معید کے چہرے کے رنگ کو اڑتا دیکھ کر۔

* * *

وہ شرم سار سا ماں کے سامنے بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ روز پہلے تک ہی تو ان کی آنکھوں میں کچھ خواب بو کر آیا تھا۔ اب کس منہ سے کہتا زمین بنجر نکلی یا تھور زدہ... وہ پائلٹ نہیں بن سکتا تھا، لیکن کچھ اور ایسا تو بن ہی جاتا کہ ماں کو اپنا خواب پورا ہوتا نظر آجاتا۔

لیکن کیا کیا جائے کہ... عزم جوان رہا، جسم جواب دے گیا۔ چار سال کے علاج، ورزشیں، کھانے پینے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگا تھا، مگر یہ سر کی چوٹ تھی جس نے کہیں اندر جا کر جگہ بنالی تھی جیسے کھوہ میں ناگ... اسے سوال سمجھنے مشکل لگ رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے دائرے سے ناچتے" لکھنے لگتا تو نظر لہرا جاتی۔ سر چکرانے لگتا۔ شدید درد ہونے لگتا، چار سال میں پہلی بار وہ خود اکیلا ڈاکٹر کے پاس گیا۔

اور ڈاکٹر نے اپنا خدشہ جو اسے پہلے دن سے تھا، اس کے بہت زور دینے پر بتا دیا۔ وہ سخت دماغی محنت والا کام کبھی نہیں کر سکے گا، اس کا دماغ اتنی مشقت برداشت نہیں کر سکتا اس لیے بہتر ہے کہ وہ دماغی کاموں سے دور رہے۔

"تو کیا دل کی سنوں ڈاکٹر صاحب؟" وہ مسکرایا۔

"اور دل یہ کہتا ہے ماں باپ کے سارے خواب پورے کرو، میں تو دوراہے پر آگیا جناب...!"

وہ دکھی تھا پر شوخ ہو رہا تھا۔ ایسا ظالم بھی کوئی ہوتا ہے، اذیت پسندی کہتے ہیں اسے عرف عام میں...

اور وہ ماں باپ کو اندھیرے میں رکھ کر ان پر ظلم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا، ابو مسکراتے رہے۔ گیلی آنکھوں والی مسکراہٹ... بے بس مسکراہٹ۔

"تو یہ پڑھے گا نہیں تو کیا کرے گا؟" ناہید نے اپنے آنسو اندر اتار لیے تھے۔ ایک ماتم سب سے چھپ کر... ایک نوحہ بس زیر لب، ایک گلہ صرف اللہ سے... اور آخری حد شکر کہ بیٹا جیتا جاگتا سامنے موجود تھا۔

"میں سوچ چکا ہوں امی! یہ بھی..." اس کی آواز صاف اور لہجہ پر عزم۔ دونوں میاں بیوی چونکے۔

"میں ایک بک اسٹور بناؤں گا۔ شہر کا سب سے بڑا بک اسٹور... جہاں دنیا کی ہر کتاب میسر ہو گی... جہاں... جہاں... جہاں..."

اس نے خوابوں کی سلائیوں پر خواہش کے نئے ڈورے ڈالے... منفرد بنائی، اچھوتا ڈیزائن... خوش رنگ... جیسے قوس قزح... ماں باپ کی دنیا پھر جگمگانے لگی۔

* * *

"سرہا کے لحاف سا... اس کا ہم قافیہ بتاؤ۔" حمیرا کاغذ قلم لیے بیٹھی تھی۔

"کیوں اس کا کیا کرنا ہے؟" سمیرا اپنے پیر کے ناخن سجا رہی تھی۔

"کچھ نہیں اس سے تحریر میں خوب صورتی آتی ہے۔" حمیرا نے پین کا سرا دانتوں میں دبایا۔

"تم نے دیکھا ہے نا سمیرا احمید کتنی خوب صورت قافیہ آرائی کرتی ہے۔"

"سمیرا احمید...؟" سمیرا عزیز چونکی۔ "سمیرا احمید کا تم سے کیا مقابلہ..."

"کیوں نہیں بھئی۔" حمیرا نے پین رکھ کر جارحانہ انداز بنایا۔ "میرا اس کا مقابلہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ جب کہ اس کے اور میرے نام کا قافیہ بھی ایک ہے۔ وہ سمیرا احمید... میں حمیرا امجید..."

"سرما کے لحاف سا' سرما کے لحاف سا' سرما کے۔ تکیے کے غلاف سا۔" سمیرا کے منہ سے یک دم نکلا۔

"ان دو باتوں کا آپس میں کیا تعلق...؟" حمیرا نے ہیرو کی صفات لکھنی تھیں اب ہیرو لحاف تو ہو سکتا ہے مگر کیا غلاف بھی (وہ بھی تکیے کا) او نہوں۔"

"کیوں نہیں ہے تعلق...؟" سمیرا نے اپنا کام چھوڑ کر اسے اپنی پوری توجہ سے نوازا۔ "سرما میں لحاف ضروری ہے تو تکیے کا غلاف بھی ضروری ہے۔ بلکہ امی کہتی ہیں عورت کا سلیقہ ان ہی چیزوں سے پتا چلتا ہے۔"

"سمیرا کی بچی میں ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ ہیرو کو تکیے سے ملا دوں' تمہارا دماغ ہے کہاں؟" حمیرا کو اپنا ہیرو یاد آنے لگا۔ ہیرو تکیہ۔

"اوبی بی...!" سمیرا نے ہاتھ نچایا "تم تکیے کو اتنا ہلکا بھی نہ لو تکیہ بھی ادب کا حصہ ہے۔"

" جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"

"تو اس ذرا سی بات پر تکیہ ادب کا حصہ ہو جائے گا؟" اس کا دل انکاری تھا۔ یا شاید تکیے کی اتنی عزت افزائی پسند نہیں آئی۔ اس کے ہونق کھلے منہ سے پرے سمیرا اپنی ہی کہہ رہی تھی۔

"تکیوں پر شعر کڑھائی کیے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شعرا نے اپنے تکیوں کا ذکر کیا ہے۔"

حمیرا نے طنزیہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

"کون سا شعر...؟" حمیرا کو کچھ یاد نہیں تھا۔

"وہی..."

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

"اس میں تکیہ کہاں ہے؟" حمیرا کے منہ سے نکلا۔

"میر کے سر کے نیچے۔" سمیرا نے ترنت کہا۔

"ہیں واقعی؟" اس کی آنکھیں آخری حد تک کھل گئیں۔ واقعی سمیرا کی معلومات حیران کن تھیں۔ سمیرا نے اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا اور بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"ویسے بائی داوے اگر تم کو تکیے پر شعر کاڑھنے کے لیے دیا جاتا تو تم کیا لکھتیں۔"

حمیرا کو سوال بہت پسند آیا تھا۔

"اوں..." وہ ٹھوڑی کے نیچے مٹھی ٹکا کر سوچنے لگی۔

"آں ہاں..." اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔

دھیرے دھیرے آ بادل دھیرے دھیرے
میرا بلبل سو رہا ہے شور نہ مچا

"اس میں تکیہ کہاں ہے۔" سمیرا چلا اٹھی۔

"اس پر بلبل نے سر رکھا ہوا ہے نا۔ یہ گہرائی کی باتیں ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔" اس نے سمیرا کو کہا اور بے نیازی سے کاغذ پر کچھ لکھا۔

سارے صوبے کے انٹر کے لڑکے لڑکیاں امتحان دینے کے بعد فارغ تھے۔ پاگل صرف یہی ایک ہوئی تھی جس کی بوریت کا علاج نہ تھا۔

حمیرا نے پھولے منہ کے ساتھ کاغذ قلم پھر اٹھا لیا اور رخ بھی پھیر لیا۔ وہ خود ہی قافیہ جوڑے گی۔ بڑی اہل علم بنتی ہے' لے کر ساری کہانی بھلا دی۔

"ویسے تم نے اچانک رائٹر بننے کا سوچا کیوں؟"

"بس میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"گھر کے کام کر لیا کرو' وہ بھی بہت ہے۔"

"تم چاہتی ہو میں ماسی بن جاؤں۔"

"گھر کے کام کرنے سے کوئی ماسی نہیں بنتا۔ موٹی ہو رہی ہو' سست الوجود۔"

"کیا۔۔۔" وہ کرنٹ کھا کر گھومی۔ "اب تم میرے نوالے گنو گی۔"

"نوالے۔۔۔" سمیرا نے کہا۔ "نوالے نہیں روٹیاں۔۔۔ بلکہ پلیٹیں پراتیں۔۔۔"

"سمیرا!" وہ دھاڑی۔

"حمیرا!" اس نے بھی یہی انداز اپنایا۔

"تم چلی جاؤ یہاں سے سمیرا۔۔۔ اور اپنا یہ سامان بھی لے جاؤ۔" اس کا ضبط جواب دے گیا۔

"ٹھیک ہے۔" سمیرا نے تابعداری سے کہا۔ "مجھے بھی مغز خالی کرنے کا شوق نہیں۔"

"اے سی بھی چلا دو۔۔۔" اس کی آواز بھی ناراض تھی۔

"اے سی۔۔۔؟" سمیرا نے دہرایا۔

"ہاں اے سی۔۔۔ ادب پیدا کرنے کے لیے پر سکون ماحول درکار ہوتا ہے، مگر یہ بات تمہیں کہاں پتا ہو گی۔"

"پر سکون ماحول۔۔۔" سمیرا نے دانت کچکچائے۔

"پہلے اپنے اندر تو ادب پیدا کر لو۔" سمیرا کو غصہ آہی گیا۔ دھپ سے دروازہ کھولتی کھٹ سے بند کرتی باہر نکل گئی۔

"کوئی بات نہیں سمیرا کی بچی۔۔۔" اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ "میں تمہیں اب خود ہی ناول لکھ کر دکھا دوں گی، سمجھیں۔۔۔"

اس نے ایک نئے جوش و جذبے سے کاغذ قلم اپنے سامنے کیے۔

"ہیرو کی صفات۔۔۔ سرما کے لحاف سا۔۔۔ اس سے آگے۔۔۔ اس سے آگے تو کیا لکھ دوں تکیے کے غلاف سا۔۔۔" بے چاری عجب مشکل میں پڑ گئی۔ "اچھا لکھ دیتی ہوں۔ اگر غلط ہو گا تو ایڈیٹر خود ہی کاٹ دے گی۔ آخر اسے بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا؟ تنخواہ کس بات کی ملتی ہے۔ ویسے بھی ایڈیٹر کو کچھ نہ کچھ تو کاٹنے کے لیے ملنا چاہیے ورنہ اسے ایڈیٹر کون کہے گا۔"

"چلو جی۔۔۔!" اس نے لکھ کر قلم کو یوں لڑکھڑایا جیسے قلم توڑ دیا۔

"اتنے حسین الفاظ واہ جی واہ۔"

ایسا غرور اور بے نیازی تو فیض نے نسخہ ہائے وفا لکھ کر بھی نہ دکھائی ہو گی۔ دیکھنے والے اش اش کر اٹھتے، مگر اس وقت کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ ہاں دو گھنٹے بعد جب سمیرا کسی کام سے اندر آئی تو کڑچ کی آواز پر بدک کر پیچھے ہٹی۔

"اوہ!" اس کے پیروں کے نیچے آکر پین ٹوٹ چکا تھا۔

"اور کاغذ۔۔۔؟" سمیرا کی متلاشی نگاہیں حمیرا پر جا کر رکیں جو اوندھی سو رہی تھی۔ گال بیڈ کے سرے پر ٹکا تھا لمبا ہاتھ نیچے تک لٹک رہا تھا۔

"او خدا۔۔۔!" سمیرا نے سر پر ہاتھ مارا۔ "ڈھیر سارے لکھے کاغذ۔۔۔ مگر محترمہ اپنے لکھے پر چڑھ کر بے سدھ سو رہی تھیں۔

کاغذ کچر مچڑ گیا تھا۔

"اب کیا ایڈیٹر۔۔۔ پہلے کاغذ کو استری بھی کرتی۔" حمیرا مجید جیسے رائٹر ہوں تو ایڈیٹر کے کمرے میں کاغذ قلم اور قینچی کے ساتھ استری بھی رکھنی پڑ جائے۔ قسم سے۔

* * *

"کہاں کی تیاری ہے؟" سمیرا نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ صاف کپڑے پہنے تھے، چوٹی کا انداز ہی بتاتا تھا۔ صفیہ کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہ بڑا ماتھا۔۔۔ کھنچی کورین آنکھیں۔

"پھپھی بھولی کے گھر جا رہی ہوں اور اپنے نصیب کہاں۔" وہ زود رنج دکھائی دینے لگی جبکہ سمیرا بری طرح چونکی۔

"کیوں۔۔۔؟"

"ذکیہ، عطیہ سے فیبرک پینٹنگ سیکھوں گی۔"

"فیبرک پینٹنگ؟" سمیرا نے دہرایا۔ "اوہ۔۔۔ تو کیا بناؤ گی؟" اسے دلچسپی پیدا ہوئی۔

"اپنے جہیز کی بیڈ شیٹس، کشن کور، تکیہ کور، صوفہ کور۔۔۔ پنکھا کور، کوم کور۔۔۔ میز پوش، دسترخوان۔۔۔"

"با۔۔۔ س۔۔۔ بس۔۔۔" سمیرا کی آنکھیں پھیلیں۔

"اتنے سارے کورس۔۔۔ اور یہ جینز بیچ میں کہاں سے آگیا؟"

"فیبرک میں مہارت کے بعد میں مشینی کڑھائی سیکھوں گی۔" حمیرا رٹو طوطے کی طرح شروع ہوگئی تھی۔ "اس کے بعد کروشیا کا سیٹ بنے گا۔۔۔ میں ہی بناؤں گی۔ اس کے بعد چار سوتی ٹانکا لازمی ہے کہ امی کو پسند ہے اور اس کے بعد سندھی ٹانکا اس کے بلوچی اور اس کے بعد۔۔۔"

"تمہارا گھر ہوگا یا کلچر ہاؤس آل پاکستان ٹانکا ورائٹی؟" سمیرا کا سوال فطری تھا۔

"کلچرل ہاؤس۔ ایک کونے میں بیٹھ کر چرخا کاتتی میں بھی کہیں نظر آجایا کروں گی۔"

"کمال ہے۔ صفیہ چچی کو کیا ہوا؟"

"میں نے بھی یہی پوچھا تھا امی آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ بولیں۔ "چپ، تم کو سوال کرنے کو کس نے کہا ہے۔""

"لیکن ان ہنگامی فیصلوں کی وجہ؟"

"وہی۔۔۔ میری فراغت۔"

"مگر تم تو کہانی لکھ رہی تھیں ناں۔۔۔ وہ کیا ہوئی؟"

"ادھوری رہ گئی۔ امی کہتی ہیں یہ کیسا فضول کام چنا ہے۔ کرسی پر گھنٹوں کے لیے بیٹھ جاؤ۔ اور موٹی ہوجاؤ گی۔"

"تم فکر مند نہ ہو۔۔۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر حمیرا کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ "جاؤ سیکھ لو فیبرک پینٹنگ۔۔۔ کپڑے بنائیں گے۔ پیاری پیاری قمیص کرتے۔۔۔ دوپٹے۔ بیڈ شیٹس کو مارو گولا۔"

"ہنہ۔۔۔!" حمیرا نے ہاتھ چھڑایا۔۔۔ "کتنے کرتے بنالیں گے۔ ایک یا دو۔۔۔ یا دس۔۔۔ آخر ہر چیز کی ایک لمٹ ہوتی ہے۔ فیبرک پینٹنگ کو فیس پینٹنگ میں بدل دوں گی۔ سارے دن گھر میں جوکر بن کر گھوموں گی یا پھر شہر کی ساری دیواروں کا ٹھیکہ لے لیتی ہوں۔ کپڑے رنگ لوں گی۔ منہ رنگ لوں گی۔۔۔ پھر سارا شہر رنگ دوں گی۔"

وہ جل بھن کر خاک ہورہی تھی۔ باہر سے گزرتے معید کے کانوں میں آخری جملے پڑے تو اس نے اندر جھانکا۔ ترس آمیز انداز لیے سمیرا خفگی سے پھولا منہ حمیرا۔۔۔ اس نے اندر قدم رکھے۔

"لوگ تمہارا نام بسنتی رکھ دیں گے جگہ جگہ سے پکار پڑے گی۔" رنگ دے بسنتی! موہے رنگ دے بسنتی آ!"

اس نے بھنگڑا انداز سے ٹانگ اٹھائی اور بازو لہرائے۔۔۔۔ جوش سا تھا۔ لڑکھڑا گیا۔ سمیرا چلائی۔

"آرام سے۔۔۔ ادھر کرسی پر بیٹھو۔" اسے بھائی کی برجستگی پر زور کی ہنسی آرہی تھی۔

"ہاں ہاں!" وہ بیٹھا۔ "کیا مسئلہ ہے؟"

حمیرا نے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔ ایک دوسرے کی کاپی تھے۔ تیکھی کھڑی ناک۔۔۔ ایک جیسی آنکھیں۔۔۔ رنگ و روپ بھی مگر سمیرا کے اندر گلابیت زیادہ تھی۔

اور ایک وہ خود جو پہلے ہی کسی جاپانی کا بچہ لگتی تھی۔ اوپر سے ماں نے بال بھی ایسے کمال کے بنادیے تھے اور اگر وہ واقعی خدانخواستہ موٹی ہوگئی تو۔۔۔ تب تو سومو پہلوان لگے گی۔۔۔ ہائے اللہ نہ کرے۔۔۔ لیکن یہ کڑھائی بھی تو بیٹھ کر کرنی ہوگی گھنٹوں۔۔۔ اب میں ٹہل ٹہل کر تو ٹانکے بھرنے سے رہی۔۔۔ پتا نہیں امی کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔۔۔ انہیں خود بھی شاید نہیں پتا کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔۔۔ اور میں کوئی بری تو نہیں ہوں اتنی پیاری معصوم سی ہوں مگر بس یہ بال اسٹائل میں آجائیں۔۔۔ تھوڑی توجہ دوں تو ماڈلز والی لک ہے میری۔۔۔ مگر توجہ کیسے دوں۔۔۔ امی نے ہی نچا ڈالا ہے۔۔۔ چار چھٹیاں ہی تو تھیں۔۔۔ دو آرزو میں کٹ جائیں دو انتظار میں۔۔۔ مگر امی کو کون سمجھائے۔

* * *

صفیہ مطمئن ہوئیں تو حمیرا سمیت باقی گھر والوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ ورنہ فراغت تو مصیبت بن کر حمیرا پر ٹوٹی تھی جیسے۔۔۔۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"اچھا ہے، ہنر سیکھ لے گی، خالی ذہن شیطان کا۔۔۔"

صفیہ نے جٹھانی سے کہا۔

"کیا سیکھ لے گی وہ بھولی آپا سے۔۔۔ سو طرح کے اور طریقے تھے مصروفیت ڈھونڈنے کے تم نے خوامخواہ بچی کے ہاتھ میں سوئی دھاگا پکڑا دیا۔"

"سوئی دھاگے میں کوئی برائی ہے بھابھی؟" صفیہ کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

"کوئی برائی نہیں ہے۔۔۔ مگر وہ لینگویج کورس کرنا چاہ رہی تھی۔۔۔ کمپیوٹر کورس وغیرہ۔۔۔ تم نے اسے پچاس سال پیچھے دھکیل دیا۔"

"چھوڑیں بھابھی۔۔۔ پڑھائی اس کا شوق ہے اور پھر عمر کم ہے ورنہ میرا واحد مقصد اس کا بیاہ ہے۔۔۔ کوئی اچھا سا بر دیکھ کر ہاتھ پیلے کر دوں۔" صفیہ کے انداز میں بے زاری تھی۔

"یہ تو ہر ماں کا خواب ہوتا ہے صفیہ۔۔۔! اس سے کسے انکار ہے مگر ٹھیک ہے۔ تم بھی صحیح ہو۔"

صفیہ نے رائے محفوظ رکھی۔۔۔ وہ ہمیشہ سے جب دل چاہتا تھا۔۔۔ بات شروع کر دیتی تھیں اور جب دل چاہتا بغیر وجہ کے چپ سادھ لیتی تھیں۔

سمیرا اسکول گئی ہوئی تھی۔۔۔ حمیرا فریم پکڑ کے بھولی کے گھر۔۔۔ معید کالج اور تایا ابو کام پر۔۔۔ دونوں دیورانی جیٹھانی صبح کی فراغت کو کسی ڈرامے سے بہلا رہی تھیں۔۔۔ صفیہ کے انداز و اطوار سے جیٹھانی نے بہت عرصہ پہلے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ ایسے ہی مزاج کی تھیں۔

حمیرا کا بھی جیسے برا وقت گزر گیا تھا۔ اس نے ماں کو بھی خوش کر دیا تھا اور خود بھی خوش ہو گئی تھی بلکہ صاف دیکھا جاتا تو زیادہ خوش تھی۔ صفیہ نے اسے چار پانچ نئے جوڑے بنوا دیے۔ نازک چپلیں بھی لے کر دیں (یہ اور بات ہے وہ انہیں پہننا بھول کر صرف گیارہ نمبر والا پسندیدہ جوتا پہنتی) صاف ستھرا رہنے کی تاکید بھی زوروں پر تھی اور حمیرا کو عمل یوں کرنا پڑ رہا تھا کہ دھمکی دی تھی انہوں نے وہ گندا دیکھنے پر ڈنڈے سے پیٹیں گی اور خود نہلانے دھلانے لگیں گی۔

وہ روز اپنے بنائے نمونے ماں کو لا کر دکھاتی تو صفیہ خوش ہو جاتیں۔ پھپھی بھولی بھی تعریف کرتی۔ وہ ذہین تھی بہت جلد سیکھ جاتی تھی۔۔۔ ہاتھ تیز چلتا تھا اور جتنی لاپروا مشہور تھی۔ کڑھائی بنائی اور خاص طور پر پینٹنگ میں تو مہارت حاصل کر لی دنوں میں۔۔۔ سب کو خوش کر دیا۔

پھپھی بھولی کے گھر میں سیکھنے والی ڈھیروں لڑکیاں صبح نو سے ایک بجے تک آتی تھیں۔ صفیہ نے حمیرا کو دوپہر تین سے رات گئے تک کا وقت دیا۔ صبح وہ اس سے صفائیاں کرواتی تھیں۔ حمیرا نے لاکھ سر پٹخا۔

"سب تو صبح میں آتی ہیں۔۔۔ میں اکیلی کیوں بیٹھوں؟"

"اکیلی کہاں، ذکیہ عطیہ بھی تو ہوتی ہیں ناں۔ ویسے بھی وہ سب تو شاگرد ہیں۔ تم تو بھتیجی ہو۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ قائل ہو گئی۔

صفیہ کا دل مطمئن ہو گیا جو کچھ وہ سوچتی تھی جو کچھ دماغ میں چلتا تھا۔۔۔ ایک مدہم سا خیال۔۔۔ ایک خواہش۔۔۔ ایک کسک۔۔۔ ایک فتح بس یوں ہی۔۔۔ ابھی کچھ واضح نہیں تھا۔ دماغ کا حجم ہر انسان کا ایک برابر ہوتا ہے۔۔۔ لیکن خیال اور سوچیں اس کے چھوٹے پن یا بڑے پن کو ظاہر کرتی ہیں۔۔۔ خیال حالات پیدا کرتے ہیں۔۔۔ اور سوچیں تربیت سے پنپتی ہیں یا پھر۔ ظرف کی حد سے۔۔۔

صفیہ کے دماغ سے پرے حمیرا بھی خوش تھی اور وجہ بالکل الگ تھی۔۔۔ اس کے ہاتھ میں سوئی ہوتی۔۔۔ پھول بوٹے بناتی۔۔۔ ذکیہ اور عطیہ بھی کم گو تھیں۔۔۔ پھپھی بھولی کو اپنی سنانے کی عادت تھی۔۔۔ مگر صبح سے بول بول کر شام ڈھلے ان کے سیل بھی ویک ہو جاتے۔ عطیہ ذکیہ سے گفتگو میں مزا نہیں آتا تھا۔ بھرپور دلچسپی تو لیتی تھیں۔۔۔ مگر ان کے خود کے پاس بات بڑھانے کے لیے موضوعات نہیں ہوتے تھے۔۔۔ پھپھی نے انہیں سلیقے کی تربیت کے ساتھ ساتھ ایک بہترین سامع بھی بنا دیا تھا۔۔۔ یوں بھی ان کی

دنیا کا دائرہ محدود تھا۔۔۔۔ ہاں بھائی ریاض۔۔۔۔ یعنی پروفیسر اللہ دتا ریاض۔

حمیرا کی ان سے بننے لگی۔ اسے معصوم شوخ سی حمیرا بہت اچھی لگتی۔۔۔۔ جس کے اندر دنیا کو جاننے کی طلب تھی۔ وہ بھولی بلی کی طرح ان کی علمیت سے بھرپور باتیں آنکھیں کھول کر سنتی۔۔۔۔ گھر میں تایا ابو اُسے پیار کرتے تھے۔۔۔۔ **معید** سے دوستی تھی۔۔۔۔ مگر ایک ناصح استاد جیسا دوستانہ روّیہ نہیں تھا۔۔۔۔ صفیہ زیادہ تر ایک خفاماں کا کردار نبھاتی تھیں۔ سمیرا اپنی دنیا میں بہت مگن۔۔۔۔ بڑی امی بس ایک ماں تھیں۔ لاڈ پیار کرنے والی ناز اٹھانے والی۔ ان کی اور بھی ذمہ داریاں اور فکریں تھیں۔۔۔۔ ایسے میں بھائی ریاض اور اس کے تعلقات دن بدن مضبوط ہوتے چلے گئے۔ اس کی گفتگو میں ہر بات کے اندر بھائی ریاض کا نام آنے لگا۔۔۔۔ بھائی ریاض نے یہ کہا۔۔۔۔ بھائی ریاض یوں بولے۔۔۔۔ بھائی ریاض یہ اور بھائی ریاض وہ۔۔۔۔ **معید** تک ریاض نامہ سے تنگ آگیا۔

بڑی امی اس کے قصے سننے کی شروع دن سے عادی تھیں۔۔۔۔ اپنی رائے بھی دیتی تھیں۔۔۔۔ مگر اس کا موقع کم آتا۔۔۔۔ حمیرا دراصل ریڈیو بنتی جارہی تھی دن بدن۔۔۔۔ لاکھ بٹن مروڑو' ایک چینل بند ہوتا تو دوسرا کھل جاتا۔

”ہے ناں بڑی امی؟“ ذرا سی بھی بے توجہی محسوس کرکے وہ انہیں پکارتی۔

”ہاں ہاں کہتی رہو' میں سن رہی ہوں۔“

اس کی نسبت سمیرا بغور سنتی بھی تھی اور سوال بھی کرتی تھی۔ بلکہ وہ ایک بے حد دلچسپی لینے والا سامع بن چکی تھی۔

ان سب سے پرے صفیہ بہت خوش تھی۔۔۔۔ بیٹی سلیقہ بھی سیکھ رہی تھی یعنی پھپھی بھولی کی نظروں میں مقام بن رہا تھا۔۔۔۔ اور دوسری جانب اے ڈی ریاض کی حمیرا کی جانب بھرپور توجہ۔۔۔۔ اور حمیرا کا جوابی ردعمل۔ ہاں اب وہ پھپھی بھولی کو کرید سکتی ہیں' اپنی مرضی کی راہ پر ڈال سکتی ہیں۔۔۔۔ وہ دکھا سکتی ہیں جو خود

دھندلے عکس کی طرح نظر آتا تھا' اب وضاحت ہو گئی تھی۔

صفیہ ان دنوں بڑی خوش نظر آتی تھیں۔ جٹھانی سے بات چیت کے طویل دور بھی چلنے لگے تھے۔ سمیرا **معید** اور حمیرا کے ساتھ بیٹھ کر لڈو کی بازی بھی لگالی۔ ایک دو ڈرامے فیملی ڈرامے بن گئے۔ سارے اکٹھے بیٹھ کر دیکھتے۔۔۔۔ لیکن خوابوں کا محل مسمار ہو گیا۔

اے ڈی ریاض اور حمیرا کی دوستی نے گل کھلا دیا۔ صفیہ بھی آنکھوں سے دیکھتی تھیں پر یہ تو نہیں سوچا تھا۔۔۔۔ سب کچھ تو ویسے ہی ہو رہا تھا۔۔۔۔ جیسے کہ وہ سوچ رہی تھیں پھر اتنی بڑی چوک کیسے ہو گئی۔۔۔۔ یہ نہیں سوچا تھا۔۔۔۔ سوچا تو کچھ اور تھا۔۔۔۔ اور کمال ہے' پھپھی بھولی بھی تو وہیں موجود تھیں۔ عطیہ ذکیہ بھی۔

وہ تو بیٹی کو دھاگے' شیشے' تکیے کے کور دے کر بیٹھی تھیں۔۔۔۔ ہر بھرواں پھول۔۔۔۔ جیسے خوابوں میں رنگ بھرتا تھا۔

اور اتنی بھیانک تعبیر۔

”او خدا!“ وہ سر پکڑے بیٹھی تھیں۔۔۔۔ کسی کو کیا الزام دیتی شاید غلطی خود ان ہی کی تھی۔ حمیرا جیسی پر بھروسا کرلیا۔۔۔۔ اپنی بیٹی کو کیا جانتی نہیں تھیں۔۔۔۔ پھپھی بھولی بے چاری کا بھی کیا قصور۔۔۔۔ انہیں ان کے پھول بوٹے پورے مل رہے تھے۔۔۔۔ باقی جائے بھاڑ میں۔۔۔۔ ہائے ایک بار دیکھ ہی لیتیں۔

پروفیسر اے ڈی ریاض۔۔۔۔ اور حمیرا امجید کرتے کیا تھے۔

* * *

حمیرا کی تیاریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔۔۔۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار خود پر اتنی توجہ دی۔۔۔۔ سر سے پیر تک (جوتی تک) نک سک سے درست' وہ بیگ تیار کیے اے ڈی ریاض کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔۔۔۔ صفیہ دروازے پر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں کسی نے اعتراض نہیں کیا جبکہ سب ہی صفیہ کے خیالات سے واقف تھے۔۔۔۔ کہ وہ حمیرا کے حوالے سے

READING
Section

کیا ارادے باندھے ہوئے ہیں۔

"تم ماں ہو کر بیٹی کے مزاج سے واقف نہیں ہو سکیں چھوٹی بھابھی۔۔۔! عبدالعزیز اندر چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔ انہیں دھیمی چال سے اندر آتے دیکھا تو مخاطب کر لیا۔۔۔ صفیہ نے جیٹھ کو دیکھا پھر جٹھانی کو۔۔۔ **معید** بھی وہیں تھا اور ان سب کے خیالات ایک ہیں یہ ان کے چہروں سے عیاں تھا۔

"وہ شروع دن سے پڑھنے لکھنے کی شوقین رہی ہے۔ تم زبردستی اسے دھاگے کڑھائی میں الجھانے لگیں۔ اچھا ہے' اے ڈی نے اسے صحیح راہ پر ڈال دیا۔ بیٹی کا بھلا ہر ماں چاہتی ہے۔ کمال ہے' تمہیں اس کے دل کی خبر نہیں ہے۔"

صفیہ کے پاس بہت سارے جواب تھے۔ مگر وہی بات کہ وہ بولتی کم تھیں۔

دراصل معاملہ بہت واضح تھا۔۔۔ پڑھائی کے شوقین لائق فائق اے ڈی ریاض نے خود تو جو چاہا پڑھ لیا۔ (بلکہ وہ ہر وقت پڑھتا ہی دکھائی دیتا تھا) پھپھی بھولی کی اس معاملے میں ایک نہ چلی مگر جہاں اے ڈی نے بہنوں کی پڑھائی کی بات کی' وہاں یہی آہنی دیوار بن کر حائل ہو گئی۔۔۔ دو بڑی میٹرک تک بڑی منتوں کے بعد پہنچیں۔ درمیان والی کا رجحان پڑھنے میں کم اور ماں کے ساتھ کام میں زیادہ لگتا تھا۔۔۔ لیکن سب سے چھوٹی والی کو شوق بھی تھا اور وہ قابل بھی تھی۔۔۔ ذرا سی توجہ سے اے ڈی کی اصلی بہن لگتی۔۔۔ مگر پھپھی نے اے ڈی کی تعلیم کو مان لیا تھا۔۔۔ یہی بہت بڑا احسان کیا تھا۔

چھوٹی کے بڑے رونے دھونے پر کالج بھیجا تو وہ بھی دو سال بعد انٹر کی شرط پر۔۔۔ چھوٹی نے نمایاں کامیابی حاصل کی اسے یقین تھا بھائی اس کے ساتھ ہے۔ مگر پھپھی پر کسی دلیل کا زور نہ چلا۔" بارہ جماعت بہت ہے ایسے ہی خرچا۔۔۔ ہاتھ میں ہنر ہونا چاہیے۔"

"پڑھائی بھی ہنر ہے اماں!" اے ڈی نے سر پیٹا۔

"ہاں ہے مگر اس میں بڑا ٹیم لگتا ہے اور پھر نوکری ملے نہ ملے۔ وہ خود کسی پروفیسر سے زیادہ کماتی ہے۔۔۔ بچیوں کو بے ہنر نہیں رہنے دی گی۔" لو جی قصہ ختم۔

اے ڈی خاموش ہو گیا۔۔۔ مگر تب ہی اسے حمیرا عبدالمجید مل گئی ذہین' قابل' پڑھنے کی شائق۔۔۔ کچھ بننے کی خواہاں۔۔۔ اسے بس کسی صحیح رہنما کی ضرورت تھی' وہ خام سونا تھی اور اے ڈی اس معاملے میں ایک جوہری ثابت ہوا۔ اس نے حمیرا کے خوابوں کی تعبیر کے لیے راستہ ہموار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ صفیہ یہ سمجھ کر خوش ہوتی رہیں کہ حمیرا' پھپھی بھولی کے دل میں جگہ بنا رہی ہے۔۔۔ پھپھی کی مرضی کے سانچے میں ڈھل کر' جبکہ حمیرا تو اے ڈی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے من پسند راستے پر دوڑنے کی تیاری کر رہی تھی۔

عقدہ تو تب کھلا جب اس نے اپنے ہاتھوں کی تیار شدہ بیڈ شیٹس کورز' نمونے صفیہ کے ہاتھ میں رکھے۔

"لے ماں! جہیز کی پیٹی میں سنبھال کر رکھ دے۔۔۔ میں نے تیرا شوق پورا کر دیا اور اب میں جاتی ہوں پڑھنے۔۔۔ بہت سارا پڑھنے۔۔۔"

اور جانا کدھر یونیورسٹی۔ آنرز کے لیے۔۔۔ یونی ورسٹی کتنی دور۔۔۔ دوسرے شہر میں ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ۔۔۔ وہ پہلے آنرز کرے گی پھر ماسٹرز۔۔۔ وہ بھی ریاضی جیسے مشکل مضمون میں۔۔۔

صفیہ ہکا بکا رہ گئیں۔ عبدالعزیز نے سراہا اور کہا کہ وہ تمام اخراجات برداشت کریں گے۔۔۔ بڑی امی ہم خیال تھیں۔ سمیرا اے ڈی کی رائے سے اختلاف کر ہی نہیں سکتی (وہی محبت کا اصول۔۔۔)

رہا معید۔۔۔ وہ ہنستا رہا صفیہ کی حالت پر۔۔۔ اور یہ کہ اے ڈی ریاض نے بے چاری کو ریاضی میں الجھا دیا۔

صفیہ کے واویلا کرنے پر سب سمجھانے لگے۔ کیوں اتنی تنگ نظری کا ثبوت دے رہی ہیں۔۔۔ اے ڈی ریاض خود سمجھانے پہنچا۔

"میں ذمہ داری لے رہا ہوں ناں مامی۔۔۔ آپ کی لڑکی کو کسی قابل بنا کر چھوڑوں گا۔" اے ڈی پر یقین تھا۔

صفیہ چونکیں۔۔۔ ہاں وہ یہی تو چاہتی تھیں کہ حمیرا

اے ڈی کی نظروں میں رہے۔۔۔ تو یہ تو زیادہ آسان تھا۔ پہلے ان کا گمان تھا کہ حمیرا کو پھپھی بھولی کے دل میں (جگہ بنانی چاہیے اس نے بنالی' سارے ٹانکے سیکھ لئے) بھلے سے وہ بھانپ چکی تھیں کہ اصل کردار و اختیار بھولی ہے حرف آخر۔۔۔ لیکن یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ حمیرا اے ڈی کے بھی نزدیک ہو جائے تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے اور اے ڈی کتنی تعریف کر رہا تھا حمیرا کی۔۔۔ وہ لاپرواہ فطرت رکھتی ہے۔۔۔ مگر بلا کی ذہانت کے ساتھ۔۔۔ شوخ و شنگ ہے مگر حساسیت کے ساتھ۔۔۔ اور اے ڈی اسے ایک کامیاب انسان بنتا دیکھ رہا ہے۔

اور مشکل کس چیز کی' اے ڈی ہے نا اس کے ساتھ' وہ ہر پل پر مقام پر اس کا ساتھ دے گا۔ صفیہ کی آنکھیں چمکیں۔۔۔ ہر پل۔۔۔ ہر مقام۔۔۔ صفیہ نے مقام کی حد بھی طے کر لی۔

یہ نہیں دیکھا۔۔۔ وہ جملے حمیرا کے لیے کہہ رہا تھا۔ نگاہیں سمیرا پر جمی تھیں۔۔۔ وہ ماں کو ساری رات اور اگلے پورے دن بھی سمجھانے کے لیے بیٹھ سکتا تھا (بشرطیکہ سمیرا اسی طرح چینی گھول گھول کر چائے پیش کرتی رہے)

حمیرا کو یہ سارے ڈرامے سمجھ میں آرہے تھے مگر وہ کھسیانی بنی ہر دلیل پر سر ہلاتی تھی۔۔۔ بس اس کی ماں کسی طرح قائل ہو جائے۔

(بعد میں سمیرا اور اے ڈی دونوں کو جتا بھی دیا کہ اسے سب نظر آتا ہے اور۔۔۔ میں بھی)

سمیرا نے انکار کرتے ہوئے تکیہ اٹھا کر مارا جبکہ اے ڈی نے **کھنکھار** کر تادیب کی "بری بات۔۔۔ بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

حمیرا ہنستی رہی۔ "بچے جو دیکھتے ہیں وہی باتیں کرتے ہیں۔ تنبیہہ کی ضرورت بڑوں کو ہے۔"

اے ڈی ہنس دیا۔۔۔ اسے اپنی معصوم سی کزن پیاری لگی تھی۔۔۔ اپنی بے حد مصروف زندگی میں اس نے کبھی نہیں جانا تھا کہ وہ دراصل ہے کیسی۔۔۔ اور جب اندازہ لگالیا تو سوچا کہ ایسی ذہانت و شوق کو ضائع ہونے دینا ظلم ہے۔۔۔ سو وہ ٹھونک بجا کر آگے آگیا۔۔۔ صفیہ کو قائل کرنا کوئی آسان تھا؟ اور صفیہ۔۔۔ وہ بالآخر مان گئیں۔

یوں اچانک مان گئیں۔ تو۔۔۔ شاید انہیں عقل آگئی تھی۔ سب نے سوچا۔۔۔ مگر صفیہ نے کچھ اور سوچا تھا۔

ان کی سوچ اور پلاننگ کی انتہا ایک ہی تھی۔

ایسے نہ سہی ویسے سہی۔

دراصل صفیہ۔۔۔

* * *

ہماری محبت کی شادی ہے۔ میرے گھر والے تو راضی نہیں تھے مگر جیت محبت کی ہوئی (وہی نا کہ والدین نے اپنی عزت رکھنے کے لیے نکاح کروادیا۔ اور ساتھ ہی زندگی بھر کی لاتعلق کا اعلان بھی۔۔۔)

صفیہ ہر ایک کو فخر سے یہ بات بتاتی تھی۔ اس کے گردو پیش کی ہم عمر عورتیں کھسیاسی جاتیں۔۔۔ ان سب نے تو بس والدین کے کہے پر سر جھکایا تھا۔۔۔ شادی کی تھی۔ پھر محبت بھی ہو گئی ہو گی۔ عبدالمجید خوش شکل آدمی تھا۔ صفیہ قبول صورت۔

سب اسے رشک آمیز حسد سے دیکھتیں۔۔۔ عبدالمجید واقعی عاشق جانثار تھا۔۔۔ چھوٹی سی جنت تھی صفیہ کی دنیا۔۔۔ پھر اللہ نے پیاری بیٹی حمیرا دے دی۔۔۔ محبت کی نشانی۔۔۔ بڑی خوب صورت زندگی لیکن۔۔۔

صفیہ نے محسوس کرنا شروع کیا۔۔۔ وہ محلے والیاں جو اس سے اس کی لو میرج کے قصے سنا کرتیں چٹخارے لے کر۔۔۔ کہ کیسے دونوں کی ملاقات ہوئی۔۔۔ پھر ملاقاتیں۔۔۔ باتیں اور۔۔۔ محبت' وہ کہاں کہاں ملتے تھے چوری چوری اور کیسے؟ پھر مخالفت پر اس کا احتجاج' کوشش اور جیت۔۔۔

صفیہ سچ میں اتنی رنگ آمیزی کر دیتی تھی کہ لگتا کسی رومانٹک فلم کا اسکرپٹ سنا رہی ہے۔ ایک سے بڑھ ایک سچویشن۔۔۔ سننے والیاں آنکھیں مٹکاتی اور لطف اٹھاتیں پھر رات گئے جب تھکے ہارے شوہر

آتے تو انہیں سارا قصہ مزید نمک مرچ سے سنا کر طعنہ دیتیں۔ ”بھائی مجید اب تک صفیہ کے لیے گجرے لاتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے منہ میں نوالے دیتا ہے۔“ بعض مرد دلچسپی سے سنے جاتے۔ مگر بعض الرٹ بھی ہوئے۔

ایسی رنگین قصے سنانے والی عورت کی سنگت صحیح نہیں۔۔۔ بس سلام دعا رکھو۔ اسی طرح کچھ بڑی بوڑھیوں کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔۔۔ بیٹیوں کو تو چھوڑو انہیں بہوؤں کے بگڑنے کا بھی خدشہ لاحق ہوگیا۔۔۔ دوسری طرف کچھ حاسد عورتیں۔۔۔ صفیہ کی لو میرج کا ٹھٹھا اڑانے لگیں۔ یہ نئی عجیب اور ناقابل قبول صورت حال تھی۔

لو میرج ایک ایسا کارنامہ تھی جو اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتا تھا۔ مگر یہ کیا؟ اس نے اپنے کانوں سے سنا۔ نوعمر لڑکیوں کو اس سے قصداً ”ایک فاصلے پر رہنے کی تاکید کی جارہی تھی اور۔۔۔ یہ کیا ہوا! اس نے خود ہی بیٹھ کر اپنی غلطیوں کو سوچا۔ اور شعوری کوشش سے لو میرج والی بات کو چھپانے لگی۔

کل کو اس کی بچی کے کانوں میں بھی یہ قصے پڑیں گے تو وہ کیا سوچے گی۔۔۔ اور اگر اس نے بھی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ا۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ کپکپا کر رہ گئی۔ لیکن سوچ کی سوئی اٹک گئی تھی۔۔۔ اسے ذمہ دار ماں کا کردار نبھانا ہوگا۔۔۔ اور کتنی بڑی بے وقوفی کردی۔۔۔ محبت مل گئی تھی یہ کافی تھا۔۔۔ اس کا اتنا پرچار کہ اشتہار بن کر پہچان بن جائے۔۔۔ غلطی ہوگئی تھی۔۔۔ اندازہ ہی نہ ہوا کہ جس چیز کو وہ فخر سے تمغے کی طرح سینے سے لگائے ہوئے ہے۔۔۔ وہ کل کو داغ محسوس ہونے لگے گی۔

اور پھر عبدالمجید فوت ہوگیا۔۔۔ اپنے سلجھے ہوئے مالک مکان میاں بیوی کی وجہ سے وہ بہت سی مشکلات سے بچی رہی۔۔۔ ورنہ لوگوں نے کیا کیا باتیں نہ کیں۔ کیسے کیسے قیاس۔۔۔ وہ الگ کہانی تھی۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ انجام بگڑتا اسے عبدالعزیز اپنے ہمراہ لے آئے۔۔۔ عزت محبت، مرتبے کے ساتھ۔۔۔ مگر اس کا کیا کرتی، خراب قسمت۔

یہاں اس کا واحد تعارف یہی تھا۔۔۔ ”یہ صفیہ ہے جس نے عبدالمجید سے پسند کی شادی کی۔۔۔ ماں باپ تو راضی تھے نہیں بس اپنی عزت بچانے کے لیے۔“

اوہ خدا۔۔۔ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔۔۔ محبت داغ بن گئی تھی۔۔۔ اور کسی ڈٹرجنٹ میں وہ طاقت کہاں کہ۔۔۔

دوسری طرف۔۔۔ جٹھانی کی عزت مقام۔۔۔ اختیار و مرتبہ۔۔۔ وہ ایسے چبھتا تھا جیسے ایڑی کا کانٹا۔۔۔ زبان کا چھالا۔۔۔ آنکھ کا تنکا اور شکل۔۔۔؟

وہ رات ساڑھے گیارہ بجے عبدالعزیز کے ہمراہ یہاں پہنچی تھی۔ دروازہ جٹھانی نے کھولا علاقے میں لائٹ نہیں تھی۔۔۔ موم بتی کی مدہم روشنی میں نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ۔۔۔ وہ کھانے کا پوچھ کر اور بستر بچھے ہوئے کا بتا کر چلی گئی۔۔۔ صفیہ کی آنکھوں سے اس رات نیند دور رہی۔۔۔ مگر یہ رت جگا، طمانیت انگیز تھا۔۔۔ وہ خود دل کے اس سکون پر حیران تھی۔ صبح مدہم گفتگو پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔

”عبدالمجید تو اپنا حصہ آپ سے لے چکا تھا اور پھر آپ کہتے ہیں اس گھر میں اس کا حصہ ہے۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا میں بھول گئی کہ آپ آبائی مکان بیچنا نہیں چاہتے تھے اور وہ بضد تھا۔۔۔ تب میں نے اپنا زیور بیچ کر اسے حصے کی رقم دی بلکہ ہم مقروض بھی ہوگئے تھے اور آج آپ انہیں یہ کہہ کر لائے ہیں کہ۔۔۔ اس گھر پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے۔ وہ اپنا حصہ لے چکا ہے سمیرا کے ابو۔۔۔“

صفیہ نے ذرا آڑ میں ہو کر جھانکا۔۔۔ جٹھانی کا چہرہ سامنے تھا۔ ان کے لہجے کی تلخی اور باز پرس کا انداز بے حد چبھتا ہوا تھا۔۔۔ مگر صفیہ تو اس حسن باکمال کو تکے جارہی تھی جو جٹھانی کے نام پر پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔

عبدالعزیز بہت مدہم مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کو جواب دے رہے تھے۔

صفیہ جواب کو نظر انداز کیے ساکت تھی۔۔۔ اتنی حسین عورت۔۔۔ اس نے اپنے دل میں حسد کی کونپل

www.Pdfsociety.com
READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

کو پھوٹتے دیکھا۔۔۔ اور اتنے سالوں میں اس نے کسی باغبان کی طرح اس کی آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنادیا عبدالعزیز کے گھر آکر وہ مالی اور ذہنی طور پر پُرسکون ہوگئی تھی۔

میاں بیوی کی باہم گفتگو سے قطع نظر اتنے سالوں میں کبھی ان ماں بیٹی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ ان کی آمد پر جٹھانی کی طرف سے کچھ سوالات اٹھے تھے۔۔۔ اور عبدالعزیز نے سمجھانے بجھانے کے بجائے۔۔۔ دو جملوں میں سارا معاملہ سلجھادیا۔۔۔ سوال ختم کردیے تھے جواب دے دیے تھے۔۔۔ جواز ڈھونڈ لیے تھے۔

صفیہ مختلف محاذوں پر اپنے اندر چھڑی جنگ سے نبرد آزما رہیں۔

جیٹھ جٹھانی میں محبت و لگاوٹ کے مظاہرے نہیں تھے۔۔۔ مگر احترام محبت و مان کی جھلک دکھاتا ضرور تھا۔

وہ خود کو اس گھر میں دوسرے درجے کا شہری سمجھتی تھیں (یہ سراسر ان کی اپنی سوچ تھی) اور بیٹی بھی سمیرا اور **معید** سے کم تر دکھائی دیتی۔۔۔ صفیہ کو ہروقت یہ خوف لاحق رہتا کہیں خاندان میں سے کوئی حمیرا کے سامنے لو میرج کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔۔۔ محبت جرم لگنے لگی تھی۔ حمیرا ماں باپ کے بارے میں کیا سوچے گی۔۔۔ اگر وہ بھی محبت کا پٹا گلے میں ڈال کر گھسٹنے لگی تو وہ کیسے اسے باز رکھ پائیں گی۔۔۔ اور یہ بھی تو ضروری نہیں کہ وہ درست انتخاب کرے۔۔۔ اور پھر لوگ کہیں گے جیسی ماں ویسی بیٹی۔۔۔ تو بس ٹھیک ہے وہ اسے جلد از جلد بیاہ دیں گی۔

اس سے پہلے کہ وہ دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھے۔۔۔ وہ اسے رہٹ کے بیل کی طرح نظر باندھ کر جکڑ دیں گی کہ لو بچی! یہ ہے تمہارا دائرہ، تمہاری دنیا۔

محبت، ایثار، خلوص کا مظاہرہ صرف عبدالعزیز کی طرف سے نہیں تھا۔۔۔ ان کے دونوں بچوں نے بھی ان دونوں کو اپنی زندگی میں یوں شامل کیا تھا۔۔۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ان کا حصہ ہوں۔۔۔ عبدالعزیز نے خوف خدا کے تحت یتیم بھتیجی اور بیوہ بھاوج کو گھر میں جگہ نہیں دی تھی۔۔۔ دل میں بھی بسالیا تھا۔۔۔ وہ سب کے کانوں میں یہ بات ڈال چکے تھے۔۔۔ کہ حمیرا مجید کل کو حمیرا **معید** ہوگی۔۔۔ اور اس اعلان پر صفیہ پہلی بار چونکی تھیں۔

جیٹھ کا بیٹا ۔۔۔ **معید**۔۔۔ ہاں ایسے تو وہ ساری فکروں سے نجات پاجائیں گی۔۔۔ صفیہ نے جٹھانی کا چہرہ ٹٹولا، وہ مسکرا رہی تھیں۔۔۔ گویا تائید کر رہی تھیں۔۔۔ کیا واقعی یہاں صرف خلوص تھا۔۔۔ عبدالعزیز خود اپنے اس آئیڈیے پر خوشی سے نہال نظر آتے تھے اور سمیرا بھی۔۔۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"اور سمیرا!" صفیہ فیصلہ نہیں کرپاتی تھیں۔۔۔ انہیں جٹھانی کا حسن زیادہ کاٹتا ہے یا جٹھانی کی بیٹی کا۔۔۔ وہ اپنا موازنہ جٹھانی سے کرتی تھیں اور حمیرا کا موازنہ سمیرا سے۔۔۔ دونوں کی عمروں میں فرق تھا۔۔۔ شکل و صورت و مزاج بھی ایک دوسرے کا الٹ۔۔۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ صفیہ ہمیشہ سمیرا کے مقابلے میں حمیرا کو دیکھتیں۔۔۔ پرکھتیں اور فیل کردیتیں۔

اور پھر جب اے ڈی سے اس کا رشتہ ہوگیا۔۔۔ تو حسد نئے سرے سے عود کر آیا۔۔۔ **معید** کسی طور کم نہیں تھا اے ڈی سے۔۔۔ وقت آگے بڑھتا تو وہ بھی قابلیت و کاملیت کے سارے درجے عبور کرلیتا۔۔۔ مگر بات تو وہیں آکر اٹکتی تھی ناں کہ دل کو شکر کی عادت نہیں تھی۔۔۔ اور نظر پر حسد کا غلبہ تھا۔

کڑھنا۔۔۔ جلنا۔۔۔ حسد۔۔۔ انسان کی طمانیت کو کھا جاتا ہے۔

حاسد ظالم ہوتا ہے۔۔۔ خود پر بھی ظلم ڈھاتا ہے۔۔۔ اور دوسروں پر بھی۔

حمیرا کو معید مل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر سمیرا کو اے ڈی کیوں ملتا ہے کسی کو بھی مل جائے بس سمیرا کو نہ ملے اور پھر حالات نے پلٹا کھایا۔

وہ ٹہل ٹہل کر سوچتیں۔۔۔ دراصل حاسد پاگل ہوجاتا ہے۔۔۔ مگر افسوس ان کے لیے حکومت پاگل خانہ نہیں بنواتی۔۔۔ (یہ حکومت بھی ناں)

حسد کفران نعمت کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور نعمتوں

سے منہ موڑنے پر بعض اوقات اللہ خفا بھی ہو جاتا ہے ہیں جب ہی تو۔۔۔

* * *

یہ تو سچ ہے رات ہولاتی ہے۔۔۔ خدشات کی ماں۔۔۔ وہم کا باعث۔۔۔ کالی شکل والی کالی رات، جو وحشت میں مبتلا کرتی تھی۔ اور یہ صبح۔۔۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ۔۔۔ اجالے کی کرنیں۔۔۔ پھولوں پتیوں پر ٹکے شبنم کے قطرے‘ ہوا میں بھی ایک سرمستی تھی۔۔۔ خوشبو۔۔۔ تو یہ صبح کی کرامات تھیں اور روشنی کی طاقت۔۔۔ سارے خوف و اوہام کہیں دور بھاگ گئے تھے۔

اتنے بڑے سفر کو اس نے ایک رات میں یاد کرلیا۔ اسے اپنا وجود ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ بشاشت لوٹ آئی تھی۔۔۔ اسے ایک تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک نیا پن‘ ایک ارادہ‘ ہمت‘ خیال اور فیصلہ۔۔۔

چیزیں بگڑ جاتی ہیں۔۔۔ مگر انہیں سدھارا بھی جاتا ہے۔ اصل بات ادراک کی ہے۔ احساس کی ہے۔ وہ کتنی ہی دیر کرسی پر بیٹھی اجالے کو پھیلتا دیکھتی رہی تھی۔ تایا ابو کے پورشن سے برتنوں کے کھنکھنانے کی آواز آرہی تھی۔ بھلا کون ہوگا سمیرا۔۔۔ یا تایا ابو۔۔۔ بڑی امی کی تو طبیعت ناساز تھی۔

اور یہ امی کہاں چلی گئیں۔۔۔ وہ سارے گھر میں انہیں ڈھونڈنے لگی۔ باہری دروازے کا پٹ وا تھا۔۔۔ اسے اچنبھا ہوا۔ ذرا سا سر نکال کر جھانکا۔۔۔ تو رات کو ماں بیٹے واپس آگئے اور امی اتنی صبح ان کے گھر چلی گئیں۔ اسے ناگوار گزرا۔ اوہ‘ پھپھی بھولی کا دروازہ کھلا تھا۔ اور کیوں چلی گئیں۔ ہاں مجھے پتا کرنا چاہیے۔ اس نے لٹکتا پلو سر پر اٹکایا۔ آج آفس نہیں جاؤں گی۔ اس معاملے کو حل کروگی پہلے۔۔۔ اس کا ہاتھ دروازہ پر تھا اور قیاس درست۔

صفیہ کی آواز آرہی تھی۔۔۔ وہ بھی آہستہ آواز۔۔۔ بے ضرر لہجہ۔۔۔ (ضرر تو جملوں میں ہوتا ہے ناں۔۔۔) اسے ماں کے سارے خیالات یاد آئے۔ دل نئے سرے سے دکھا۔ تو یعنی امی باز نہیں آئیں۔ اور یہ پھپھی اتنا بڑھ بڑھ کر کیا بولے۔۔۔ جاتی ہیں۔ پھپھی بھولی کی پاٹ دار آواز سماعت سے ٹکرائی تو اس کے قدم رک گئے۔ یہ پھپھی بھولی کا نئے انداز سے بنا گھر تھا۔ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوں تو گیلری سی تھی۔ پھر ایک دوسرے دروازے سے اندر جانے پر سارا گھر سامنے آتا تھا۔ وسیع آنگن‘ برآمدے کمرے۔۔۔ پھپھی نے ساتھ کا پلاٹ بھی خرید کر گھر کو خوب بڑا کرلیا تھا۔ وہ گیلری میں کھڑی تھی۔ نیم وا دروازے کے آگے پردہ لگا تھا۔ ذرا پتا تو لگے چل کیا رہا ہے۔ اس نے کان لگائے۔

"میرے قابل بیٹے کے لیے کوئی رشتوں کی کمی ہے۔۔۔ لوگ تو گھر آکر نام لیتے ہیں۔ مگر مجھے کیا پتا تھا۔۔۔ بھابھی نے میرے اندر اتنے کیڑے نکالنے ہیں۔۔۔ اسے میری عادتیں پسند نہیں۔۔۔ میرا مزاج پسند نہیں۔۔۔ ہاں بس میرا بیٹا پسند ہے۔ تو جاؤ جی میں بیٹا بھی نہیں دیتی۔ میں اپنے حساب کی عورت ہوں صفیہ۔۔۔ ساری زندگی بریک (باریک) سوئی سے موتی ٹانکے گن گن کر‘ مجھے غلطیاں کرنے کی عادت نہیں۔

اور اس سمیرا میں شکل کے علاوہ ہے کیا؟ بیوہ ہو کر زندگی گزاری‘ ہنر تھا میرے ہاتھوں میں۔۔۔" بھولی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دکھائے۔ "سمیرا کے پاس کیا ہے‘ تعلیم کے نام پر کوئی کام کی ڈگری نہیں۔

(اوہ تو اسے ڈی کی ماں ہونے کا یہ فائدہ ہوا پھپھی کو ڈگریوں کا پتا لگ گیا کام والی‘ بے کار)

اچھا خاصا پڑھ رہی تھی تو پڑھتی رہتی۔ پر ناجی تلیم ادھ وچ کار چھڈ کے (ادھوری تعلیم چھوڑ کے) سکولے پڑھان لگ گئی۔ اور اسکول بھی کون سا۔۔۔ معذوروں والا۔۔۔ جو خیرات پر چلتا ہے‘ خیراتی اب تنخواہ کیا دیں گے‘ کوئی پروا نہیں۔

بس روز صبح اٹھے منہ ہاتھ رگڑے۔ باپ کی کمائی سے لشکتے کپڑے چڑھائے اور پہنچ گئی نوکری کرنے اور نوکری کیا گونگے بہروں کو پڑھانا ہے۔

ایک میرا اپنا پتر۔۔۔ بس سوال ہی یاد کرنے جوگی ذہانت تھی اس کی‘ ذرا جو دنیا ورتانے کی مت ہوتی۔

(دنیا نبھانے کی عقل) بھئی جب تو اتنا قابل تھا تو کوئی ڈاکٹر انجینئر والی پڑھائی پڑھتا نے کر ماسٹر بن گیا۔ آگے نوں (بہو) بھی میں استانی لے آؤں۔ کیوں جی، مجھے کوئی کتے نے وڈیا ہے۔ تلیم تلیم کا سیاپا ڈال دیا۔ تعلیم کے بھی طریقے ہوتے ہیں اگر جو مجھے اللہ دتا کی پڑھائی کے زمانے میں خبر ہوتی کہ پڑھتا کیا ہے وہ تو سیدھا سیدھا اچھی والی پڑھائی کرواتی۔۔۔ کبھی ماسٹر نہ بننے دیتی۔ بے وقوف نکلا میرا پتر۔" پھپھی نے باقاعدہ ہاتھ ملے۔

"وہ بہت بڑی یونیورسٹی کا پروفیسر ہے بھولی آپا!" صفیہ کا لہجہ دھیما تھا۔

"ہاں۔۔۔ وہی ماسٹر صاحب۔۔۔!" پھپھی کے لہجے میں اپنے بیٹے کے لیے اتنا استہزاد تھا تو وہ کسی اور کو کیسے بخشتی۔

"دیکھ صفیہ۔۔۔!" پھپھی بھولی نے صفیہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا۔ "تو بھی میری طرح بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی، مگر تجھے مل گیا عبدالعزیز کا سہارا۔۔۔ مجھے کون ملا؟ پنج جی چھوڑ کر مرا تھا تیرا بھائی، میں اگر ہنر والی نہ ہوتی تو بچے فاقوں سے مرجاتے، اس سمیرا کے ہاتھوں میں کیا ہے؟ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر واکٹر بن جاتی چلو استانی ہی بن جاتی، مگر گورنمنٹ اسکول کی بنتی نا۔۔۔ مرنے تک پنشن بھی ملتی رہتی ہے۔ اس نے پڑھائی چھوڑی رستے میں۔۔۔ اور خیراتی اسکول میں اللہ کے نام پر گونگے بہروں کو پڑھانے لگی۔ کل کو کوئی مصیبت پڑے تو میں کیا سارے شہر کے ہتھ پیر ٹوٹ جانے کی دعائیں مانگنے لگوں کہ جی میرا اسکول چلے۔ بول بتا ذرا۔۔۔ ہنر ایسا ہو جو کام آئے۔"

پھپھی بھولی کی بات میں اس کا تجربہ بول رہا تھا۔ جو اس پر بیتی، جیسے اس نے زندگی گزاری، مگر بات کے اختتام پر وہ جو فلسفہ بیان کر رہی تھی جو خدشات وہ اس کی اپنی سوچ کا مظہر تھے۔ وہ جیسے دنیا کو دیکھتی تھی سمجھتی تھی۔

حمیرا کا دل دکھا۔ یا پھر یہ کہ حالات کی تلخیاں اور مشکلیں سہ سہ کر بھولی حقیقت پسند ہوگئی تھی، لیکن حقیقت پسندی کا یہ مطلب تو نہیں۔ بندہ اپنے ہاتھوں سے اپنا کلیجہ نوچنے کی بات کرے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے مرجانے کا گمان پال لے اور اس کی اولاد کی روٹی کی فکرمندی میں ہونے والی بہو کو بے ہنر قرار دے کر مسترد کردے۔ کمال تھی پھپھی اور کمال تھا اس کا نظریہ۔۔۔

"اور یہ بات جانے بھی دوں۔ چلو اللہ سبب بنا دیتا ہے، مگر میرے کس کام کی ایسی نزاکتوں والی کڑی۔۔۔ جب رشتہ مانگا تھا تو سو لڑکیوں جیسی ایک لڑکی تھی۔ پڑھنے لکھنے والی، قابل۔۔۔ مگر یہ تو بعد میں کھلا کہ ماں نے کوئی سلیقہ طریقہ سمجھایا ہی نہیں۔ سارا وقت بس منہ ہاتھ رگڑتی رہی۔ استری کرکے سوہنے کپڑے چڑھانے منہ کی کریم الگ، ہاتھوں کی الگ۔۔۔ پیروں کی الگ، گز گز کا تو اس نے ناخن رکھا ہوا ہے اور اس پر سارا وقت رنگ لگالیا۔ پتا نہیں نماز بھی پڑھتی ہے کہ نہیں۔ جتنی دیر میں اس نے پیپرن (ایپرن) لگانا ہے میں نے ادھے ٹبر کی روٹیاں بنا بھی لینی ہیں۔"

پھپھی کی آواز اور لہجہ تیز ہوگیا تھا۔ صفیہ کی ہنسی باہر تک آئی اور حمیرا کا دل چھلنی کرگئی۔ یہاں صفیہ کے مکالمے تو کچھ اور ہونے چاہیے تھے نا۔ دگرنہ "کہ نہیں بھولی آپا۔۔۔ ناخن رکھنا اس کا شوق ہے، نیل پالش خریدنے سے پہلے وہ ریمور خریدتی ہے صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک کا شوق۔۔۔ دوپہر کی نماز تو اس نے کبھی قضا کی ہی نہیں۔"

مگر صفیہ کے مکالمے کیسے درست ہوتے، جب انہوں نے اپنا کردار ہی بدل لیا تھا۔ ایک نیا کردار۔۔۔ مار آستین کا کردار۔۔۔

وہ پھپھی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں، واقعی سمیرا کے عیب بے شمار۔۔۔ بھول گئیں ساری زندگی حمیرا کو سمیرا کی مثال دے دے کر فقط منہ دھونے پر راضی کرنے کے لیے وہ سر پیٹ لیتی تھیں، کل کی مثال۔۔۔ آج کا عیب۔ واہ امی۔۔۔ آپ کتنے مزے سے، حساب سے چل رہی تھیں۔

"اور تو بھی یاد رکھ صفیہ۔۔۔ اللہ دتا کے لیے اب

میں جس لڑکی پر ہاتھ رکھوں، وہ گھر چھوڑ کر جائیں، مگر میری محنتوں کی کمائی پر۔۔۔" پھپھی نے گردن اٹھا کر اپنے گھر کو فخر سے دیکھا۔ "کسی غیر کی لڑکی کیوں عیش کرے، عبدالعزیز بھی میرا بھائی۔۔۔ عبدالمجید بھی۔۔۔ اور میری عادت ہے صاف بات کرنے کی۔۔۔ مجھے حمیرا جیسی نوں ہی چاہیے جو میری طرح روٹی پر اچار رکھ کے کھالے۔ میری طرح بغیر استری کے کپڑے پہن لے اور سب سے ضروری بات۔۔۔ ہاتھ میں ہنر ہو۔ کتنی تنخواہ ہے اس کی؟"

ایک کے بعد ایک خوبی بتاتے ہوئے پھپھی نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

"انچاس ہزار پانچ سو۔" صفیہ کے لہجے میں غرور کا عنصر غالب آگیا۔

"ہاں۔۔۔" پھپھی نے اپنے گھٹنے پر زوردار ہاتھ مارا۔ "یہ ہوئی نا بات۔۔۔ کل کو وقت پڑے تو کسی کا منہ تو نہ دیکھنا پڑے گا۔"

"اللہ نہ کرے آپا۔۔۔ خدا دونوں کو زندگی دے صحت دے۔" صفیہ کا جملہ بے ساختہ تھا۔ کیا اس لیے کہ بات اپنی بیٹی کی تھی اور یہ دونوں کون۔۔۔ حمیرا نے سوچا ایک تو حمیرا۔۔۔ تو دوسرا کون۔۔۔ اوہ اے ڈی ریاض۔۔۔

"واہ ماں، ایک کو دو میں بھی گن لیا۔ دونوں لں لں۔۔۔" اس کے ہاتھ دروازے پر سخت ہوئے۔

"اے ڈی مان جائے گا؟" صفیہ کی ساری گوٹیں نکل گئی تھیں۔ بس وہ ایک کوئین پھنسی تھی کوئین حمیرا مجید۔۔۔

"کیسے نہیں مانے گا۔" پھپھی نے حسب عادت ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر دعوا کیا۔ "میرا بیٹا ہے وہ۔۔۔ جب اسے پتا لگے گا نا کہ کیسے ناہید نے مجھے ساری زندگی مذاق سمجھا، میرے خیالوں کا مذاق اڑایا۔ تو خود ہی پیچھے ہٹے گا، میں تو شکر کرتی ہوں صفیہ۔۔۔ جو تو نے مجھے ناہید کے سارے خیال بتا دیے۔ میں اس کی خاموشی کو بیٹی کی ماں کی جھجک سمجھتی رہی اور وہ مجھ میں عیب نکالتی رہی۔" پھپھی کے لہجے میں گہرا افسوس تھا۔

غیبت۔۔۔ اور چغل خوری، حمیرا کو یہی دونوں عنوان موزوں لگے تو صفیہ نے یہ کام بھی کیا تھا اور اگر یہ سب بڑی امی سن لیں تو۔۔۔ کتنا دل دکھے گا ان کا۔۔۔ اے ڈی اور سمیرا کے رشتے والی بات سے بھی زیادہ۔۔۔ صفیہ نے بھروسے کا خون کیا تھا۔

"سچی بات تو یہ صفیہ۔۔۔ مجھے خود بھی پتا نہیں تھا۔ اللہ دتا اتنا لیق فیق (لائق فائق) منڈا ہے۔ ماسٹر صاحب کے کہنے پر پڑھنے ڈال دیا تھا۔" پھپھی بھولی صفیہ کے نزدیک ہو کر جیسے راز کی بات بتانے لگی۔ "پھر جب ادھر شہر آئی تو کون مجھے جانتا تھا۔ کوئی نہیں۔ بس ایک عبدالعزیز کا آسرا تھا۔ کل کو مجھے منڈا بیاہنا بھی تھا کہ نہیں۔۔۔ میں نے سوچا کہ جب وہ پڑھ لکھ جائے گا تو کڑی بھی پڑھی لکھی مانگے گا تو میں کہاں ڈھونڈنے جاؤں گی، چلو اس سمیرا کا نام ہی پکا کر دوں۔ مجھے کیا پتا تھا میرے پتر نے اتنا قابل نکلنا ہے کہ بڑے بڑے لوگ اپنے منہ سے رشتہ ڈالیں گے۔ اللہ دتا کے کالج کے سب سے وڈے افسر نے اپنی بہن کے لیے خود مجھے کہا۔ ساتھ پڑھانے والی دو استانیاں بھی اسے تحفے شحفے دیتی ہیں۔ سارا شہر مجھے اے ڈی کی ماں کے نام سے جانتا ہے۔ مجھے کوئی تھوڑ (کمی) ہے کڑیوں کی۔"

صفیہ سر ہلا رہی تھیں۔ حمیرا ہونق ہو گئی پھپھی بھولی کیا واقعی بھولی تھیں کہ بنا سوچے سمجھے کچھ بھی بول دیتی تھیں۔ انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی باتیں کر کے وہ خود کو کتنا مطلب پرست، خود غرض، مفاد پرست اور۔۔۔ اور نجانے کیا کیا بنا کر پیش کر رہی تھیں اور صفیہ کو ان کی ہاں میں ہاں ملانی چاہیے تھی یا آئینہ دکھانا چاہیے تھا۔ (مگر آئینہ کیسے دکھائیں جب دونوں ہی ایک دوسرے کی پرچھائی ہو گئیں تو۔۔۔)

اس کے صبر کی حد ختم ہو گئی۔ وہ ابھی اندر جا کر دونوں کا دماغ درست کرے گی اور یہ بھائی اللہ دتا ریاض کدھر تھا صبح سویرے۔۔۔ اگر وہ بھی ماں کا ہم

خیال ہوا۔۔۔ تو ہوا کرے وہ اسے بھی ٹھیک کرنا جانتی ہے بلکہ ٹھیک ٹھاک۔۔۔ اس نے ایک زور دار آواز سے دروازہ کھولا تھا اوہ۔۔۔ پردے کے پیچھے یعنی درمیان میں بڑی امی کھڑی تھیں تو جو کچھ وہ سن رہی تھی۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ بھی سن رہی تھیں۔ بھیگا چہرہ۔۔۔ نجانے کب سے۔

اتنی ہی دکھی۔۔۔ بلکہ زیادہ۔۔۔

اتنی ہی غضب ناک۔۔۔ مگر شکستہ۔۔۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں اور کیا کیا نہیں تھا بڑی امی کی آنکھوں میں سب کچھ۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔

دروازے کی آواز پر صفیہ اور بھولی بھی چونکی تھیں۔

”او کون ہے‘ دروازہ پٹ مارتا ہے۔ (توڑ دیتا) پورے باون ہزار کا دروازہ ہے۔ لکڑی تول کے (یعنی وزن مستند ہے۔)“ بڑی امی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پل بھر کو نمودار ہوئی‘ یہی سطحیت تو ناپسند تھی بھولی کی۔۔۔ صاف گوئی کو لوگ خوبی کہتے ہیں۔ ہوگی خوبی۔۔۔ جیسے میٹھا اچھا لگتا ہے‘ مگر حد سے بڑھ جائے تو بیماری۔

”او کون ہے دروازے پر؟“ پھپھی شاید اس طرف آرہی تھی۔ بڑی امی نے باہر کی طرف قدم اٹھائے۔ اب کیا بچا تھا وہ کس لیے رکتیں‘ آگئی تو تھیں کہ بھولی سے پوچھیں گی کیوں کس لیے۔۔۔ اب پتا لگ گیا تھا۔۔۔ یوں۔۔۔ اور اس لیے۔۔۔ مگر راستے میں حائل تھی حمیرا عبدالمجید۔۔۔ اس نے ان کا ہاتھ دبوچا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں‘ اس نے دوسرے ہاتھ سے چوڑے پردے کو سرکا دیا۔۔۔ منظر واضح ہوگیا۔

دروازے کی جانب آتی پھپھی ٹھٹک کر رکی تھی۔ صفیہ کی منتظر نگاہوں کو بھی جھٹکا لگا اور حمیرا کا فیصلہ کن جارحانہ انداز۔۔۔ مرجائے گی یا مار دے گی‘ مگر کس کو۔۔۔ پھپھی بھولی نے چونک کر صفیہ کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

”کہاں سے کہانی شروع کروں اور کیا کیا بتاؤں۔۔۔ اور کیوں بتاؤں امی‘ بتایا تو اسے جاتا ہے جو انجان ہو۔ آپ پر تو پھر بیتی تھی۔“

حمیرا کی آواز دکھ اور صدمے سے بوجھل تھی۔ بڑی امی کو اس نے سامنے کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ وہ یوں اکڑی بیٹھی تھیں جیسے پھانسی والی الیکٹرک چیئر پر بٹھائی گئی ہوں۔ ناک کی سیدھ میں دیکھتی قصداً انجان۔۔۔

”آپ میری تنخواہ کے انچاس ہزار گنتی ہیں پھپھی۔۔۔!“ وہ کب سے بول رہی تھی۔ مخاطب کبھی ماں ہوتی‘ کبھی پھپھی۔۔۔

”یہ معلوم ہے اس تنخواہ تک پہنچانے کے لیے تایا ابو نے کیسے پیٹ کاٹ کر فیسیں بھریں اور پھپھی سے کیا گلہ امی۔۔۔ آپ نے کبھی اپنی کسی ضرورت کے لیے منہ سے کہا؟ انہوں نے بند لفافہ آپ کے کہنے سے پہلے آپ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے صلہ رحمی تو کہہ سکتے ہیں۔ فرض نہیں۔۔۔ جب کہ ابو پہلے ہی اپنا حصہ وصول کرچکے تھے۔ اور یہ بات بڑی امی نے جب ان سے کہی تو ان کا جواب کیا تھا؟“

صفیہ نے سر اٹھایا۔ وہ ان ہی سے پوچھ رہی تھی۔ صفیہ کی نگاہیں بڑی امی پر جم گئیں۔ یہی سوال تو برا لگا تھا۔ کیوں پوچھا تھا انہوں نے شوہر سے۔۔۔؟ یعنی جٹھانی کو ان کی آمد ناگوار گزری تھی جب ہی تو سوال اٹھایا تھا اور یہ بات کل رات بھی صفیہ نے بیٹی کے سامنے دہرائی تھی جب وہ احسان گنوا رہی تھی‘ اتنے سال پہلے کی وہ رات۔۔۔ اس سوال کی چبھن آج تک باقی تھی۔ جیٹھ کا جواب سنا ہی نہیں (حالانکہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنی کسی بھی الجھن کا سوال کا جواب طلب کرنے کا حق محفوظ رکھتی تھیں)

”آپ تایا ابو کا جواب بھول گئیں امی! مگر میں نہیں۔“ اس کا لہجہ پگھلنے لگا۔

”اس گھر میں مجید کا کوئی حصہ نہیں سمیرا کے ابو!“

”ہاں۔۔۔!“ عبدالعزیز نے تسلیم کیا‘ لیکن میرے دل میں تو اس کا حصہ ہے نا۔ وہ میں نے اسے کبھی نہیں دیا۔ وہ آج بھی وہیں رہتا ہے۔ گھر تو بہت بے کار سی چیز ہے‘ دولت جائیداد‘ زر زمین میں سے حصہ دیا جاسکتا

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے دل کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔“

کمال ہے حمیرا کو من و عن سب یاد تھا حالانکہ یہ تو بہت پرانی بات تھی۔ بہت چھوٹی بچی تھی وہ اس وقت تو اس نے اس اتنی خاص لاجواب کردینے والی بات کو یاد رکھا تھا اور اس کی اصل روح کو پہچانا تھا۔

”کمال ہے۔“ صفیہ چونکی تھیں۔ ہاں عبدالعزیز بیوی کو کچھ جواب دے تو رہے تھے، مگر وہ ”سوال“ کی چبھن کے احساس میں ایسی کھوئیں کہ سنا ہی نہیں سمجھنا تو پھر دور کی بات ہے۔

”اور پھپھی آپ...! آپ صرف نام کی بھولی نکلیں۔ ورنہ آپ کے حساب کتاب اور جوڑ توڑ سے تو صاف پتا چلتا آپ کا بھولپن سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا۔“

”کیسے طریقے سے آپ نے وقت گزارا۔ جس لڑکی کے مکھن ورگے ہتھ پیروں کو سراہتی تھیں ”ان میں آج کیا کیڑے پڑگئے؟ کیسا درست استعمال کیا آپ نے انسانوں کا...

میں تو آپ کو بہت سیدھا سادا، صاف گو، حقیقت پسند انسان سمجھتی تھی۔ بڑی قدر تھی آپ کی میرے دل میں... مگر ایسی حقیقت پسندی...“ اس نے جھرجھری لی ”وہ نہ کبھی دیکھی نہ سنی کہ آپ خود اپنے بیٹے کے خدانخواستہ مرجانے کا گمان کرتی ہیں۔ توکل نہ سہی مامتا ہی سہی... مرنا تو خیر ہر ایک نے ہے ہی... مگر ایسی انوکھی بات نہ دیکھی نہ سنی کہ جی بہو باہنر اس لیے لانی ہے کہ بیٹا مرجائے تو وہ گھر کو سنبھال لے... کس گمان میں جیتی ہیں آپ... ہر عورت بیوہ رہتی نہیں ہے کیونکہ ہر عورت بھولی یا صفیہ بھی نہیں ہوتی کہ ایک شخص کے نام کو حرفِ آخر سمجھ کر جیے... بیوہ راہ بدل بھی تو سکتی ہے، بچے چھوڑ کر بھی چلی جاتی ہیں۔ نیا گھر بسالیتی ہیں پھپھی... آپ کس خدشے میں جی رہی ہیں؟“

وہ حقیقتاً ”شدید حیرت کا شکار پھپھی سے جواب کی منتظر تھی اور پھپھی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ”ہاں یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں۔“ حمیرا کی تقریر سنی تو پل بھر بھی وہ سب عورتیں بھی یاد آگئیں جو بیوگی کے چار چھ ماہ بعد بچے ادھر ادھر چھوڑ چھاڑ کر نئی دنیا بسا کر چلی گئیں، لیکن... اگر وہ اپنے حساب سے سوچتی تھی تو کوئی غلط تو نہیں تھا۔ اس نے کس مشکل سے بچوں کی روٹی پوری کی تھی۔ اگر بے ہنری ہوتی تو؟ اس نے سوئی سے سی تھیں روٹیاں... جب ہی تو بیٹیوں کو طاق کرکے اگلے گھر بھیجا تھا۔ وہ اپنی سوچ میں بالکل درست تھی، لیکن یہ جو حمیرا نے دوسری بات کی طرف دھیان کروایا تو وہ...

پھپھی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ وہ باز نہیں آسکتی تھی۔ اتنے مشکل تھے بیوگی کے سال کہ ہر چیز کا تاریک پہلو پہلے نظر آتا تھا۔

اس وقت بھی اسے یہ دکھائی دینے لگا۔ اللہ دتا مرگیا ہے اور بہو نئی دنیا بسا کر یہ جا وہ جا... اور... وہ اس کے پوتے پوتیاں رلتے پھرتے۔

”ہائے...“ پھپھی بھولی کے دل پر ہاتھ پڑا۔ آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ ہول خراش منظر...

یہ حمیرا نے کیا کہہ دیا تھا۔ کیا دکھا دیا تھا۔

پھپھی کی نگاہیں حمیرا کی جانب اٹھیں، مگر وہ متوجہ نہیں تھی وہ صفیہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔

”آپ کو **معید** کے رشتے کے لیے منع کرنا تھا امی...! تو آپ بس یہ کہہ دیتیں کہ آپ کو کرنا نہیں ہے۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”آپ نے **معید** کے لیے اتنے برے الفاظ استعمال کیے امی...“ اسے اپنی تکلیف بیان کرنے کے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

”آپ نے کہا کہ **معید**، وہ...“

”حمیرا...“ بڑی امی نے تڑپ اٹھنے والے انداز میں اسے ٹوکا تھا۔ ”وہ سب مت دہرانا۔“

”کیا... کیا سب...؟“ وہ چونکی۔ صفیہ نے بھی سر اٹھایا تھا۔ وہ کس بات کو دہرانے سے منع کررہی تھیں۔ انہیں کیا پتا حمیرا کیا کہنے والی ہے۔

”میں نے رات تم ماں بیٹی کی ساری باتیں سن لی تھیں۔“

”اوہ...“ صفیہ کے منہ سے سانس خارج ہوئی

بڑی امی نے وہ۔۔۔ سب۔۔۔ سن۔۔۔ لیا تھا۔ وہ سب جسے یاد کرنے سے بھی اسے تکلیف ہوتی تھی۔

اب وہ کیا بولے۔۔۔ صفائی دے، مگر کیسے۔۔۔ جھٹلا دے، مگر جھٹلا دینے سے کوئی حقیقت بدلتی ہے۔

"اوہ!" اسے یک دم یاد آگیا جیسے جان واپس آگئی۔ ہاں اسے صفائی کی کیا ضرورت ہے۔

"اگر آپ نے رات ہم ماں بیٹی کی باتیں سن لی تھیں تو۔۔۔" وہ قصداً رکی۔ "تو پھر آپ نے میرے جواب بھی سن لیے ہوں گے۔"

بڑی امی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہاں اس کے جواب یعنی اس کی رائے۔۔۔

باتیں چھپ کر سنی تھیں سو سچائی پر انگلی نہیں اٹھا سکتی تھیں اگر ماں سچ بولی تھی تو بیٹی بھی۔۔۔ اور اس کی آنکھیں بھی اس وقت یہی جتا رہی تھیں کہ بڑی امی آپ نے میرا سچ بھی تو سن لیا تھا نا۔۔۔

حمیرا کا دل مضبوط ہو گیا، مگر یہ کیا بڑی امی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور کیا کہہ رہی تھیں۔ ان کی مخاطب صفیہ تھیں۔

"تم فکر مند نہ ہو صفیہ۔۔۔ تمہیں انکار کی ضرورت نہیں اور نہ جواز کی۔۔۔ سمیرا کے ابو چھ سال پہلے ہی اس رشتے کو نہ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"کون سا رشتہ۔۔۔؟" حمیرا چونکی۔ سمیرا اور اے ڈی کا۔۔۔

"**معید** اور حمیرا کا رشتہ۔۔۔" بڑی امی نے الجھن رفع کی۔ ایک نظر تینوں پر ڈالی۔ پھپھی تو سوچوں کے نئے جہان میں غرق ہو چکی تھیں۔ انہیں جیسے کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا جبکہ یہ ماں بیٹی۔۔۔ صفیہ فقط حیران تھیں یہ کب ہوا۔ انہیں تو نہیں معلوم۔۔۔

جبکہ حمیرا۔۔۔ اس کا رنگ **لٹھے** کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

وہ بے یقینی سے بڑی امی کو دیکھ رہی تھی جو اپنی بات کہہ کر صحن عبور کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کیسا صدمہ پہنچا تھا۔ بھولی آپا کے انکار سے یا انکار سے زیادہ اس بات کا کہ ان کی بیٹی کو چھوڑ کر حمیرا کا رشتہ طلب کرنے کا۔۔۔ یا پھر صفیہ کے اقرار کا یا دھوکے کا تو دراصل یہ دکھ کی پوری سیریل تھی۔ ایک کے بعد ایک جھٹکا۔۔۔ تین دن سے رو رہی تھیں۔ بازپرس کا دل چاہتا تھا، مگر کیا پوچھتیں اور کس سے؟ دن کا قرار لٹ گیا اور رات کی نیند۔۔۔

حلق خشک ہوا تو پانی پینے باہر آئی تھیں پھر برآمدے میں نکل آئیں۔

ایک عالم محو خواب تھا، لیکن کوئی اور بھی جاگ رہا تھا۔ پر کون۔۔۔؟ باتوں کی آوازیں تھیں۔ عبدالعزیز تو "اللہ مالک ہے" کہہ کر گہری نیند میں چلے گئے اور وہ رشک سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

سوئی ہوئی سمیرا پر خود بھی آیات پھونک کر باہر آئی تھیں۔ تو کیا **معید**۔۔۔ لیکن باتوں کی آواز تو ادھر صفیہ کے پورشن سے آرہی تھی۔ وہ کسی ارادے کے بنا آگے تک چلی آئیں۔

حمیرا کی آواز بلند تھی اور صفیہ کے حسب عادت دھیمی۔۔۔ مگر رات کی خاموشی میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر یہ وہی باتیں تھیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے اس سے اچھا تھا۔ ہم بہرے ہوتے، مگر جو عذر صفیہ نے ڈھونڈے تھے۔ دل زرات سے بھرا ہوا تھا ان باتوں کو سننے کے بعد تو گھر کی دہلیز پھلانگ گئیں اور پھر صبح صبح۔۔۔ وہ نجانے کیوں بھولی کے گھر کی طرف چلیں۔ پھر وہاں ان سے پہلے صفیہ موجود تھیں اور پھر حمیرا بھی آگئی اور پھر جو کچھ ہوا وہ کسی سے تو کہنا تھا۔ تو بہترین سامع بیٹی کے علاوہ اور کون ہوتا۔

اور سمیرا اس کی سوجی آنکھیں۔۔۔ وہ چھپ کر روتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا، مگر اس وقت وہ فقط حیران تھی، بے یقین، ماں سے وہ سب کچھ سن رہی تھی جو رات ماں نے سنا تھا صفیہ اور حمیرا کی بھی باتیں۔۔۔

☆ ☆ ☆

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”اتنے خاموش تو تم نہیں ہوتے؟“ عبدالعزیز نجانے کب سے معید پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔

”میں۔۔۔ خاموش۔۔۔؟ نہیں تو۔۔۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”میں تو اخبار پڑھ رہا تھا۔“

”اتنا اخبار بھی تم کبھی نہیں پڑھتے؟“ وہ آخر اس کے باپ تھے۔

”ہاں بس وہ۔۔۔“ اس نے اخبار کا صفحہ پلٹا پڑا مگر نظر آ رہا تھا نجانے کس خبر کا بقیہ پڑھنے کی عجلت تھی۔

”اور۔۔۔؟“ عبدالعزیز اس کے سر پر پہنچ گئے۔

”الٹا اخبار تو تم کبھی بھی نہیں پڑھتے تھے۔ یہ ہنر کب سے سیکھا۔“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”اوہ اچھا تو یہ الٹا تھا۔۔۔“ اس نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ فوراً ”سیدھا کیا اور پڑھنے بھی لگا۔

”کیا چھپانا چاہ رہے ہو بیٹا۔۔۔؟“

”کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں ابو۔۔۔؟“ اس نے اخبار لپیٹ دیا۔

”صفیہ کے انکار سے دکھ ہوا ہے؟“

”آپ کو ہوا ہے۔۔۔؟“ اس نے پہلے ان کا حال دل جاننا مناسب سمجھا۔

”نہیں۔۔۔“ وہ سچ کہہ رہے تھے۔

”تو پھر مجھے بھی نہیں ہوا۔“ وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”جوابدہ۔ ختم ہوا۔ بڑا بن رہے تھے عبدالعزیز ”افتخار احمد“۔۔۔ ہونہہ!“

”ابھی جھوٹ بولنے میں اتنی مہارت بھی حاصل نہیں کی کہ اپنے باپ کو چلاؤ گے۔“

”اوہ۔۔۔!“ وہ پیارا سا مسکرایا۔ ”میں بھی آپ کے بارے میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔“

”ہم یہاں مکالمہ بازی کرنے نہیں بیٹھے معید۔۔۔!“

”تو پھر آپ ہار مان لیجیے۔“

”یعنی تم نہیں بتاؤ گے کہ تم دکھی ہو۔“ سوال سے زیادہ دکھ ان کے لہجے میں تھا۔

”آپ نہیں ہیں۔“ اس نے ہار مان لی۔ آنکھوں سے شکستگی جھلکنے لگی تھی۔

”ہوں۔۔۔ باوجود اس کے کہ میں تو چھ برس پہلے ہی اپنے خواب سے دستبردار ہو گیا تھا۔“ عبدالعزیز نے بھی سچ کہا۔ اسی میں عافیت نظر آئی تھی۔

”تو پھر میرا بھی یہی جواب ہے ابو۔۔۔! چچی جان کا حق ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا بھلا چاہیں اور صرف وہ ہی کیوں؟ کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ اسے زندگی میں بہت خوشیاں ملیں۔ اسے غم کی ہوا نہ لگے اسے۔۔۔“ وہ بولتا چلا گیا۔ خواہش یعنی وہ دعائیں جو وہ اس کے لیے کرتا تھا۔

”اسے۔۔۔؟ اس کا نام کیوں نہیں لیتے۔۔۔ حمیرا۔۔۔“ یاد دہانی کے لیے نام دہرایا۔ عبدالعزیز کو ”اسے“ کے تخاطب سے ظاہر ہوتی اجنبیت کھلی تھی۔ معید عبدالعزیز چونکا پھر مسکرا دیا۔

”تکلیف ہوتی ہے ابو۔۔۔ لگتا ہے کھو دیا۔ یہ اجنبیت برقرار رہے استقامت کے لیے ضروری ہے۔“ تو اس نے اپنا اندر کھول دیا تھا۔

”جب چھ برس پہلے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا تھا تو اس وقت ایسی باتیں کیوں؟“ عبدالعزیز کو اپنا بڑھاپا پہلی بار زیادہ محسوس ہوا یا اپنی بے بسی۔

”میں تو نہیں کر رہا۔ آپ اگلوانے کی قسم کھا کر آئے ہیں۔“ اس نے باپ کو گھورا۔

وہ ان کے قد سے کچھ اونچا تھا۔ عمر میں بہت چھوٹا۔۔۔ مگر وہ اس پوری دنیا میں ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے۔ سب سے پکے والے۔ ایسے دوست جو دل کی باتیں ایک دوسرے سے کر سکتے تھے بلکہ کہے بغیر بھی سمجھ سکتے تھے۔

دکھ صرف یہ ہے ”تکلیف اس چیز کی ہے کہ چچی اتنا سب پلان نہ کرتیں۔ سمیرا کی جگہ حمیرا۔۔۔“

”اسے یہی بہتر لگا ہو گا حمیرا کے لیے۔۔۔“

”مگر یہ ہو نہیں سکتا۔۔۔“ معید کا قطعی پن نمایاں تھا۔

”کیا مطلب؟“ عبدالعزیز چونکے۔

”جتنا میں اے ڈی بھائی کو جانتا ہوں وہ کبھی نہیں مانیں گے۔“

”اور حمیرا بھی نہیں مانے گی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"کیا؟"

"اے ڈی سے شادی... کسی سے بھی کرے گی، مگر اس سے نہیں۔" عبدالعزیز کیا اتنا بھی نہ جانتے حمیرا کو...

"دعوے مت کریں ابو! پھر دکھی ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا خبر وہ بھی چچی کی ہم خیال ہو۔ وہ اب صرف آپ کی پیاری بھتیجی نہیں رہی، اتنی بڑی افسر ہے۔ چار سال سے اے ڈی بھائی کے ساتھ ہے بلکہ آج جو کچھ ہے اس میں اے ڈی بھائی کی محنت و دلچسپی کا ہاتھ ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ذہن بھی بن گیا ہو جب ہی پھپھی بھولی نے اتنی بڑی بات کہی اور چچی نے جھٹ مان لی۔"

وہ اس پہلو پر بہت زیادہ سوچ چکا تھا۔ دونوں کا جوڑ بنتا تھا عمروں کا فرق ذرا زیادہ ہو تا مگر...

"لیکن پھر... سمیرا کا کیا ہو گا؟" عبدالعزیز کی نظریں بے ساختہ بیٹے کی جانب اٹھیں اور پھر ہار گئیں۔ وہاں بھی یہی سوال تھا۔

"ہم آپی کے لیے کوئی اور رشتہ تلاش کر لیں گے۔ وہ اتنی پیاری، اتنی اچھی ہیں۔ کون منع کرے گا۔"

"وہ خود کردے گی۔" عبدالعزیز کی آواز کسی کنوئیں سے بر آمد ہوئی۔

"تمہیں نہیں معلوم، اس نے بچپن سے اپنے نام کے ساتھ اے ڈی کا نام جڑا دیکھا ہے۔"

"انہیں اپنے دل کو سمجھانا ہو گا۔ حمیرا کے خوشی کے لیے..." معیذ نے بہن کے لیے کہا۔

"حمیرا کی خوشی کے بچے..."

یہ غضب ناک پکار حمیرا کی تھی۔

* * *

"معیذ سے شادی...!" صفیہ نے کتنی دقت سے یہ تین لفظ کہے تھے۔

"ہاں معیذ سے شادی..." حمیرا نے کتنی آسانی سے ہاں کا اضافہ کر دیا تھا۔

"تمہارا دماغ چل گیا ہے حمیرا... تم خود کو دیکھو اور اسے دیکھو۔"

"کہاں تم اور کہاں وہ..." حیرت کی زیادتی سے صفیہ کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ "تم" کہتے ہوئے اس نے چھت کو دیکھا تھا اور "وہ" بتاتے ہوئے زمین کو... حقارت سے۔

"امی... آپ مجھے یہ بتائیے آپ مجھے کہاں دیکھ رہی ہیں۔ آسمان پر؟ مگر یہ کیوں بھولتی ہیں۔ آسمان کو دونوں ہاتھوں پر بھی اٹھالیں تب بھی پیر زمین پر ہی ٹکانے پڑتے ہیں۔"

"مجھے سبق پڑھا رہی ہو۔ تم کیوں بھولیں، زمین پیروں کے نیچے ہوتی ہے۔" صفیہ نے اپنے تئیں اسے لاجواب کر دیا تھا اور وہ ہو گئی تھی لاجواب۔ ششدر۔

"امی...! آپ یہ معیذ کے لیے کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں...!" صفیہ نے ڈنگ لہجہ اپنایا۔ "تمہارا اس کا جوڑ ہے کوئی... تمہارا معیار..."

"ہاں امی! میرا معیار..." اس نے ہاتھ اٹھایا۔ "ڈرائیور عبدالمجید کی یتیم بیٹی جسے گھر خالی کرنے کا نوٹس ملا تھا اور رات سر پر کھڑی تھی۔ میں بلبل تھی امی! جگنو کی آرزو مند... مجھے آسمان مل گیا امی! آپ بھول گئیں۔ پوری کہکشاں جس نے میری زندگی کو روشن کر دیا اتنا کہ مجھے کبھی رات بھی تاریک نہیں لگی اور آپ کہتی ہیں احسان نہیں کیا تھا۔ چچا، تایا یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ ہیں۔ سر پر ہاتھ امی...؟ ان سب نے مجھے دل میں جگہ دی تھی۔" اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر درد بھرا تھا۔

"ہاں تو اس احسان کے بدلے میں اپنی بیٹی ان کے زمانے بھر کے نکمے بیٹے کو تھما دوں۔ اس میں ہے کیا... ہڈیوں کا ڈھانچہ... چلتے پھرتے بجتا ہے جیسے جھنجھنا۔"

حمیرا کی سانس کہیں اندر ٹھہر گئی۔ امی نے کیا کہا تھا یا اس نے کیا سنا تھا۔

"جھنجھنا؟ یہ آپ نے معیذ کے لیے کہا امی...؟"

"ہاں کون سی ہڈی سلامت ہے اس کی... کو لہے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

میں پلٹیں۔۔۔ ٹانگوں میں راڈ ٹخنوں تک پڑنے لگے ہیں۔ میں نہیں دے سکتی احسان کی اتنی بڑی قیمت۔۔۔ اور احسان بھی کیسا اپنے بھائی ہی کی تو اولاد تھی غیر تو نہیں۔۔۔"

"جب تایا ابو نے رشتہ دیا، وہ ایسا نہیں تھا امی۔۔۔" اس نے یاد دلایا۔

"مگر اب وہ ایسا ہی ہے جیسا میں بتا رہی ہوں۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"آپ کو پتا ہے، آپ کتنی بری باتیں کر رہی ہیں۔"

"یہ مت بولو حمیرا۔۔۔ تم نے اسے کیا غور سے دیکھا نہیں۔ لگتا ہے ہینگر پر کپڑے ٹنگے ہیں۔"

"امی۔۔۔!"

"ہڈیوں پر منڈھی کھال۔۔۔ اس سے زیادہ جسم تو کھیت میں کھڑے کاں گڈے کا ہوتا ہے۔"

"امی جی۔۔۔!" اس کے احتجاج کی شدت نے گردن کی رگیں پھلادی تھیں۔

"ایک آنکھ سے وہ تجھے کیا دیکھے گا، کبھی سوچا۔" صفیہ ہر چوٹ پچھلی سے کاری لگارہی تھیں۔

"امی۔۔۔!" وہ یک دم بے دم ہوگئی۔ (ہاں اس کی دونوں آنکھیں اپنی جگہ موجود تھیں۔ بولتی مسکراتی اور اب تو ان میں زندگی کے نئے رنگ خواب اور عزم بھی جھلکنے لگے تھے، مگر ایک سے کم دکھائی دیتا تھا، مگر یہ عیب نظر تو نہیں آتا تھا۔

ہاں وہ دبلا پتلا رہ گیا تھا، مگر نقش تو ویسے ہی دل میں اتر جانے والے تھے۔ ہاں وہ۔۔۔) "اس کی تو ایک آنکھ گئی تھی امی۔ اور آپ نے اپنی دو آنکھوں سے اسے اتنا برا دیکھا۔" وہ آگے بول نہ سکی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی اور اس کا رونا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس لیے کہ وہ روتی ہی نہیں تھی۔۔۔

"میری بچی۔۔۔!" صفیہ اس کے ساتھ لگ گئیں۔ "میں تیری ماں ہوں تیرا برا کیوں چاہوں گی۔ تیرا جوڑ اے ڈی یا پھر اس جیسے بندے کے ساتھ ہی سجے گا۔ میں کہہ دوں گی بھائی عزیز سے۔۔۔ اتنی بڑی قیمت نہ وصولیں۔ اپنے بیٹے کے لیے انہیں اور بہت سی مل جائیں گی، میں اپنی بیٹی کو اس احسان کے بوجھ تلے دبنے نہیں دوں گی۔"

وہ اس کے آنسو صاف کر رہی تھیں۔ پچکار رہی تھیں۔ ماں کا سب سے خوب صورت روپ۔

"نہیں۔۔۔" اس نے صفیہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔ "آپ سے کس نے کہا مجھے احسان اتارنا ہے، میں اتار بھی سکتی ہوں بھلا۔۔۔؟ مجھ روتی کو ہنسایا تھا امی ان سب نے۔۔۔" اس کا لمبا ہاتھ عبدالعزیز کے پورشن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "ہنسی کی قیمت کیسے ادا کروں؟ مجھے رشتے ملے تھے امی۔۔۔ خوشی ملی تھی، خوشی کا احسان اتاروں۔۔۔"

"ان سب چیزوں کو تو میں نے کبھی گنا ہی نہیں کہ اس احسان کا بدلہ اتار ہی نہیں سکتی تھی۔ احسان نہیں نیکی تھی جو تایا ابو نے ہم پر کی ہے۔ اور نیکی کا بدلہ اللہ دے گا نا کہ ہم جیسے گھٹیا انسان۔۔۔ اور آپ امی۔۔۔ آپ کم بولتی تھیں، اچھا کرتی تھیں۔ آج زیادہ بول کر آپ نے کیا ستم ڈھایا۔ کوئی اپنوں کا ایسے مذاق اڑاتا ہے، اتنی بری باتیں تو غیروں کے لیے بھی نہیں کہتے۔ جھنجھنا اور ہینگر۔۔۔ آپ کی سوچ امی۔۔۔"

"تم اپنی ماں سے بدتمیزی کر رہی ہو حمیرا۔۔۔ اتنے علم نے یہ نہیں بتایا کہ ماں کو کیسے مخاطب کرتے ہیں۔"

"علم ہی نے تو زبان بند کردی امی۔۔۔ ورنہ آپ کے خیالات کے انکشاف کے بعد کیا کیا اس دل میں آیا تھا، مگر میں آپ کی بات مان بھی نہیں سکتی۔ شادی تو مجھے معید عبدالعزیز سے ہی کرنی ہے۔" اس کا جملہ دو ٹوک تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" صفیہ کی اتنی اونچی آواز ان در و دیوار نے بھی پہلی بار سنی تھی اور اس کے ساتھ ہی برے القابات و خطابات کا ایک نیا سلسلہ تھا جو کوہ ہندوکش کی پہاڑوں سے زیادہ پھیل گیا۔

اور خیال۔۔۔ تعفن زدہ۔ بھبکے، تنگ اور جیسے گٹر کا ڈھکن کھل جائے۔

"تمہیں میری بات ماننا ہوگی حمیرا... اے ڈی نہ سہی کوئی اور سہی، مگر معید کبھی نہیں۔"

صفیہ خود ہی تھک کر بات ختم کرنے پر آگئیں۔

"اور یہ بات میں کبھی نہیں مانوں گی۔" وہ بھی امی کے لہجے میں بولی تھی۔

دونوں ماہ بیٹی روبرو ایک دوسرے کو تکتی جاتی تھیں۔ ایسی خاموشی چھا گئی جیسے کمرے میں کوئی ہے ہی نہیں... پھر صفیہ ہی انھیں بستر درست کرنے لگیں جیسے اپنی بات ختم کرکے اب سکون کی نیند لینے کا ارادہ ہو۔

"مجھے اندازہ تھا ہمیشہ سے... مگر یقین آج ہوگیا۔"

صفیہ کے ہاتھ پل بھر کو رکے۔ "کس بات کا یقین؟"

"آپ حسد کا شکار ہیں امی!"

صفیہ نے تیزی سے پلکیں اٹھائیں۔ "تم اپنی ماں کو کہہ رہی ہو یہ۔"

"حسد گالی نہیں ہے۔ ایک کیفیت ہے۔ جو صحیح غلط کی تمیز کو بھلا دیتی ہے۔ اندھا کردیتی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" صفیہ واقعی تلملا گئیں۔

"بکواس نہیں ہے امی، یہ سچ ہے۔" وہ صفیہ کی حالت کے برعکس بہت پرسکون تھی۔ جیسے کسی نتیجے تک پہنچ گئی ہو۔

"بہت بچپن میں... جب ہم یہاں آگئے تھے۔ مجھے تب بھی یہ احساس ہوتا تھا مگر سمجھ نہیں پاتی تھی لیکن آج میں نتیجہ نکالنے کے قابل ہوچکی ہوں تو یاد آتا ہے۔ آپ نے کبھی سمیرا کو عید شبرات پر بھی پچکار کر یہ نہیں کہا۔ "ماشاءاللہ بڑی پیاری لگ رہی ہو۔" میرے متوجہ کرنے پر بھی یا تو ان سنی کردیتی تھیں۔ یا پھر اک سرسری نگاہ پر ڈال کر ہاں ہاں کہہ کر جان چھڑا لیتی تھیں اور میں سوچتی تھی۔

میرا ماتھا جس طرح بڑی امی چومتی ہیں آپ نے تو کبھی اس طرح سمیرا کو پیار نہیں کیا۔ معید کو آپ نے پھر بھی نظر بھر کے دیکھا شاید اس کی وجہ تایا ابو کی خواہش رہی ہو۔ مگر خیر بعد میں تو آپ نے اس کا صفحہ ہی پھاڑ دیا گویا۔

"بلاوجہ کے اندازے مت لگاؤ حمیرا۔" صفیہ نے رعب سے کہا۔

مگر حمیرا کا دھیان نہیں تھا۔ وہ دیوار پر لکھا سبق پڑھ رہی تھی جیسے۔

آپ نے ہمیشہ مجھے سمیرا جیسا بننے کی ترغیب دی۔ مجھے گہرے شوخ رنگ پسند تھے۔ آپ میرے لیے زبردستی ہلکے رنگ لاتیں۔ اور پرزور اصرار سے پہناتی تھیں۔ میں بازار میں اپنی پسند کی چیز پر ہاتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اور آپ کن اکھیوں سے سمیرا کو دیکھتیں کہ وہ کیا لینا چاہتی ہے۔ وہ کیا کھاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ موٹی ہے۔ پتلی ہے' اچھی ہے بری ہے۔ آپ نے ہمیشہ مجھے اس جیسا بنانا چاہا۔ یہ سوچے بناء کہ میں ایک الگ انسان ہوں۔ میری سوچ' انداز رویے دوسرے انسان سے یقیناً" الگ ہوں گے۔ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں خود سے کیا چاہتی ہوں۔ میری اپنی ایک شخصیت ہے۔ اور اپنی قسمت۔

والدین اولاد کی خوشی کے لیے ہر حد پھلانگ جاتے ہیں۔ مگر یہ کیا کہ آپ سمیرا سے خوشیاں چھین کر میری جھولی میں ڈال دیں۔ اور صرف سمیرا کا رونا کیوں... آپ کو اندازہ ہے آپ کی بھائی ریاض والی بات اگر پوری ہوجائے یعنی میری اور بھائی ریاض کی شادی' اس نے بدقت کہا۔ (جو بات کہنی اتنی مشکل ہو اس پر عمل کتنا کٹھن ہوگا) تو تایا ابو کے دونوں بچے آزردہ ہوں گے۔ آپ دونوں سے ان کی خوشیاں چھین لینا چاہتی ہیں اور ان کو بھی چھوٹے۔ ان سے تو بلاجواز دشمنی نباہنا تھی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میں کتنی ناخوش ہوں گی۔"

"معید... تمہاری خوشی کب سے بن گیا۔" صفیہ نے دانت پیسے تھے۔

"ہمیشہ سے امی..." اس کے لہجے کی تیزی نے صفیہ کو حیران کردیا۔

"اس کا حال دیکھا ہے تم نے۔"

"ہاں کیا ہوا اسے؟" وہ واقعی معصوم تھی یا... بے وقوف' اندھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا حمیرا۔"

"یہ ہو کر رہے گا امی۔"

اس میں کیا بچا ہے جسے سمیٹنے کے لیے اپنی عمر گھلانی ہے۔ "صفیہ سر پیٹ لینا چاہتی تھی۔ ملبہ، کھنڈر۔۔۔ ڈھانچہ رہ گیا ہے صرف۔"

"ملبے پر دوبارہ گھر کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ کھنڈرات بستیوں میں بدل جاتے ہیں۔" وہ مسکرائی تھی۔

"میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم معید کا نام لوگی اور وہ بھی اس طرح۔" صفیہ کی حیرت بجا تھی۔ لڑکیاں تو بڑے ہیرو ٹائپ کے آئیڈیل شریک حیات کا خواب دیکھتی ہیں۔

"وہ مجھے اچھا لگتا ہے امی۔"

Downloaded From Paksociety.com

"اس حال میں۔"

"ہر حال میں امی۔"

"کیوں؟" حمیرا کی نگاہیں بے ساختہ اٹھیں۔ چمکتی آنکھیں۔۔۔ مسکرائیں۔

"ہاں یہ سوال آپ نے صحیح کیا۔ کیونکہ یہ میں نے خود سے بھی کئی بار کیا ہے پر جواب نہیں ملا' وہ ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔ اتنا کہ میں نے اس کے علاوہ کبھی کسی اور کو سوچنا تو دور نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں۔۔۔ اور دیکھنے کو بھی چھوڑیں۔۔۔ نظر ہی نہیں اٹھی۔"

صفیہ کا منہ کھل گیا۔۔۔ کون بیٹی ہوگی جو ماں کے سامنے اس طرح دل کھول دے مگر وہ حمیرا عبدالمجید تھی۔ جو سوچا کہہ دیا۔

"اے ڈی نہ سہی۔۔۔ مگر معید کبھی نہیں۔۔۔" بہت دیر بعد صفیہ بول سکیں۔ سمیرا کے لیے اے ڈی جیسا شوہر اور حمیرا کے لیے معید۔۔۔ ناں" صفیہ کے انداز کی قطعیت اور بے رحمی خوفناک تھی' وہ مسلسل دائیں بائیں گردن ہلا رہی تھیں۔

سمیرا کے لیے اتنا تضحیک آمیز انداز کیوں اپناتی ہیں امی۔ کوئی فرق نہیں ہے سمیرا اور حمیرا میں۔۔۔ یا پھر وہی کہ وہ حسد جو برباد کر دینا سکھاتا ہے اور۔" حمیرا حسد کو مزید واضح کرنے لگی تھی۔ مگر۔۔۔

صفیہ کے ایک تھپڑ نے اس کا منہ بند کر دیا۔ اس کا ہاتھ۔۔۔ بے ساختہ گال پر ٹھہرا تھا۔ حیران نگاہیں ماں کی جانب اٹھی تھیں جو غضب ناکی کی حد پر پہنچ کر بے قابو ہو گئی تھیں۔

"خبردار جو دوبارہ میرے سامنے یہ حسد۔۔۔ حسد کی بکواس کی۔۔۔ نہیں ہوں میں حاسد۔۔۔ ہے کیا ان ماں بیٹی میں جو میں ان سے حسد کروں گی۔ اور تمہیں شرم نہیں آتی ماں کے لیے مسلسل یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے۔ تم جیسی اولاد۔۔۔" صفیہ کی آواز یکدم گھٹی۔

بیٹی عجیب سی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میں تو صرف سمیرا کے نام سے حسد کا اندازہ لگا رہی تھی۔ پر آپ تو ماں بیٹی کا لفظ استعمال کر رہی ہیں۔ تو کیا بڑی امی سے بھی؟"

"حمیرا۔۔۔!" صفیہ کے شانے جھک گئے۔

"میں بچی نہیں ہوں امی۔۔۔ میں نے تو بہت کم عمری سے چیزوں کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں حاسد نہیں ہوں۔ میں کسی سے حسد نہیں کرتی۔" صفیہ خود سے ہم کلام تھیں جیسے۔ مگر انداز ایسا تھا جو دراصل قبول کرنے کا انداز ہوتا ہے۔

"امی۔!" حمیرا اپنا گال کو سہلا کر ان کے نزدیک سرکی صفیہ کے ہاتھ نرمی سے تھامے۔ صفیہ کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ "لیکن ۔ ہیرا اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور انہیں کسی قدر پیچھے ہٹاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ وہ حیران رہ گئی۔

اور پھر ساری رات برآمدے کی جالی سے منہ جوڑے وہ چوہے بلی کا کھیل دیکھتے ہوئے ان القابات و جملوں کو یاد کر کے روتی رہی جو صفیہ نے معید کے لیے کہے تھے۔ گھٹیا، جھنجھنا، ملبہ، کھنڈر، ہینگر اور ڈھانچہ اتنی ساری باتیں۔

اتنا تکبر، اتنا غرور۔

* * *

"چچی کے دل میں کیا تھا اور کیوں تھا کو چھوڑیں۔۔۔ حمیرا ایسی نہیں ہے۔" سارا قصہ سن کر سمیرا کے لبوں سے بے ساختہ گواہی نکلی۔

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ لاکھ چیخے گی۔ محبت کے دعوے کرے گی مگر تمہارے ابو بھی نہیں مانیں گے۔" بڑی امی شوہر کے مزاج اور فیصلوں سے واقف تھیں۔

"کیا نہیں مانیں گے؟" سمیرا سمجھی نہیں۔

"یہی... حمیرا اور معید کی شادی۔"

"اوہ..." سمیرا کو سب یاد آگیا۔

"جب وہ صفیہ اور حمیرا کو یہاں لائے۔ بہت دکھی تھے۔ بھائی کے لا ابالی پن... پڑھنے لکھنے سے عدم دلچسپی گاڑیوں اور ریسوں کے شوق میں پڑ کر وہ الگ ہی مزاج کا بن گیا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بالکل الگ تھا۔ باقی خاندان کے لوگوں کی نسبت... کچھ بڑے بزرگ تو اسے صاف آوارہ کہتے تھے۔ حالانکہ یہ آوارگی نہیں تھی بلکہ بس وہ ذرا الگ مزاج کا تھا۔

اور پھر جب اس نے صفیہ سے شادی کی۔ انہیں صفیہ پر اعتراض تھا۔ ایک اتنی ہٹ دھرم لڑکی اچھی بیوی ثابت نہیں ہوگی جو ماں باپ کے سامنے اکڑ جائے؟ انہیں اتنا مجبور کردے۔ تو اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے۔ ہاں بعد میں... یعنی اب وہ صفیہ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اس نے واقعی عبدالمجید سے محبت کی تھی اور بیوہ ہونے کے بعد بھی باقی کی ساری زندگی جس عزت سے اس کا نام سنبھالتے ہوئے گزاری وہ قابل تحسین ہے۔

مگر اس وقت عبدالمجید کے انتقال کے بعد... وہ بھائی سے خفا تو تھے۔ مگر کوئی تعلق تھوڑی ختم ہوا تھا۔ خون کا رشتہ تھا یہ...

وہ اپنا حصہ لڑ جھگڑ کر لے جاچکا تھا۔ یہ سارا گھر اب تمہارے ابو کا تھا۔ مگر انہوں نے اگلی ہی صبح... مزدور بلوا کر گھر کے بیچ دونوں ماں بیٹی کے لیے باقاعدہ پورشن بنوادیا۔ ساری ضروریات و سہولیات کو مد نظر رکھ کر... کچن بنایا مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وہ چاہتے ہیں گھر میں ایک ہی دستر خوان لگے۔ اور ان سب چیزوں کو دیکھ کر صفیہ بے یقین رہتی تھی۔

لوگ، رشتے دار آآکر پوچھتے تھے۔ عبدالمجید تو اپنے حصے سے بڑھ کر لے چکا تو اب یہ سب؟ تمہارے ابو اپنے دل پر ہاتھ رکھتے۔

"وہ زمین کا حصہ تھا۔ اور یہ میرے دل کا حصہ ہے۔"

صفیہ کی شادی کے لیے اٹھائے گئے قدم... حمیرا کی منزل کھوٹی کرسکتے تھے۔ بڑی کھوجتی نظروں سے دنیا حمیرا کو دیکھتی تھی۔ اس کی شوخیوں و شرارتوں کو آنے والے وقت میں ماں جیسی ہونے کے گمان میں جانچتے۔ تب تمہارے ابو نے اعلان کردیا وہ حمیرا کو اپنی بہو بنائیں گے۔

اور تب ہی میں نے پہلی بار صفیہ کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ سکون بھی ابھرتا دیکھا تھا۔ اسے تمہارے ابو کی محبت و خلوص پر یقین آگیا تھا۔ لیکن۔" بڑی امی خاموش ہوگئیں۔

سمیرا بھی جانتی تھی۔ قصے کو کہاں آکر رک جانا تھا۔ اسی لیکن پر...

سمیرا نے قصداً منہ پھیر لیا۔ ماں دو چار دن سے مسلسل رو رہی تھیں۔ مگر اب جو نمی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ اور بہہ جانے کو تھی۔ وہ بیٹے کے لیے تھی اور وہ اس کے حوالے سے کبھی نہیں روتی تھیں۔

بس ایک بار۔ بس ایک بار روئی تھیں۔ ویسے جیسے کہ ماؤں کو جوان بیٹوں کے مرنے پر رونا چاہیے۔

ابھی کچھ دن پہلے تو کالج میں داخلہ لیا تھا۔ ابھی ہفتہ پہلے تو اس کے سارے تنگ ہوجانے والے کپڑے نکال کر نئے سائز کے کپڑے جوتے بنوائے تھے۔

اتنا لمبا، تنومند، باڈی بلڈر جیسا گلال سرخ گالوں، سنہرے بال اور اور چمکتی شریر آنکھوں والا بیٹا... اور لوگ کہتے ہیں وہ اب نہیں ہے۔

وہ حالت رکوع کی طرح جھکی تھیں اور اللہ پکارتی ہوئی سیدھی کھڑی ہوئی تھیں اور آسمان کو دیکھ کر روتی چلی گئی تھیں۔

مگر پھر جب انہیں پتا لگا۔ نہیں... ان کا بیٹا زندہ ہے۔ تب انہوں نے آنسو پونچھ لیے... اور پھر کبھی نہیں روئیں... جس اللہ نے اس حال میں زندہ رکھا

تھا۔ وہ آگے بھی بچالے گا۔

مگر آج اتنے سالوں بعد آنکھوں میں آتی یہ بے بس نمی بیٹے کے لیے تھی۔ بیٹا معید عبدالعزیز۔

کرچیاں دوبارہ نہیں جڑتیں... لیکن اگر اللہ جوڑے تو... اس سے کیا ناممکن ہے۔ کیا چیز ہے جو اس کے اختیار میں نہیں۔

جب انسان کے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ تب اللہ شروع ہوتا ہے۔ تو صرف اللہ... کیا اللہ... واہ اللہ۔

وہ... وہ معید عبدالعزیز نہیں رہا تھا۔ وہ شہزادوں جیسا۔

مگر شہزادہ... شہزادہ ہوتا ہے۔ لگنے کی کیا بات ہے۔ وہ بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہاں دبلا پتلا تھا۔ پائلٹ نہیں بن سکا تھا افسر بھی نہیں بنا۔

اور صفیہ... جب ناہید، بیٹے کو سہم کر دیکھتی تھیں۔ ماں تھیں ناں... وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

تب صفیہ... بھی ماں تھیں ناں... بیٹی کی ماں۔

اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ عبدالعزیز جیسے حساس اور محبت کرنے والے انسان ایک ماں کی آنکھ کا خوف نہ پڑھتے۔

خدشات... جو چیخ چیخ کر کہتے تھے۔ "پیاری بیٹی کے لیے کیا یہ معید عبدالعزیز؟"

اور تب ایک رات عبدالعزیز نے ناہید کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ اپنے خواب سے دستبردار ہوتے ہیں۔

وہی خواب مرحوم بھائی کی بیٹی کو بہو بنا کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے کا خواب۔ وہ کیسے اتنے ظالم ہو سکتے ہیں کہ... اپنے بیٹے کی حالت کو نظر انداز کر دیں۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" ناہید کا یقین پہاڑوں سے بڑھ کر تھا۔

"لیکن اگر نہ ہوا تو...؟"

"تو تب کی تب دیکھی جائے گی۔" ناہید حقیقت پسند بھی ہو چکی تھیں۔

"لیکن میں اپنے اور تمہارے اور بالخصوص معید کے ذہن میں یہ بات ڈال دینا چاہتا ہوں کہ ضروری نہیں ہر خواب تعبیر پالے۔"

"وہ ٹوٹ جائے گا۔" وہ تھیں تو ایک ماں ہی۔

"نہیں..." وہ مسکرائے۔ "میرا فیصلہ، یہ اعلان... اسے جڑنے میں مدد دے گا۔ تم دیکھ لینا۔"

اور تھا تو معید عبدالعزیز بھی ان کا بیٹا... پھر ان جیسا کیسے نہ ہوتا۔ وقت گزرا... وہ جڑ گیا... ٹھیک ہو گیا۔

لیکن اس نے اپنے قدم خود بخود پیچھے کر لیے۔ نظریں پھیر لیں... حمیرا کا حق تھا، اسے اس جیسا قابل اور کامل شریک حیات ملے۔ وہ خود بہت اچھا تھا۔ بہت پیارا بھی... سامنے سے دیکھنے والا کوئی بھی شخص نہیں بتا سکتا تھا کہ جسم کتنی شکست ریخت کے بعد جڑا ہے۔

"ہاں یہ ضرور غلطی ہو گئی کہ ہم نے صفیہ کو نہیں بتایا۔ بتا دیتے تو شاید وہ ایسی منصوبہ بندیاں نہ کرتی۔ لیکن سمیرا...! اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اجنبی کی اجنبی ہی رہی۔ ہم اتنے سال ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے رہے۔ مگر ہم نے کبھی ایک دوسرے سے دل کی باتیں نہیں کیں۔ نہ میں نے... یا پھر میں کرنا بھی چاہتی تھی۔ پر وہ اپنے دائرے سے کبھی باہر نکلی ہی نہیں... پتا نہیں کیا وجہ تھی۔ میں نہیں سمجھ سکی۔"

بڑی امی نے یہ الجھن بھی بیٹی کے آگے کھول دی۔ سمیرا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اتنا مت سوچیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"چھوڑ دو میری طبیعت کی خرابی کو..." وہ سخت بے زار و پریشان لہجے میں بولیں۔

"یہ جو اتنا سب کچھ خراب ہو گیا ہے... یہ کیسے ٹھیک ہو گا۔"

"کیا خراب ہو گیا؟" وہ فوری طور پر سمجھ نہ سکی۔

"یہی سب۔"

"بھولی کا ذہن... صفیہ کی سوچ۔ اور وہ حمیرا... اس نے جس بے یقینی اور صدمے سے تصدیق چاہی

READING
Section

تھی کہ اس کا رشتہ ختم کیا جا چکا ہے وہ بھی چھ سال پہلے اور اسے خبر بھی نہیں۔۔۔ اور تمہارا کیا ہو گا سمیرا۔۔۔ اگر اے ڈی بھی ماں کا ہم خیال نکال تو۔۔۔" سمیرا کے منہ سے ٹھنڈا سانس خارج ہوا تھا۔

کیا اے ڈی ماں کا ہم خیال ہو سکتا تھا؟

معید کے حادثے کے وقت وہ انٹر میں تھی۔ بہت خواب تھے اس کے مستقبل کے حوالے سے ' سب سے پہلے تو وہ اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اے ڈی کی طرح۔۔۔ وہ بھی استاد بننا چاہتی تھی۔

مگر معید کے حادثے کے بعد اس نے استادوں کی ایک نئی قسم کو دیکھا اپاہج انسانوں کو زندگی جینا سکھانے والے استاد۔

اس کے دل نے کہا' وہ یہ پیشہ چنے گی۔ تب اے ڈی ہی نے تو اسے سب سمجھایا تھا اس حوالے سے تعلیم اور پھر تربیت حاصل کرنا اور پھر عملی اقدام۔۔۔ بہت کم لوگ اس پیشے کو اپناتے تھے۔ یہاں خدمت خلق کا جذبہ لے کر جانا پڑتا تھا۔

اور آمدنی۔۔۔ اگر ایسا کوئی خیال تھا تو پھر آپ رہنے دیں۔۔۔

اور اے ڈی ان سب باتوں سے واقف تھا۔ اگر وہ مادیت پرست ہوتا تو وہ سمیرا کو کبھی اس شعبے میں جانے نہ دیتا۔

کوئی ایسا کام بتا تا یا پڑھواتا جس کے بدلے میں اچھی تنخواہ اور فوائد حاصل ہو سکیں۔

(ہاں اس نے حمیرا کو اس کی دلچسپی کے پیش نظر ہی میتھس پڑھوایا تھا۔ اور وہ اتنی قابل تھی کہ گولڈ میڈل حاصل کر کے آج ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کی افسر بن گئی اور تنخواہ پوری انچاس ہزار پانچ سو) تو ثابت ہوا اے ڈی کی سوچ ماں جیسی نہیں ہے۔

اسے صرف سمیرا سے دلچسپی تھی۔ نہ کہ سمیرا کے ہنروں سے (سمیرا فی سبیل اللہ کام کرتی تھی)

کیا اس کی سوچ بھی بدل گئی تھی۔ انسانوں کی سوچ بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ محبتوں میں کتنا بھی یقین ہو، دل کو دھڑکا تو رہتا ہی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جھٹکے سے سنبھلی تو گھر لوٹی' نہ تایا ابو تھے نہ تایا کا بیٹا۔۔۔ اتنی صبح کہاں ہوں گے۔ اس نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔ گلی سے گزرتے چنگ چی رکشے کی سائیڈ کرسی پر آدھا ادھورا اٹک کر مین بازار پہنچی۔

معید کا اسٹور صبح صبح ہی کھلتا تھا۔ مگر وہ گیارہ بجے کے قریب جایا کرتا تھا۔ ملازمین صبح کا کام دیکھتے تھے۔ مگر آج۔۔۔ اوہ۔۔۔" معید کی چھوٹی آلٹو باہر موجود تھی۔ اس نے دانت کچکچائے۔

بڑے سے گلاس ڈور سے اسٹور کا اندرونی منظر صاف دکھائی دیتا تھا' وہ سامنے ہی براجمان کسی سے محو گفتگو تھا۔ پھر اس نے "کسی" کو بھی دیکھ لیا۔ اوہ دونوں مجرم' ایک ہی جگہ مل گئے تھے۔ ویئیس ویری گڈ۔۔۔ دروازہ بے آواز تھا۔ وہ بھی سر پر پہنچ کر دھماکا کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس سے پہلے خود بولنا شروع کرتی۔ کان خود بخود سننے لگے۔

عبدالعزیز کچھ کہہ رہے تھے۔ بتا رہے تھے' وہ حمیرا کو جانتے ہیں۔ وہ کسی سے بھی شادی کر لے گی مگر اے ڈی سے کبھی نہیں کرے گی۔

مگر جواب میں جو معید نے بولنا شروع کیا۔ وہ حیران کرنے کے بعد آگ لگانے والے اندازے تھے۔ کیسی بے فکری تھی اس کے انداز میں۔ اور اس نے سوچا بھی کیسے کہ وہ۔۔۔

"تم نے سوچا بھی کیسے کہ۔۔۔ میں سمیرا سے اے ڈی چھین لوں گی۔" اس نے میز پر ہاتھ مارے تھے۔

"آپ بیچ میں سے نکل جائیں تایا ابو۔۔۔! آپ سے میں بعد میں بات کروں گی۔"

وہ ہنوز معید کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ عبدالعزیز کو بھی دیکھے بغیر حکم جاری کیا۔ اس کے انداز کی قطعیت دیکھ کر عبدالعزیز نے باہر نکل جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اور وہ ان کے نکلنے ہی کی منتظر تھی۔ اس نے اسٹور کے گلاس ڈور کو لاک کر دیا۔ ساتھ ہی

وقفہ برائے نماز۔ کا پلاسٹک ٹیگ لٹکا دیا۔

"اس وقت کون سی نماز ہوتی ہے؟" معید کی آواز ابھری۔ وال کلاک ٹیکلوس بجے تھے۔

"نماز جنازہ۔" وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اس کی سمت گھومی تھی۔

"کس کی؟" اس کا سوال عین فطری تھا۔

"تمہاری۔" وہ تین قدموں میں اس کے سر پر پہنچی تھی۔

"میری۔۔۔؟" وہ واقعی دہل گیا۔ "ایسی جوان عمر میں۔"

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے شادی سے انکار کرنے سے۔"

معید کی بولتی بند ہو گئی۔ اسے مزید آگ لگی۔

"اب بولتے کیوں نہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟" اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ اس کے منہ کے سامنے کر کر کے پوچھا۔

"تو تم کو مجھ سے شادی کرنی تھی۔" معید کے لہجے سے پتا لگتا تھا' وہ ابھی تک حمیرا کے موڈ کا اندازہ لگا نہیں سکا۔

"جی ہاں۔" حمیرا نے لمبا سانس اندر کھینچا گویا غصہ پیا۔ صبر کا گھونٹ پیا۔ "کنیز یہی چاہتی تھی۔"

"تو پھر کنیز کو بھیجتیں۔۔۔ تم کیوں کھڑی ہو۔" شاہانہ لہجہ اختیار کیا۔

"کنیز کے بچے۔۔۔" ضبط کی حد یہیں تک تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ معید کے شانے پر زور سے مارا۔ بے چارہ بمشکل سنبھلا۔ کرسی ہل گئی تھی۔

"تم نے میرے بارے میں اتنا غلط سوچا کہ میں اے ڈی بھائی سے۔ اتنی گھٹیا بات۔" اسے اس سوچ پر ہی گھن آئی تھی۔

"میں نے سوچا۔۔۔" وہ غرائی "تم میں اگر سوچنے کی صلاحیت ہوئی تو کسی مقام پر ہوتے اس اسٹور میں نہ بیٹھے ہوتے۔"

معید کے ہلکے پھلکے موڈ پر اس جملے کا اثر ہوا۔ اب کی بار اس نے نگاہ اٹھائی تھی۔ سنجیدہ دو ٹوک۔ قطعیت سے بھرپور۔

"بس یہی بات تھی۔ کہ مجھ میں واقعی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی تو میں بھی کچھ اچھا سوچتا پھر میں نے یہی سوچا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ تم کسی بہت اچھے "قابل" مکمل انسان کو ڈیزرو کرتی ہو جو تمہارے لیول۔"

"تم ہوتے کون ہو میرا لیول طے کرنے والے۔ اور میں نے کب تم سے گزارش کی کہ تم میرے لیے "قابل" انسان ڈھونڈو۔" وہ پھٹ پڑی۔ "میں اپنا اچھا برا سمجھتی ہوں۔"

"اور تمہیں اپنے لیے جو "اچھا" لگا وہ میں ہوں۔" اس کے سوال کی کاٹ جان لیوا تھی۔ پر آگے بھی تو حمیرا عبدالمجید تھی جس نے زور و شور سے سر ہلایا۔

"ہاں!"

"احسان اتارنے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔"

"احسان ؟" وہ چونکی۔

"ہاں وہی احسان۔۔۔ جو ابو نے کیا۔ وہی سب باتیں جو چچی کہہ رہی تھیں قیمت۔۔۔ ان کا اپنا انداز تھا۔۔۔ تمہارا اپنا۔۔۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ وہ ابو کی اپنے مرحوم بھائی سے محبت تھی اور فرض بھی۔۔۔ تمہیں اس فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ کہ تم ترس کھاؤ۔۔۔ اور میں تو حیران ہوں۔ تم ایسا ردعمل ظاہر کر رہی ہو۔ ہمارے درمیان تو کبھی بھی ایسا کچھ نہیں رہا۔"

وہ حمیرا کی پھٹی آنکھوں اور فق ہوتے رنگ سے بے پرواہ ہو کر اپنی کہہ رہا تھا۔

"یاد نہیں۔۔۔ جب ایک بار تمہیں کہانی لکھنے کا جنون ہوا تھا۔ میں تو کہانی میں بھی تمہارا ہیرو بننے کا اہل نہیں تھا۔ تم مجھے رئیل ہیرو کہہ رہی ہو۔ کمال ہے یار۔" اس نے بے پروائی سے بالوں میں ہاتھ چلایا اور مسکرایا بھی تھا۔ دوستانہ مسکراہٹ کتنے مزے سے لاعلم۔ کتنا پرسکون۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی۔ چنگیز خان کھوپڑیوں کے مینار کی بلندی دیکھ کر مسکراتا تھا۔ تو کتنا ظالم تھا جو ایسے عالم میں

مسکرا سکتا تھا؟ یہ سامنے بھی تو چنگیز خان ہی تھا' مارچ دو ہزار سولہ کا ہلاکو خان..... تاتار اعظم۔

اسے مار رہا تھا..... اور ہنس رہا تھا۔

اور سچ بھی کہہ رہا تھا۔ ان کے بیچ کب تھے وعدے وعید..... نظر' حق' مسکان لیکن جب وہ کہہ رہی ہے اپنے منہ سے۔ تو مانتا کیوں نہیں۔

کوئی لڑکی کا دل ایسے توڑتا ہے۔ کہ لڑکی اس پر مرتی رہے اور وہ.....

اسے سب کچھ سنا کر دوبارہ اخبار بنی؟ کیا اپنی قبل از وقت وفات کی خبر مل گئی تھی۔

"ظالم کمینے!" اس نے دانت کچکچائے۔ اور اگلے ہی لمحے میز پر پڑے سارے اخبار' نوٹ بکس' کتابیں اس پر برسا دیں۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا۔ اپنے سامنے والا ریک خالی کر دیا..... پھر اس کے پیچھے والا۔ اس کی روزی روٹی پر لات مارنے والی بات تھی یہ.....

بے چارے کا بک اسٹور..... ردی کی دکان بن جائے گا اگر اسے بروقت روکا نہ گیا۔ اور بھلے سے دروازہ اندر سے لاک تھا۔ مگر تھا تو شیشے کا..... ابھی جم غفیر لگ جاتا..... کاروبار کا خسارہ..... اور عزت کا کچرا..... نہیں بھئی۔ خود کو کتابوں' کاپیوں کے وار سے بچاتے اس نے بمشکل اس کے دونوں ہاتھ تھامے مگر کدھر جناب' وہ حمیرا..... اسے سنبھالنا اتنا آسان کہاں تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑے ہوئے اسے گھما دیا۔ پشت سے کس لیا۔ تب وہ جکڑی گئی حرکت کی محتاج ہائے بے چاری۔ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

"چھوڑو' مجھے۔" وہ جھنجلائی۔

"مجھے چھوڑو معید....." وہ بہ دقت گردن پیچھے کر کے بولی۔

اس کی آنکھوں میں حزن کی کیفیت چھ برس سے ٹھہر گئی تھی مگر ایک شوخی کا لپکا ترچھی نگاہ سے مخفی نہ رہ سکا۔ یہ دیکھ کیسے رہا تھا۔ اور مسکرا کیسے رہا تھا۔ ایسے تو کبھی نہیں مسکرایا۔

"ابھی تو اس بات پر قیامت برپا کر دی تھی کہ تمہیں چھوڑنے کی بات ہی کیوں کی اور اب کہتی ہو چھوڑ دو۔" اس کا لہجہ بھی بدلا تھا۔

"وہ دوسرا چھوڑنا تھا۔" اسے وضاحت کرنی مشکل لگی۔

"چھوڑنا..... چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ تم طے کر لو۔ پکڑے رہوں یا چھوڑ دوں۔" اتنے معنی خیز جملے..... حمیرا کو قربت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ پوری جان سے کسمسائی۔ مگر کہاں جی۔ ایسے ہی بڑی امی کہتی رہتی ہیں۔

"میرا کمزور بچہ..... جان نہیں پکڑتا جسم..... اب کیا کنگ کانگ ہو جائے۔"

"میں رو پڑوں گی۔"

"پرواہ نہیں....."

"مجھے درد ہو رہا ہے معید....." اس کی آواز سے بھی عیاں ہوا۔

"اوہ۔!" معید نے شکنجہ کھول دیا۔ وہ سرعت سے پلٹی' اب دونوں روبرو تھے۔ وہ مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ یہ گھور رہی تھی اور اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔

"زیادہ درد ہو رہا ہے۔" وہ ایک قدم آگے آیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

"حمیرا۔!" اس نے نرمی اور فکر مندی سے پکارا تھا۔

اس درد سے بہت کم جو لوگوں کے انکار سے ہوا۔" معید بہت محتاط انداز سے اپنی شہادت کی انگلی سے ہاتھ کے سرخ نشان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جہاں صرف سچ کی تحریر تھی۔

"تم واقعی سچ کہہ رہی ہو؟" وہ اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔ دکھائی تو صاف دے رہا تھا۔ پھر بھی اس نے سر ہلا دیا۔

"احسان..... یا محبت.....؟" اسے وضاحت درکار تھی۔

"محبت....." اب جب کہ بات صاف ہونے لگی تھی۔ تو پھر وہ کیوں رکتی۔

"کیا....."

"محبت۔" اس نے جواب دہرایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"کس بات کا۔۔۔؟" حمیرا الجھی۔

"محبت کا۔۔۔ واقعی؟" اس نے سینے پر ہاتھ لپیٹ کر اسے تسلی سے جانچا۔

وہ پہلی بار چونکی۔ تو حاصل کیا ہوا خسارہ۔۔۔ محبت بھی نہ ملی اور پندار بھی جاتا رہا۔

شکستگی کے احساس نے اسے لڑکھڑا دیا۔ اس نے کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے تھاما پھر گھسیٹ کر بیٹھ بھی گئی۔ سر بھی جھکا دیا۔ تو یعنی ہار مان لی۔

اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ یہ کنارے تک۔۔۔ پھر بہہ پڑیں۔۔۔ گالوں سے بے آواز سیل رواں گزرنے لگا۔

اور یہ منظر دیکھنا دل گردے کا کام تھا۔

"حمیرا۔۔۔!" وہ بھی کرسی کھسکا کر نزدیک آبیٹھا۔

"دنیا جینے نہیں دے گی۔" اس نے بالآخر اصل خدشہ بتادیا۔ "جوڑ بھی تو دیکھو، تم اور میں۔۔۔ اچھے لگیں گے کیا ساتھ ساتھ۔"

وہ چہرہ نیچے کیے اس کا چہرہ دیکھنے کی تگ و دو میں تھا۔ اس نے جھکے جھکے نظر اٹھائی اور معید عبدالعزیز کو دل پر آرے چلنے کا مطلب سمجھ میں آگیا۔

"تمہیں بڑے لوگوں کو جواب دینے پڑیں گے۔" وہ ہارنے لگا تھا۔ حمیرا نے سر اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔

"دنیا مذاق اڑائے گی۔ اور تمہیں پاگل کہے گی، بے وقوف پکارے گی۔ تمہیں زیادہ سننا پڑے گا۔ ابھی تم پر جوش سوار ہے اور ہوش تب آئے گا جب وقت گزر چکا ہوگا۔ میں تمہیں عقل دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے اس کے سر پر ہاتھ سے دستک دی۔

"میں تم سے عقل مانگنے کب آئی تھی؟" اس نے شاکی نگاہ سے اسے دیکھا۔

"مجھے کبھی بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھ سے ایسے سوال کرنے آؤ گی۔"

"اور میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تم صاف جواب دے دو گے۔"

"نہیں تمہارا اس بے وقوفی میں ساتھ نہیں دے سکتا۔" یہ وہی جانتا تھا اس نے کس دل سے یہ جملہ کہا تھا۔ "اور کیا گارنٹی ہے کہ تم کبھی پچھتاؤ گی نہیں۔"

"کوئی محبت کے لیے بھی گارنٹی مانگتا ہے؟" حمیرا نے اسے شرمندہ کردیا تھا۔ "گارنٹی تو میرے پاس اپنی زندگی کی بھی نہیں ہے۔" اس نے حقیقت بتلائی۔

"ہا۔!" معید نے لمبا سانس بھر کے اس کے چہرے پر نگاہیں جمائیں۔ "تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بہت پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ "مجھے قبول ہے۔"

"کیا؟"

"وہی جس کی تم قسم کھا کر آئی تھیں۔ مرجاؤ گی یا ماردوں گی۔ محبت یار!"

وہ بے فکری سے ہنسا۔ حمیرا نے چونک کر اسے دیکھا پر اس کی بات کی گہرائی کو جانا۔ تو کیا اس نے؟

اس کی پرشوق نگاہیں حمیرا کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ پھر یہ کیا۔۔۔؟ وہ تو بھاں بھاں کرکے رونے لگی تھی۔ اس کا تو خیال تھا وہ خوشی سے اچھل پڑے گی۔ اور وہ کتنا برا روتی تھی۔ معید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور خود سے عہد باندھا۔ وہ زندگی بھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں آنے دے گا۔ قسم سے۔ اتنی بری شکل۔

* * *

پھپھی بھولی معافی مانگنے آئی تھی۔ اپنی غلطی بھی تسلیم کرلی تھی۔ اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز سے۔

"ساری زندگی پھول بوٹے بناتی رہی۔ رنگوں کو سجاتی رہی۔ لوگ لال کے ساتھ ہرے پتے بناتے تھے، میں نے کالے پتے بنا کر بھی کپڑے سجا لیے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ اللہ دتا میں نے سپیشل منٹ کی۔۔۔ وہ جو عطیہ نے کہا تھا اماں کرتی ہیں۔"

"اماں۔۔۔ ایکسپرمنٹ۔۔۔" اے ڈی نے نرمی سے کہا۔

"ہاں وہی ایکسپریس نٹ۔۔۔"

سب نے ہنسی چھپائی۔

"مجھ بے وقوف کے ذہن میں خیال ہی نہ آیا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اے ڈی کے ساتھ تو سمیرا نے ہی بجنا ہے۔ اب بھلا یہ حمیرا اتنی موٹی ناک والی لڑکی جچتی میرے اللہ دتا کے ساتھ۔۔۔ حمیرا پر ستم توڑا حمیرا ہی سے پوچھا۔

"کمال کر دیا پھپھی!" معید نے قہقہہ لگایا۔

"آپ سچ کہتی ہیں صرف ناک ہی کیوں؟ میرے جیسی آنکھوں والی لڑکی بھی آپ کے اللہ دتا کے ساتھ نہیں سجتی تھی۔" حمیرا نے آنکھیں بھینگی کر کے دکھائیں۔

"اوئی۔۔۔!" پھپھی یوں بدکیں جیسے۔۔۔ کسی نے سوئی چبھوئی ہو۔

باقی سب بھی ہنس دیے۔ رونے سے آنکھیں اور چہرہ پہلے ہی سوجا ہوا تھا۔ اس پر بھینگا پن۔۔۔ قیامت یعنی دو آتشہ۔

"تجھے تو پتا ہے نا عبدالعزیز! میرا ذہن چھوٹا بنایا اللہ نے۔۔۔ ساری زندگی وہی کام کیے جو ضروری تھے جن کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ اسے ہی سوچا جو سامنے نظر آیا۔

تم بھی مجھے معاف کر دینا ناہید۔۔۔ چھوٹی عورت سمجھ کر۔۔۔ میرا تو قد بھی تم سے کم ہے۔" پھپھی کا لہجہ شرمسار تھا، دلیل بھی خوب دی۔

"بھولی آپا۔۔۔!" ناہید نے پھپھی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ "اتنے قابل بیٹے کی ماں کا قد چھوٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ اے ڈی کے کندھوں پر چڑھ کر دنیا دیکھیں آپ۔۔۔"

"تو مجھ سے ناراض تو نہیں۔۔۔!" پھپھی کو اندازہ تھا زیادہ دل ناہید ہی کا دکھایا ہے اس نے۔۔۔

"نہیں۔۔۔ بلکہ آپ بتائیں۔ آپ تو مجھ سے ناراض نہیں۔۔۔ وہ سب خیال جو میں آپ کے بارے میں رکھتی تھی۔"

چائے کے گھونٹ خاموشی سے بھرتی صفیہ سب کے بیچ بیٹھے ہونے کے باوجود الگ محسوس ہو رہی تھیں۔

یہ معافی تو انہیں مانگنی تھی، وہی تو تھیں جو ناہید کے خیالات کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کا بنا کر بھولی کے آگے پیش کرتی تھیں۔

اور پیش کش کی اہمیت سے کیسے انکار ہے؟

"تم کچھ نہیں بول رہیں چھوٹی بھابھی۔۔۔؟" عبدالعزیز نے پکارا۔

"کیا بولوں۔۔۔؟" وہ اظہار کی قوت کھو چکی تھیں کیا؟

"بھولی آپا سمیرا اور اے ڈی کی شادی کے لیے دن مانگ رہی ہیں۔ تم بھی کوئی مشورہ دو۔"

"جو آپ کو مناسب لگے۔" صفیہ نے ناہید کی آڑ میں بیٹھی سمیرا کو دیکھا پھر اے ڈی کو۔ وہ کتنا سنجیدہ متین بن کر بزرگوں کی محفل میں براجمان تھا۔ مودب و محتاط (ہاں محتاط۔۔۔ نگاہوں کی چوری کا کھیل اتنے لوگوں کے بیچ بیٹھ کر کھیلنے والے سے بڑا محتاط اور کون ہو گا۔ ایک نرم گرم نگاہ وہ ناہید کے پہلو پر ڈال ہی لیتا تھا)

صفیہ دل سے اٹھتی صدا پر ایمان لے آئیں، وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ تو پھر خواہ مخواہ انہوں نے اتنا کھڑاک کیوں ڈال دیا۔ وہ متاسف تھیں۔

سمیرا کے چہرے کے رنگ۔۔۔ وہ شرمگیں مسکان۔۔۔ پلکوں کا اٹھنا اور جھکنا۔۔۔ اور اے ڈی۔۔۔ وہ سنجیدہ تھا، مگر اس جانب دیکھنے پر مجبور بھی لگتا تھا اک نظر جیسے فرض تھی۔

"اپنے ابو سے کہو، لگے ہاتھوں میرے دن بھی مانگ لیں چھوٹی بھابھی سے۔۔۔!" برتن اٹھا کر لے جانے کے بہانے حمیرا معید کے پاس گزری۔

"تمہیں ذرا شرم نہیں آتی۔" وہ بڑبڑایا۔

"بے وقوف، موقع سے فائدہ اٹھانا سیکھو۔۔۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

"یہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو۔" عبدالعزیز کا دھیان ادھر ہوا۔

"کچھ نہیں تایا ابو۔۔۔!" وہ سیدھی ہو کر فوراً "نیک پروین" ہو گئی۔ "یہ معید کچھ کہہ رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا۔ بولو بیٹا۔۔۔!"

"میں تو کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔" وہ سٹپٹایا۔

"اب مگر کیوں رہے ہو؟ ابھی تو میرے کان کھا رہے تھے۔" حمیرا مجبور نظر آئی۔

"حمیرا۔۔۔!" اس نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"تم ہی بتا دو' کیا کہہ رہا تھا۔" عبدالعزیز نے حمیرا سے ہی پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

"بتا دوں۔۔۔" اس نے معید سے پوچھا پھر پلکیں پٹپٹاتے ہوئے لب کھولے "کہہ رہا تھا۔ ابو سے کہتا ہوں صفیہ چچی سے حمیرا کے دن بھی لے لیتے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" معید کرسی سے اچھل پڑا۔

"میں نے کہا میں لڑکی ہو کر ایسی بات کیسے کر سکتی ہوں آخر آل میں مشرقی لڑکی ہوں جو جان سے چلی جاتی ہے مگر آن نہیں جانے دیتی۔"

"یہ جھوٹ بول رہی ہے ابو۔۔۔ بکواس کرتی ہے۔" معید اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اب مجھے پریشرائز کرنے کے لیے چلا رہا ہے۔ کیا یہ ساری زندگی مجھ پر ایسے ہی رعب جھاڑے گا۔" سخت فکرمندی سے حاضرین کو دیکھا۔

دیکھنے کی چیز اس وقت پھپھی بھولی تھی۔ ناک پر انگلی ٹکا کر وہ سخت اچنبھے سے حمیرا کو سن رہی تھی۔

"اپنی شادی کی بات کوئی ایسے کرتا ہے سب کے بیچوں بیچ منہ پھاڑ کر۔۔۔ اور چلو معید نے ایسا آئیڈیا دے بھی دیا تھا تو لڑکے تو ایسی شوخیاں کرتے ہی ہیں۔ لڑکی ہی کو "پی لینا" چاہیے تھا۔"

پھر پھپھی نے جو کچھ سوچا' وہی بی حمیرا سے کہہ بھی دیا۔ معید کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ وہ پرسکون ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھپھی بھولی دوبارہ اپنا سوال دہرا رہی تھی' مگر عبدالعزیز کا دھیان صفیہ کی خاموشی پر تھا۔ حمیرا نے اپنا معاملہ معید سے درست کروا لیا تھا' مگر صفیہ کی مرضی کے بغیر۔۔۔ انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی یہی سوچ رہی تھیں۔ صفیہ گم صم تھیں۔ نجانے دھیان کا پنچھی کدھر اڑان بھر گیا تھا۔

حمیرا کی اتنی قابل گرفت حرکات پر وہ ناگواری یا تنبیہہ کا ہنکارا بھی نہ بھر سکی تھیں۔ ناہید نے آنکھ کے اشارے سے شوہر کو "ابھی اس بات کو رہنے دیں" کا کہا۔

حمیرا بڑے مزے سے عبدالعزیز کے ساتھ کرسی جوڑ کر دن تاریخ طے کرنے کے لیے کیلنڈر اور قلم اٹھا لائی۔ اے ڈی نے اس موقع پر پھپھی بھولی کا بیٹا ہونے کا ثبوت دیا۔ شرم کا تقاضا تھا' اس کی شادی کی بات ہو رہی تھی۔ اسے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

وہ معذرت کرتے اٹھا۔ اسے اس تخت کے پاس سے گزر کر جانا تھا جہاں ناہید کے پہلو میں سمیرا براجمان تھی۔ سب کا دھیان کیلنڈر پر تھا' لیکن یہ کیا۔۔۔ سمیرا کی طرف دیکھ کر کوئی شوخ بات۔۔۔ یا شوخ اشارہ کرتا جبکہ وہ اس پر اک گہری گرم نگاہ ڈال کر نکلتا چلا گیا۔

"ایسے تو کبھی نہیں ہوا۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔" سمیرا کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے سب کو دیکھا۔ سب گم تھے۔

ایسا کیوں لگا وہ خفا تھا۔۔۔ اور اگر تھا تو کیوں؟ سمیرا حق دق تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کسی کی بات سے غرض نہیں کہ اس نے یہ کہا اور اس نے وہ۔۔۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ تم نے میرے بارے میں یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔۔۔ اور حمیرا۔۔۔ سے۔"

اے ڈی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اسے جملہ مکمل کرنے سے بھی کراہت سی محسوس ہوئی تھی۔ حمیرا اسے اپنی چاروں بہنوں کی طرح پیاری تھی۔ ایسا خیال تو خواب میں بھی نہیں آیا تھا کہ وہ حمیرا سے شا۔۔۔ اونہوں۔

"میں نے سوچا نہیں تھا۔ پھپھی اور چچی نے بتایا تھا۔" سمیرا کتنی بار وضاحت دے چکی تھی۔

"تو تم نے یقین کیوں کیا؟" سوال ہنوز اٹکا ہوا تھا۔

سمیرا نے اپنی نم ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں۔ وہ سب کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ناراضی کے وہم کو دور کرنے کے لیے اے ڈی کا نمبر ملایا۔۔۔

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پر یہ کیا۔۔۔؟ کال وصول ہی نہیں کی جارہی تھی۔ ابھی جب وہ یہاں سے گیا تھا تو فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ مسلسل ملاتی رہی پھر پیغام لکھا۔

"پک دی فون اے ڈی۔۔۔" جواب ندارد۔۔۔

دل کی بے چینی حد سے سوا ہو گئی۔ پنکھے لگ گئے جب بالآخر جواب آیا۔ "مجھے فون مت کرو۔۔۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

وہ بھونچکی رہ گئی۔ اندر سارے بڑے دن طے کر رہے تھے اور وہ کہتا تھا۔

"مجھے کال مت کرو۔۔۔ مجھے بات نہیں کرنی۔" مگر کیوں؟ تو اس کا خدشہ درست تھا۔ وہ ناراض تھا۔

شدید بے قراری کے عالم میں وہ گھر سے نکل آئی۔ اندر سب لوگ خوش گپیوں میں محو تھے اور سامنے پھپھی کے گھر کا دروازہ نیم وا تھا۔ اے ڈی کے اسٹڈی والے بڑے کمرے کی روشنی باہر آرہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف پشت کیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے میز پہ فون پڑا تھا۔ اور اس پر مسڈ کال کی تعداد نمایاں تھی۔۔۔ میسجز کے سائن والا لفافہ بار بار جل بجھ ہوتا تھا۔

"تو وہ واقعی خفا تھا پر کیوں۔۔۔؟"

اور جب سبب بتایا (پھپھی بھولی نے پہلے جرم بیٹے کے سامنے قبولا تھا۔ سمیرا کے رونے کا بتایا تھا)

وہ پوچھ رہا تھا کہ وہ اس سے بدگمان کیوں ہوئی، وہ کوئی موم کا گڈا تھا جو سہرا لگا کر اندھا دھند نکل پڑتا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ماں کیا سوچ رہی ہے اور کیوں۔۔۔

اور جب اسے پتا لگا تب۔۔۔ اس نے ماں کو کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ خود ہی اپنی غلطیوں کو مان رہی تھیں۔ ان کے پاس جواز تھے جو شاید خود ان کی حد تک درست تھے، مگر سمیرا نے کیوں؟ (بعد میں حمیرا سے ساری تفصیل بھی مل گئی تھی)۔

اے ڈی قطعاً "ضدی نہیں تھا، مگر سمیرا کیا کرتی کہ "کیوں" پر آکر اٹک گیا تھا۔

"سوری کر تو رہی ہوں۔" وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی جو کرسی سے اٹھ کر دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

"اے ڈی۔۔۔!" اس نے پکارا۔ کوئی جواب نہیں۔۔۔ سمیرا کا دل بھر آیا ساتھ ہی اسے احساس ہوا اگر پھپھی اوپر آجائیں تو۔۔۔

"کیا میری آواز سنائی نہیں دے رہی؟" وہ ایک قدم آگے ہوئی اور ذرا اونچا بولی۔ اس کی محبت لٹاتی نگاہیں اور سحر انگیز مسکراہٹ ہی دیکھی تھی۔

ایسی ناراضی۔۔۔ اور جب کہ وہ پکار رہی ہے، تب بھی۔۔۔ تو ٹھیک ہے۔ مانگ تو لی معافی۔۔۔ کر لی غلطی تسلیم۔۔۔ اب اور کیا کرے۔ قدموں میں بیٹھنے سے تو رہی۔ محبت کی شرائط میں پہلی شق برابری کی ہونی چاہیے۔

اور یہ بھی کہ۔

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔۔۔

یہ کیا کہ۔۔۔ وہ مجرم بنی کھڑی تھی اور تھک گئی تھی اور وہ بے حس بنا منہ موڑے کھڑا تھا۔

اور یہ بھی کہ وہ چل کر آئی تھی۔ اور اسے اس بات نے بھی نہیں پگھلایا تھا۔

"ٹھیک ہے پروفیسر اے ڈی ریاض۔۔۔ تو پھر میں بھی آپ کی کلاس کی کوئی نالائق اسٹوڈنٹ نہیں ہوں جو مسلسل معافی مانگتی رہوں اور آپ مڑ کر بھی نہ دیکھیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ چلتی ہوں عزت افزائی کا شکریہ۔ خدا حافظ۔"

اور اسی پر بس نہیں۔ وہ حافظ کے ظ سے پہلے قدم بھی بڑھا چکی تھی۔

"ارے او۔۔۔ ارے سمیرا! رکو۔۔۔"

اے ڈی جست بھر کے اس تک آیا۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی وہ معافی مانگتی۔ جی بھر کے دیکھنے کا ایسا موقع۔۔۔ دل تو اس کی آمد پر ہی باغ باغ ہو گیا تھا، مگر بس یونہی۔۔۔

دراصل سمیرا کو خبر نہیں تھی، دیوار پر لگے ایک آئینے میں وہ پوری کی پوری دکھائی دے رہی تھی اے ڈی کو۔۔۔ بس اسی لیے۔۔۔

پھر وہ تو رکنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ آنکھوں میں نمی لیے مسلسل انکار۔ اے ڈی کو سچ بتانا پڑا۔ وہ بھڑک اٹھی۔

"آپ کو شرم نہیں آتی کسی کو چھپ چھپ کر دیکھتے ہوئے۔"

"اچھا..." اے ڈی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ' میں تمہیں علی الاعلان دیکھ لیتا ہوں۔" وہ خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ دیکھنا بھی شروع کر دیا۔

"لو خوامخواہ۔" وہ بدکی۔ دوپٹا درست کیا۔ ماتھے تک کھینچ لیا۔

اے ڈی دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سب جس کے بارے میں سمیرا کہتی تھی۔ صاف صاف بات کیا کریں نا۔

"وہ امی کے خیالات تھے جو حالات سے پیدا ہوئے۔ مجھے تم جیسی ہو جو ہو' اسی طرح پیاری ہو۔" اے ڈی کی نگاہیں اس کے سرخ چہرے پر ٹکی تھیں۔

"ہنہہ... بے ہنر... اونہوں... مجھے نہیں پروا... میرے گھر صرف محبت سیکھ کر آنا۔"

سمیرا کی نظریں بے ساختہ اٹھیں' مگر پھر جھک گئیں۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ تاب لے آتی۔

* * *

"خود کی بیٹی انہیں حاسد کہہ گئی تھی تو کیا وہ واقعی تھیں۔"

کیسا گالی کی طرح لگا تھا یہ لفظ...

نہیں وہ نہیں تھیں... کبھی نہیں... وہ تو بس اپنی بیٹی کا بھلا چاہتی تھیں۔ اس کا حق تھا کہ وہ بحیثیت ماں بیٹی کے لیے اچھا برا سوچے اور کوشش کرے اور وہی اس نے کی تھی۔

لیکن یہ بھی تو سچ تھا نا۔ ناہید کو دیکھ کر دل میں طیش کی لہر اٹھی تھی۔

اور سمیرا کے چہرے پر نظر پڑتی تو قدرت کی صناعی کو سراہنے کے بجائے وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتی تھیں۔

اور حمیرا نے کہا' یہی کیفیت تو حسد کہلاتی ہے۔

جب دل چاہے چہرہ بگاڑ دیا جائے۔ یہ اتنی اچھی ہے تو کیوں...

اور یہ جو حسن ہے' یہ آخر کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

ہاں شکر خدا کا' وہ اتنی منتقم نہ ہوئیں' عملی کوشش سے حسن کو ختم کرنے کا سبب ڈھونڈتیں مگر...

سارا خاندان ناہید کو اس پر فوقیت دیتا تھا۔ اس کی صورت' اس کا طریقہ سلیقہ اس کا خاندان...

اور مجھے من مانی کرنے والی بھگوڑی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ عزت دی ہی نہیں۔ میرے منہ پر کئی ایک نے کہا۔ "کیا دیکھ کر عبدالمجید نے عشق رچایا؟"

حالانکہ وہ عشق تھا تو میں نے وفا بھی تو نبھائی۔

چونتیس برس کی عمر میں بیوہ ہوئی تھی۔ گیارہ برس کی بچی تھی... پھینک جاتی اسے کہیں... دس لوگ مل جاتے ہاتھ تھامنے کو... اسے کسی نے نہ سراہا اور خیر میں نے یہ کام کسی تعریف کے لیے کیا بھی نہیں تھا' محبت تھی عبدالمجید سے... آج بھی ہے۔ اور حمیرا کہتی ہے' میں حاسد ہوں۔

انہیں حمیرا کے جملے یاد آنے لگے۔

"یاد ہے کئی سال پہلے مجھے کہانی لکھنے کا شوق چڑھا تھا۔ پیاری سی شوخ' محبت بھری کہانی...

پیاری سی ایک لڑکی... اچھا سا ایک لڑکا... اور بہت ساری محبت... مگر مجھے جوڑ توڑ کرنا نہیں آیا... کہانی آگے بڑھ ہی نہ سکی... میں "غلط" لکھ ہی نہیں سکی۔ مجھے تو بس "سب اچھا" لکھنا آرہا تھا۔ مجھے پتا ہوتا کہ آپ کتنی مہارت سے منظر بدلنا جانتی ہیں تو آپ سے پوچھ لیتی۔ سیکھ لیتی امی..." اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

ہاں' وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں نے ناہید کے بھولی آپا پر کچھ اعتراضات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ بھولی کے دل میں میل بھرا اور سمیرا کی شخصیت مزاج کو بھی تو گھٹانے کی کوشش کی تھی۔ نیل پالش لگانے والی اور بھولی نے خامیوں کی فہرست میں بے نمازی لکھ لیا۔ حالانکہ میں گواہ تھی۔ وہ تہجد کے وقت اٹھ کر بھائی

کی صحت و تندرستی کے لیے "گریہ" کرتی تھی۔ ابھی تک تو اس کے وہ نفلی روزے پورے نہیں ہوئے جو اس نے معید کو اسٹریچر پر دیکھ کر مان لیے تھے۔

اور اس کی طرف سے صدقہ جاریہ یہ تھا کہ اس نے اپنی زندگی ایسے لوگوں کے لیے وقف کر دی تھی جو اچانک حادثات میں گھر جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی و جسمانی بحالی۔۔۔ انہیں دوبارہ زندگی کی طرف موڑنے کی کوشش اور اس کی نفیس مزاجی کو سستی و کاہلی کے زمرے میں ڈال دیا بھولی نے ایک اور نمبر کاٹ دیا۔

اس کی نفاست پسندی کو "ادا" کہہ کر بھولی کے گھر کے لیے مس فٹ بھی تو میں نے ہی کیا تھا۔

تو پھر حمیرا ٹھیک کہتی ہے کہ۔۔۔

جس چیز کو بتانے اور سمجھانے کے لیے اور جس سے بچنے کے لیے اللہ نے پوری پوری دو سورتیں اتار دیں۔ سورۃ الناس اور سورۃ **الفلق**، حمیرا نے پہلے سورت پڑھی۔۔۔ پھر ترجمہ دہرایا۔

اس سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟

نفرت، محبت، بغض، عناد، غصہ، پیار اور بہت سی ایسی دوسری باتوں کی طرح حسد بھی انسانی فطرت کے اندر موجود ایک جذبہ ہے۔ یہ چیزیں انسان کے خمیر میں شامل ہیں۔ بس یہ ہے کہ۔۔۔ کون اس کی کتنی آبیاری کرتا ہے۔

"امی آپ کا معاملہ بس یہ ہے کہ آپ نے حسد کے اس عنصر کو اتنی محنت سے پروان چڑھایا کہ باقی سب جذبے پیچھے رہ گئے۔ اور حسد۔۔۔ اوہ۔۔۔" اس نے جھرجھری لی تھی۔ "یہ تو زندگی سے بے ساختگی بر جستگی کو نوچ لیتا ہے یہ ادھیڑ بن۔۔۔ میں جت جاتا ہے حاسد کی۔۔۔ نیند اڑ جاتی ہے قرار لٹ جاتا ہے۔ نری بیماری۔۔۔"

(کہاں سے سیکھی تھیں اس نے یہ باتیں، صفیہ ششدر تھیں وہ تو گویا صفیہ کی کیفیت کا احوال بیان کر رہی تھی۔ ہاں وہ اتنے سال بالکل ایسی ہی بے چارگی اور مشکل سے جی تھیں)

اور پتا ہے اللہ کیا کرتا ہے بیماری دیتا ہے تو شفا بھی بتا دیتا ہے۔ بس چاروں قل پڑھ کر خود پر پھونک لو۔ اس سے دوسروں کے حسد سے بھی بچ جاتے ہیں اور خود کرنے سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔

دل پھر بھی نہ مانے تو ان نعمتوں کو یاد کر لینا چاہیے جو میسر ہیں، چلتے پھرتے دل میں شکر بھرنے لگتا ہے۔

وہ تو مبہوت سی پڑھنے جاتی تھی۔ اس نے حسد کے موضوع پر پی ایچ ڈی کب کی۔ ہاں وہ کتنی بے خبر تھیں اپنی بیٹی کی صلاحیتوں اور ذہانت سے۔ شکل و جسم دیکھتی رہیں اگر اے ڈی ریاض اسے درست سمت نہ دکھاتا۔۔۔ تو کیسے ضائع کر دیتیں وہ اپنی بیٹی کو۔۔۔ تو یہ تو اللہ کا پھر ان پر خاص کرم ہوا تھا کہ وہ دوسروں کے بچوں کے لیے اتنا غلط سوچتی رہیں، لیکن اللہ ان سے بے نیاز نہیں تھا۔

ادھر ادھر دھیان لگانے کے بجائے اپنی بیٹی کو دیکھ لیتیں تو جانتیں کتنی بڑی نعمت تو انہیں بھی میسر تھی۔ قابل بیٹی۔۔۔ (انچاس ہزار پانچ سو تو خالی تنخواہ تھی اس کی) صفیہ کی سوچوں سے پرے اس کا درس جاری تھا۔)

"حسد سے، شرک سے، بغض سے بچنا بہت ضروری ہے امی۔۔۔ حسد دنیا برباد کرتا ہے اور شرک آخرت۔۔۔"

چاروں قل بڑی ضروری چیز ہیں۔۔۔ دین کی پوری تعلیمات ان میں سمٹ آئی ہیں۔

اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ اللہ نے انہیں نماز کا حصہ بنا دیا تاکہ جو "دوا" سمجھ کر ہاتھ میں نہ لے وہ "دعا" سمجھ کر پڑھ ڈالے۔

کتنے پیار سے سمجھایا تھا اس نے۔۔۔ کسی کامل استاد کی طرح۔۔۔

اور کتنی خوش قسمت تھیں وہ۔۔۔ انہوں نے اسے جنم دیا تھا۔

علم کسی کی میراث نہیں۔۔۔ بعض دفعہ اولاد۔۔۔ بھی والدین کی تربیت کر دیتی ہے کر سکتی ہے۔

"اوہ میرے اللہ۔۔۔" صفیہ نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

شکر کے آنسو کہ شرم کے۔۔۔؟
مگر جس کے بھی۔۔۔ اللہ کو دونوں پسند ہیں۔

* * *

"میں جب آپ کی جگہ پر خود کو رکھ کر سوچتا ہوں تو آپ بالکل صحیح لگتی ہیں چچی جان! بھلا کون ماں چاہے گی کہ اس کی بیٹی کسی ایسے شخص کو اپنی تمام زندگی کا ہم سفر بنائے جو ہم سفری کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہ کر سکے۔"

اس کے جملے بہت دل گیر تھے دل چیر دینے والے جیسے۔۔۔ مگر ان کی ذرا سی پرچھائیں بھی چہرے سے عیاں نہ تھی۔

"وہ بہت تیز چلنے والی ہے۔ میں تو شاید چہل قدمی میں بھی قدم سے قدم نہ ملا سکوں۔" وہ مسکرایا تھا۔

"کل میری شاپ پر آ کر اس نے مجھے قائل کر لیا تھا۔" اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ "اور آپ تو جانتی ہیں اسے قائل کرنا آتا ہے۔ میں بھی مان گیا لیکن جب تنہائی میں حقیقت پسندی سے سوچا تو وہ بے وقوف لگی۔ جذباتی، کم فہم۔۔۔"

صفیہ اس کا چہرہ پڑھنے کی تگ و دو میں تھیں۔ دل کا حال جاننے کی خواہش اور وہ سب سے بے پرواہ بول رہا تھا۔ وہ سب، جو اس نے بہت تسلی سے سوچا تھا اور ترتیب دیا تھا۔

"لیکن وہ اٹل ارادہ بھی رکھتی ہے، جو ٹھان لے تو ٹھان لے۔"

"تو پھر تم مجھے کون سی کہانی سنانے آ گئے ہو، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا ناں کہ ایک بے وقوف لڑکی کیسے تمہارے لیے اپنی ماں کے مقابل آ گئی ہے۔"

"بالکل ہونا چاہیے تھا۔" وہ بہت پیارا مسکرایا۔ "اگر خود غرض ہوتا۔۔۔"

صفیہ بری طرح چونکیں۔

"تم بہت اچھی باتیں کر سکتے ہو معید عبدالعزیز۔۔۔ خود کو لاتعلق ظاہر کرنا بہت آسان ہے۔ اس لیے کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تمہارا مقدمہ لڑنے کے لیے وہ بے وقوف لڑکی کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔"

"یہ الزام سچ نہیں ہے صفیہ چچی۔۔۔!" معید کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "لیکن آپ مانیں گی نہیں... میں دس گواہ بھی لے کر آ جاؤں کہ میں نے اسے کبھی نہیں اکسایا بلکہ کبھی جتایا بھی نہیں کہ ایک رشتہ اور بھی تھا ہمارے بیچ۔۔۔ یا یہ کہ رشتہ بڑھ بھی سکتا ہے سو بات ختم کرتا ہوں۔" وہ رکا پھر مضبوط لہجے میں کہا۔

"ابو مجھے علاج کے لیے ملک سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔" صفیہ نے چونک کر دیکھا۔

انہیں ایسے کسی ارادے کی خبر نہیں تھی اور یہ کہ اب اس میں سے کیا ٹھیک کروانا باقی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ ہاں ایک بار ناہید بھابھی آنکھ کے کسی آپریشن کی بات کر رہی تھیں تو کیا وہی... لیکن پھر بھی انہیں کیا۔۔۔ جاتا ہے تو جائے۔

صفیہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی صورت دیکھی۔

وہ سنجیدہ تو ہو چکا تھا مگر قطعیت کا یہ انداز۔۔۔ وہ مزید کیا کہنے والا تھا۔

"اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔" بالآخر اس نے دھماکا کر دیا۔ "کم از کم اس وقت تک جب تک آپ اپنی پسند سے اپنی بیٹی کی زندگی کے فیصلے نہ کر لیں۔"

"اور جیسے کہ وہ مان جائے گی ناں۔۔۔!" صفیہ کا دل پگھلا تھا مگر بس پل بھر کی تھی یہ کیفیت۔ بڑا چبھتا لہجہ تھا۔ لیکن وہ مسکرانے لگا تھا۔

"نہ مانے، مگر کب تک نہیں مانے گی۔ میں کسی گوری چٹی میم کے ساتھ تصویریں بنوا کر بھیج دوں گا۔ سارے شہر کو دکھا دیجیے گا اور حمیرا کے لیے جو اسپیشل کاپی بھیجوں گا۔ اس کے پیچھے جلی حروف میں لکھ دوں گا۔ 'دبھابھی۔۔۔ کیسی لگی؟"

اس کا چہرہ ہی نہیں لہجہ بھی متبسم تھا۔ مگر وہ آنکھیں۔۔۔ فقط جھوٹ کہنے سے وہ اتنی دکھی ہو گئی تھیں۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

توحمیرا۔۔۔ اس جھوٹ کو سن کروہ کتنی دکھی ہوتی؟ ہاں وہ دکھی ہوتی۔۔۔ اسے اتنا دکھ ہوتا کہ اس کا دل پھٹ جاتا۔

وہ اتنا روتی کہ آنکھوں کا پانی خشک ہو جاتا۔

خود کو پیٹ ڈالتی۔۔۔ اور ختم ہو جاتی۔

"ہائے اللہ نہ کرے۔۔۔" صفیہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

کچھ ارادے معید عبدالعزیز بتا گیا تھا۔ اور حمیرا نے بھی تو ایک جملہ کہا تھا اور اس کے بعد وہ زندگی بھر بھی کچھ نہ بولتی۔ تو صفیہ کے لیے کافی تھا۔

"شادی تو میں معید ہی سے کروں گی امی۔۔۔ اور آپ ہی کروائیں گی۔ پورے دل کی خوشی و قبولیت سے میں گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی نہیں۔۔۔"

اور صفیہ کے سر پر جیسے کسی نے کلہاڑا مار دیا تھا۔ شدید خوف زدگی کے عالم میں بیٹی کی صورت دیکھی۔ کیا اس نے ماں کو سنایا تھا۔ جتایا تھا کہ وہ۔۔۔

یا اللہ۔۔۔ ان کی بیٹی انہیں طعنہ دے گی۔ یہ تو صفیہ نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

وہ تو اس چیز کی شعوری ولاشعوری کوشش کرتی رہیں کہ حمیرا کو کبھی پتا نہ چلے کہ۔۔۔ لیکن ایسی باتیں کوئی چھپتی ہیں؟ آج بیٹی کے منہ سے۔۔۔

مگر۔۔۔ وہ حمیرا کی صورت دیکھنے لگیں تو چونکیں۔

اس کے پیغام اور فیصلے میں جتانے کا گہرا تاثر ضرور تھا مگر چہرے پر ایسا کوئی رنگ نہیں تھا جو بتاتا کہ وہ ماں پر طنز کر رہی ہے۔ ہاں اس نے ماں کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے اپنے معیار اور اقدار کی بات کی تھی۔ اس نے ماں کو حق دیا تھا۔ ماں کا مان بڑھایا تھا۔ گھٹایا نہیں تھا۔

آپ ہی کریں گی۔ آپ ہی کو کرنا ہو گا۔ میں کوئی بے وقوفی نہیں کروں گی۔"

وہی اس کا بے ساختہ' بے فکر انداز۔۔۔ اس نے اگر ماں کو دھمکایا بھی تھا تو اتنے مان سے۔۔۔ اتنی عزت دی۔ بھروسا کر لیا اور اپنا آپ بھی بتا دیا۔ اس کے لیے کتنی اہم تھی صفیہ کی منظوری' خوشی۔۔۔ وہ اپنی ذات پہ اختیار رکھتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ سر جھٹک کر کہہ سکتی تھی صفیہ۔۔۔ کون صفیہ۔۔۔ زندگی تو اس کی ہے اس کو گزارنی ہے۔

اور معید عبدالعزیز۔ سب اس کے ساتھ تھے۔ پھر۔۔۔؟ وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ فرماں برداری۔۔۔ اوہ خدا۔۔۔

حمیرا صفیہ کی بیٹی تھی مگر ماں پر نہیں گئی تھی۔

معید۔۔۔ عبدالمجید کا بھتیجا تھا، اور اس پر نہیں گیا تھا۔ ورنہ راہ بجھاتا ہاتھ پکڑ کر نکل لیتا۔۔۔ تو وہ کیا کر لیتیں۔

"توصفیہ عبدالمجید تم نے زندگی بھر کیا کیا؟"

حمیرا نے کہا تھا' وہ کسی مکمل صحت مند و توانا شخص سے شادی کر لیتی ہے۔ مگر اس کی کیا گارنٹی ہے۔ کہ وہ شہ زور اور توانا رہے گا۔ حادثہ تو شادی کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔

اور کیا تب وہ شوہر کے عیب دیکھتے ہوئے اپنی بستی بستی گھر ہستی چھوڑ آئے گی۔۔۔ کبھی نہیں (کوئی عورت ایسا نہیں کرتی اور یہاں تو اس کا دل دھڑکتا تھا معید کے نام پر)

بات تو ٹھیک تھی۔ مرنے کے خوف سے لوگ جینا تو نہیں چھوڑ دیتے۔

اور عبدالمجید بھی تو صفیہ کو بیچ راستے میں چھوڑ گیا تھا۔ تو پھر تو صفیہ کو اس سے شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی کہ۔ اس نے تو مر جانا ہے۔

تو ایسے نہیں ہوتا۔ انسان ہر کام اچھی امید اور توکل کے سہارے کرتا ہے۔

زندگی کتنی آسان بلکہ عیش و آرام سے گزری۔ کیسی تھی وہ شام۔۔۔ جب گھر خالی کرنے کا نوٹس مل گیا تھا اور جیب میں پیسے نہیں تھے۔ گاڑی تھانے میں کھڑی تھی۔ صفیہ کے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے صاف انکار کر دیا تھا جیو یا مرو۔ ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

اور دروازہ قرض خواہ بجاتے تھے اور دیکھتے تھے صفیہ کو بھی۔۔۔ اور کچھ صفیہ کی بیٹی کو بھی۔۔۔ گھر سے

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نکلتیں تو کہاں جاتیں۔ رات کیا فٹ پاتھ پر کٹتی۔۔۔ یا؟

یا۔۔۔

اللہ تو ہمیشہ سے مددگار رہا تھا۔ جب دنیا کے سارے در بند ہو گئے۔ تب اللہ نے فرشتہ بھیج دیا۔ اللہ کبھی خود سامنے نہیں آتا کسی کو بھیجتا ہے اور وہ ”کسی“ عبدالعزیز تھے۔ جنہوں نے صرف سہارا نہیں دیا۔ عزت بھی دی۔ دنیا کے مصائب، عیاری اور گندی نظروں کے سامنے ڈھال بن گئے۔

”آپ سوچیے امی اگر اس شام بڑے ابو نہ آتے تو آج ہم کہاں اور کس حال میں ہوتے۔ انہوں نے عزت تو دی۔ محبت بھی دی اور آپ نے کیا کیا۔۔۔؟ ہمیشہ بدگمان رہیں۔ بلکہ بدگمان نہیں انجان۔۔۔ آپ کو ادراک ہی نہیں کہ کیسے اللہ ہم پر مہربان رہا۔ ایک فرشتہ ہمیں زندگی بھر کے لیے دے دیا۔“

اور واقعی صفیہ۔۔۔ یہ تو تم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔۔۔

* * *

پھپھو بھولی دن لینے کے بعد رات گئے تک بیٹھی رہی تھی۔ اے ڈی کو ہی بلانے آنا پڑا اور صفیہ کے لیے سب کے درمیان بیٹھنا بہت مشکل تھا، مگر کیا کرتیں کہ عبدالعزیز ہر بات طے کرتے ہوئے۔۔۔

”کیوں چھوٹی بھابھی! کیا خیال ہے؟“

یا

”تم بھی تو بولو۔۔۔ یہ ٹھیک رہے گا یا وہ۔۔۔؟“

اور ناہید بھی منتظر نگاہوں سے دیکھتی تھیں جیسے صفیہ کی رائے سب سے اہم ہو اور یہ عزت اور مان۔۔۔ زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ جتنا کہ نظرانداز کرنا نہ لگتا۔ محفل ختم ہوئی تو وہ اپنے کمرے میں آ کر خود احتسابی میں گھر گئی تھیں۔ بیٹی نے جو رات کہا تھا ”م نہیں حاسد۔۔۔

اور جو شام کو سمجھایا تھا وہ سبق۔۔۔

عشاء کے لیے کھڑی ہوئیں تو ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔ دعا مانگنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کتنی ہی دیر بس ہتھیلیوں پر برسات ہوتی رہی اور نجانے وہ کب تک یونہی رہتیں۔ جب حمیرا کی بڑ دھڑ آمد نے چونکایا۔

اس نے زور سے دروازہ کھولا تھا۔ وہ ان سے کچھ پوچھتی آ رہی تھی انہیں جائے نماز پر بیٹھا دیکھ کر لب بھینچ لیے۔

”کیا ہوا؟“ صفیہ نے جائے نماز کا کونا موڑا۔ گھبراہٹ سی ہوئی۔ اس کے پیچھے **معید** بھی اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

حمیرا ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ”تم بھی آجاؤ ادھر۔۔۔ یہ فیصلہ ہو جاتا ہے۔“

معید ذرا سا ہچکچایا۔۔۔ ”میں ٹھیک ہوں ادھر ہی۔۔۔“

”آؤ نا۔۔۔!“ حمیرا نے ہاتھ بڑھایا۔ ”بیٹھو۔۔۔! امی پھونک ماریں گی۔“

معید اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔۔۔ صفیہ کے دل کی خبر نہیں تھی۔ سب کچھ تو حمیرا ہی ٹھانے ہوئے تھی۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ صفیہ نے **معید** سے نظر ہٹا کر بیٹی کو دیکھا۔

”کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ وال کلاک دیکھیں۔۔۔ کیا بجا ہے؟“

”وال کلاک۔۔۔؟“ صفیہ نے گردن موڑی ”بارہ بج رہے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ اور اس نے مجھے وش نہیں کیا۔ میری برتھ ڈے تھی آج۔۔۔“

”مائنڈ یو۔۔۔ تمہارے برتھ سرٹیفکیٹ پر یکم اپریل لکھا ہے۔“

”مجھے فول بننا پسند نہیں۔۔۔ اسی لیے میں اکتیس مارچ لکھتی ہوں۔“

”تمہارے لکھنے سے کیا ہوتا ہے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔“

”حقیقت یہ ہے کہ میں رات بارہ بجے پیدا ہوئی تھی۔ کیوں امی۔۔۔؟“

”ہاں زوال کا وقت۔۔۔ بارہ۔۔۔“ **معید** نے ٹھٹھا

اڑایا۔

”معید۔۔۔!“ اس نے دھاڑ لگائی۔

”امی۔۔۔!“ اگلی پکار صفیہ کے لیے تھی۔ وہ معاملہ حل کیوں نہیں کرتیں۔

”ہاں بارہ ہی بجے تھے۔“

”تو پھر برتھ سرٹیفکیٹ پر یکم اپریل کیوں لکھا؟“ معید کا سوال وزن رکھتا تھا۔

”وہ تو اس کے ابو نے لکھوایا تھا۔“

”او ابو۔۔۔!“ حمیرا نے چھت کی طرف دیکھا۔ ”بہرحال۔۔۔ برتھ سرٹیفکیٹ جو مرضی کہے، مجھے فول نہیں بننا۔۔۔ ویسے بھی مجھ جیسی لڑکی مارچ ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔“

”کیوں۔۔۔؟“ معید نے ابرو چڑھائے۔ ”تم میں کیا خاص ہے۔۔۔ بلکہ مارچ میں کیا خاص ہے؟“ وہ بھنایا تھا۔

”مارچ۔۔۔!“ وہ بہت پیارا مسکرائی۔ ”بہار کا موسم۔۔۔ پھولوں خوشبوؤں، رنگوں کا موسم۔۔۔ مجھ جیسی لڑکی ایسے ہی کسی مہینے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بہار جیسی لڑکی حمیرا عبدالمجید۔۔۔“ وہ کھلکھلائی۔

معید لاجواب ہوا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ صفیہ نے دونوں کو ایک نظر سے دیکھا۔

”شکر ہے کہ کوئی ایسا بڑا نقصان نہیں ہوا جس کی تلافی نہ کی جا سکتی۔ ایسی کھلکھلاہٹ، روشنی ہی تو چاہی تھی اپنی بیٹی کے لیے۔۔۔“

”آپ نے پھونک نہیں ماری مجھ پر۔۔۔“ اس کی ہنسی تھمی تو اس نے صفیہ سے ڈپٹ کر پوچھا۔

صفیہ اپنے خیالوں سے چونکیں۔ حمیرا بڑے اہتمام سے چوکڑی مار کے منہ ذرا سا آگے کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔

صفیہ کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں۔

معید سینے پر ہاتھ لپیٹے چوکھٹ کا سہارا لیے پیروں کی قینچی بنائے ذرا سا ترچھا کھڑا حمیرا کے لاڈ اور مان کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

کتنے برے الفاظ سے پکارا تھا اسے ہمیشہ۔۔۔ صفیہ خود سے خفا ہونے لگیں۔

”ادھر آؤ۔۔۔“ اسے پکارا۔ وہ حیران ہوا۔

”ہاں تم۔۔۔“ صفیہ نے سر ہلایا۔

معید کچھ نا سمجھی کے عالم میں نزدیک آیا۔ صفیہ بیٹھ جانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ وہ کچھ جھجکا، مگر بیٹھ گیا۔

اور صفیہ نے اسے حیران کر دیا۔ حمیرا کو بھی، مگر معید کو زیادہ۔

صفیہ نے اپنی مانگی ہوئی ساری دعائیں ان دونوں پر پھونک دی تھیں۔ دعائیں یعنی خواہشیں۔۔۔ دعا یعنی اقرار۔۔۔

”یا ہو۔۔۔“ حمیرا پہلے ہوش میں آئی۔ معید تو گم صم ہو ہی گیا تھا۔ وہ صفیہ سے لپٹ گئی۔

”ارے ارے۔۔۔“ صفیہ چلّاتی رہ گئیں۔

”اب کہو۔۔۔“ صفیہ کمرے سے نکل گئیں تب وہ معید کی سمت متوجہ ہوئی۔

”کیا؟“

”مارچ کہ اپریل۔۔۔“

”مارچ۔۔۔!“ معید نے مان لیا۔

”لیں۔۔۔ اب یہ بھی کہو۔۔۔ محبت، مارچ کا موسم۔۔۔“ معید نے اس کے سراپے پر نگاہ ڈالی۔

قرمزی رنگ کے سادہ سوٹ پر دنیا جہان کے شوخ دھاگے بنے ہوئے تھے۔ اس کی ذہانت سے پُر آنکھیں۔ صحت مند سراپا۔۔۔

پر وہ پیاری کتنی لگ رہی تھی۔ پھول، خوشبو، بہار سی لڑکی۔

ہاں۔۔۔ محبت مارچ کا موسم۔۔۔ وہ مان گیا تھا۔

Downloaded From

READING
Section

تنزیلہ عزیز

وصلِ سحر

"جی ہاں کل۔۔۔!" عزت نے دہرایا۔

"شادی اٹینڈ کیے بغیر۔۔۔؟ مگر کیوں؟" تیمور کو ان کی واپسی کا سن کر حقیقتاً حیرت ہوئی تھی۔

"وہ۔۔۔!" عزت بے ساختہ کچھ بولتے بولتے رک گئی تھی۔

"ہاں ہاں بولو۔۔۔ رک کیوں گئیں؟" تیمور نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا۔

"کیا آپ کو نہیں پتا۔۔۔؟" وہ براہ راست بات کرتے ہوئے ججھک رہی تھی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا نہیں پتا؟ صاف بات کرو عزت مجھے ٹینشن ہو رہی ہے۔" تیمور کو سچ مچ مزید تشویش ہونے لگی تھی۔

"آپ کو بابا کی کال نہیں آئی۔۔۔؟" عزت ابھی بھی کھل کے بات نہیں کر پا رہی تھی۔

"میرا سیل میرے پاس نہیں تھا۔۔۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی آفس سے آیا ہوں۔۔۔ لیکن تم بتاؤ۔۔۔ کیا مسئلہ ہے۔۔۔ واپسی کیوں ہو رہی ہے؟ کیا وجہ ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" تیمور کو زیادہ پریشانی عزت کی طرف سے ہو رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ اسب ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ بابا بہت غصے میں ہیں اسی لیے واپس آ رہے ہیں۔"

انتیسویں قسط

Downloaded From Paksociety.com

Downloaded From

READING
Section

"غصے میں کیوں ہیں۔۔۔؟" تیمور پریشانی کی وجہ سے اصل وجہ بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔۔۔

"آپ کی شادی کی وجہ سے۔" تیمور پہلے چونکا پھر سنبھل گیا۔

"اوہ! تو خبر پہنچ گئی ان تک۔۔۔ میرا سرپرائز بھی نہیں رہنے دیا کسی مخبر نے۔۔۔" تیمور نے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

"بھائی! وہ سچ میں بہت غصے میں ہیں۔" عزت نے اسے رضا حیدر کے مزاج کی سنگینی کا بڑی سنجیدگی سے احساس دلایا تھا۔

"اور میں سچ میں بہت مزے میں ہوں۔" تیمور نے بات کرتے ہوئے اب کی بار ماورا کی طرف دیکھا تھا اور اس دیکھنے میں بھی شرارت تھی۔

"اور بھابھی۔۔۔؟" عزت نے بڑے پیار اور بڑے اشتیاق سے ماورا کو بھابھی کے نام سے نوازا تھا۔

"یہ بات تم اپنی بھابھی سے ہی پوچھ لو۔۔۔" تیمور نے کہہ کر فون ماورا کی سمت بڑھایا اور ماورا نے یکدم چونک کر تیمور کی طرف دیکھا تھا۔

"عزت ہے دوسری طرف۔۔۔ لو بات کرلو۔" تیمور نے فون اسے تھما دیا تھا اور مجبوراً ماورا کو چپ کا قفل توڑنا پڑا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔!" اس نے محض سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! مبارک ہو بھابھی!" عزت کے لہجے میں دبی دبی شرارت اور خوشی ہمک رہی تھی۔

"خیر مبارک۔۔۔ کیسی ہو؟" ماورا نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

"بہت اچھی ہوں۔۔۔ بھائی نے اپنے دل کی خوشی پالی۔۔۔ اب جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا ایم ریئلی ویری ہیپی۔۔۔" عزت کے اندر کی خوشی ماورا اتنی دور سے بھی محسوس کر سکتی تھی جیسے دن میں رضا حیدر کا غم و غصہ محسوس کیا تھا۔

"واپس آرہی ہو۔۔۔؟" ماورا کو ان لوگوں کی بات چیت سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ لوگ کل واپس آرہے ہیں۔

"جی۔۔۔ اور میں اس بات پہ بہت خوش ہوں کہ ہم کل واپس آرہے ہیں۔" عزت واقعی بہت خوش تھی۔

"ہاں۔۔۔ ولید کو مس کر رہی ہو گی اسی لیے واپسی پہ اتنی خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔۔۔" بالآخر ماورا بھی ذرا سے خوشگوار موڈ میں آگئی تھی۔

"بھابھی پلیز۔۔۔ بھائی کیا سوچیں گے؟" عزت نے اس کے چھیڑنے پہ اسے روکا تھا۔

"عزت، ولید کو مس کر رہی ہے، اس بات پہ آپ کیا سوچیں گے۔ ذرا بتا سکتے ہیں مجھے۔۔۔؟" ماورا نے بے اختیار شرارت کا رخ تیمور کی طرف موڑ دیا تھا اور عزت ایئر پیس سے ابھرتی اس کی آواز سن کر سر پیٹ کے رہ گئی تھی۔

"اف بھابھی۔۔۔!" عزت شرم کے مارے اور کیا بولتی۔۔۔

"بتائیں ناں کیا سوچیں گے؟" ماورا نے اسے اکسایا اور تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔۔۔ کیونکہ ماورا نے اسپیکر کا بٹن آن کر رکھا تھا۔

"سوچوں گا کہ اب ولید بارات لے ہی آئے تو اچھا ہے۔" تیمور نے بھی ماورا کی اس شرارت میں اس کا پورا ساتھ دیا تھا۔

"اوہ گاڈ۔۔۔! بھائی آپ بھی؟" عزت نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا تھا۔

"جی ہاں۔۔۔! میں بھی۔" تیمور نے بھی اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"اچھا۔۔۔ بھابھی کے آتے ہی بھابھی کی طرف ہو گئے۔۔۔ بہن کو اکیلا چھوڑ دیا؟" عزت نے احتجاج کیا۔

"نہیں۔۔۔! میں نے بہن کو اکیلا نہیں چھوڑا۔۔۔ پہلے اس کا ساتھ دینے والے کا انتظام کیا ہے۔۔۔ پھر خود کسی کا ساتھ دیا ہے۔" تیمور ڈرائیو کرتے ہوئے عزت کو جواب بھی دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ کن اکھیوں سے ماورا کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جو فون کا اسپیکر آن کیے ان دونوں بہن بھائی کی نوک جھوک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"تو اب کبھی بہن کا ساتھ نہیں دیں گے۔۔۔ بس ایک ہی بار دینا تھا؟" عزت نے اسے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔۔۔

"ارے کیوں نہیں میری جان۔۔۔ زندگی کے ہر موڑ، مقام پر ساتھ دوں گا۔۔۔ جب تک زندگی ہے۔۔۔ لیکن جہاں معاملہ تمہاری بھابھی کا ہو گا۔۔۔ وہاں میں تمہاری بھابھی کا ہی ساتھ دوں گا۔۔۔ تمہارا نہیں۔۔۔" بات کرتے کرتے تیمور نے آخر میں پھر اسے چھیڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے، پھر بھابھی سے ہی بات کریں مجھ سے نہیں۔" عزت ناراض ہو چکی تھی اور تیمور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم بھی اپنی بھابھی سے ہی بات کرو۔۔۔ مجھ سے نہیں۔" تیمور نے بھی اسی کا انداز اپنایا تھا۔

"نہیں۔۔۔ اب میں آپ دونوں سے ہی بات نہیں کروں گی۔" ماورا ان دونوں سے بھی چار ہاتھ آگے تھی۔

"کیوں۔۔۔؟" عزت اور تیمور بیک وقت بولے تھے۔

"کیونکہ آپ دونوں آپس میں بات نہیں کر رہے۔۔۔ آپس میں ناراض ہو رہے ہیں تو میری کیا ویلیو۔۔۔؟ مجھ سے بھی ہو جائیں گے۔۔۔ جن کا آپس میں اتفاق نہیں ہوتا۔ ان کا کسی اور کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" ماورا نے بڑے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے ان پر چوٹ کی تھی اور وہ دونوں بہن بھائی جیسے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے۔

"لیکن یہ تو ہمارا آپس کا معاملہ ہے ناں۔۔۔؟" تیمور نے کمزور سی دلیل دی۔۔۔

"اب یہ آپس کا معاملہ نہیں ہے۔۔۔ اب اس آپس کے معاملے میں میں بھی شامل ہو چکی ہوں۔۔۔ اب آپ لوگوں کی مرضی یا تو شامل کر لیں یا اس آپس کے معاملے سے نکال دیں مجھے۔۔۔؟" ماورا نے کہتے ہوئے بڑی لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔ اور وہ دونوں بہن بھائی اس کی بات پہ لاجواب ہو کر ایک بار پھر چپ ہوئے تھے۔

"تو پھر کیا کیا جائے اب۔۔۔؟" عزت نے لب کشائی کی۔

"آپ لوگ خود سمجھ دار ہیں۔۔۔ میرے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" ماورا جان بوجھ کر لاپروائی کا اظہار کر رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔ سوری۔" اب کی بار پھر وہ دونوں بیک وقت بول پڑے تھے اور ماورا ان دونوں کی اس بے ساختگی پہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اور اس کی ہنسی سمجھ میں آتے ہی وہ دونوں بہن بھائی بھی ہنس پڑے تھے۔ اور اسی ہنسی اور نوک جھونک کے دوران ان کا سفر تمام ہوا تھا۔ شاپنگ مال کے قریب پہنچتے ہی کال بند ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"سر۔۔۔! یہ ہے ریڈ رسٹ واچز کی تمام کولیکشن۔۔۔ آپ خود چیک کر لیجیے۔۔۔" برانچ کے مینیجر کے آرڈر پہ سیلز بوائے نے تمام کولیکشن تیمور کے سامنے سجا دی تھی۔

”ان میں سے ڈائمنڈ واچ کون سی ہے۔۔۔!“ تیمور تمام رسٹ واچز کو توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ تمام ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

”یہ دس رسٹ واچز ڈائمنڈ میں ہیں۔ اور یہ آٹھ اوریجنل گولڈ میں۔۔۔“ سیلز بوائے اور منیجر الرٹ کھڑے تھے۔

”تم بتاؤ اب۔۔۔؟ یا پھر آج بھی مجھے ہی زحمت کرنا پڑے گی؟“ تیمور نے تمام رسٹ واچز کا جائزہ لینے کے بعد ماورا سے رجوع کیا تھا۔

”ریڈ رسٹ واچ آپ کی پسند ہے، اس لیے سلیکشن بھی آپ کی ہی ہونی چاہیے، میں نے تو بس آپ کو پہن کے دکھائی ہے۔“ ماورا نے بے حد آہستہ اور سہولت سے کہتے ہوئے معاملہ تیمور کی پسند پہ چھوڑ دیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ بات ہے؟ پھر اس یادگار شاپنگ پہ یادگار سیلفی تو ہونی چاہیے ناں؟“ تیمور نے فرمائش کی تھی۔

اور پھر سیلز بوائے نے تیمور کی پسند کی ہوئی ڈائمنڈ کی رسٹ واچ اسے پیش کی جو تیمور نے بڑی احتیاط سے نکال کر ماورا کی کلائی کی زینت بنانی چاہی تھی جس کے لیے ماورا نے ہاتھ سامنے کر دیا تھا۔

اور تیمور نے وہ رسٹ واچ خ اس کی کلائی میں سجادی تھی۔

”تھینکس۔۔۔!“ ماورا کے چہرے پہ ہلکی شرم کی سرخی بکھری نظر آنے لگی تھی۔

* * *

”آئس کریم۔۔۔!“ شاپنگ مال سے نکلتے ہی ماورا کی نظر آئس کریم پارلر کی سمت اٹھی تھی۔

”کھاؤ گی۔۔۔؟“ تیمور کے قدم بھی رک گئے تھے۔

”میں اکیلی نہیں۔۔۔ آپ بھی کھائیں گے۔“ ماورا نے اسے بھی شامل کیا۔

”مجھے خاص پسند نہیں ہے۔۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے تو ہے پسند۔۔۔“ ماورا کا بہت موڈ تھا آئس کریم کھانے کا۔۔۔

”تو تم کھاؤ۔۔۔“ اس نے لاپروائی سے کہا۔

”آپ کھائیں گے تب۔۔۔“ اس نے ضد کی۔

”ماورا۔۔۔!“ تیمور نے مصنوعی خفگی سے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”رہنے دیں۔۔۔ میں بھی نہیں کھاتی۔۔۔“ وہ سر جھٹک کر قدم آگے بڑھا چکی تھی۔

اور تیمور نے اس کی اس بچوں جیسی ناراضی پہ مسکراتے ہوئے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”اچھا آؤ میں بھی کھاتا ہوں۔“ تیمور نے اسے ہلکے سے اپنی طرف کھینچا تھا۔ اور اس کے مان جانے پہ ماورا بھی مسکرا اٹھی تھی۔

”لیکن ایک شرط پہ۔۔۔“ تیمور نے شرط رکھی۔

”کیا۔۔۔؟“ ماورا نے بے ساختہ پوچھا۔

”آئس کریم کون میں لینی ہے۔۔۔ اور وہ بھی صرف ایک ہی کون۔۔۔ شیئر کر کے کھائیں گے۔“ تیمور کی شرط پہ ماورا ایکدم بدک اٹھی تھی۔

”واٹ۔۔۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔“ ماورا کو تیمور کی دماغی حالت پہ شک گزرا تھا۔

”اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟ اگر ہم آئس کریم کھا سکتے ہیں تو پھر کون میں کیوں نہیں؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"لیکن... کون میں تو بچے۔" ماورا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تو کیا ہوا... آئس کریم بھی تو بچے ہی کھاتے ہیں ناں...؟" تیمور نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"لیکن تیمور...!" وہ جھنجلائی۔

"اب لیکن ویکن کو چھوڑو... بتاؤ کھاؤ گی یا نہیں؟" تیمور نے اسے شرارتی نظروں سے دیکھا... اور ماورا اس کی نظروں کے مفہوم سے نظر چرا کر پلکیں جھکا گئی تھی۔

"کھاؤں گی... لیکن شیئر۔"

"پھر لیکن...؟" تیمور نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تیمور..." ماورا پھر جھنجلائی تھی۔

"لیتے ہیں ناں... لیکن شیئر کر کے نہیں..." اب کی بار تیمور نے خود اس کی بات مکمل کر دی تھی اور ماورا اس کی شرارت سمجھ کے مسکرا دی۔

"چلو آؤ۔" تیمور اس کا ہاتھ پکڑے آئس کریم پارلر کے اندر آگیا۔ اور پھر سچ مچ اس نے دو کون لی تھیں اور مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔

"ہم شیئر نہیں کر سکتے... لیکن ایک دوسرے کے ساتھ اپنی کون تو چینج کر سکتے ہیں ہاں؟ تیمور نے شرارت کا ایک نیا پہلو نکالا اور آئس کریم کھاتے کھاتے ماورا ایک بار پھر چونک گئی تھی۔

واٹ...؟ مگر کیوں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیونکہ میرے پاس مینگو فلیور ہے اور تمہارے پاس اسٹرابیری... میں اسٹرابیری فلیور ٹیسٹ کرنا چاہتا ہوں... تم یہ لے لو۔" تیمور نے اپنی آدھی کون اس کی طرف بڑھائی اور ماورا ہکا بکا اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

"یار... اتنا شاک کیوں لگ رہا ہے۔ میں بدلے میں دے تو رہا ہوں۔" تیمور نے اسے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کی۔

"پاگل ہو گئے ہیں۔" ماورا نے اسے گھورا۔

"ہاں... اور تم کنجوس ہو گئی ہو... ذرا سی آئس کریم نہیں دے سکتیں؟" تیمور نے جیسے بڑے افسوس کا اظہار کیا تھا جس پر ماورا بے اختیار امڈنے والی ہنسی نہیں روک سکی تھی۔

"یہ لیں... دونوں رکھ لیں..." ماورا نے بڑی سہولت سے اسے اپنی کون بھی تھما دی تھی اور تیمور اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑی کونز دیکھ کر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"اوہو...!" اتنے میں ایک زوردار سیٹی بجی تھی اور ان دونوں نے یکدم سامنے کی طرف دیکھا تھا جہاں اپنی بائیک پہ بیٹھا ولید ان دونوں کو دیکھ کر ہوٹنگ کر رہا تھا۔

"تفریح ہو رہی ہے... واہ... کیا بات ہے؟" ولید نے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے داد دی تھی۔

"کیوں جناب ہمیں کوئی حق نہیں تفریح کرنے کا...؟" تیمور نے الٹا اس سے سوال کیا تھا۔

"ارے کیوں نہیں... کون کہتا ہے کہ آپ کو حق نہیں ہے۔ آپ کے حق تو پورے شہر پہ ہیں... کون روک سکتا ہے بھلا؟ پابندی تو ہم جیسے غریبوں کے لیے ہوتی ہے جو اپنی بیگم کے ساتھ ایک کپ چائے بھی نہیں پی سکتے۔"

"چھوڑو یار... موڈ خراب مت کرو... بلکہ جوائن کرو ہمیں۔" تیمور نے اس کی ساری فریاد پہ پانی پھیر دیا تھا۔

"واہ... جوائن کروں تمہیں؟ وہ بھی اس شرمناک حلیے میں۔" ولید نے طنزیہ اسے سر تا پا دیکھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مُکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مُکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مُتعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

"کیوں میرے حلیے کو کیا ہوا ہے بھلا؟" تیمور نے جیسے خود کو سر تا پا دیکھنے کی کوشش کی تھی اور ایسی ہی کوشش ماورا نے بھی کی تھی۔ جس پہ ماورا کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"رک! دکھاتا ہوں ابھی۔" ولید نے جیب سے موبائل نکالا اور اگلے لمحے میں اس کا حلیہ اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا تھا۔

"اگر آپ اس کو جوائن کرنا چاہتی ہیں تو کرلیں۔" ولید نے ماورا کو تیمور کے ساتھ کھڑے ہونے کا سگنل دیا تھا۔

"بس..... بس یہی کافی ہیں۔" ماورا نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

"کیوں.....؟" تیمور نے ماورا کو دیکھا۔

"کیوں کا جواب یہاں ہے....." ولید بائیک سے اتر کر قریب آ گیا تھا اور اپنا موبائل اس کے سامنے کر دیا تھا۔

جس کو دیکھ کر خود تیمور حق دق رہ گیا تھا اس نے دونوں ہاتھوں میں دو کونز پکڑی ہوئی تھیں اور ان میں سے آئس کریم پگھل پگھل کر اس کی پتلون اور جوتوں کو رنگین کرتی جا رہی تھی ایک طرف پیلا اور ایک طرف گلابی اور یہی حشر اس کے ہاتھوں کا بھی ہو رہا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ.....!" تیمور نے یکدم دونوں کونز دور پھینک دی تھیں جن کا بسکٹ اب اس کی ہتھیلیوں سے چپک چکا تھا۔

"ہے نا شرم ناک حلیہ؟" ولید نے تائید چاہی۔

"ہونہہ..... شرمناک کیوں؟ بچپن میں بھی تو کھاتے تھے اور تقریباً" یہی حال ہوتا تھا۔" تیمور شرمندہ ہوئے بغیر اب دائیں بائیں ہاتھ دھونے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہا تھا۔

"اچھا تو تم ایسے کھاتے تھے؟" ولید نے اس کی پینٹ اور جوتوں کی طرف دیکھ کر پوچھا جس پہ ماورا مزید ہنسی تھی... اور تیمور اس کی ہنسی دیکھ کر سیراب ہو گیا تھا۔

"یار..... میں جیسے بھی کھاتا تھا لیکن میرے آج کے پیسے پورے ہو گئے ہیں پینٹ اور جوتے خراب ہونے کا بھی افسوس نہیں ہے....." ماورا اور ولید دونوں ہی اس کی بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔

"یہ تم کہہ رہے ہو ناں.....! ورنہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو پینٹ سے داغ ختم کرنے کی فکر میں ہی ہلکان ہو رہا ہوتا... امی سے الگ ڈانٹ پڑتی کہ داغ کہاں سے لگا لیے؟ سارا واشنگ پاؤڈر ختم ہو گیا ہے۔" ولید نے اپنا الگ رونا رویا تھا۔

ماورا بے تحاشا کھلکھلائی تھی اور تیمور نے اسے گھور کے دیکھا تھا۔

"پورے پورے میراثی ہو گئے ہو....."

"یار! اب تمہارا رشتے دار ہو گیا ہوں آخر..... کچھ تو عزت سے پیش آؤ۔" ولید نے سر کھجاتے ہوئے اسے تھوڑی شرم دلائی تھی۔

"عزت سے پیش آتا ہوں..... پہلے میں ہاتھ تو دھو لوں۔" تیمور کہہ کر واپس آئس کریم پارلر کے اندر چلا گیا تھا اور ماورا ولید کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"عزت آپ کے ساتھ کیسے پیش آتی ہے پہلے یہ تو بتائیں.....؟" اب چھیڑنے کی باری ماورا کی تھی اور ولید اس کی بات پر ہنس پڑا تھا۔

"وہ تو کچھ ایکسٹرا عزت سے پیش آتی ہے۔" اس کا انداز شرارت بھرا تھا۔

”کل آرہی ہے واپس... اطلاع ملی آپ کو!“ ماورا نے مسکرا کے پوچھا۔

”آف کورس... اطلاع ملی اب تو ہر کام کی سب سے پہلے اطلاع ملے گی۔“ ولید نے فخریہ انداز میں بتایا۔

”وہ کیسے...؟“ ماورا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”بس کچھ دن پہلے تھوڑا رعب اور دبدبہ ڈالا تھا... اور تب سے اب تک سب ٹھیک چل رہا ہے۔“ اس نے جیسے اپنے کالر کھڑے کیے تھے اور ماورا نے اسے خاصی متاثر کن نظروں سے سرتاپا دیکھا تھا۔

”اوہ اچھا... تو یہ بھی ہو چکا ہے... ہماری لڑکی پہ رعب بھی ڈالے جا چکے ہیں۔“

”آپ کی لڑکی نہیں... اپنی بیوی پہ۔“ ولید نے تصحیح کی۔

”ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ ماورا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب کہو کیا فرما رہے تھے؟“ تیمور ہاتھ دھو آیا تھا۔

”میں اب اجازت چاہ رہا ہوں۔ مجھے کسی سے ملنا ہے آپ لوگ انجوائے کریں۔“ ولید نے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں یار... کچھ دیر تو رکو... ڈنر کرتے ہیں۔“ تیمور نے اسے روکنا چاہا۔

”نہیں پھر کبھی سہی ابھی ٹائم نہیں ہے...“ ولید اس سے ہاتھ ملا کر اجازت لیتے ہی رخصت ہو گیا تھا۔

”اب کیا ارادہ ہے... ڈنر کہاں ہونا چاہیے؟“ تیمور ماورا کی طرف متوجہ ہوا۔

”گھر پر...“ ماورا واقعی سکون سے ڈنر کرنا چاہتی تھی۔

”اوہ... یہ تو سب سے اچھا آئیڈیا ہے...“ تیمور کو بھی پسند آیا تھا۔

”لیکن ڈنر سے بھی پہلے تم نے گھر جا کے چینج کرنا ہے تیار ہونا ہے۔ آج تمہیں فل تیاری میں دیکھنے کا موڈ ہو رہا ہے۔ ایک سجی سنوری بیوی کے روپ میں...“ تیمور کی فرمائش اس کے لیے مشکل تو تھی مگر ناممکن نہیں... ماورا سوچ کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

آف وائٹ فراک میں ہلکے میک اپ کے ساتھ سجی سنوری ماورا خود کو دیکھ کر خود ہی حیران رہ گئی اس نے اپنا ایسا روپ و رنگ کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی ایسا تیار ہوئی تھی۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے ماورا! پلیز ذرا جلدی۔“ تیمور بھوک کے ہاتھوں مجبور کافی عجلت میں اندر داخل ہوا تھا لیکن ڈریسنگ ٹیبل کی سمت نظر اٹھتے ہی ساری بھوک و پیاس ختم ہو گئی تھی‘ وہ مبہوت سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”میں تیار ہوں چلیے...“ ماورا اس کے قدموں اور زبان کی خاموشی نوٹ کر چکی تھی‘ اسی لیے اس خاموشی کے تسلسل کو اس نے خود ہی توڑنے کی کوشش کی تھی۔

”کہاں...؟“ تیمور نے نا سمجھی سے پوچھتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھائے تھے۔

”ڈائننگ روم میں... آپ کو بھوک لگی ہے ناں... اس لیے۔“ اس نے پلکیں جھکالی تھیں کیونکہ وہ اسے بہت وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔

”کس نے کہا کہ مجھے بھوک لگی ہے...؟“ تیمور نے قریب آتے ہوئے اسے ساتھ لگالیا۔

”آپ نے...“ ماورا نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پہ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔

”میری بھوک تو ختم ہو گئی...“

”پھر پیاس ختم ہو گئی... پھر نیند ختم ہو گی... پھر۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

”جب تم پاس ہو تو پھر ہر چیز ختم ہی ہو گی ناں؟ تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کی کیا ضرورت؟ بھوک پیاس نیند سب جانے دو..... کیونکہ تم جو ہو۔“

تیمور کی آواز مدھم ہو گئی تھی اور اس کی آواز کے ساتھ ماورا کی دھڑکن کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔

”لیکن مجھے تو بھوک لگی ہے۔“ ماورا نے اس کی بات ٹالنے کی کوشش کی....

”فرصت سے میرے پاس بیٹھو.... دل سے دل کی باتیں سنو.... ایسی فرصتیں بار بار نہیں ملتیں۔“ تیمور دل کی گہرائیوں سے ان لمحوں کو محسوس کر رہا تھا۔

” زندگی ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے....“ ماورا نے لاپروائی سے کہا۔

”زندگی کب ہے اور کب نہیں، یہ ہی تو پتا نہیں چلتا.... اس لیے اپنے ہر پل کو اپنی مٹھی میں اس طرح قید کر لینا چاہیے کہ سب رنگ آپ کے ہاتھوں میں محفوظ ہو جائیں....“ تیمور نے فلسفہ جھاڑا۔

”اچھا تو آپ سب رنگ اپنی مٹھی میں محفوظ کر رہے ہیں....؟“

”بالکل....“ تیمور نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر یہ بھی محفوظ کر لیں۔“ ماورا نے کہتے ہوئے یکدم اسے پرے دھکیلا اور خود دروازے کی طرف بھاگ گئی تھی، تیمور اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے سٹپٹا کے رہ گیا تھا اور ماورا کھلکھلاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

”ماورا!“ اس کے پیچھے وہ بھی بھاگا آیا تھا۔

* * *

ان کی زندگی کے یہ تین دن بہت خوشگواریت لیے ہوئے گزرے تھے۔

لیکن صبح ہوتے ہی وہ تمام خوشگواریت کہیں دور جا سوئی تھی۔

وہ دونوں ابھی اپنے کمرے میں سو رہے تھے جب رضا حیدر کی چنگھاڑتی ہوئی آواز ان تک پہنچی تھی۔

”تیمور.... تیمور کہاں ہو.... نیچے آؤ۔“ رضا حیدر پتا نہیں یہاں تک کیسے برداشت کر کے پہنچے تھے.... اور گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ تیمور کی آنکھ کھلی اور وہ یکدم بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ ماورا بھی بیدار ہو چکی تھی۔

”بابا آ گئے....؟“ تیمور نے اسے دیکھا۔

”جی....!“ وہ نظریں جھکا گئی۔

”اچھا.... میں دیکھتا ہوں۔“ وہ شرٹ اور سلیپر پہن کر دروازے کی طرف لپکا۔

”تیمور....!“ ماورا نے اسے بے ساختہ پکارا تھا، نجانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ اس کی طرف پلٹا، ماورا کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی، وہ بے اختیار اس کے قریب آیا۔

”ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہو گا تم پریشان نہ ہو۔“ تیمور اس کے ماتھے سے اس کے بال پیچھے ہٹا کر اس کا ماتھا چوم کر گال تھپکتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ اور ماورا کو لگا جیسے اس کے سینے سے دل نکل کر باہر آ گیا ہو۔ اس کے آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے!

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

Downloaded From

READING
Section

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

Downloaded From

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ ”پچھتاؤ گی۔“ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

✡ ✡ ✡

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔

READING
Section

عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے لگتہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

عبداللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

ناولٹ

Downloaded From

عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پرواک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑجاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔

READING
Section

اوریدا اور ارصم کی بہت دوستی ہے۔ جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کر لے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

تیرہویں قسط

جلال صاحب نے ناراضی سے اپنی زوجہ محترمہ کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے اپنے پیروں کے ناخنوں کو گھورنے میں مصروف تھیں۔ اتنا تو انہیں بھی اندازہ تھا کہ وہ ان سے پوچھے بغیر ایک قدم اٹھا چکی ہیں۔ اب انہیں جلال صاحب کے ردعمل کا ڈر تھا۔

تیمور کی ترسی ہوئی نگاہیں اپنے بوڑھے باپ پر جمی ہوئی تھیں جو ان سے چند قدموں کے فاصلے پر کسی بلند و بالا پہاڑ کی مانند ساکت کھڑے تھے اور ان کے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ جسے وہ چاہتے ہوئے بھی اکیلے عبور نہیں کر سکتے تھے۔ سات لوگوں کی موجودگی میں بھی ایک اعصاب شکن خاموشی ان کے درمیان آکر ٹھہر گئی۔

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرائے کھڑے تھے۔

"بڑے ابا، کیسے ہیں آپ.....؟" ماہیر کی آواز نے اس سناٹے کو توڑا۔ ان لمحات میں ایسی ہمت وہی کر سکتا تھا اور اس نے کی بھی۔ اس کے سوال پر سب ہی کی سوالیہ نگاہیں بڑے ابا کے چہرے کی جانب اٹھیں۔

"ٹھیک ہوں....." ان کا لہجہ سرد، چہرہ سپاٹ اور آنکھوں سے صاف خفگی جھلکی۔

"کہیں جا رہے تھے کیا۔" اس دفعہ سوال کرنے کی ہمت ان کی بیگم نے کی۔

"ہوں....." انہوں نے اپنی شریک سفر کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ بڑے عجلت بھرے انداز میں انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اگلے ہی لمحے انجن کی آواز پر سب لوگ بے اختیار ہی ایک طرف ہو گئے۔

"ماہیر، تم لوگ جاؤ میں کسی ملازم سے کہہ کر سامان اندر بھجواتی ہوں۔" بڑی اماں کے چہرے پر پھیلی بڑی بے ساختہ سی شرمندگی اور مایوسی کے ملے جلے جذبات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ وہ بہت زیادہ ضد کر کے تیمور کو پاکستان لائی تھیں اور دل کے کسی کونے میں یہ خوش فہمی پنپ اٹھی تھی کہ شاید اتنے سالوں کے بعد بیمار بیٹے کو دیکھ کر سرد جذبات کی برف پگھل جائے لیکن ہوا وہی تھا جس کا ڈر ان کے دل میں کنڈلی مارے کسی سانپ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جلال نے انا اور ضد کا چولا آج بھی مضبوطی سے پہنا ہوا تھا اور اسے کسی صورت اتارنے کو تیار نہیں تھے۔

"ماہیر! اپنے بابا کو اندر لے کر جاؤ....." اتنے سرد استقبال پر بڑی اماں کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"اماں! آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے میں پہلی دفعہ اس گھر میں آیا ہوں۔" تیمور نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیں۔

"ہاں بھئی، یہ عدینہ ہے ناں....." تیمور کے شفقت بھرے لہجے پر عدینہ نے جھٹ سے انہیں سلام کیا۔

"انکل کیسے ہیں آپ اور بڑی اماں شکر ہے، آپ واپس آگئیں، اوریدا نے مجھے بہت تنگ کر رکھا تھا۔" عدینہ ہلکے پھلکے انداز میں ماحول میں پھیلے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش میں بولی۔ عدینہ کو بڑی اماں کے نقوش بہت جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔

"اچھا، مجھے تو بتا رہی تھی کہ یہ اب سدھر گئی ہے....." بڑی اماں نے محبت سے عدینہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار دیا۔

"بڑی اماں ایسا، اس صدی میں تو ممکن نہیں، اگلی صدی کی ضمانت میں دے نہیں سکتا۔" ماہیر، اوریدا کو چھیڑتا ہوا سرمد کے ساتھ مل کر گاڑی سے سامان نکالنے لگا۔ سرمد کی نظریں بار بار بھٹک کر اوریدا کی طرف جا رہی تھیں جو اسے خاصی کمزور اور افسردہ سی لگ رہی تھی۔

"دیکھ لیں پاپا! یہ آتے ہی شروع ہو گئے۔" اوریدا نے منہ بنا کر شکایت لگائی، وہ تیمور کے کندھے سے لگی کھڑی تھی۔

"اچھا اچھا اب یہ شکایتیں اندر جا کر کر لینا، کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئی ہیں میری۔" بڑی اماں نے لاپروائی سے اسے ٹوکا اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

"یہ تم دونوں کہاں خالی ہاتھ لٹکاتی جا رہی ہو، تھوڑا سامان اٹھاؤ....." ماہیر نے ایک دفعہ پھر شرارت کی۔

"تو کس نے کہا تھا سارا لندن خالی کر کے آجائیں....." اوریدا نے ناک چڑھا کر بیزاری سے ماہیر کو جواب دیا اور عدینہ کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب چل دی، جب کہ ماہیر اور سرمد دونوں مسکراتے ہوئے سامان نکالنے لگے۔

☆ ☆ ☆

ہاشم اور بختاور کی زندگی شدید قسم کی مشکلات کا شکار ہو چکی تھی۔ معاشی مسائل منہ کھولے ان کی ساری خوشیاں نگلنے کے لیے تیار تھے۔ دکانوں پر لگنے

والی آگ نے ہاشم کو ایک دن میں آسمان سے زمین تک پہنچا دیا تھا۔ ایک تو غربت اور اوپر سے بیماری نے اسے بے انتہا چڑچڑا کر دیا تھا۔ وہ بات بات پر بختاور سے لڑنے لگتا۔ ان حالات نے بختاور کی ساری دلکشی اور رنگ روپ اجاڑ کر رکھ دیا' اس کی آنکھوں کے گرد حلقے دن بہ بدن سیاہ ہوتے جارہے تھے۔ ان ہی دنوں دوبارہ اماں بننے کی خبر نے ان دونوں کو ہی خوف زدہ کر دیا۔

”مجھے نہیں چاہیے' یہ بچہ بس کسی طرح سے اس سے جان چھڑاؤ۔۔۔“ ہاشم نے سنتے ہی آسمان سر پر اٹھالیا۔

”میں کیسے جان چھڑا سکتی ہوں ہاشم' یہ گناہ ہے۔۔۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”مجھے کسی گناہ ثواب کا نہیں پتا' میں اسے نہیں پال سکتا۔۔۔“ وہ حد درجہ مایوس اور قنوطیت کا شکار تھا۔

”ہم انسان کون ہوتے ہیں کسی کو پالنے والے' وہ رب ہے جو پوری دنیا کو پالتا ہے۔“ بختاور نے بڑے غلط موقعے پر اسے نصیحت کی۔

”تو کہو ناں' اپنے رب کو' ہمیں چینی' گھی' دال اور گوشت دے کر جائے۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولا۔

”استغفراللہ۔۔۔“ وہ فوراً“ خوف زدہ ہوئی۔

”یہ ایکٹنگ میرے سامنے مت کیا کرو۔۔۔“ اس نے بے زار لہجے میں کہا۔

”ہاشم! کیوں اتنا زیادہ مایوس ہو رہے ہو' اللہ بہتر کرے گا۔۔۔“ بختاور روہانسی ہوئی۔

”میں تمہاری طرح ان خوش فہمیوں کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔۔۔“ وہ بلند آواز میں چیخا۔

”اس میں خوش فہمی کی کیا بات ہے۔۔۔؟“ اسے بھی غصہ آیا۔

”پچھلے آٹھ ہفتوں سے میں اس بیڈ پر پڑا ہوا ہوں' ادھار لے کر ہمارا گزارا ہو رہا ہے' اور تمہاری شکر گزاری ہی ختم نہیں ہو رہی۔“ وہ متنفر لہجے میں گویا ہوا۔

”ایک بات کہوں' اگر برا نہ مانو تو۔۔۔“ وہ اس کے قریب آن بیٹھی اور آس بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”کوئی تبلیغی لیکچر مت دینا پلیز!“ اس نے بھی جواباً“ انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

”لیکچر نہیں دے رہی' اصل میں مجھے فائزہ بھابھی نے کہا ہے۔۔۔“ وہ ہلکا سا اٹکی۔

”کیا کہا ہے۔۔۔؟“ ہاشم نے ناگواری سے اسے دیکھا جو کشمکش و پیچ کا شکار ہو رہی تھی۔

”اب بول بھی دو خوامخواہ کی ایکٹنگ مت کرو۔۔۔“ ہاشم کی قوت برداشت آج کل بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو دیکھ کر بختاور نے کھل کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا ویسے بھی وہ ان حالات سے خود بھی خاصی دل برداشتہ ہو چکی تھی۔

”اصل میں فائزہ بھابھی کی کسی دوست کا پرائیویٹ اسکول ہے' انہوں نے مجھے آفر کی ہے کہ میں وہاں جاب کر لوں۔“ اس کے منہ سے انتہائی غیر متوقع بات سن کر ہاشم ایک لمحے کو چپ کر گیا' کچھ بھی تھا وہ بختاور پر معاشی ذمے داریوں کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

”مجھے معلوم تھا' تمہیں یہ بات پسند نہیں آئے گی' لیکن جیسے ہی تمہیں کوئی جاب ملے گی میں چھوڑ دوں گی اسے۔“ اس نے فوراً“ ہی اس کی سوچ پڑھ کر اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”کہاں پر ہے اسکول۔۔۔؟“ ہاشم کے لہجے میں ہلکی سی رضامندی دیکھ کر وہ پرجوش ہوئی۔

”یہیں' دو گلیاں چھوڑ کر۔۔۔“ اس نے فوراً“ جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے' لیکن اس سے پہلے اس بچے سے جان چھڑاؤ۔۔۔“ ہاشم کی اس بات نے اس کا سارا سکون درہم برہم کیا۔

”گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔۔۔ میں کسی ڈاکٹر کو دینے کے لیے فیس کہاں سے لاؤں۔۔؟“ وہ جھنجلا سی گئی۔

”بے وقوف لڑکی، یہ ہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں اپنا گزارہ نہیں ہو رہا اور تمہیں آبادی بڑھانے کی پڑی ہوئی ہے۔“ اس کی زبان دن بہ دن تلخ اور دل دکھانے والی بن چکی تھی۔ بختاور ایک دم شرمندہ ہوئی جیسے اس جان کو دنیا میں لانے کی وہ اکیلی ذمے دار ہو۔

”میں ڈاکٹر کو دینے کے لیے پیسوں کی بات کر رہی ہوں۔۔۔“ اس نے جتاتی ہوئی نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”فائزہ بھابھی سے بات کرو، کسی مڈوائف یا لیڈی ہیلتھ ورکر وغیرہ کے پاس لے جائیں گی تمہیں۔“ اس نے نظریں چرا کر اس دفعہ ذرا دھیمے لہجے میں مشورہ دیا۔

”اچھا، دیکھوں گی۔۔۔“ بختاور نے اسے ٹالا۔

اگلے ہی ہفتے فائزہ بھابھی کے توسط سے اس کی پرائیویٹ اسکول میں جاب شروع ہو گئی تھی۔ تنخواہ اگرچہ کم تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا، لیکن بختاور کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ نوکری آنے والے دنوں میں اس کے لیے اور زیادہ مشکلات کا باعث بن جائے گی۔ ایک تو اس کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اوپر سے گھر میں اکیلے رہ رہ کر ہاشم حد درجہ چڑچڑا ہو گیا تھا، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس سے لڑنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ اس دن بھی وہ اسکول سے واپسی پر سبزی منڈی چلی گئی۔ واپسی پر کچھ دیر ہو گئی تھی، اس لیے جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا، ہاشم اس پر برس پڑا۔

”کہاں آوارہ گردیاں کرتی ہوئی آ رہی ہو، کچھ اندازہ ہے کہ سارا دن گھر میں پاگلوں کی طرح اکیلا پڑا رہتا ہوں۔“ وہ اس کے مضمحل اور تھکے تھکے وجود سے دانستہ نظریں چرائے اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔

”گھر میں پکانے کے لیے کچھ نہیں تھا، وہی لینے گئی تھی۔۔۔“ بختاور نے آہستہ سے کہہ کر شاپر سائیڈ میز پر رکھے۔

”اور یہ گھاس پھونس اور کھیت کھلیان اٹھا کر لے آئی ہو تم۔۔۔؟“ وہ طنزیہ نگاہوں سے پالک اور میتھی کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ تین چار دن کی سبزی اکٹھی لے آئی تھی۔

”تمہارے لیے گوشت بھی لائی ہوں۔۔۔“ اس نے ہاشم کو چپ کروانے کے لیے افسردگی سے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے گوشت کا بھوکا ہوں، کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا میں نے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی بات میں سے غلط مطلب نکال چکا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہاشم، کیوں بات بات پر لڑنے لگتے ہو۔۔۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”تم میری کوئی بات نہیں مانتی ہو۔۔۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

”مثلاً“ کون سی بات نہیں مانی۔۔۔؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”تم مڈوائف کے پاس کیوں نہیں گئیں۔۔۔؟“ وہ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

”اس دفعہ صرف پندرہ دن کی تنخواہ ملی ہے، اگلے ماہ چلی جاؤں گی۔۔۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔

”میں بتا رہا ہوں تمہیں۔۔۔“ وہ انگلی اٹھا کر دھمکی دینے کے انداز میں بولا۔ ”مجھے یہ بچہ ہی نہیں بلکہ اگلے تین چار سال تک کوئی بچہ نہیں چاہیے، جب تک میں خود اسٹیبلش نہیں ہو جاتا۔۔۔“ اس کے ارادوں نے بختاور کو خوف زدہ کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔؟“ وہ گھبرا کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

”میں اپنے بچے کو ٹکے ٹکے کی چیزوں کے لیے نہیں ترسا سکتا۔۔۔“ اس کے پورے وجود میں تلخی رچ بس گئی تھی۔

”حالات ایک جیسے ہمیشہ تھوڑی رہیں گے، انشاء اللہ کوئی نہ کوئی سبب نکل آئے گا۔“ وہ اسے دلاسا دینے کے انداز میں بولی۔

”ایک دفعہ دکانیں سیٹ ہو جائیں تو چلو، کوئی نہ کوئی

تو آسرا ہو جائے۔۔۔" وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔۔۔ اس کا مزاج عجیب سا ہو گیا تھا ایک دم غصے سے چیختے ہوئے فوراً" ہی ٹھنڈا پڑ جاتا، شاید یہ غصہ، ناراضی اور تلخی اس کے وجود کی نہیں حالات کی پیدا کردہ تھی۔ بختاور نے تو اس کا یہ روپ یہاں آنے کے بعد ہی دیکھا تھا۔

وہ اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔

"اندازاً" کتنے پیسے درکار ہوں گے۔۔۔" بختاور کچھ سوچ کر اس کے قریب آئی۔

"کافی سارے۔۔۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"کیا تم میری یہ گولڈ کی چین اور کچھ اور چھوٹی موٹی چیزوں کو بیچ کر گزارا کر سکتے ہو۔؟" اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"اب میں اتنا بھی گھٹیا نہیں ہوا۔۔۔" اسے کرنٹ لگا۔

"جب وقت اچھا آئے گا تو میں بنوالوں گی ناں۔۔۔" بختاور اس کے بالکل پاس آکر بیٹھ گئی اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاشم کے چہرے پر پھیلا تناؤ تھوڑا کم ہوا۔ بختاور کو احساس ہوا، ان دونوں کو ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر محبت اور نرمی سے بات کیسے پورا پورا ۔ مہینہ گزر جاتا تھا۔ حالات کی تلخ دھوپ، محبت بھری چھاؤں پر حاوی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے لڑتے محبت کرنا بھول گئے تھے۔

"بال کتنے بڑے اور رف ہو چکے ہیں۔۔۔" بختاور کو بات کرتے کرتے احساس ہوا تو وہ سرسوں کا تیل اٹھا لائی اور آہستہ آہستہ اس کے سر کا مساج کرنے لگی۔

اب یہ اس کی نرم پوروں میں رچی محبت کا اثر تھا یا ہاشم ذہنی طور پر خود سے لڑتے لڑتے تھک چکا تھا اس کے چہرے پر طمانیت کے رنگ پھیلنے لگے۔

"ہاتھ کتنے سخت ہو گئے ہیں تمہارے۔۔۔" اس نے ایک دم ہی اس کا بازو پکڑ کر اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ بختاور نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ہاشم کی آنکھوں میں شرمندگی، اداسی اور دکھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" بختاور کو عجیب سا احساس ہوا۔۔۔

"وقت بہت ظالم ہے۔۔۔" وہ کسی تکلیف دہ سوچ کے زیرِ اثر بولا، وہ ناسمجھی کے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"انسان اچھے وقتوں میں محبت کے جو بڑے بڑے دعوے زعم کے ساتھ کرتا ہے، حالات کی ایک ٹھوکر کے آگے ساری قسمیں، سارے وعدے بھربھری ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔ وقت کی بساط پر کوئی نہیں جانتا، کسی مہرے کو کس وقت کہاں پر مات ہو جائے۔" اس نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔

"برا وقت خزاں رسیدہ شجر کی مانند سہی لیکن اس پر بھی امید کی کونپلوں کو پھوٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ شرط یہ ہے کہ اسے خلوص دل سے پانی دیا جائے۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے اس کی کنپٹیوں کو ہلکا ہلکا دبانا شروع کیا تو ہاشم کو ایسے لگا جیسے دنیا بھر کے غم، دکھ اور رنج بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو رہے ہوں اس پر ایک دل فریب سی غنودگی طاری ہونے لگی اور آج کافی مہینوں کے بعد ایک پُرسکون نیند اس کا مقدر بنی تھی۔

☼ ☼ ☼

آپا صالحہ نے جب سے بل بورڈ پر وہ چہرہ دیکھا تھا ان کا آدھا سکون تباہ ہو چکا تھا۔ وہ آج کل نماز پڑھنے کے بعد اکثر ہی اپنی ساس کے کمرے میں ٹی وی کے سامنے پائی جاتیں۔ وہ اس لڑکی کو ایک دفعہ پھر غور سے دیکھنا چاہتی تھیں جسے دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکنیں مرتعش ہوئی تھیں۔

"آج کل کوئی نیا ڈراما نہیں آرہا کیا؟" آپا صالحہ نے اپنی ساس کو دودھ کا گلاس پکڑاتے ہوئے دانستہ لاپروائی سے پوچھا۔ اتنا تو انہیں بھی پتا تھا کہ وہ ڈراموں کی خاصی شوقین تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"کس چینل پر۔۔۔؟" بے بے نے دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے انہیں تحیر میں مبتلا کیا۔

"آپ کو پتا تو ہے مجھے کہاں شوق ہے ان فلموں ڈراموں کا اور کیا پتا کون کون سے چینلز پر آتی ہیں ایسی چیزیں۔۔۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"پھر کیوں پوچھ رہی ہو تم۔۔؟" بے بے کا لہجہ تو عام سا تھا، لیکن وہ گھبرا گئیں۔

"میں تو ایسے ہی بات کر رہی تھی۔" وہ اٹھ کر خوامخواہ ان کے پلنگ پر بچھی چادر کی نادیدہ سلوٹیں دور کرنے لگیں۔

"آج کل دو نئے ڈرامے شروع ہوئے ہیں۔" بے بے نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا۔۔۔ کون کون سے۔۔۔؟" وہ ان کے قریب آکر بیٹھ گئیں، جب کہ بے بے ان کو دونوں ڈراموں کی کہانی سنانے لگیں، جو انہیں بالکل سمجھ میں نہیں آئی، کیونکہ ان کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں وہ کسی خاص چہرے کی منتظر تھیں، جو اللہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ بور ہو کر کھڑی ہو گئیں، عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔

"اب ڈراما تو پورا دیکھ لو۔۔۔" بے بے نے انہیں دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر ٹوکا۔

"میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔" وہ جلدی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنی تسبیحات سے فارغ ہو کر بے بے کے کمرے میں آئیں تو ٹی وی چل رہا تھا، جب کہ وہ گہری نیند میں تھیں، یہ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو جاتیں اور پھر رات کے کسی پہر ان کی آنکھ کھلتی تو ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی بند کر کے دوبارہ سو جاتیں۔

صالحہ نے ان کے سرہانے کے پاس رکھا ریموٹ اٹھایا اور جیسے ہی بند کرنے کے لیے ان کی انگلی ریموٹ کنٹرول کی طرف بڑھی انہیں زوردار جھٹکا لگا۔ سامنے ٹی وی پر بسکٹ کے اشتہار میں ہنستا مسکراتا چہرہ وہی تھا جو اس دن انہوں نے بل بورڈ پر دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے بائیں طرف موجود چھوٹا سا تل اور وہی روشن چمک دار آنکھیں جن کا نقش ان کے دل پر کھدا ہوا تھا۔ وہ بے تاب انداز میں ٹی وی کی جانب بڑھیں، جیسے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر نکال لیں گی، لیکن چند سیکنڈ کا اشتہار ختم ہو چکا تھا۔ وہ مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گئیں اور ٹی وی کی آواز بند کر کے وہ پوری دل جمعی سے اشتہارات دیکھنے لگیں۔ ان کا دل اتنے زوردار طریقے سے دھڑک رہا تھا، جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"صالحہ پتر! نیند نہیں آرہی کیا۔۔۔؟" بے بے کی آواز پر وہ بری طرح اچھلیں۔

"آپ جاگ رہیں تھیں کیا؟"

وہ اچھی خاصی شرمندہ ہو گئیں۔

"نہیں۔۔۔ ٹی وی کی آواز بند ہونے سے آنکھ کھلی ہے میری۔۔۔" وہ معصومیت سے گویا ہوئیں۔

"آپ بھی دنیا کی پہلی اور آخری خاتون ہوں گی، جن کی نیند شور سے نہیں بلکہ خاموشی سے خراب ہوتی ہے۔" انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی ساس کو چھیڑا تو وہ مسکرا دیں۔ جب کہ صالحہ کی نگاہیں ابھی تک ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں، لیکن بسکٹ کا وہ اشتہار آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تنگ آکر انہوں نے ٹی وی بند کر دیا اور اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ یہ رات بھی گزشتہ راتوں کی طرح انہوں نے کانٹوں پر ہی گزاری تھی۔

"آخر کون تھی وہ لڑکی اور میرا دھیان بار بار ایک ہی طرف کیوں جا رہا ہے۔" انہوں نے اپنے اندر بڑھتے ہوئے گھٹن کے احساس کو کم کرنے کے لیے کمرے کی کھڑکی کھولی اور لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو۔" انہوں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن دل ناداں اس بار سنبھلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"یا اللہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح اللہ سے رجوع کیا۔ نوافل پڑھنے

کے بعد ان کا ذہن کچھ پرسکون ہوا تو وہ سو گئیں' لیکن دل ہی دل میں وہ تہیہ کر چکی تھیں کہ اس لڑکی کا کھوج لگا کر رہیں گی۔

اگلی صبح مدرسے کی بچیوں سے فراغت پا کر وہ کسی کام سے بے بے کے کمرے میں آئیں تو مونا وہاں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور ٹی وی چل رہا تھا۔

"آپا! آئیں نا' بہت زبردست ڈراما شروع ہوا ہے۔" مونا نے بوکھلا کر انہیں پیش کش کی۔

"کون سا....؟" انہوں نے خلاف عادت پوچھا تو مونا ایک دم حیران ہوئی۔ جب کہ ان کی نظریں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں جہاں وہی معصوم چہرہ اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔

"مونا! اس لڑکی کا نام کیا ہے....؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کس کا....؟" مونا نے چونک کر ان کی نظروں کے تعاقب میں ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔

"اوہ یہ تو شانزے ابراہیم ہے' پہلا سیریل ہے یہ اس کا...." مونا کی معلومات قابل رشک تھیں۔ جب کہ دوسری طرف آپا صالحہ جتنی دفعہ اسے دیکھ رہی تھیں اتنی ہی دفعہ ان کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک ہی نام رقص کر رہا تھا' جسے وہ سننا نہیں چاہتی تھیں۔

* * *

شانزے نے بمشکل رباب کو منایا تھا بس ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کی کسر رہ گئی تھی۔ رباب نے اگرچہ اپنا بیگ دوبارہ اسے الماری میں رکھ دیا' لیکن اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"اب اپنا موڈ تو ٹھیک کر لو تم...." وہ اس کے لیے کافی بنا کر ٹیرس میں لے آئی۔

"موڈ میرا ٹھیک ہے' میں بس اس وقت سے ایک ہی بات سوچ رہی ہوں۔" وہ بات کرتے کرتے رکی' شانزے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ لوگ بہت بدقسمت ہوتے ہیں شانزے' انہیں رشتوں کی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ انہیں کھو نہ دیں۔"

"تم مجھ پر طنز کر رہی ہو نا...." شانزے فوراً بات کی تہ تک پہنچی۔

"نہیں.... تمہیں بتا رہی ہوں۔" رباب نے سادگی سے کہا۔

"فکر مت کرو' میری زندگی میں ویسے ہی گنے چنے لوگ ہیں اور تم واحد دوست ہو میری...." شانزے نے اطلاع دینے کے انداز میں اسے بتایا۔

"یہ ہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔" اس کے بڑبڑانے پر شانزے چونکی۔ "کیسی مصیبت....؟"

"پتا ہے جن لوگوں کا کوئی دوست نہیں ہوتا ان سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے مجھے...." وہ صاف گو انداز میں گویا ہوئی۔

"وہ کیوں بھلا....؟" شانزے کافی پینا بھول کر اس کا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

"جن کا کوئی دوست نہیں ہوتا' ان میں کوئی نہ کوئی ایسی ناپسندیدہ بات ہوتی ضرور ہے' جو کوئی بھی ان کے قریب جانا پسند نہیں کرتا۔" رباب کا لہجہ اس کا دل دکھا گیا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میرا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔" شانزے دکھی ہوئی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تمہارا شمار ایسے لوگوں میں نہ ہو...." رباب کی بات پر اس کے دکھ کی شدت کم ہوئی۔

"پلیز.... شانزے! لوگوں کی قدر کیا کرو' اچھے اور مخلص لوگ زندگی میں بار بار نہیں ملتے۔" رباب کی بات پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرادی۔

"ہاں.... اسی لیے میں اس ویک اینڈ پر پھپھو کے پاس جا رہی ہوں۔" شانزے کی بات نے اسے حیران کیا۔

"لاہور....؟" رباب نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

READING Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.Paksocietu.com

Downloaded From

”ہاں میرے تایا کے بیٹے کی شادی ہے اور سب لوگ بلا رہے ہیں مجھے....“ اس نے مسکرا کر بتایا۔

”اس دفعہ جاؤ تو ان سے اپنی والدہ کے بارے میں ضرور پوچھنا۔“ رباب نے جلدی سے کہا۔

”ہاں بات کر کے دیکھوں گی شاید وہ لوگ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔“ اس نے نیم رضامندی کا اظہار کیا۔

”شاید نہیں یقیناً“ وہ ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے۔“ رباب نے اسے تسلی دی۔

”مجھے اب ماہیر کی بھی ٹینشن ہونے لگی ہے۔“ شانزے نے ہلکا سا جھجک کر کہا تو رباب نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا، وہ ایسی ہی تھی پل میں تولہ اور پل میں ماشہ....

”کب آرہا ہے وہ پاکستان....؟“ رباب نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھا۔

”پتا نہیں....“ وہ واقعی نہیں جانتی تھی۔

”ایسا کرو، تم اسے خود فون کر کے بتا دو، ایسی باتیں جب تیسرے بندے کے منہ سے پتا چلیں تو زیادہ تکلیف دیتی ہیں۔“ رباب نے اسے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

”اب تک تو سرمد بھائی انہیں بتا بھی چکے ہوں گے۔“ شانزے نے منہ بنا کر یاد دہانی کروائی۔

”نہیں.... وہ ایسے نہیں ہیں، میرا نہیں خیال کہ انہوں نے کچھ ماہیر کو بتایا ہوگا۔“ رباب نے فوراً ہی سرمد کی حمایت کی۔

”خیر ہے.... تم آج کل بہت سرمد بھائی کا فیور کرنے لگی ہو۔“ شانزے کے چھیڑنے پر رباب کا چہرہ بلش ہوا۔

”میں تو یونہی ایک جنرل سی بات کر رہی تھی۔“ اس نے گھبرا کر صفائی دی۔

”فکر مت کرو، یہ جنرل سی باتیں ہی بعض دفعہ ”خاص“ بن جاتی ہیں، انسان کو پتا ہی نہیں چلتا۔“ شانزے شرارت کے موڈ میں تھی۔ رباب نے ہنستے ہوئے اسے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

* * *

”آج تو یقین ہو گیا مجھے....“ بڑی اماں نے اپنے بریف کیس سے کپڑے نکالتے ہوئے بوا رحمت کو مخاطب کیا۔ وہ اس وقت اپنا انگلینڈ سے واپس لایا ہوا سامان ٹھکانے لگانے میں مصروف تھیں۔

”کس بات کا بیگم صاحب....؟“ بوا رحمت نے ان کے سوٹ کو سلیقے سے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ تمہارے صاحب کے سینے میں دل نہیں کوئی پتھر کی سلیب گڑی ہوئی ہے، تب ہی تو کسی بات کا اثر نہیں ہوتا ان پر....“ وہ حد درجہ خفا تھیں۔

”لیکن اب تو بہت فرق آچکا ہے ان میں....“ بوا رحمت نے ان کی بات سے اختلاف کیا جو انہیں بالکل اچھا نہیں لگا۔

”کیسا فرق....؟ اتنے سال بعد کوئی دشمن کا بچہ بھی سامنے آجائے تو انسان اس کا حال احوال پوچھ لیتا ہے۔ ادھر تو ہنوز ماتھے کے بل ہی کم ہونے کا نام نہیں لے رہے، الٹا مجھے تو ان میں اضافہ ہی لگ رہا ہے۔“ انہوں نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا دوپٹا مسہری پر پھینکا۔

”میں تیمور میاں کی نہیں، اوریدا بیٹی کی بات کر رہی ہوں، اب تو صاحب بہت خیال رکھنے لگے ہیں اس کا۔“ بوا نے گھبرا کر وضاحت دی۔

”تو یہ بھی سوچو نا، اوریدا کو پاکستان آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا.... پورے پانچ سال....“ انہوں نے باقاعدہ انگلیوں پر گن کر بتایا۔

”اچھا.... آپ ٹینشن نہ لیں، ٹھیک ہو جائیں گے وہ....“ بوا رحمت الماری میں کپڑے جمانے لگیں۔

”کتنا دل خراب ہوا ہوگا میرے بچے کا۔“ ان کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”تو تیمور میاں کو کون سا نہیں پتا تھا یاد نہیں، کتنی کھری کھری سنائی تھیں، انہوں نے اسے فون کر کے....“ بوا رحمت نے ماضی کی ایک تلخ یاد کی

READING
Section

طرف اشارہ کیا۔

"وہ قیامت خیز گھڑیاں کیسے بھول سکتی ہوں میں..." انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔...

"جب وہ وقت گزر گیا تو یہ بھی گزر جائے گا۔ تھوڑا حوصلے سے کام لیں۔" بوا نے انہیں حوصلہ دیا۔

"ویسے طبیعت ٹھیک تھی تمہارے صاحب کی، جو بھتیجی کے ہاں فنکشن میں نہیں گئے۔" انہیں اچانک یاد آیا۔

"یہ معمہ تو میری بھی سمجھ سے باہر ہے تب سے منہ پھلائے گھوم رہی ہے بینش..." بوا رحمت الماری بند کرتے ہوئے مسکرائیں۔

"لیکن یہ معجزہ ہوا کیسے...؟" بڑی اماں کا موڈ بھی کچھ بہتر ہوا۔

"یہ تو اب بڑے صاحب جانتے ہیں یا بینش بیگم' اوپر سے ارصم نے بھی ادھر آنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔" انہوں نے مزید ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"ہاں نا دو دن ہو گئے ہمیں آئے ہوئے' آغا کے علاوہ کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا ادھر..." انہوں نے بھی منہ بنایا۔

"بینش تو سنا ہے لاہور گئی ہوئی ہے اپنے مہمانوں کو چھوڑنے..." بوا نے لقمہ دیا۔

"ویسے کچھ زیادہ ہی لمبا عرصہ نہیں رہ گئی اس کی نند یہاں..." بڑی اماں کو حیرانی ہوئی۔

"ظاہر ہے' بیٹے کی شادی کرنی تھی اور اپنی پر کٹی کبوتری بیٹی کو بھی زبردستی باندھ دیا ارصم کے ساتھ..." بوا رحمت کو غصہ آیا۔

"ہاں! ارصم والے قصے کا تو مجھے بھی دکھ ہے' یہ زیادتی نہیں کرنی چاہیے تھی بینش کو... اس کے نانا بتا رہے تھے بالکل خوش نہیں ہے وہ..." بڑی اماں کا یہ جملہ کمرے میں داخل ہوتیں اوریدا اور عدینہ دونوں نے سنا تھا۔

"کون خوش نہیں ہے بڑی اماں؟" اوریدا نے یوں ہی پوچھا۔

"ارصم...!" انہوں نے پھر ایک سرد آہ کھینچی۔

"کیوں... کیا ہوا ہے اسے...؟" اوریدا کا دل بے ربط انداز میں دھڑکا۔

"پوچھ تو تم ایسے رہی ہو جیسے تمہیں کسی بات کی خبر ہی نہ ہو...؟" بڑی اماں نے ہلکی سی بے زاری سے اسے ٹوکا... عدینہ کو ہنسی آگئی۔

"کیا بات کر رہی ہیں؟ مجھے واقعی کچھ نہیں پتا..." وہ جھنجلا گئی۔

"کیوں' ارصم نے تمہیں نہیں بتایا کہ اس کی ماں نے زبردستی اسے اس کی پھپھی کی بیٹی سے باندھ دیا ہے؟" وہ منہ بنا کر بولیں۔

"اب اتنا بھی بچہ نہیں ہے وہ' کہ کوئی بھی انگلی سے پکڑ کر اسے جس مرضی کھونٹے سے باندھ دے۔" اوریدا کے بولنے سے پہلے ہی بوا رحمت نے بے تکلفی سے تبصرہ کیا۔ اوریدا چپ کی چپ رہ گئی۔ عدینہ کو اس پر رحم آیا۔

"تمہیں بینش کی مکاریوں کا اندازہ نہیں ہے بوا' ایسا جال بچھاتی ہے کہ بندہ کہیں پر نہیں مار سکتا۔" بڑی اماں نے تو لگتا تھا بینش پر پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔

"اماں! آپ چھوڑیں ان باتوں کو..." اوریدا کے صبر کا پیمانہ چھلکا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں منہ بنا رہی ہو؟" انہوں نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

"یہ عدینہ واپس جا رہی ہے ہاسٹل' آپ اسے منع کریں نا۔" اوریدا کو یاد آیا کہ وہ بڑی اماں کے پاس کس کام سے آئی تھی۔

"کیوں بھئی لڑکی' ہماری آمد کیا اتنی بری لگی ہے کہ تم نے اپنا سامان باندھ لیا۔" ان کے دو ٹوک انداز پر عدینہ گڑبڑا گئی۔

"نن نہیں! بڑی اماں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر سامان کھولو اپنا' کہیں جانے کی ضرورت نہیں..." بڑی اماں کے لہجے اور انداز میں ایسا کچھ تھا

READING
Section

کہ عدینہ بوکھلا گئی۔ جبکہ اوریدا نے بڑے مزے سے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اٹھایا۔

"وہ تو میں اس لیے کہہ رہی تھی بڑی اماں۔۔۔ اب آپ لوگ آ جو گئے ہیں۔" عدینہ کی بات پر بڑی اماں نے پاس رکھا اپنا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگایا اور اسے گھور کر دیکھا' وہ مزید گڑبڑا گئی۔

"بیٹا! اگر ہمارا آنا اچھا نہیں لگا تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔" ان کا انداز ہلکا پھلکا تھا' لیکن عدینہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا بڑی اماں۔۔۔" وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

"جو بھی مطلب تھا' اپنا سامان کھولو' کچھ دن بعد چلی جانا' ابھی تو میری تم سے ڈھنگ سے ملاقات تک نہیں ہو پائی۔" اس دفعہ انہوں نے محبت بھرے انداز میں کہا تھا' تب ہی عدینہ کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

"میں نے کہا تھا' بڑی اماں جانے نہیں دیں گی' لیکن تم نے خوامخواہ کی ضد لگا رکھی تھی۔" وہ اوریدا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

"قسم سے تمہاری بڑی اماں تو بالکل میری آپا کی طرح ڈانٹتی ہیں۔" عدینہ کو ان کا انداز الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ کوئی بات تھی ایسی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی' وہ جب بھی بڑی اماں کی طرف دیکھتی تو ان کا انداز اسے خاصا مانوس اور آشنا سا محسوس ہوتا۔

"تم اپنی امی کو آپا کیوں کہتی ہو؟" اوریدا کی حیرانی پر وہ مسکرائی' کیونکہ یہ سوال اکثر ہی اس سے کیا جاتا تھا۔

"اصل میں امی کے مدرسے کی ساری بچیاں ان کو آپا کہتی تھیں تو میں نے بھی بچپن میں ان کی دیکھا دیکھی انہیں آپا کہنا شروع کر دیا۔" وہ اوریدا کے ساتھ لان کی طرف نکل آئی تھی۔

"تو انہوں نے کبھی تمہیں ٹوکا نہیں۔۔۔؟" اوریدا حیران ہوئی۔

"شروع شروع میں تو بہت کہتی تھیں' لیکن میری زبان پر امی کا لفظ چڑھتا ہی نہیں تھا' تنگ آ کر انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔" عدینہ بڑے مزے سے اسے بتا رہی تھی۔ دونوں جیسے ہی لان میں پہنچیں' اپنے پورشن سے باہر نکلتا ارصم انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"ہائے ارصم! کیسے ہو؟ گیسٹ چلے گئے تمہارے؟" عدینہ نے اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ اوریدا دانستہ ٹہلتے ہوئے گل چین کے پودے کے پاس آ کر رک گئی۔

وہ ارصم کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ گل چین کے سفید اور سرخی نما پھولوں پر ایک تتلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اوریدا کی نگاہیں تتلی پر اور سماعتیں ارصم اور عدینہ کی گفتگو پر تھیں۔

"ہاں۔۔۔ گیسٹ چلے گئے تھے۔ تم سناؤ' کیا ہو رہا ہے آج کل؟" وہ بظاہر عدینہ سے بات کر رہا تھا' لیکن اس کی افسردہ نگاہیں اوریدا کی پشت پر جمی ہوئی تھیں جو اس کی جانب رخ موڑے ناراض سے انداز میں کھڑی تھی۔

"کچھ نہیں' بس ایگزام ہونے والے ہیں اور سخت ٹینشن ہو رہی ہے مجھے۔۔۔" عدینہ نے مسکرا کر اطلاع دی۔

"تم جیسی جینئس لڑکی کو بھی ٹینشن ہوتی ہے تو باقی لوگوں کا کیا حال ہو گا۔" اس کا لہجہ اوریدا کو کچھ جتاتا ہوا محسوس ہوا۔

"باقی لوگوں کے گھر میں چار چار ڈاکٹرز موجود ہیں' انہیں ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔" عدینہ فوراً ہی اس کا اشارہ سمجھی۔

"کسی ہیلپ کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔" ارصم نے کھلے دل سے پیش کش کی۔ "فی الحال تو بڑے ابا ہی کافی ہیں۔۔۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"عدینہ! میں پاپا کے پاس جا رہی ہوں' تم فارغ ہو کر وہیں آ جانا۔۔۔" اوریدا پلٹی اور اپنی بات مکمل کر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

"پاپا۔۔۔" ارصم نے تعجب انگیز نگاہوں سے عدینہ کی طرف دیکھا۔ "یہ کس کی بات کر رہی تھی؟"

"اپنے فادر کی۔۔۔ اور کسے پاپا کہہ سکتی ہے وہ۔۔۔" اب کے حیران ہونے کی باری عدینہ کی تھی۔

"انکل تیمور۔۔۔" ارصم کو جھٹکا لگا۔ "انکل تیمور پاکستان آئے ہوئے ہیں کیا۔۔۔؟"

"کیا مطلب؟ آپ کو نہیں پتا کیا؟" عدینہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین نہ آیا ہو۔

"نہیں تو۔۔۔ میں تو کچھ دیر پہلے ہی ماما کے ساتھ لاہور سے واپس آیا ہوں، اصل میں میری پھپھو واپس جا رہی تھیں نا۔ ان کی لاہور سے فلائٹ تھی۔" ارصم نے اس دفعہ ذرا تفصیل سے بتایا۔

"او اچھا۔۔۔" اسے ساری بات سمجھ میں آگئی۔

"پھر تو آپ کو یہ بھی نہیں پتا ہوگا کہ ماہیر اور بڑی اماں بھی واپس آچکے ہیں۔" عدینہ نے اسے مزید حیران کیا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔ "کب پہنچے سب لوگ۔۔۔؟"

"پرسوں دوپہر میں۔۔۔ میں بھی حیران تھی کہ آپ ملنے کیوں نہیں آئے۔" عدینہ مزے سے بولی۔

"انکل تیمور کیسے ہیں اب۔۔۔؟" ارصم نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ سامنے ہی تو ان کا پورشن ہے، آپ جا کر پوچھ لیں، انہیں خوشی ہوگی۔" عدینہ کے خوش گوار لہجے پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

"میں، ماما اور آغا جی کو بتا کر آتا ہوں۔" وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

"اف۔۔۔ ارصم بھائی کب بڑے ہوں گے آپ بس کردیں اب، سارے فیصلے ماما کے پلو کو پکڑ کر ہی کرنے ہوتے ہیں کیا؟" عدینہ کا طنزیہ انداز اسے کوفت میں مبتلا کر گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ کس تناظر میں یہ بات کر رہی ہے۔

"میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا، چلو انکل۔۔۔ تیمور سے مل کر آتے ہیں۔" وہ شرمندگی سے سر جھکا کر اس کے ساتھ اندر کی طرف چل پڑا۔

✡ ✡ ✡

"پاپا۔۔۔ آپ کوئی ٹینشن لے رہے ہیں کیا؟" ماہیر نے تیمور صاحب کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے والد کے رویے کی وجہ سے خاصے تناؤ کا شکار تھے۔

"کیوں میاں کیا فشار خون بلند ہو رہا ہے میرا۔۔۔" وہ مسکرا کر اپنے دونوں بچوں کی پریشان شکلیں دیکھنے لگے۔ اوریدا ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"ابھی ہوا تو نہیں، لیکن اسی طرح ٹینشن لیتے رہے تو ضرور ہو جائے گا۔" ماہیر نے ہلکے پھلکے لہجے میں انہیں ڈرایا۔

"جس باپ کی اتنی اچھی۔۔۔ لائق اور فرماں بردار اولاد ہو، وہ بھلا کیوں ٹینشن لے گا۔" انہوں نے مسکرا کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"اب لائق اور فرماں بردار تو سمجھ میں آتا ہے کہ آپ نے "میرے" لیے کہا ہے، اس کا مطلب ہے کہ آپ اوریدا سے مطمئن نہیں۔" ماہیر نے بالکل خاموش بیٹھی اوریدا کو چھیڑا جو اس وقت کچھ افسردہ سی لگ رہی تھی۔ ماہیر کی شرارت پر اس نے گھور کر اپنے بھائی کو دیکھا۔

"میری بیٹی تو بہت بدل گئی ہے ماہیر۔۔۔" تیمور نے بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ لیا تو اوریدا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"آپ کو پتا ہے پاپا۔۔۔ میں آپ کو بہت مس کرتی تھی۔" وہ جذباتی ہوئی۔

"فار گاڈ سیک اوریدا، یہاں کوئی رونے دھونے والا سین مت کرنا، میرا رلا دینے کا کوئی موڈ نہیں۔" ماہیر نے انگلی اٹھا کر شرارتی انداز میں تنبیہہ کی تو اوریدا نے بھی نمکین آنسوؤں کا ایک گولہ زبردستی اپنے اندر دھکیلا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے رونے کی۔۔۔ ہونہہ۔۔۔" وہ

اچھی خاصی چڑ گئی تھی۔

"پاپا۔۔۔ میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟" ماہیر نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"بھئی میں کیوں ٹینس ہوں گا بھلا۔۔۔؟" تیمور صاحب نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

"وہ۔۔۔" وہ تھوڑا سا اٹکا۔ "بڑے ابا جو آپ سے بات نہیں کر رہے، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"بھئی کر لیں گے، ابھی مجھے آئے ہوئے ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر اسے دلاسا دیا۔

"بڑے ابا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" اوریدا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"وہ خفا ہیں مجھ سے اور سچ پوچھو تو یہ ناراضی ان کا حق بنتی ہے۔" وہ اداس ہوئے۔

"بچوں سے غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں۔" اوریدا نے جھٹ سے کہا۔

"کچھ غلطیاں ناقابل معافی ہوتی ہیں۔ انسان چاہے بھی تو اپنا ظرف بڑا نہیں کر سکتا۔" وہ لاشعوری طور پر اپنے باپ کی حمایت کر رہے تھے۔ اسی دوران کھلے دروازے سے عدینہ اور ارصم داخل ہوئے۔ تیمور نے خوش گوار حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"السلام علیکم انکل! کیسے ہیں آپ۔۔۔؟" ارصم بڑے پُرجوش انداز میں ان کی طرف بڑھا، اوریدا نے سہارا دے کر تیمور کو بیٹھنے میں مدد دی۔

"آپ ڈاکٹر ارصم ہیں نا؟" تیمور نے مسکرا کر بالکل درست اندازہ لگایا۔ اوریدا مختلف فنکشنز کی تصویریں اکثر انہیں واٹس ایپ کرتی رہتی تھی اور ایک دو دفعہ ان کی ارصم سے فون پر بھی بات ہوئی تھی، لیکن اس طرح روبرو ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔

ارصم کو پہلی نظر میں تیمور انکل کی شخصیت بڑی متاثر کن لگی تھی۔ وہ بے تکلفانہ انداز میں اس کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔

"اوریدا سے اکثر ذکر سنا تھا تمہارا۔۔۔" تیمور کی بات پر اوریدا نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ارصم کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تیمور نے محبت بھرے انداز میں اس نوجوان لڑکے کو دیکھا، وہ بالکل اپنے باپ کی طرح تھا۔ طیبہ نے بینش کی شادی کی تصویریں انہیں ای میل کی تھیں۔

"اور سناؤ، آغا جی کیسے ہیں؟"

"وہ ٹھیک ہیں، انہیں شاید آپ کی آمد کا علم نہیں ہے۔" ارصم نے کچھ جھجک کر جواب دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں برخوردار، وہ مجھ سے مل کر گئے ہیں کل۔۔۔" تیمور نے اسے حیران کیا۔

"اچھا۔۔۔" ارصم نے تعجب سے ان کی جانب ایسے دیکھا جیسے اس بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"اور سناؤ ارصم، تمہاری نالائق اسٹوڈنٹ کی اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔" ماہیر نے بھی مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔

"آپ شاید اوریدا کی بات کر رہے ہیں۔" وہ ہلکا سا جھجک کر بولا۔

"کیا کوئی اور بھی نالائق کزن آگئی ہے تمہاری اس گھر میں۔۔۔؟" ماہیر نے اس دفعہ ذرا غور سے اس کا الجھن بھرا چہرہ دیکھا۔ وہ اسے کچھ پریشان لگا تھا۔ جیسے اس موضوع پر بات کرنا نہ چاہ رہا ہو۔

"میں بڑے ابا سے پڑھتی ہوں اب۔۔۔" اوریدا سنجیدگی سے بولتی ہوئی ماہیر اور تیمور کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کر گئی۔

"بڑے ابا سے۔۔۔؟" ماہیر کو یقین نہیں آیا۔

"یقین نہیں آتا تو عدینہ سے پوچھ لیں، یہ بھی تو بڑے ابا کی بڑی چہیتی اسٹوڈنٹ ہے۔" اوریدا نے فوراً ہی خاموش بیٹھی عدینہ کو معاملے میں گھسیٹا۔

"عدینہ کو تو خیر کسی ٹیوٹر کی ضرورت ہی نہیں، اس سے پتا چل گیا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔" ماہیر جب سے آیا تھا اسے مسلسل تنگ کر رہا تھا۔

"پاپا دیکھ لیں انہیں۔۔۔" اوریدا مصنوعی ناراضی سے بولی۔

"اسے تو میں دیکھتا ہی رہتا ہوں بیٹا، ابھی آپ جا کر میرے اور ارصم کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لائیں۔" تیمور نے محبت سے اسے اٹھایا۔

READING
Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”ارصم چائے نہیں' بلیک کافی پیتا ہے۔“ اوریدا کی زبان پھسلی اور وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ عدینہ اور ارصم نے چونک کر اس کا خفت زدہ چہرہ دیکھا۔ وہ جلدی جلدی اپنی چپل پہن رہی تھی' جیسے اڑ کر اس کمرے سے نکل جانا چاہتی ہو۔ جبکہ ارصم ان سے بے نیاز ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا' جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ یہ جملہ اوریدا کے منہ سے نکلا ہے۔

* * *

”تیمور' پاکستان آگیا ہے؟“ حیرت' غصے اور صدمے کی زیادتی سے بینش کا منہ کھلا اور بند ہونا بھول گیا۔

”ہاں۔۔۔“ آغا جی نے نظریں چرا کر اپنی بات کی تصدیق کی۔

”واٹ۔۔۔؟“ ناگواری کی ایک تیز لہر ان کے پورے وجود میں بجلی کی طرح دوڑی' ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی لاوا ایک دم ہی ان کے وجود کے اندر پھوٹا ہو۔ انہوں نے اس طرح آغا جی کی طرف دیکھا جیسے ابھی تک ان کی بات کا یقین نہ آرہا ہو۔

”اس میں اتنی حیرانی والی کیا بات ہے؟“ آغا جی کی گود میں ایک ہیلتھ جرنل کھلا پڑا تھا۔ وہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے بالکل عام سے انداز میں اپنی بیٹی کی طرف دیکھ رہے تھے' جس کا چہرہ دھواں دھواں اور آنکھوں میں تنفر کے ——— بدنما رنگ ایک دم ہی ابھرے تھے۔

”تایا ابا نے اسے گھسنے بھی کیسے دیا گھر میں۔۔۔؟“ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کپ کو باقاعدہ میز پر پٹخا تھا۔ تھوڑی سی چائے چھلک کر میز کے سیاہ شیشے پر پھیل گئی۔ آغا جی نے ناگواری سے ان کی اس حرکت کو دیکھا۔

”یہ گھر تیمور کے نام ہے' یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے اسے۔۔۔“ آغا جی کی بات پر بینش نے خود کو بمشکل بھڑکنے سے روکا۔

”کتنی گھٹیا حرکت کر کے گیا تھا وہ یہاں سے؟ کیا یہ بھول گئے آپ لوگ۔۔۔“ وہ متنفر لہجے میں انہیں یاد دلا رہی تھیں۔

”شادی ہی تو کی تھی نا اس نے؟ ایسا کون سا غلط کام کر لیا۔“ آغا جی کا سادہ لہجہ ان کے دل میں آگ لگا گیا۔

”بہت افسوس کی بات ہے آغا جی' اگر آپ کے نزدیک یہ ایک معمولی بات ہے۔ اس ایک بات نے میری ساری زندگی کا سکون غارت کر دیا' کیا کمی تھی آپ کی بیٹی میں۔۔۔ بولیں' جواب دیں۔۔۔“ وہ آج پہلی دفعہ اس موضوع پر ان کے روبرو آئی تھیں۔

”بات کمی کی نہیں بیٹا۔۔۔“ انہوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو پھر کس چیز کی ہے؟“ بینش نے فوراً ان کی بات کو کاٹا۔

”یہ تو قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں' تمہاری قسمت میں جاوید کا ساتھ تھا تو کوئی اور شخص کیسے آسکتا تھا تمہاری زندگی میں۔۔۔؟“ انہوں نے سنجیدگی سے اس کا سخت ناراض چہرہ دیکھا۔

”اس دو ٹکے کی لڑکی کی خاطر۔۔۔ اس نے ایک پڑھی لکھی' قابل ڈاکٹر کو ٹھکرا دیا' یہ قسمت کا فیصلہ نہیں' آپ کی اور میری بے وقوفی تھی' جو اس منشی کی تھرڈ کلاس بیٹی کو اپنے گھر میں لے آئے منہ اٹھا کر۔۔۔“ وہ غصے سے اب باقاعدہ ٹھنکنے لگیں۔

”وہ مر چکی ہے بینش۔۔۔“ آغا جی نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

”تو۔۔۔“ وہ خفگی سے بھرپور نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”مرے ہوئے انسان کے لیے ایسے لفظوں کا استعمال مت کرو۔“ انہوں نے نرمی سے ٹوکا۔

”وہ تو مر کر جان چھڑا گئی اس دنیا سے' آپ مجھے بتائیں' میں کیا کروں؟ میں تو روز جیتی ہوں اور روز مرتی ہوں' اپنی توہین کا احساس مجھے ہر وقت چرکے لگاتا ہے۔ آخر کیوں کیا تیمور نے میرے ساتھ ایسا۔۔۔؟“ وہ ایک دم چیخیں۔

”تیمور کی زندگی میں اسی نے آنا تھا۔ تم اپنے آپ

کو یہ بات سمجھا کیوں نہیں لیتی ہو۔۔۔" آغا جی کو اپنی بیٹی پر ترس آیا۔ وہ اپنی لگائی ہوئی خود ساختہ حسد کی آگ میں بہت سالوں سے جل رہی تھیں۔ ارصم نے اندر داخل ہوتے ہوئے آغا جی کا یہ جملہ سنا تو ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا' وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بینش کی نفرت کے پیچھے چھپی اصل وجہ یہ ہوگی۔

"نہیں نکال سکتی میں آغا جی! آپ یہ بات مت کہا کریں مجھے۔۔۔" وہ اس قدر زور سے چلائیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ارصم کو کمرے میں داخل ہونا پڑا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے ملازموں تک اس چیخ و پکار کے پیچھے چھپی ہوئی "اصل" وجہ پہنچے۔

"ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ کیوں ایسے چلا رہی ہیں آپ؟" ارصم ایک دم ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ بینش کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کچھ بھی تھا وہ اپنے ماضی کا یہ قصہ اپنی جوان اولاد کے سامنے نہیں کھول سکتی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوا؟ تم کہاں گئے تھے؟" وہ تھوڑا سا رخ موڑ کر اپنے آنسو صاف کرنے لگیں۔

"بڑے ابا کی طرف۔۔۔" وہ لاپروائی سے بولتا ہوا آغا جی کی طرف متوجہ ہوا۔ "آغا جی! آپ بڑی اماں اور انکل تیمور سے مل کر بھی آ گئے اور بتایا تک نہیں۔" ارصم کی بات پر بینش نے تڑپ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا جو نظریں چرائے بیٹھے تھے۔

"کیوں۔۔۔ تم نے کیا کرنا تھا؟" وہ آہستہ سے گویا ہوئے۔

"میں اور ممی بھی مل آتے' وہ لوگ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔" ارصم نے روانی میں بینش کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟ میں نے کیا اکیس توپوں کی سلامی دینی تھی انہیں یا ریڈ کارپٹ استقبال کرنا تھا۔" وہ بولی نہیں پھنکاری تھیں۔ "اور تم کس خوشی میں انہیں سلامیاں دینے پہنچ گئے تھے؟" ارصم ہکا بکا انداز میں انہیں دیکھنے لگا' جو اکثر ہی اس کے ساتھ زیادتی کر جاتی تھیں۔

"ممی۔۔۔! آپ ایسے کیوں بات کر رہی ہیں' میں نے کیا کیا ہے؟" اس نے خلاف توقع احتجاج کیا۔

"کیا ضرورت تھی ان کی طرف جانے کی؟" وہ تلخ لہجے میں بولیں۔

"کیوں نہیں جانا چاہیے تھا آخر؟ مجھے بھی تو پتا چلے۔" اس کے ضبط کا پیمانہ بھی چھلکا۔

"اب تم مجھ سے سوال جواب کرو گے؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ ارصم ان کی بات کا جواب دیتا' آغا جی نے فوراً بات بدلنے کی کوشش کی۔ "ارصم بیٹا آپ نے ہاسٹل نہیں جانا کیا' بہت ہرج ہو گیا ہے اسٹڈیز کا۔۔۔"

"کہیں نہیں جانا اس نے' اسی گھر میں رہے گا یہ۔۔۔" بینش کے اعصاب بری طرح چٹخے۔

"اگر آپ اسی طرح کہیں کا غصہ کہیں اور نکالتی رہیں تو میں یہ گھر ہی کیا شہر بھی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" ارصم بھی بھڑک کر بولا۔ وہ تو ویسے ہی پچھلے کچھ دنوں سے شدید ذہنی اذیت سے دوچار تھا اور اوپر سے بینش کی گئی زبردستی کی منگنی کا غم بھی ابھی تازہ تھا۔

"آپ نے دیکھا آغا جان' یہ کیسے دھمکیاں دے رہا ہے مجھے؟" انہوں نے شکایتی نگاہوں سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

"تم بھی تو ہر معاملے میں اسے خوامخواہ گھسیٹ لیتی ہو۔" آغا جی کا اپنا بھی مزاج آج برہم تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔! اس گھر میں ایک میں ہی فساد کی جڑ ہوں' باقی سب تو دودھ کے دھلے ہوئے ہیں۔" وہ اندرونی خلفشار کے تحت ناراضی سے گویا ہوئیں اور پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ارصم نے شکایتی نظروں سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

"تم نے ضرور بی بی سی لندن کی طرح آ کر نیوز بریک کرنا تھی۔۔۔" آغا جی نے ارصم کی کلاس لی' جو منہ بنائے کھڑا تھا۔

"تو مجھے کون سا پتا تھا وہ پرانے کھاتے کھول کر بیٹھی ہوئی ہیں۔" ارصم نے بے زاری سے جواب دیتے ہوئے ارسلہ کی کال دوسری دفعہ کاٹی۔ وہ پچھلے دس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

منٹ سے بار بار اسے فون کر رہی تھی، جب کہ وہ اس موقع پر اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"تمہیں ابھی تک اپنی ماں کے مزاج کا نہیں پتا چل سکا۔" انہوں نے سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ان کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔ کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں....." اس نے بے زاری سے سائیڈ میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور پینے لگا۔ اس کا بلند ہوتا ہوا فشار خون آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔

"بہرحال، خیال رکھا کرو اپنی ماں کا....." آغا جی نے اسے نرم لہجے میں نصیحت کی۔

"اب آپ ہی بتا دیں اور کتنا رکھوں؟ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے تو دست بردار ہو گیا ان کے کہنے پر، اب پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔

کمرے میں دوبارہ داخل ہوتی بینش کو ارصم کی بات سن کر دھچکا سا لگا، وہ سیل فون ہاتھ میں لیے آ رہی تھیں، دوسری طرف ارسلہ تھی، جس نے ارصم کے بار بار کال کاٹنے پر تنگ آ کر بینش کے نمبر پر فون کر دیا تھا۔

"ارسلہ کی کال ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔" بینش نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنا سیل فون اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے بے زاری سے فون پکڑ کر کان سے لگایا اور ارسلہ کے بولنے سے پہلے ہی شروع ہو گیا۔

"میں تمہیں رات میں خود کال کر لوں گا۔ ابھی تھوڑا بزی ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ بینش ہکا بکا سی رہ گئیں۔

"تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی وہ....." انہوں نے جھنجلا کر اپنے بیٹے کا بے زار چہرہ دیکھا۔

"سوری..... میں اتنے خراب موڈ کے ساتھ کسی سے بات نہیں کر سکتا۔" وہ ناراضی سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

"آپ نے دیکھے اس کے تیور....." بینش نے چڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا، جو انگلیوں کی پوروں سے اپنی کنپٹیوں کو سہلا رہے تھے۔ بینش کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ آج کی رات بھی انہیں اکیلے ہی کڑھنا تھا۔

* * *

"اوریدا! تم نے نوٹ کیا ارصم کچھ ڈسٹرب سا تھا۔" وہ اور عدینہ دونوں میڈیکل کی بھاری بھرکم کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔ جب کہ اوریدا کی نگاہیں کتاب پر اور دھیان کہیں اور تھا۔ عدینہ نے کئی دفعہ اس کی بے توجہی کو محسوس کیا اور پھر بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"پتا نہیں....." وہ صاف مکر گئی۔

"اب تم کم از کم میرے سامنے تو جھوٹ نہ بولو۔" عدینہ کو غصہ آیا۔

"ٹرسٹ می، میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔" اس نے جھٹ سے صفائی دی۔

"جن سے محبت ہو، انہیں دل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے لیے ظاہری بینائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔" عدینہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"مجھے اس سے محبت "ہے" نہیں "تھی"..... اوریدا نے فوراً تصحیح کی۔

"محبت کوئی نزلہ، زکام یا بخار تو نہیں، کبھی ہے اور کبھی نہیں۔" اس نے برا سا منہ بنا کر مزید اضافہ کیا۔ "تم اتنا زیادہ کونشس کیوں ہو جاتی ہو میرے سامنے.....؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں، ارصم کے لیے میرے دل میں اب کوئی گنجائش نہیں۔" اوریدا نے اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔

"زبان سے کہہ دینے سے دل اتنی جلدی مان جائے تو پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے۔" عدینہ کو پتا تھا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"تو تم کیوں پھر عبداللہ بھائی کے ساتھ ایسا کر رہی ہو؟" اوریدا نے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"اس نے تو مجھے اس بات کی سزا دی، جس میں میرا

کوئی قصور ہی نہیں تھا۔" عدینہ افسردہ ہوئی۔

"تو میرا کیا قصور تھا، میں نے ایک جائز رشتے کو ناپسندیدہ طریقے سے اپنانے سے انکار ہی تو کیا تھا۔" اوریدا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اوریدا، محبت کے معاملے میں ہم لڑکیاں کتنی بے بس ہوتی ہیں۔" اس نے گود میں رکھی کتاب بند کر کے کشن قالین پر رکھا اور مسہری سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

"وہ کیسے...؟" اوریدا کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"دیکھو نا محبت کے سفر میں اگر کوئی لڑکی اپنے گھر والوں سے بغاوت کر کے محبوب کی انگلی تھام لے تو دنیا والوں کی انگلیاں اس پر اٹھ جاتی ہیں اور جب وہ اپنے خاندان اور ماں باپ کی عزت کا بھرم رکھ لے تو تب بھی بے وفائی کا طوق اس کے گلے میں پہنا دیا جاتا ہے۔" عدینہ مزید تلخ ہوئی۔ "اس لیے بتاؤ لڑکیاں بے چاریاں کریں تو کیا کریں آخر...؟"

"انہیں چاہیے کہ وہ اپنے شرعی رشتوں کو غیر شرعی طریقوں سے مت ڈھونڈیں، اللہ نے کسی نہ کسی کا ساتھ تو لکھا ہی ہوتا ہے قسمت میں..." اوریدا نے اپنے دل کو جب سے سمجھا لیا تھا، تب سے کچھ پرسکون تھی۔

"کچھ بھی ہے ارصم کو تمہارے لیے اسٹینڈ لینا چاہیے تھا۔" عدینہ کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"کیا فائدہ... مجھ جیسی لڑکیاں تو اسے ہزاروں مل سکتی ہیں، لیکن ماں کا رشتہ تو نہیں..." اوریدا نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم، ماں کے رشتے کا تو کوئی بھی نعم البدل نہیں ہوتا۔" عدینہ خلاف توقع فوراً ہی متفق ہوئی۔ "تمہاری ماما کیسی تھیں اوریدا...؟"

"میری ماما..." اوریدا کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی جگنو چمکے۔

"تم بیٹھو، میں تمہیں ان کی تصویریں دکھاتی ہوں۔" اوریدا جلدی سے اپنی الماری سے ایک پرانا اور بوسیدہ سا البم اٹھا لائی۔

"ہاں ہاں دکھاؤ۔" عدینہ پرجوش انداز میں اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

"ارے یہ انکل تیمور ہیں..." عدینہ پہلی تصویر دیکھ کر ہنسی، اس تصویر میں تیمور کی عمر کوئی چودہ پندرہ سال تھی اور وہ کسی درخت سے شرارتی انداز میں لٹکا ہوا تھا۔

"بابا... بہت جولی تھے، طیبہ پھپھو اکثر ان کی شرارتوں کے قصے سناتی ہیں۔" اوریدا نے مسکرا کر بتایا۔

"یہ دیکھو طیبہ پھپھو کی سالگرہ کی تصویر..." اوریدا نے ایک تصویر پر انگلی رکھی۔ جہاں ایک سات آٹھ سالہ لڑکی ہنستے ہوئے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹ رہی تھی۔

"بہت مزے کی تصویریں ہیں۔" عدینہ بڑے شوق سے پورا البم دیکھ رہی تھی۔

"اور یہ میری ڈیزی پھپھو..." اوریدا کے پرجوش انداز پر وہ ایک تصویر پر جھکی اور ساتھ ہی اسے زوردار کرنٹ لگا۔ اس نے خوف زدہ انداز سے دوبارہ اس تصویر کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر اوریدا کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔ پھپھی، بھتیجی کے نقوش میں مماثلت کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔

"یہ تمہاری ڈیزی پھپھو ہیں؟" اس نے بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... بہت ینگ ایج میں ان کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔" اوریدا کی بات نے اس کا رہا سہا سکون بھی برباد کر دیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اس کی ڈیزی پھپھو کی تصویریں دیکھے جا رہی تھی۔ اب تو اس میں ذرہ برابر بھی شبہے کی بات نہیں رہی تھی۔ عدینہ کے دل و دماغ میں ایک حشر برپا ہو گیا۔

"تمہیں کیا ہوا؟" اوریدا کو ایک دم ہی اس کی خاموشی کچھ پراسرار سی لگی۔

"کک کچھ نہیں..." وہ ہکلائی۔

"تمہیں یقین ہے کہ تمہاری پھپھو کی ڈیتھ ہو چکی ہے؟" وہ محتاط انداز میں گویا ہوئی۔

"ہاں نا... ہر سال ان کی برسی پر بڑی اماں باقاعدہ ختم دلواتی ہیں۔" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے چونکی۔ "لیکن تم یہ بات کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ایسے ہی، مجھے یوں لگا جیسے ان خاتون کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔" اس نے جلدی سے بات بنائی۔

"ارے نہیں... !" اوریدا ہنسی۔ "تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

جبکہ عدینہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ نہیں بتا سکی کہ آج ہی تو کئی سالوں کی غلط فہمی دور ہوئی ہے۔ ایک دم ہی اس کا دل باقی تصویروں سے اچاٹ ہو گیا اور وہ اب بے دلی سے بس اوریدا کی باتوں پر ہوں ہاں میں سر ہلا رہی تھی۔ جبکہ اس کا ذہن دور کہیں کسی اور گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔

* * *

بختاور اس دن معمول سے زیادہ تھک گئی تھی۔ بجلی اور گیس کے بل ادا کرنے کی آخری تاریخ تھی اور اسے کافی دیر لائن میں لگ کر بل جمع کروانے پڑے تھے۔ واپسی پر وہ گھر کا سودا سلف لے کر گھر پہنچی تو سیڑھیوں پر ہاشم کے قہقہے کی آواز نے اسے حیران کیا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ ٹی وی لاؤنج میں کسی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

تین چار دن پہلے ہی اس کا پلستر کھلا تھا اور اب وہ چلنے لگا تھا۔

"لو تمہاری بھابھی بھی آگئیں..." وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی ہاشم کی پرجوش آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"السلام علیکم..." تھوڑی سی جھجک کر وہ دروازے میں ہی رک گئی۔ ہاشم کے ساتھ اس ہی کی عمر کا ایک شخص موجود تھا۔ جس کے ساتھ بیٹھا ہوا وہ بے تکلفی سے پھل کھا رہا تھا۔ سینٹرل ٹیبل پر پھلوں کے بہت سے شاپر رکھے ہوئے تھے اور یہ پھل شاید نہیں یقیناً وہ ہی شخص لایا تھا۔

"بختاور! یہ میرا بہت اچھا دوست ہے سیموئیل، کل ہی پاکستان آیا ہے۔" ہاشم نے اسے دیکھتے ہی تعارف کی رسم نبھائی۔

"کیسے ہیں آپ...؟" بختاور کو پہلی نظر میں ہی یہ فرنچ کٹ داڑھی والا اس کا دوست اچھا نہیں لگا۔ مناسب قد کے ساتھ اس کی رنگت خاصی سپید تھی اور سر کے بال شاید اس نے ڈائی کر کے سنہری کر رکھے تھے اور اس کے چہرے پر موجود چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک محسوس کی جانے والی مکاری تھی۔

"فائن اینڈ، آپ کیسی ہیں؟" اپنی شخصیت کے برعکس اس کی آواز خاصی متاثر کن تھی۔

"ٹھیک ہوں، چائے بناؤں آپ لوگوں کے لیے؟" بختاور نے رسماً پوچھا۔

"نہیں، میں سیموئیل کے ساتھ باہر کھانا کھانے جا رہا ہوں، تم بھی کھانا نہ بنانا کچھ بھی نہ بنانا بلکہ کچھ نہ کچھ لے آؤں گا۔ میں تمہارے لیے..." ہاشم کی بات پر اس کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی، ویسے بھی وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ اس وقت ایک بستر کے علاوہ اسے کسی اور چیز کی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہاشم اپنے دوست کے ساتھ شام... چار بجے کا گیا رات گیارہ بجے ڈھیروں سامان کے ساتھ لدا پھندا لوٹا تو بختاور کی آنکھوں سے ساری نیند بھک کر کے اڑ گئی۔

"یہ اتنا سامان کہاں سے آیا...؟" وہ ایک دم گھبرا گئی۔

"میں لے کر آیا ہوں اور کہاں سے آئے گا؟" وہ لاپروائی سے کہہ کر چیزیں شاپرز سے باہر نکالنے لگا۔

"لیکن پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس...؟" وہ پریشان ہوئی۔

"آسمان سے بارش ہوئی تھی، میں نے جلدی جلدی سمیٹ لی۔" اس کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔

"ہاشم! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں، کہاں سے

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"لے کر آئے ہیں یہ سب۔۔۔" وہ فکرمندی سے جیم، ڈبل روٹی، مکھن، چینی، شربت، کولڈ ڈرنکس، مسالے اور ان ساری چیزوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں وہ عیاشی کے زمرے میں لاکر استعمال کرنا ترک کر چکی تھی۔

"فکر مت کرو، ڈاکا نہیں مارا میں نے کہیں پر۔۔۔" وہ ایئر فریشنر نکال کر اب کمرے میں اسپرے کرنے لگا، ایک دم ہی پورا کمرہ جیسمین کی خوشبو سے مہکنے لگا۔

"لیکن پھر بھی کچھ پتا بھی تو چلے۔۔۔؟" وہ اب ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

"سیموئیل نے کچھ عرصہ پہلے مجھ سے قرضہ لیا تھا، وہ واپس کیا ہے آج۔۔۔" اس نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔

"کیا ضرورت تھی اتنی فضول خرچی کرنے کی، ہمیں تو آج کل ویسے ہی پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔" بختاور اب فکرمند انداز سے دل ہی دل میں ان تمام چیزوں کی قیمت کا اندازہ لگا رہی تھی۔

"فکر مت کرو ابھی بھی کافی پیسے ہیں میرے پاس اور صبح دکانوں کی مرمت کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔" اس نے مزید اسے حیران کیا۔

"کیا لاکھوں کا قرضہ دے دیا تھا اسے۔۔۔؟" بختاور کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"نہیں جان من، میں اب سیموئیل کے ساتھ پارٹنر شپ میں بزنس کر رہا ہوں۔" اس نے مزے سے ایک سوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ دیکھو میں تمہارے لیے لایا ہوں، کیسا ہے؟" بختاور نے ایک نظر اس خوب صورت لان کے سوٹ پر ڈالی، موسم بدل چکا تھا اور اسے اب ان کپڑوں کی اشد ضرورت تھی، لیکن ان سب چیزوں کو دیکھ کر اسے خوشی کے بجائے گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ اچھا ہے۔۔۔" اس نے ہاشم کا دل رکھنے کے لیے زبردستی مسکرا کر کہا۔

"ویسے کیا بزنس شروع کر رہے ہیں آپ لوگ۔۔۔" بختاور سیموئیل کی طرف سے متفکر تھی۔

"فی الحال تو ایک پبلشنگ ادارہ لگائیں گے اور سیموئیل امریکہ سے کچھ مہنگی بکس لاکر یہاں پاکستان میں پبلش کرے گا، جن کی ادھر کافی مانگ ہوگی۔" ہاشم اپنے بازوؤں کا تکیہ بنا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

"اس نے کیا وہاں سے پرمیشن لی ہے، میرا مطلب ہے ان اشاعتی اداروں سے۔۔۔ کہیں کاپی ایکٹ کی خلاف ورزی تو نہیں ہوگی۔" بختاور کو ایک دم ہی کئی خدشات لاحق ہوئے۔

"ظاہر ہے اس نے کچھ نہ کچھ تو انتظام کیا ہی ہوگا نا، اب اتنا بھی بے وقوف نہیں ہے وہ۔۔۔" ہاشم ہنسا۔

"پھر بھی آپ دیکھ بھال کر ہی پارٹنر شپ کیجیے گا۔" اس نے فورا" ہی نصیحت کی۔

"بے وقوف لڑکی، ابھی تو سارا سرمایہ ہی وہ لگا رہا ہے اور میں تو صرف اپنی خدمات دوں گا اسے، اس کام کے لیے۔" اس نے وضاحت دی۔

"سیموئیل کیا کرسچن ہے؟" بختاور نے اس کے نام سے اندازہ لگایا۔

"پہلے تھا، اب نہیں ہے۔" دوسری طرف سے فورا" ہی جواب آیا تو وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

"اچھا تو اسلام قبول کرنے کے بعد کم از کم انسان اپنا نام ہی تبدیل کرے۔" وہ مطمئن ہو کر اب چیزیں سمیٹنے لگی۔ جبکہ ہاشم نے اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"سنو بختاور! اب تم جاب چھوڑ دینا۔" اس کی بات پر وہ مسکرائی۔ "وہ کیوں۔۔۔؟"

"مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ تم جاب کرو، مجھے بہت شرمندگی ہوتی تھی دل ہی دل میں۔۔۔" پیسے جیب میں آنے کے بعد ہاشم کا لہجہ ایک دم ہی تبدیل ہو گیا۔ بختاور کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ غربت واقعی خوب صورت رشتوں کو بہت بدصورت بنا دیتی ہے۔

"ہاں دیکھوں گی، تھوڑا آپ کا کام سیٹ ہو جائے پھر ریزائن کروں گی۔" وہ خود بھی جاب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے شاپر اٹھا کر الماری میں رکھنے شروع کر دیے، ہاشم اسے غور سے دیکھتے ہوئے ایک دم ہی چونکا۔

”بخاور...“ اس کے نرم لہجے پر وہ فوراً“ متوجہ ہوئی

”تم کسی ڈاکٹر کے پاس تو نہیں گئیں نا۔“ وہ اب شرمندہ لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا، بخاور فوراً“ سمجھ گئی کہ وہ کس معاملے کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ اس نے فوراً“ ہی نفی میں سر ہلایا تو وہ پرسکون ہو گیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اب جانے کی...“ وہ نظریں چرائے بیٹھا تھا۔ بخاور کو ایک دم ہی اس پر پیار آیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ فطرتاً“ ایک برا انسان نہیں تھا لیکن حالات کے گرداب میں پھنس کر یہ سب کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس رات بہت عرصے کے بعد وہ دونوں ہی پرسکون نیند سوئے تھے۔

* * *

شائستہ بیگم اپنے دوپٹے پر بیل لگاتے ہوئے کن اکھیوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھیں جو مسلسل ایک ہی کتاب میں سر دیے بیٹھے تھے۔ انہیں آئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور ڈاکٹر جلال نے ایک دفعہ بھی تیمور کے متعلق بات نہیں کی تھی۔ جبکہ شائستہ بیگم دل ہی دل میں ہر وقت آل تو جلال تو کا ورد کرنے میں مگن رہتیں۔ ان دونوں کے درمیان گھریلو معاملات پر چھوٹی موٹی گفتگو تو ہو رہی تھی مگر دونوں ہی اس متنازعہ موضوع پر بات کرنے سے کترا رہے تھے۔

”یہ بینش نظر نہیں آ رہی آج کل، خیر تو ہے نا؟؟“ انہوں نے ڈاکٹر جلال کو مخاطب کرنے کے لیے ان کی لاڈلی بھتیجی کے بارے میں پوچھا۔

”شاید بزی ہو گی کہیں...“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”ارصم کی منگنی پر کیوں نہیں گئے آپ...؟“ ابھی تک یہ بات ان کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی، اس لیے جھٹ سے پوچھ لی۔

”ویسے ہی...“ ان کے مختصر جواب پر وہ مایوس ہوئیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر ماہیر بڑے عجلت میں اندر داخل ہوا۔

”بڑے ابا... کسی اچھے کارڈیالوجسٹ کا تو بتائیں۔ پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہیر اچھا خاصا گھبرایا ہوا تھا۔

”کسی بھی اسپتال کی ایمرجنسی میں لے جاؤ، کوئی نہ کوئی کارڈیالوجسٹ بیٹھا ہو گا۔“ ان کی بے رخی پر ماہیر کو ایک دم جھٹکا لگا۔

”کیا ہوا تیمور کو... خیریت تو ہے نا؟“ بڑی اماں کے فوراً“ ہی ہاتھ پیر پھولے۔

”کچھ نہیں ہوا انہیں۔“ ماہیر نے بے حد غصے سے بڑے ابا کی طرف دیکھا جو بڑے سکون سے اپنی کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کی بے حسی خاصی دل دکھانے والی تھی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکلا اور غصے کے اظہار کے طور پر اس نے بڑے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔

اس کی اس بدتمیزی پر ڈاکٹر جلال کے چہرے پر ناگواری کا تاثر بڑی قوت سے ابھرا، لیکن وہ مصلحتاً“ خاموش رہے، کیونکہ ان کی بیگم صاحبہ حواس باختہ انداز میں اپنے پوتے کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی تھیں۔

”آگ لگ جائے ایسے اسپتال کو، جہاں میرے بچے کا علاج نہیں ہو سکتا۔“ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بلند آواز میں بڑبڑائیں۔ کھلے دروازے سے انہیں ملازموں کے بھاگنے، شائستہ بیگم اور اوریدا کے رونے کی آوازیں، بلند آواز میں آ رہی تھیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے باہر کوئی افراتفری کا سماں ہو۔ انہوں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا، لیکن اپنی بیگم کے رونے کی آواز ان کے اعصاب پر بری طرح سے سوار ہو چکی تھی۔

”ذرا ماہیر کو کال کر لو، اس کے باپ کی طبیعت خراب ہے۔“ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو فون کر کے درخواست کی اور خود ایک دفعہ پھر اپنی کتاب کھول لی، لیکن اس دفعہ ایک لفظ بھی ان کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ تنگ آ کر وہ اپنے کمرے سے نکل آئے۔ سامنے ٹی وی لاؤنج کے صوفے سے ٹیک لگائے اوریدا قالین پر افسردہ انداز میں بیٹھی تھی۔

انہیں دیکھ کر بھی وہ ویسے ہی سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

"عدینہ کہاں ہے؟ ہاسٹل واپس چلی گئی کیا؟" انہوں نے یوں ہی اسے مخاطب کرنے کے لیے پوچھا۔

"جی..." اوریدا کا لہجہ بھیگا ہوا تھا، وہ شاید کافی دیر سے رو رہی تھی۔ اسی وقت آغا جی پریشان انداز میں ان کے پورشن میں داخل ہوئے۔

"بھائی جان! کس اسپتال میں لے کر گئے ہیں تیمور کو...؟" انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی پریشانی سے پوچھا۔

"کیوں... تمہاری بات نہیں ہوئی ماہیر سے...؟" وہ الٹا حیران ہوئے۔

"بات تو ہوئی تھی، لیکن وہ اس وقت ڈرائیو کر رہا تھا، اس نے کچھ خاص بتایا نہیں۔" وہ فکرمند انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔

"دوبارہ کال کر کے دیکھ لیں۔" انہوں نے حتی الامکان اپنے لہجے کو لاپروا رکھنے کی کوشش کی، آغا جی فوراً" ہی ماہیر کا نمبر ملانے لگے، دوسری طرف بیل جا رہی تھی، لیکن کال اٹینڈ نہیں کی جا رہی تھی۔ انہوں نے تنگ آ کر فون بند کر دیا۔ دونوں بھائی اگلے ایک گھنٹے تک یوں ہی بیٹھے رہے۔ ماہیر کسی کا بھی فون اٹینڈ نہیں کر رہا تھا، وہ سب ہی سے خفا ہو چکا تھا۔

* * *

"لگتا ہے آج کوئی خاص مہمان آنے والا ہے۔" بے بے نے صحن میں مٹرگشت کرتی مرغیوں کے آگے باجرہ ڈالتے ہوئے، موتا کو مخاطب کیا، جو گیلے کپڑوں کا ٹب اٹھائے غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن اور بے زاری کا عنصر غالب تھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا...؟" موتا نے دھلے ہوئے کپڑوں کا پانی مزید نچوڑا۔

"صبح سے منڈیر پر بیٹھا کوا جو کائیں کائیں کر کے سر کھا رہا ہے۔" انہوں نے ہش ہش کر کے مرغیوں کو پودوں کی طرف جانے سے روکا۔

"بے بے کووں اور کبوتروں والا ٹائم گزر گیا، اب مہمان موبائل پر کال کر کے آتے ہیں۔" موتا نے انہیں چھیڑا اور خود جھٹک جھٹک کر کپڑے تار پر پھیلانے لگی۔

"بھاڑ میں جائے یہ موا مبیل..." بے بے نے برا سا منہ بنایا۔

"اس نے تو پرونوں (مہمانوں) کو دیکھ کر اچانک ملنے والی خوشی ہی چھین لی..."

"بے بے آج کل کے دور میں کوئی خوش نہیں ہوتا مہمانوں کے آنے سے..." موتا نے بے زاری سے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ صبح سے کپڑے دھو دھو کر تھک چکی تھی، لیکن ابھی بھی آپا کو تفصیلی صفائی کی دھن سوار تھی۔

"اس لیے تو گھروں میں اتنی بے برکتی ہے، پورا پورا ٹبر کما رہا ہوتا ہے اور پھر بھی سب ہی رو رہے ہوتے ہیں۔"

"کپڑے پھیلا کر صالحہ کو ایک کپ دودھ گرم کر کے دے دینا، اس نے دوائی کھانی ہے۔" بے بے نے موتا کو مخاطب کیا۔

"اچھا ابھی دیتی ہوں۔" موتا نے خالی ٹب اٹھایا اور غسل خانے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ باہر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"موتا... باہر دیکھو کون آیا ہے؟" بے بے نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اس اسے کہا تو وہ ٹب زمین پر رکھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی اور جیسے ہی اس نے گیٹ کھولا اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ سامنے عبداللہ سر جھکائے اپنی والدہ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اگر عدینہ نے اس کے زندہ ہونے کی اطلاع نہ دی ہوتی تو شاید اس وقت موتا خوف کے مارے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

"ارے خالہ آپ... آئیں نا اندر، باہر کیوں کھڑی ہیں۔" خوشی موتا کے لہجے سے چھلکی۔

"ہاں بھئی میاں! تم کون سی قبر سے کفن پھاڑ کر نکل آئے۔" بے بے کو آپا صالحہ بتا چکی تھیں۔ ان کے طنزیہ انداز پر وہ شرمندہ ہوا۔

"موتا مہمانوں کو بیٹھک میں بٹھا دو، میں صالحہ کو

اٹھاتی ہوں۔"

موتا نے انہیں فوراً" بیٹھک میں بٹھایا اور خود باورچی خانے کی طرف چلی آئی‘ آپا کے کہے بغیر اس نے جلدی جلدی چائے کا پانی رکھا اور خود بسکٹ پلیٹوں میں ڈال کر انڈے ابالنے لگی۔ اس وقت گھر میں جو کھانے کو موجود تھا‘ وہ سب رکھ کر جب وہ بیس پچیس منٹ کے بعد بیٹھک میں آئی تو اندر کا ماحول خاصا سرد تھا۔ آپا کے چہرے پر پھیلا غصہ اور ناراضی دور ہی سے نظر آرہی تھی۔

"تم تو خود اچھے خاصے باشعور‘ سمجھ دار اور سلجھے ہوئے لڑکے تھے‘ پوری ایمان داری سے بتاؤ‘ ایسی کون سی غلط بات کہہ دی تھی میں نے‘ جو تم منہ چھپا کر ایسے غائب ہوئے کہ سارے ہی رابطے ختم کر ڈالے۔" آپا صالحہ اگرچہ بیمار تھیں لیکن ان کا لہجہ ابھی بھی خاصا جان دار تھا۔ وہ اپنے سامنے شرمندگی سے سر جھکا کے بیٹھے عبداللہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے رہی تھیں۔

"یہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے صالحہ‘ سو جوتے بھی مارو گی تو اف نہیں کرے گا۔" عبداللہ کی والدہ نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔

آج کل کے بچے کھاتے کہاں ہیں جوتے‘ الٹا والدین کو ہی بھگو بھگو کر مارتے ہیں۔ ان کا غصہ کسی صورت کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

"میں نے اتنا سمجھایا تھا اسے‘ کم از کم اپنی خیریت کی تو اطلاع دے دو‘ لیکن اس نے میری ایک بات نہیں مانی۔" عبداللہ کی والدہ بھی آج اپنے بیٹے کی حمایت کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"ہم اس کے کیا لگتے تھے جو یہ ہمیں اطلاع دیتا۔" آپا صالحہ کا لہجہ غم سے لبریز ہوا۔ انہیں حقیقتاً "عبداللہ پر بہت غصہ آرہا تھا۔

"میں کچھ بن کر آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔" وہ تھوڑا سا جھجک کر بولا۔

"بیٹا! تم شاید بھول رہے ہو‘ میں نے اس وقت اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھمانے کی بات کی تھی‘ جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔" آپا صالحہ کے رنجیدہ لہجے پر وہ ایک دفعہ پھر شرمندہ ہوا۔

"آپا! میں آپ سے معافی کا طلب گار ہوں اور اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا‘ جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔" اس نے خفت زدہ انداز میں اپنا سر مزید جھکا لیا۔

"بیٹا ہم کون ہوتے ہیں معاف کرنے والے‘ ہماری بساط ہی کیا ہے۔ معافی مانگنی ہے تو اللہ سے مانگو....." انہوں نے بے رخی کی انتہا کردی۔

"اچھا اچھا اب غصہ تھوک دے صالحہ....." بے بے نے محتاط انداز میں گفتگو میں حصہ لیا۔ "گھر چل کر تو اگر دشمن بھی آجائے تو اسے معاف کردینا چاہیے۔"

"تمہارا کون سا اس کے ساتھ دشمنی والا تعلق تھا بے بے....." آپا صالحہ نے انہیں یاد دلایا۔

"جو بھی ہے قطع تعلقی اللہ کو پسند نہیں۔" بے بے نے موتا کو اشارہ کیا‘ وہ جلدی جلدی تھرماس سے چائے نکال کر پیالیوں میں ڈالنے لگی۔

"تو اس کا مطلب ہے..... آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔" عبداللہ نے پہلی دفعہ پریشان انداز میں آپا صالحہ کا چہرہ دیکھا‘ ایک نظر میں ہی وہ اسے کافی بیمار اور بوڑھی لگی تھیں۔ ایک نامعلوم سی بے چینی نے اس کے وجود کو گھیرا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے آپا....." اس کے تشویش زدہ انداز پر آپا صالحہ نے بے اختیار نظریں چرائیں۔ عبداللہ انہیں اپنی سگی اولاد کی طرح عزیز تھا اور سچ بات تو یہ تھی کہ اس کی موجودگی میں انہیں کبھی بھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج اسے دیکھ کر ان کے زخموں کے سارے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہوں میں....." ان کا لہجہ اس دفعہ خاصا مدھم تھا۔

"مدرسہ کیسا چل رہا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اللہ کا بہت کرم ہے‘ کسی کے جانے سے دنیا کے کام نہیں رکتے‘ یہاں تو پھر دینی تعلیم کا کام تھا‘ اللہ نے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مدد کردی۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دفعہ پھر طنز کر گئیں۔

"آپا۔۔۔ آپ جو مرضی کہیں لیکن پلیز اپنا دل صاف کر لیں میری طرف سے۔۔۔" عبداللہ نے دوٹوک انداز میں بات کرنے کی ٹھان لی۔

"میاں۔۔۔ ہمارے دل صاف کرنے سے کیا ہوتا ہے، بس تم خوش رہو، آباد رہو۔" وہ تھوڑا سا افسردہ ہوئیں۔ عبداللہ ایک دم اٹھا اور ان کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوکھلا سی گئیں۔

"بیٹا! یہ کیا کر رہے ہو تم۔۔۔؟" وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں، مونا نے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کا گلا بڑی مشکل سے گھونٹا تھا۔ اس کی لائی ہوئی چائے کپوں میں پڑے پڑے ٹھنڈی ہونے لگی۔ کمرے کا ماحول ابھی بھی سرد تھا۔

"آپ جب تک مجھے معاف نہیں کریں گے، میں اپنی جگہ سے نہیں اٹھوں گا۔" اس کی نگاہیں جھکی ہوئی لیکن لہجہ بے لچک تھا۔

"اچھا اچھا معاف کیا، اب اٹھ کر کرسی پر بیٹھو۔ پی ایچ ڈی تک پہنچ گئے لیکن حرکتیں ابھی بھی بچوں جیسی ہی ہیں تمہاری۔" آپا صالحہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں گویا ہوئیں تو کمرے میں موجود سب افراد کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تو پھر میں کب سے اپنا مدرسہ سنبھالنے آؤں۔۔۔" عبداللہ کی اگلی فرمائش نے آپا صالحہ کو ہکا بکا کر دیا۔ وہ بھونچکا ہو کر اس کی سنجیدہ شکل دیکھنے لگیں۔

"تم پی ایچ ڈی کر کے اب مدرسہ سنبھالو گے کیا۔۔۔؟" انہوں نے ذرا سا سنبھل کر کہا۔

"آپ سے زیادہ کون جان سکتا ہے یہ کہ ہمارے دینی مدرسوں کو پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے آپا۔" وہ سنجیدگی سے مزید گویا ہوا۔

"پڑھے لکھے لوگ ان بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں جو فیڈ کریں گے اسی سے ان کے مستقبل کی راہیں متعین ہوں گی۔ ہم اپنے مدرسے سے چند سو بھی اچھے مسلمان بنانے میں کامیاب ہو گئے تو آخرت میں ہماری نجات کا کچھ نہ کچھ سامان پیدا ہو ہی جائے گا۔"

عبداللہ کی باتیں ہمیشہ کی طرح آپا صالحہ کے دل پر اثر کرنے لگی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ دو گھنٹے کی اس ملاقات کے بعد عبداللہ جب اٹھا تو آپا کے دل پر چھائی بدگمانی کی کثافت آخرکار دھل ہی گئی تھی۔

* * *

بختاور اور ہاشم کی ـــــ خوش حال زندگی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اگلے پانچ ماہ میں بختاور کے گھر میں ٹی وی سمیت بہت سی الیکٹرانک اشیاء کا اضافہ ہو چکا تھا۔ سیموئیل کے ساتھ پارٹنرشپ ہاشم کو راس آگئی تھی اور اوپر سے اس کی دکانیں دوبارہ سے کرائی پر چڑھ گئیں تھیں اس لیے معاشی لحاظ سے وہ دونوں اب خاصے پرسکون تھے، جب کہ بختاور نے اپنی نوکری ابھی تک نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا ارادہ کہ تھا کہ وہ پریگننسی کے آخری مہینے میں جاب چھوڑ دے گی، کیونکہ ہاشم اپنے پبلشنگ ادارے میں خاصا مصروف ہو چکا تھا، وہ صبح نو بجے کا گیا ہوا رات کو دس گیارہ بجے کے بعد ہی لوٹتا تھا ـــــ جمعے کا دن تھا اور وہ چھٹی کی وجہ سے گھر میں تھی کہ پی ٹی سی ایل فون پر نیلم کی کال آگئی، وہ خاصی خوش تھی۔

"نیلی تمہاری شادی ہو رہی ہے۔۔۔؟" بختاور اس اطلاع پر ایک دم خوش ہو گئی۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو بختاور، اگر تم میری شادی پر نہ آئیں تو میں سخت خفا ہو جاؤں گی تم سے۔" دوسری طرف موجود نیلم نے اسے دھمکی دی۔

"ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔؟" بختاور کھلکھلا کر ہنسی۔

"تمہاری وجہ سے میں نے شادی کی ڈیٹ کافی لیٹ کی ہے، اب تم میرے بھانجے یا بھانجی کے ساتھ پہنچ جانا۔" نیلم نے ہنستے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"اچھا اچھا، اب کتنی دفعہ احسان جتاؤ گی تم اس بات کا۔" بختاور نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

”تمہیں پتا ہے ناں‘ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں‘ اور میری شادی پر میری بہن اور دوست کا کردار تم نے ہی ادا کرنا ہے۔“ دوسری طرف نیلم کچھ اداس ہوئی۔

”تم ٹینشن ہی مت لو‘ میں انشاءاللہ پورے دس دن پہلے پہنچ جاؤں گی۔“ بختاور نے اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

”ہاشم بھائی اتنے دن پہلے آنے کی اجازت دے دیں گے ناں۔“ اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ارے اب ان کی کوئی ٹینشن نہیں‘ وہ دن رات اپنا بزنس پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں۔“ بختاور نے اسے مطمئن کیا۔

”ان کے گھر سے دوبارہ کوئی نہیں آیا۔“ نیلم نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا۔

”نہیں یار! ان کے بڑے بھائی نے بھی دوبارہ جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔“ بختاور نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”بختاور ایک بات پوچھوں‘ اگر تم برا نہ مانو تو.....؟“ نیلم پھر ہچکچائی۔

”کمال کرتی ہو نیلم تم‘ اب تم بھی غیروں جیسی باتیں کروگی کیا؟“ اس نے فوراً ہی اسے جھاڑا۔

”اصل میں تم نے بتایا ہی نہیں کہ ہاشم بھائی اب نماز وغیرہ پڑھتے ہیں کہ نہیں؟“ نیلم کی بات پر بختاور ایک دم افسردہ ہوئی۔

”سچ کہو تو یار وہ اس ٹاپک پر ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہوتے‘ تنگ آکر میں نے بھی انہیں‘ ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔“

”لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے بختاور۔“ نیلم پریشان ہوئی۔

”تو کیا کروں یار‘ روز روز کے جھگڑوں سے مجھے ٹینشن ہوتی ہے۔“ بختاور نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

”لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں‘ ان کے عقائد کی تصحیح کرنی چاہیے‘ ورنہ کل کو یہ بات تمہارے بچوں کے لیے مسئلے کا باعث بنے گی۔“ نیلم کی بات پر وہ ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ ”وہ کیسے؟“

”دیکھو ناں‘ کل کو اگر ہاشم بھائی نے اپنے نظریات اپنے بچوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی تو.....؟“ بختاور اس کی بات سن کر خوفزدہ ہوئی۔

”اللہ نہ کرے یار!“ اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ نیلم کی اس بات کے بعد اس کا ایک دم ہی ساری گفتگو سے دل اچاٹ ہو گیا تھا‘ تب ہی تو اس نے دو چار باتیں کر کے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ نیلم کے ساتھ ہونے والی تازہ تازہ باتوں کا ہی اثر تھا جو رات کو ہاشم کو کھانا دیتے ہوئے اس نے دانستہ یہی موضوع چھیڑ دیا۔

”ہاشم آپ کے خیال میں اس دفعہ ہمارے ہاں بیٹا ہوگا یا بیٹی؟“ اپنی پلیٹ میں مٹن پلاؤ نکالتے ہوئے وہ اس کی بات پر مسکرایا۔

”بیٹا.....“ وہ اس کے پر اعتماد انداز پر حیران ہوئی۔

”آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ رہے ہیں؟“

”مجھے پتا ہے اس دفعہ بیٹا ہی ہوگا.....“ اس نے سلاد اپنی پلیٹ میں ڈالا اور مزے سے کھانے لگا۔

”اور اگر بیٹی ہو گئی تو.....؟“ اس نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا۔ ایک لمحے کو ہاشم کا چہرہ تاریک ہوا اور ساتھ ہی اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں اس بار ایسا نہیں ہوگا.....“ وہ سر جھٹک کر ایک دفعہ پھر کھانا کھانے لگا۔

”پتا ہے ہاشم‘ میرا بیٹا ہوا ناں تو میں اسے قرآن پاک حفظ کرواؤں گی۔“ بختاور کے پرجوش انداز پر ہاشم سے نوالہ نگلنا مشکل ہو گیا۔ اسی لمحے اسے کھانسی آئی اور لقمہ گلے میں اٹکا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ بختاور نے گھبرا کر پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا‘ چند ہی سیکنڈ میں ہاشم کا منہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا‘ بختاور جلدی سے اٹھ کر اس کی پشت سہلانے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں اب.....“ ہاشم نے ٹشو سے منہ صاف کیا۔

”کتنی دفعہ کہا ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے بولتے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نہیں ہیں۔۔۔“ وہ خفا ہوئی۔

”اور کتنی دفعہ سمجھایا ہے تمہیں کہ مجھ سے ایسے ٹاپک پر بات مت کیا کرو۔“ وہ ہلکا سا برہم ہوا۔

”کیسے ٹاپک پر۔۔۔؟“ بختاور کو اپنی بات بھول چکی تھی اس لیے وہ تعجب بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس کی کھانے سے دلچسپی بالکل ختم ہوگئی تھی اور وہ بے زاری سے ٹرے پرے کرکے اب ٹی وی دیکھنے میں مگن ہوچکا تھا۔

* * *

ماہیر، سرمد کے ساتھ اے ایف آئی سی (آرمڈ فورس انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی) کی پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ پریشانی تھی۔ تیمور کے سینے میں ایک دم درد اٹھا تھا اور وہ لوگ گھبرا کر انہیں اسپتال لے آئے تھے۔ جہاں انہیں ابتدائی طبی امداد کے بعد داخل کرلیا گیا تھا۔

”بڑے ابا سے مجھے اس قدر بے حسی کی امید نہیں تھی۔۔۔“ ماہیر ان سے اچھا خاصا خفا ہوچکا تھا۔

”اچھا تم اپنا دل برا مت کرو۔“ ان دونوں کے درمیان تعلقات ٹھیک ہوجائیں گے۔“ سرمد نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”یار! حد ہوتی ہے ہر بات کی، ایسی بھی کیا ناراضی کہ انسان اپنے پروفیشن کے تقاضے ہی بھول جائے۔“ اس نے بے زاری سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی سرمد نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ دونوں اسپتال سے گھر جارہے تھے کیونکہ اسپتال میں کسی اٹینڈنٹ کو رکنے کی اجازت نہیں تھی۔

”مجھے بابا کو بائی پاس سرجری کے بعد یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہہ کر سیٹ کا لیور کھینچا اور آرام دہ انداز میں بیٹھ گیا۔

”شکر ہے تم نے بڑی اماں کو گھر بھجوادیا، ورنہ بڑی مشکل ہوجاتی۔“ سرمد گاڑی کو اسپتال سے نکال کر پشاور روڈ کی طرف لے آیا۔

”بڑی مشکلوں سے تو راضی ہوئی تھیں وہ۔۔۔“ ماہیر خاصا تھک چکا تھا، اس لیے آنکھیں بند کرکے اس کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ دونوں نے شام سے کافی بھاگ دوڑ کی تھی۔

وہ تو سرمد کی والدہ طیبہ کی ایک کولیگ، پروفیسر کی حیثیت سے یہاں جاب کررہی تھیں، اس لیے انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”شانزے کہاں گم ہے؟ تم نے اسے بتایا نہیں، میں پاکستان آچکا ہوں۔“ ماہیر نے ایک دم ہی آنکھیں کھولیں تو سرمد بوکھلا گیا، کیونکہ سامنے سگنل کے دائیں طرف لگے بل بورڈ پر شانزے کے سیریل کا بڑا سا ایڈ لگا ہوا تھا جس پر شانزے کا مسکراتا ہوا چہرہ دور ہی سے لشکارے مارتا ہوا نظر آرہا تھا۔

”ابھی کچھ دن اور نہ ہی بتاؤ تو اچھا ہے، ورنہ اس کا شکایت نامہ شروع ہوجائے گا۔“ سرمد نے سگنل کھلتے ہی تیزی سے اپنی گاڑی نکالی اور سکون کا سانس لیا کہ ماہیر کی اس بل بورڈ پر نظر نہیں پڑی تھی۔

”ویسے کر کیا رہی ہے وہ آج کل۔۔۔؟“ وہ دوبارہ آنکھیں موند چکا تھا۔

”کوئی خاص آئیڈیا نہیں، کیونکہ میں خود پچھلے دنوں ایک کمرشل کے شوٹ میں کافی بزی تھا۔“ سرمد نے صاف اسے ٹالا تھا۔ وہ پریشانی کے اس موقع پر اسے ایک اور بری خبر نہیں سنانا چاہتا تھا کیونکہ اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ ماہیر کو اس کا شوبز میں کام کرنا سخت ناپسند تھا۔

”فارغ تو وہ بیٹھ نہیں سکتی، یقیناً“ کچھ نہ کچھ تو کررہی ہوگی وہ۔“ ماہیر اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

”تم چھوڑو اسے، یہ بتاؤ، شادی کا کیا پروگرام ہے؟“

”پاپا ذرا ٹھیک ہوجائیں تو انہیں شانزے کی پھپھو کے گھر لے کر جاؤں گا۔“ وہ اسے اپنے ارادے بتارہا تھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر تک پہنچ چکے تھے۔ جیسے ہی سرمد نے گاڑی اندر داخل کی، سامنے بینش بڑی تیزی سے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بڑھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم آنٹی، کیسی ہیں آپ......؟" سرمد نے گاڑی سے اترتے ہی انہیں سلام جھاڑا۔

"فائن......" وہ ماہیر کو نظرانداز کرکے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔

"ساری دنیا بدل سکتی ہے لیکن یہ لوگ نہیں......" ماہیر نے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"کون لوگ۔" سرمد اپنے سیل فون پر آیا...... ٹیکسٹ پڑھتے ہوئے بے دھیانی سے بولا۔

"بڑے ابا اور بینش پھپھی صاحبہ......" ماہیر نہ جانے کس بات پر بری طرح چڑا ہوا تھا۔

"شرم کرو۔ تمہارے پاپا کی سابقہ منگیتر رہی ہیں یہ خاتون......" سرمد نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

"میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں یار کہ پاپا نے عقل مندی کا فیصلہ کرتے ہوئے شادی نہیں کی ان سے، ورنہ ایسی سڑیل مدر کو برداشت کرنا آسان کام تھوڑی تھا۔" ماہیر کی بات پر سرمد کھلکھلا کر ہنسا۔ "یہ تو تم ارصم بے چارے سے پوچھو......"

"اس کی تو مجبوری ہے یار، اب فادر بھی زندہ نہیں اس کے، ورنہ سوتیلی ہی سہی، ایک اور مدر لے آتا مارکیٹ سے......" ماہیر غیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"شرم کرو، ارصم سن لے تو کیا سوچے......" سرمد نے مسکرا کر کہا۔

"اس کی تو لگتا ہے آج کل سوچنے سمجھنے کی ساری حسیں ختم ہوچکی ہیں، دماغ کہیں اور ہوتا ہے اور دل کہیں اور ہوتا ہے۔" ماہیر نے بے لاگ تبصرہ کیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوچکے تھے۔ سامنے لاؤنج میں اوریدا بڑے ابا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، اس کی نظریں ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں جبکہ بڑے ابا صبح کا باسی اخبار دوبارہ پڑھ رہے تھے۔ بڑے ابا کو دیکھتے ہی ماہیر کو دوپہر کی ساری ٹینشن دوبارہ یاد آگئی اور ساتھ ہی اس کا اچھا خاصا موڈ خراب ہوگیا۔

"بھائی، پاپا کیسے ہیں اب......؟" اوریدا ان دونوں کو دیکھ کر فوراً کھڑی ہوئی۔

"بس دعا کرو......" ماہیر نے مختصر جواب دیا اور بڑے ابا کو نظرانداز کرکے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر جلال نے بطور خاص اس کا یہ انداز نوٹ کیا تھا، وہ سرمد سے اس کا حال احوال پوچھنے لگے۔ انہوں نے ابھی بھی تیمور کی طبیعت کا نہیں پوچھا تھا۔ ماہیر کو ایک دم ہی ان کی بے حسی پر غصہ آیا۔

"بھائی، پاپا کب آئیں گے گھر......؟" اوریدا اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر اپنی ہی دھن میں سوال کررہی تھی۔

"پتا نہیں......" ماہیر بڑے ابا کی موجودگی میں کھل کر بات کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی......" اسے تسلی نہیں ہوئی۔

"اوریدا کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ؟ تم کوئی بچی ہو جسے اتنا نہیں معلوم کہ اگر کسی شخص کو اسپتال میں ایڈمٹ کرلیا جائے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ خواہ مخواہ بے تکے سوال کرکے سر کھا رہی ہو۔" وہ جھنجلا کر اٹھا اور ہاتھ میں پکڑا ریموٹ غصے سے کارپٹ پر پھینکا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اوریدا اور سرمد دونوں نے پریشانی سے اس کا یہ روپ دیکھا۔

"سرمد بھائی! پاپا کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا......؟" اوریدا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سرمد کے دل کو کچھ ہوا۔

"کیوں ٹینشن لے رہی ہو اوریدا؟ ٹھیک ہوجائیں گے وہ۔" سرمد نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی، لیکن اوریدا اپنے مچلتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش میں ہلکان ہورہی تھی۔ بڑے ابا کچھ سوچ کر اٹھے اور لاؤنج سے نکل گئے۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو تم۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کوئی روتا ہے بھلا؟" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے نرمی سے اسے دلاسا دینے کی کوشش کررہا تھا، لاؤنج میں ارصم کے ساتھ داخل ہوتے آغا جی نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ارصم کے اندر چھن

سے کچھ ٹوٹا‘ اب بھی اوریدا کے ارد گرد سرمد کی موجودگی اس کے لیے اذیت کا باعث بنتی تھی۔

”بیٹا‘ تیمور کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟۔“ آغا جی اوریدا کو روتا دیکھ کر بوکھلا گئے۔ جب کہ وہ اپنی ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں بے دردی سے رگڑتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئی۔ وہ ارصم کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

”انکل تیمور بہتر ہیں لیکن.... مکمل ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“ سرمد نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تیمور کو بائی پاس سرجری کے بعد فوراً“ اتنی لمبی ٹریولنگ نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ آغا جی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”جی وہ تو نہیں کرنا چاہتے تھے‘ لیکن بڑی اماں کی ضد کے آگے انہیں سر جھکانا پڑا۔“ سرمد نے انہیں اصل بات بتائی۔

”ٹھیک ہے۔ میں بھائی جان کے کمرے میں جا رہا ہوں تم ذرا ماہیر کو بھیجو وہاں....“ آغا جی‘ ارصم کے ساتھ ”ڈاکٹر جلال کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

وہاں ایک اور منظر ان کا منتظر تھا‘ بڑی اماں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے افسردہ انداز میں نیم دراز تھیں۔ انہوں نے سپاٹ نظروں سے آغا جی اور ارصم کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ ان کی آنکھیں متورم اور چہرہ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے سرخ ہوچکا تھا جو سفید رنگ کے دوپٹے میں اور زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔

پھر وہ بے زاری سے اٹھیں اور اپنی چپل پہن کر کمرے سے نکل گئیں۔ آغا جی اور ارصم دونوں نے حیرانی سے جلال صاحب کی طرف دیکھا۔

”بھابھی کو کیا ہوا....؟“ آغا جی ایک دم پریشان ہوئے۔

”ناراض ہیں وہ سب سے....“ ڈاکٹر جلال کے جواب نے انہیں مزید تشویش میں مبتلا کیا۔ ”لیکن کیوں....؟“

”نہیں لگتا ہے کہ ان کے بیٹے پر گھر کے کسی ڈاکٹر نے کوئی توجہ نہیں دی؟“ وہ سنجیدہ انداز میں ان کی ناراضی کی وجہ بتانے لگے۔ وہ جب سے اسپتال سے آئی تھیں اسی طرح سے سب اکھڑی اکھڑی ہوئی تھیں اور ملازموں کی الگ شامت آئی ہوئی تھی۔

”پھر تو یہ ناراضی ان کا حق بنتی ہے‘ آپ کو جانا چاہیے تھا ساتھ....“ آغا جی نے محتاط انداز میں کہا۔

”نہیں مر کر بھی ایسا نہیں کر سکتا....“ وہ ابھی تک تیمور سے خفا تھے۔ اسی وقت ماہیر ست انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

”آغا جی آپ نے بلایا تھا مجھے....“

”بیٹا تیمور کو کہاں لے کر گئے تھے تم اور کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟“ وہ فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

”آغا جی۔ آپ کے اسپتال کے علاوہ بھی بہت اچھے اسپتال موجود ہیں اس شہر میں۔“ اس کا طنزیہ انداز آغا جی کے لیے بالکل نیا تھا‘ وہ سمجھ گئے۔ کہ وہ بھی بڑی اماں کی طرح ان سب سے بدگمان ہوچکا ہے۔

”بیٹا‘ مجھے تو بھائی جان نے کہا تھا تم سے رابطہ کرنے کو....“ انہوں نے بوکھلا کر اپنی صفائی دی جبکہ ماہیر کے سامنے اس بات پر ڈاکٹر جلال جز بز سے ہو کر رہ گئے۔ تیمور نے غور سے بڑے ابا کا چہرہ دیکھا اور سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”اے ایف آئی سی میں ایڈمٹ کروا دیا ہے انہیں؟“

”وہاں میرے بہت اچھے دوست ڈاکٹر فاروق ہیں‘ میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”آغا جی اس کی ضرورت نہیں ہے اب....“ ماہیر نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ ”میرے ایک دوست کے فادر ہیں وہاں‘ ان شاءاللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ ماہیر نے بھی آج ان سب کو شرمندہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ اب نیکسٹ ٹائم تم اسپتال جاؤ تو مجھے ساتھ لے کر جانا۔“ انہوں نے محتاط لہجے میں کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"جی، ٹھیک ہے، اب میں جاؤں...؟" وہ ابھی تک خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی آغا جی نے شکایتی نظروں سے ڈاکٹر جلال کی طرف دیکھا۔ انہیں بھی اپنے بھائی کا یہ طرزِ عمل اچھا نہیں لگا تھا۔

"بھائی جان گلے شکوے اور ناراضگیاں زندہ انسانوں کے ساتھ ہوتی ہیں اور اس کے بعد تو بس افسوس ہی رہ جاتا ہے۔" آغا جی نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے تھے، ڈاکٹر جلال کے سپاٹ چہرے پر ایک اضطراب کی لہر دوڑی، لیکن وہ اس موقعے پر کچھ بھی نہیں بولنا چاہتے تھے اور ویسے بھی اب بولنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں ان کے پاس، اس لیے کمرے میں ایک چبھنے والا سناٹا پھیل گیا۔

* * *

بہت سال پہلے ایسی ہی ایک افسردہ شام کو شائستہ بیگم نے تیمور اور بندیا کا نکاح خاموشی سے پڑھوا دیا تھا۔ اس کے بعد ہر وقت ان کے دل کو دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے لیکن دس دن گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود ہی مطمئن ہو گئی تھیں۔ تیمور جانے سے پہلے بندیا کا آئی ڈی کارڈ اور بہت سے کاغذات خاموشی سے بنوا رہا تھا۔ بندیا کے ہونٹوں پر بھی خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ ڈیزی کی شادی کے بعد یہ دوسری شادی تھی جو خاصے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔

"کل طیبہ اور صلاح الدین کا نکاح ہے۔" ڈاکٹر جلال کی اطلاع پر شائستہ بیگم کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی قسمت میں اپنی اولاد کی شادی کی خوشیاں نہیں ہیں۔ کسی ایک کی شادی پر بھی وہ اپنے چاؤ پورے نہیں کر سکی تھیں۔ گھر میں طیبہ کے نکاح کی تیاریاں بے دلی سے شروع ہو گئی تھیں۔ تیمور اور اس کی ماں کے اعتراضات کو جلال صاحب نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ اگلے دن گنتی کے چار لوگ آئے اور طیبہ کا نکاح بڑی خاموشی سے صلاح الدین سے پڑھوا دیا گیا۔

"میں ساری زندگی بابا سے بات نہیں کروں گی۔" طیبہ نے نکاح نامے پر دستخط کر کے قلم غصے سے میز پر پھینکا۔

"اللہ تمہاری قسمت اچھی کرے..." بڑی اماں نے روتے ہوئے اسے دعا دی۔

"مت دیا کریں مجھے ایسی دعائیں، آپ کی اولاد کو آپ کی دعا، بد دعا بن کر لگتی ہے۔" طیبہ سخت قنوطیت کا شکار تھی۔ اسی وقت دروازہ دھڑ کر کے کھلا اور حواس باختہ انداز میں تیمور اندر داخل ہوا۔

"کیا بات ہے تیمور...؟" بڑی اماں اور طیبہ اس کا چہرہ دیکھ کر دہل گئیں۔

"صلاح الدین نے باہر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔" وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

"لیکن کیوں...؟" شائستہ بیگم کا دل دھک کر کے رہ گیا۔

"وہ کہتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت رخصتی کروا کر لے کر جائے گا۔" تیمور نے کمرے میں دھماکا کیا تھا۔ طیبہ نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ اس کی باپ نے تو گارنٹی دی تھی کہ طیبہ کو تعلیم مکمل ہونے سے پہلے رخصتی نہیں مانگیں گے۔" شائستہ بیگم کو غصہ آیا۔

"وہ کہتا ہے کہ گارنٹی میں نے نہیں، میرے باپ نے دی تھی جبکہ نکاح تو میرے ساتھ ہوا ہے۔" تیمور کا چہرہ ضبط کی کوشش میں لال ہو رہا تھا۔ طیبہ دہل کر اپنی ماں کے ساتھ چمٹ گئی۔ اسی وقت کھلے دروازے سے ڈاکٹر جلال اندر داخل ہوئے۔ وہ خود بھی اچھے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔

"یہ تیمور کیا کہہ رہا ہے، کیا کہا ہے صلاح الدین نے؟" انہوں نے گھبرا کر اپنے شوہر سے پوچھا۔

"کمینگی کر رہا ہے وہ..." جلال صاحب فکر مند انداز میں ٹہلنے لگے۔ شائستہ بیگم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ خاصا سنجیدہ ہے۔

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے، ابھی تو طیبہ کا میڈیکل کا

پہلا سال ہے۔۔۔۔“ وہ بوکھلا کر بولیں۔

”لیکن اب بات تو ماننی پڑے گی۔ وہ لان میں دھرنا دیے بیٹھا ہے اور ساری برادری کے لوگ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔“ ڈاکٹر جلال کی بات پر طیبہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”بابا وعدہ خلافی کر رہے ہیں وہ لوگ۔۔۔۔“ تیمور ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”تو کیا طلاق کا ٹھپہ لگوا کر گھر میں بٹھالوں اسے۔۔۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولے۔

”دے دے طلاق، طیبہ کو لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔“ وہ پہلی دفعہ باپ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے، میرا نہیں۔۔۔“ وہ استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”تو ٹھیک ہے۔ اٹھا کر دے دیں اپنی بیٹی، ان جاہل جنگلی لوگوں کو۔۔۔“ تیمور کا منہ سرخ ہوا۔

”مجھے جو کرنا ہوگا کرلوں گا، تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔“ جلال صاحب بھی طیبہ کے سسرال والوں کا غصہ اس پر اتار رہے تھے۔ جب کہ تیمور کو اپنی بہن طیبہ کا سہما ہوا چہرہ طیش دلا رہا تھا۔

”ساری زندگی غلط ہی فیصلے کیے ہیں آپ نے، اسی وجہ سے ڈیزی گھر سے بھاگ گئی اور بہت اچھا کیا اس نے جو اس جہنم سے نکل گئی۔“ تیمور مشتعل انداز میں بولا۔ اور ڈیزی کے نام پر ڈاکٹر جلال کا دماغ گھوم گیا اور انہوں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ پوری قوت سے تیمور کے منہ پر دے مارا۔ وہ جو اپنے ہی دھیان میں کھڑا تھا، پیچھے دیوار کے ساتھ برے طریقے سے جا ٹکرایا۔

بڑی اماں اور طیبہ حواس باختہ ہوگئیں، جب کہ تیمور کے ہونٹوں سے ایک باریک سی لہو کی لکیر ٹھوڑی کی طرف بہنے لگی۔ اس نے سخت متنفر نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس وقت ڈاکٹر جلال کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی دن وہ ایسے ہی ان کی زندگیوں سے بھی نکل جائے گا۔

”شرم آنی چاہیے آپ کو جوان اولاد پر ایسے ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔“ شائستہ بیگم بھڑک کر بولیں۔

”تم بھی اپنی زبان بند رکھو ورنہ۔۔۔۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر غصے سے دھمکی دی۔

”ایک دفعہ ہی ساری اولاد کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیں، قطرہ قطرہ اپنی نفرت کا زہر کیوں پلا رہے ہیں انہیں۔“ وہ بھی اپنے حواس کھو بیٹھیں۔

”تم اپنا سامان پیک کرو، میں بوا کو بھیج رہا ہوں مدد کے لیے۔۔۔۔“ انہوں نے طیبہ کی طرف دیکھ کر حکم دیا اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی شائستہ بیگم، طیبہ کو گلے لگا کر بلند آواز سے رونے لگیں، ان کے بین سن کر گھر کے ملازم تک سہم گئے تھے۔

اس دن طیبہ نے جب اس گھر سے قدم نکالا تو ساتھ ہی اس کے دل سے اپنے باپ کے نام کی ساری محبت بھی یہیں کہیں رہ گئی تھی، بس گلے شکووں کی ایک فصل پک کر تیار ہو گئی تھی۔ انہوں نے صلاح الدین کی حویلی میں قدم رکھ کر دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر جلال شروع شروع میں اس سے ملنے جاتے تھے، لیکن وہ انہیں دیکھ کر کمرے میں بند ہو جاتیں اور ان کے جانے کے بعد ہی دروازہ کھولتیں۔ حویلی میں طیبہ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا، جلال صاحب تک یہ خبریں پہنچتیں تو وہ بے چین ہو جاتے، صلاح الدین عجیب عیاش قسم کے مزاج کا حامل بندہ تھا، لیکن اس کے سسر نے ایک وعدہ نبھایا تھا اور وہ طیبہ کی تعلیم کا تھا۔

اپنی میڈیکل کی تعلیم کے دوران وہ دو بیٹوں کی ماں بنیں اور پھر ہاؤس جاب کر کے انہوں نے اپنی میڈیکل کی ڈگری کو تالا لگا کر کسی اٹیچی کیس میں چھپا دیا تھا۔ طیبہ نے پورے دس سال کے بعد اپنی ماں کی بیماری کے بعد دوبارہ اس گھر میں قدم رکھا تھا اور تب بھی اپنے باپ سے سلام دعا کیے بغیر واپس آ گئی تھیں۔ بڑی اماں کے بار بار مجبور کرنے پر وہ کبھی کبھار میکے آ جاتی تھیں، لیکن باپ سے ناراضی کا پودا اب ایک تناور درخت کی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

صورت اختیار کر چکا تھا۔

بڑے ابا، دل ہی دل میں طیبہ سے خاصے شرمندہ تھے اور اس چیز کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے، لیکن طیبہ کے دل پر جمی کدورت کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کا اپنے بھائی تیمور سے اس کی شادی کے بعد بھی رابطہ رہا اور وہ اکثر بندیا سے بھی فون پر بات کر لیتی تھی، اسے تیمور کی شادی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ بینش کے ساتھ تیمور کی شادی نہ ہونے پر اس نے باقاعدہ شکرانے کے نوافل پڑھے تھے۔ اپنے بیٹوں اشعر اور سرمد کے جوان ہونے کے بعد طیبہ کے حالات خاصے بدل گئے تھے۔ سرمد کا اپنے ننھیال سے خاصا لگاؤ تھا اور وہ اکثر ہی بڑے ابا کے گھر میں پایا جاتا تھا جبکہ اشعر پی ایچ ڈی کرنے آسٹریلیا گیا ہوا تھا، لیکن طیبہ کے اپنے باپ کے ساتھ تعلقات اتنے سال گزرنے کے بعد بھی سرد مہری کا شکار تھے۔

* * *

بختاور اس دن الٹرا ساؤنڈ کروا کر آئی تو کچھ چپ چپ سی تھی کیونکہ وہ ایک دفعہ پھر بیٹی کی ماں بننے جا رہی تھی، حالانکہ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ اس بار اللہ اسے اپنی نعمت سے نوازے گا۔ اس نے بے شمار دعائیں اور وظائف کیے تھے۔ اس خبر کے بعد وہ خاصی اداس تھی اور اس نے ہمیشہ کی طرح نیلم کے پی ٹی سی ایل نمبر پر کال ملائی اور بے اختیار اس کے سامنے رو پڑی۔

"بختاور پاگل تو نہیں ہو گئی ہو، تم سے مجھے اس جہالت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔" نیلم نے اسے جھاڑا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"یار! اللہ نے پہلے بھی تو مجھے دو بیٹیاں دی تھیں کیا تھا جو اس بار..." بات کرتے کرتے اس کا دل بھر آیا۔

"بختاور، اللہ جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹیاں۔ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی کیا۔" نیلم نے اسے دلاسا دیتے ہوئے پوچھا۔

"پڑھی ہے یار، لیکن اس کے اختیار میں تو ہر چیز ہے نا۔" وہ ابھی بھی گلہ کرنے سے باز نہیں آئی۔

"تو پھر اللہ کی رضا میں خوش ہو جاؤ۔ وہ ان شاء اللہ تمہاری یہ خواہش بھی پوری کرے گا۔" نیلم اسے نرم لفظوں میں سمجھا رہی تھی۔

"میں اپنے لیے نہیں ہاشم کے لیے کہہ رہی تھی۔" اس نے فوراً" ہی تصحیح کی۔

"اسے بھی پیار سے سمجھانا، وہ سمجھ جائے گا۔" نیلم نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی، نیلم سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ کچن میں آ کر رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔

"خیر تو ہے، تم کچھ چپ چپ سی لگ رہی ہو مجھے..." ہاشم نے کھانا کھا کر ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس کا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھا۔

"ویسے ہی کمر میں درد تھا میری..." بختاور نے نہ جانے کیوں یہ بات ہاشم سے چھپالی۔ وہ اسے وقت سے پہلے دل گرفتہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ جاب چھوڑ دو، پتا نہیں تم کیوں ابھی تک اس جاب سے چمٹی ہوئی ہو۔" وہ بے زاری سے گویا ہوا۔

"ہاں اسی ہفتے ریزائن کروں گی۔" خلاف توقع وہ فوراً" ہی مان گئی۔

"ایک فل ٹائم ملازمہ کا بھی بندوبست کیا ہے میں نے تمہارے لیے۔ تم دوسرا کمرہ اس کے لیے سیٹ کر دو۔" ہاشم کی اگلی بات نے اسے حیران کیا۔

"وہ کیوں بھلا...؟"

"سارے دن میں گھر میں نہیں ہوتا، خدانخواستہ تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تو...؟" وہ پہلے کی طرح اس کا خیال کرنے لگا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" بختاور کا ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے وہ بحث کیے بغیر مان گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

Downloaded From

READING
Section

اس کی کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں پر کہانیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہ آنکھوں میں اداسی لیے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینہ میلا تھا۔ اور اس کے سامنے کھڑے سارے عکس دھندلائے ہوئے تھے۔ وہ آئینوں سے عکس چرانے کی کوشش میں تھک گئی تھی جبکہ خود اس کا عکس کہاں واضح تھا؟ زندگی' کہانی' دھندلی تھی۔ وقت کی لپیٹ میں' سب کچھ میلا تھا۔ اور کئی تنہائیوں کا بوجھ اٹھائے وہ اکیلی تھی۔

وہ۔ وہ جو ادب کے آسمان کا درخشاں ستارہ بن کر چمکنا چاہتی تھی اور جس نے خوابوں کی روشنی میں ماحول کو چمکانا چاہا تھا۔ بہت سے ستاروں کے جھرمٹ میں ایک ستارہ ادب کے آسمان پر چمکتا تھا۔ ستارہ جو سمت بتاتا تھا۔ اسے بھی اپنی سمت کا تعین کرنا تھا۔ ماضی' ماضی' پھر ماضی' کسی حقیقت نے اسے جھٹکا دیا تھا۔

"میں تمہیں پچھلے چھ منٹ سے آوازیں دے رہا ہوں' سنتی ہو؟"

"تم کبھی مت بدلنا۔" ہمیشہ والا رعب ہمیشہ والی

سدرۃ المنتہی

وہ جس سفر کا راہی ہے

اکڑ۔ ایک مرد کا اچھا ہونا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

"جو نوجوانی میں نہ بدلا' وہ بڑھاپے میں بدل کر کیا کرے گا؟" اس نے جھلا کر دریافت کیا۔

"اپنے خیالوں سے باہر نکلو اور گھر پہ توجہ دو۔"

"تم آج کل کچھ زیادہ چڑچڑے نہیں ہو رہے؟" حالانکہ وہ تو شروع سے ہی ایسا تھا۔

"میں تو سمجھا تھا وقت کے ساتھ ساتھ تم بدل جاؤگی' نکل آؤ گی اس کتابی دنیا سے' ان کتابی خیالوں سے۔" شکایت پر زور تھی' لہجہ ملامتی۔

"کتابیں تم جیسوں کی ہی زندگی سناتی ہیں اور کہانیاں تم جیسوں کی سختیوں اور بے رحمیوں کے باب ہی سے چھپتی ہیں۔"

"مجھے تمہاری کن ترانیوں کی پروا نہیں ہے۔" وہ دھاڑا۔

"جب دلیل نہ دے سکو یا جواب نہ ہو تو چیخا چلایا مت کرو۔" حالانکہ وہ تو دھاڑا تھا۔

"مجھے تم سے کبھی اچھے کی امید ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس نے تولیہ کرسی کی پشت پر زور سے مارا تو کپڑے کی تہہ میں چھپی منوں جیسی مٹی کی لہر بگولے کی طرح اڑ کر اس کی ناک تک پہنچی اور اسے اس معمولی سے گرد سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"پتا بھی ہے کتنی سخت الرجی ہے مجھے، ہر وہ کام ضرور کرنا جو مجھے تکلیف دیتا ہو۔" لہجے میں کیسی ٹوٹ پھوٹ تھی۔ دکھ تھا، جیسے کوئی شیشے کا گلاس کرچی کرچی ہوتے وقت سسکیاں لیتا ہے اور جیسے کرچیاں معمولی سے ارتعاش کے ساتھ فرش پر بکھرتی ہیں اور چھن سے بجھ جاتی ہیں۔ لہجہ زکام کے زیر اثر ٹھنڈا بھیگا ہوا، جنوری کی ٹھنڈ کا مارا، دھیما تھا۔

قدوس نے زہر بھری نگاہ، تنے ہوئے جبڑے میں بھنچی ہوئی، ترشی تیزی مار دینے والی سخت کڑک نظر سے دیکھا تھا۔

"تم میرے لیے ہمیشہ ہی جان کا آزار بنی رہو گی۔" الماری کے پٹ کو زور سے کھولا۔ تڑاخ سے بند کیا۔ دل چاہ رہا تھا یہ تڑاخ اس پر برسا دے اور کئی بار برسائی بھی۔ مگر اس کے گھر چھوڑ جانے کے بعد جو گھر پر تھوڑی بہت نظر ڈالی جاتی تھی، اس کی نظر میں، ورنہ گھر کی چھوٹی بڑی ذمہ داریاں اس کے سر تھیں، وہ کون دیکھتا۔

اسے بس لکھاری کا لکھنا، پڑھنا او دو گھڑی کا سکون غصہ دیتا تھا۔ شوہروں کی بھی عجیب نفسیات ہوتی ہے۔ بیوی چھ گھنٹے ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہے تو جائز۔ سو بار دن میں سج دھج کرے تو فطرت۔ کئی گھنٹے محلے اور خاندان بھر کی شکایتیں سنائے تو ملامت جھلاہٹ۔ اور اگر دو گھنٹے ایک کتاب لے کر بیٹھ جائے۔ کاغذ قلم کے ساتھ چار دن گزارے، حالات حاضرہ پر نظر ڈالے، کسی عالمی مسئلے پر بحث کرے، تو اپنے دائرے سے نکلتی نظر آتی ہے۔

* * *

عورت کی دلیل جتنی مضبوط ہو مرد کا شعور اندر سے سہم جاتا لگتا ہے۔ وہ بیس سال سے اسی ایک ماحول میں اسی فطرت کے مرد کے ساتھ جی رہی تھی۔ دنیا بدلی ہو تو بدلی ہو۔ دنیا میں کوئی سو میں دو مرد اچھے مزاج کے ہوں تو ہوں۔ مگر عبدالقدوس تو اسے لگا پیدائشی ایسا تھا اور مرتے دم تک اسی فطرت و مزاج کا رہے گا۔ ایک مرد کے بدلنے کی خواہش اب اس کے اندر دم توڑ چکی تھی۔ اب صرف گزارہ کرنا تھا۔ دن تمام کرنے تھے۔

"کس عقل مند نے مشورہ دیا تھا تمہیں جو شادی جیسا ڈھول گلے میں ڈال لیا۔" زہرہ نے خود چار رشتے ٹھکرائے۔ مانا کہ تنہائیوں کا شکار تھی مگر تھی بہت آزاد۔ مرضی سے آنا جانا، باہر نکلنا اس ہر وقت کے جھنجھٹ سے تو آزاد تھی۔ حالانکہ بہت سی خواہشیں اس کے اندر بھی سر اٹھاتی تھیں۔

جب لوگ اس پہ جملے کستے سٹھیا گئی ہے۔ توبہ، اف بے چاری۔ اکیلی ہے، جو کماتی ہے بھتیجوں، بھانجوں پر لٹا دیتی ہے۔ اس کے باوجود بھی کمینے ایک نہیں مانتے، مجال ہے جو کبھی سینہ تان کر کہا ہو خالہ ہمارے لیے کیا کیا جتن کرتی ہیں۔ یا پھپھی نے اپنی کئی ضرورتیں مار کر ہماری ضرورتیں پوری کی ہیں۔ بھانجوں کو شکایت تھی کہ بھتیجوں پر سب لٹا دیا۔ اور بھتیجوں کی طرف سے یہ کہ بھانجوں پر تو جان چھڑکتی ہیں۔ بھتیجوں کا احساس نہیں ہے، بھائی ریٹائرمنٹ کو آپہنچا ہے، دو عمرے ایک حج کر چکی ہے، یہ نہیں کہ اب بھائی کے نام کر دے زمین کے چار ایکڑ، یا سونے کا سیٹ بڑی بھتیجی کو دے تو جہیز بنانے میں آسانی ہو۔

ادھر بہن کی یہی شکایت.... سونے کی انگوٹھی بھی بھیا کو دے دی، کڑے گروی رکھ لیے۔ میں تو جیسے کچھ ہوں نہیں اس کے لیے، بہن ہوں۔ وہ اب بھی فون پر یہی فسانے سنا رہی تھی۔ نور کو۔ اور وہ نور فاطمہ نام کی ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی، جس کا خود کوئی اکلوتا لاڈلا نہیں تھا۔

شوہر نے تب ہی دوسری شادی کر لی، مگر وہ بیوی نہ اسے جھیل سکی، علیحدگی ہو گئی، بچے اسی کے پاس

تھے۔ جو باپ کو پوچھتے تک نہ تھے' اور باپ نے کون سا ہاتھ رکھا سر پہ۔ خرچے کے لیے چار پیسے کبھی نہ دیے۔ نہ پیار کی تھپکی جوان کو خالی خولی چاہیے بھی نہ تھی۔ بیٹی ڈاکٹر تھی اور بیٹا سرکاری ملازم' مگر دونوں جھوٹے منہ نہ پوچھتے کہ ہمیں کون سا باپ نے سنبھالا تھا جو ہم اس کا خیال کریں گے۔

تیسری شادی کیوں نہ کرتا عبدالقدوس اگر اسے لڑکی ملی ہوتی یا پھر کما کر کھلانے کا دم خم ہوتا۔ اور اب بھی کون سا نور فاطمہ کی کوئی ذمہ داری تھی اس پر' شروع سے لگا بندھا خرچہ بھی گھر کے لیے مشکل سے دیتا اور اب بھی وہ آدھے سے زیادہ بوجھ اٹھائے ہوئے تھی۔ خرچہ بھی کم تھا۔ دو افراد تھے کل اگر چاہتے تو سب کچھ تھا زندگی کے لیے۔ بس گاڑی تو اچھی چل رہی تھی۔ مہینے کا آدھا راشن لاتا اور بجلی کا بل ادا کرتا۔ اس کے علاوہ اسے ایک دھیلا تک نہ دیتا تھا۔

وہ اپنے ساتھ اس کے لیے بھی سال کے چار چھ جوڑے بنواتی۔ نئی چپلیں لاتی۔ موسم کے سرد گرم کپڑوں کا اضافہ کرتی۔ وہ ناشکرا اور ناقدرا پھر بھی یہی کہ فلاں چیز تو لنڈے سے لائی ہو۔ اس کی پلاسٹک تو خود بتا رہی ہے۔ کپڑا خود اپنی حیثیت پہ چیختا ہے۔

اور وہ یہی کہتی کہ کھڑکی کھلی ہے۔ پھینک دو بے شک یا گلی کے چوکیدار کو دے دو۔ ثواب ملے گا۔" وہ احسان کر کے کہتا۔ "اب لائی ہو تو کیا دوں پہن لیتا ہوں۔" لے لیتا۔

آدمی نہیں آسیب تھا اور مسلط بھی۔

وہ سخت بے زار پھر زہرہ کی بات پر عمل کیا' پچھلے سال سے اس کے لیے کچھ نہ خریدا۔ اس لیے اس کا رویہ خراب سے خراب تر ہوتا گیا۔ ہر وقت نکتہ چینی کی تو عادت ہی تھی اب تو جتنا وقت وہ گھر پر گزارتا اسے زچ کیے رہتا۔ تیز آواز میں گانے لگا دیتا۔ ٹی وی چلا دیتا۔ یا پھر فون پہ نت نئے نمبر پر بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کے مزید دماغ خراب کرتا رہتا۔ وہ کڑھتی رہتی۔ سوچتے سمجھنے کی صلاحیت سے وہ محروم تھا۔ بکتا جھکتا کمرے سے باہر نکلتے ہوئے روم اسپرے کمرے کی کھڑکیوں دیواروں پہ مارتا نکل گیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے کھانستی ہوئی لاؤنج تک آئی تو وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ اور حسب توقع یہی وقت تھا جب زہرہ کی کال آئی تھی اس دوران اسے پتا تھا وہ بار بار فون کر کے نمبر چیک کرے گا کہ کس سے بات ہو رہی ہے۔ پھر جب وہ جواباً "فون کرے گی تو وہ جان بوجھ کر اپنا فون مصروف کر دے گا' یا بند۔ اسے زچ کرنے اور تنگ کرنے کا کون سا موقع ہوتا جو وہ جانے دیتا۔ وہ بھی چار سن کر تین سنا دیتی تھی۔

"سچ پوچھو تو زہرا! اب عمر کے باقی سال سکون سے گزارنا چاہتی ہوں۔ بے زار آگئی ہوں اس جھنجھٹ سے۔ جی چاہتا ہے کہیں دور نکل جاؤں۔ صحراؤں' وادیوں' جنگلوں میں۔ جہاں کم از کم عبدالقدوس کی پہنچ نہ ہو۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ چلو نکل چلیں۔" وہ بھی زندگی سے بے زار تھی۔

"اپنے ہیں یا جانی دشمن۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تلوار لٹکائے رکھتے ہیں۔ میں نے تو اب کسی کو کچھ نہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔ اب تو بس کوستے رہیں۔ مجھے نہیں پرواہ۔ یہی کہیں گے کہ کمینی نے کچھ نہ دیا ہمیں۔ ایسے ہی مر گئی۔ مرنا تو ہے کیوں نہ زندگی کے چند سال میں بھی مرضی سے جیوں۔ خود پر خرچ کروں۔ وہ جو ٹرپ جا رہا ہے نا دبئی۔ میں بھی بس تیاری پکڑتی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے' چلو ایک ساتھ نکلتے ہیں۔"

"چھوڑو زہرہ۔ میرے ساتھ تو عبدالقدوس جیسا جھنجھنا لگا ہے۔ گھر میں اور بات ہے ہمیں باہر جا کر اپنی رہی سہی عزت بھی مٹی کرنے سے کیا فائدہ۔ چار لوگ عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں' کافی ہیں۔"

"اچھا چلو چھوڑو.... جانے دو.... یہ بتاؤ کوئی کہانی لکھی۔"

"کیا بتاؤں یار! کتنی کہانیاں ادھوری ہیں۔ یار زہرہ اب کہانی مکمل کرنا جان جوکھوں جیسا کام بن گیا ہے۔"

READING Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.Pdfsociety.com

”چھوڑو نوریہ سستی۔ قلم اٹھاؤ تو سہی۔ یاد ہے اپنے دور کی کامیاب ترین لکھاری رہ چکی ہو بلکہ اب بھی ہو۔ لفظ تو ایسے جھڑتے ہیں تمہارے قلم سے جیسے.....

☼ ☼ ☼

وہ اسے لفظوں کے اس دور میں لے گئی جب لفظ واقعی احساسات سے پر تھے، لفظوں میں احساس کی روشنیاں جگمگاتی تھیں۔ سفر کتنا عجیب اور دلچسپ تھا۔

اسے یاد آیا پہلی کہانی تب لکھی جب اسے لکھنا نہیں آتا تھا۔ سفر تھا حقیقت سے کہانی کا، اور کہانی سے کیش کیے ہوئے سچ کا سفر تھا، خواب سے روشنی کا۔ سفر جواب زندگی کی آخری سیڑھی کو چھو رہا تھا۔ اب جب اس کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی تھی۔ اب جب حافظہ قدرے کمزور تھا۔ ہاتھ کپکپاتے تھے۔ ذہن تھکن سے چور نیند کے خمار سے شل دوائیوں کے زیر اثر سویا رہتا۔ اور گھر کے کام منہ کھول کر کھڑے ہوتے اور عبدالقدوس کا منہ بند کون کرتا۔

ایسے میں وہ اسے یاد دلا رہی تھی۔

”تم جو ادب کے آسمان کا درخشاں ستارہ تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے تمہاری پہلی کہانی۔ اس ریگستانی بوڑھے کی، جو تھر کی ریت میں شام ڈھلے بیٹھ کر لوک داستان سناتا تھا۔ جیسے بچے کو لوری دی جائے۔ ویسا سکون ملتا تھا۔“

اسے یاد تھا جب اس کی پہلی کہانی، کتنی پھیلی ہوئی بے ربط سی، بے ترتیب سی بے ڈھنگی لکھائی۔ مگر لکھائی کا کیا۔ وہ تو آہستہ آہستہ ننھے ستاروں میں تبدیل نہ بھی ہوتی تو لفظوں کا طلسم تو بڑھتا جا رہا تھا۔ کہانی نہ چھپنے کے ڈر سے باہر نکل گئی تھی۔ اور کہانی لینے کے لیے پرچوں سے ہر ماہ کئی فون یا ٹیسکٹ میسج آتے تھے۔

مگر اب۔ جب داستان اپنا روپ بچھائے سوتی بنی تھی۔ خوابوں نے اپنا ڈیرہ بدلا تھا۔ کہانی جب خواب کے دیس سے لفظ چرالاتی تھی۔ اب تو اس کے پاس کوئی دیا نہ تھا۔ کہ احساس جب محبت کا دم بھرتے ایک ساتھ ٹولیوں کی طرح سہیلیوں کی صورت اڑتے، آسمان کے نیچے ہاتھ پھیلاتے، ایک ساتھ گھر کو جاتے پرندوں جیسے پھڑپھڑاتے تھے۔ جملے تو اودھم مچاتے تھے۔ جملے جادوئی سحر تھے۔ تتلیاں پھولوں سے رنگ چرالاتیں اور کہانی خواب سے، گھر کے مسائل سے نبٹنے کے لیے تیار کھڑی ہوتی تھی۔ کہانی فضاؤں، خلاؤں میں اڑنے، سمندر میں تیرنے، زمین پر رقص کرنے، تھرکنے ناچنے لگی تھی۔ خوابوں کے پر اونچے تھے۔ خواب کے دل مکانوں کے پنجروں میں دانہ چگنے لگے تھے۔

کہانی، جوانی کی دہلیز پر ہجر کے ذائقے سے بھی آشنا ہوئی اور گھر کی مصروفیتوں میں دب گئی مگر ایک جھٹکا لگتا تھا گاڑی کو۔ دھکا ایک ہی کافی۔ کہانی پھر سے دم بھرنے لگتی۔ ماں کے انتقال کے بعد باپ نے اسے شادی کے لیے منالیا۔ اور قسمت پھوٹی جب عبدالقدوس سے نکمے کے ساتھ بیاہ کر گئی۔ شروع شروع میں ضبط کیا۔ گھر بنانے کی چاہ بھی تھی۔ اور لوگوں کی باتیں سہنے کی سکت نہ پاکر خود کو مضبوط کیا۔ اس کے سدھرنے کی چاہ بھی تھی۔ چھ سال ہوئے، بدبختی کہیں یا خوش بختی کہ اولاد کی بھاری ذمہ داری نہ پڑی۔ عبدالقدوس تو ویسے بھی دوسری شادی کے لیے پر تول رہا تھا پھر اس نے کر بھی لی۔

شروع شروع میں ایک گھر میں ساتھ رہائش تھی۔ دوسری بیوی کو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ سو گھر الگ کیا۔ اس کی ناز برداریاں عروج پر تھیں۔ دو سال بعد بیٹا۔ اور پھر بیٹی کی پیدائش۔ مگر عبدالقدوس کا ستارہ گردش میں تھا وہ کہاں کما کر خرچہ پورا کرتا۔ نوکری چھوڑنے کے بعد آوارہ پھرتا تھا۔ بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی۔ مکان جو کرائے کا تھا، مالک مکان نے خالی کرالیا۔ خوب زوردار جھگڑا ہوا۔ بیوی نے خلع کے لیے نوٹس دیا۔ وہ بھی مجبور تھی۔ اس جیسے مرد کے ساتھ گزارا کرنا واقعی مشکل تھا۔ وہ واپس اسی گھر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

آپڑا۔

"لو خوش ہو جاؤ... میرا گھر تمہاری بددعاؤں نے برباد کرو کھایا۔" وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔

اس سے نیکی کی توقع بے کار تھی۔ جی میں آیا کہ سامان اس سمیت گلی کے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے۔ مگر رحم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جو اس کے پاس وافر مقدار میں موجود تھا۔ اس نے اسی سے کام لیا اور ساتھ ترس ملا لیا۔ ہمدردی تو از خود اضافی تھی۔ بس پھر کیا ہوا، بھگت ہی رہی تھی۔

اور زہرہ کہہ رہی تھی۔ "کہانی لکھو۔ موڈ میں آؤ۔"

گھنٹہ پورا ہوا فون بند ہوا۔ وہ رکھ کر اٹھی۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام نبٹانے باقی تھے۔ کپڑے دھونا، استری کرنا۔ جھاڑو پونچھ تو چھینکوں سے مار دیتی تھی، کئی ادبی پرچوں کے ایڈیٹوریل میں نام نہ کام تھا۔ جو کر کے دینا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ صبح اسکول جانا تھا۔ بچوں سے سر کھپا کر دماغ پلپلا ہو جاتا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھی۔

"کہانی ہو جائے۔"

"زہرہ بھی ناں... بالکل پاگل ہے۔" وہ مسکرا دی۔ کہانی اس کے ذہن میں چونچ پھر بھی مارتی رہی تھی۔

اف یہ پہلے کی شہرت کی چاہ۔ بعد کی ذمہ داری۔ اور آخر کار خالی پن۔ زہرہ نے بھی کیا سوچ کر اس سے وعدہ لیا۔ "تازہ افسانے کا۔ اور اس نے وعدہ کر بھی لیا۔

* * *

رات کی ٹھنڈک نے ماحول کو خواب آور بنایا ہوا تھا۔ عبدالقدوس اپنی آوارہ گردیوں میں اب تک مشغول تھا۔ وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔ کاغذ قلم بکھرے تھے۔ میز بھری پڑی تھی۔ ادھوری تو کئی کہانیاں تھیں۔ اور وعدہ اپنی حیثیت جتا رہا تھا۔ کہانی کو چھیڑنا چاہا جو گھٹنے سے آلگی۔ اس نے چوما۔ ساتھ لگایا خیال کو۔ کاغذ فرش سے سمیٹے تھے۔ نیند پوری طرح تیار کھڑی تھی۔ آواز دے رہی تھی۔ مگر وعدے نے کہا آج نہ سونا۔ اس نے جمائی لے کر کھڑکی سے سر نکالا تو ایک یاد تازہ ہوئی۔ وہ جیسے کہانی کو آواز دے رہی تھی۔

اسے یاد آیا جب وہ آٹھ سال کی تھی۔ کندھوں پر بستہ اٹھائے نہر کنارے چلتی ہوئی اور ایک سفید کالی لکھائی سے بھرا کاغذ اڑتا ہوا کنارے آلگا، بس پتے کی طرح، ہوا سے اڑ کر نہ ڈوب جاتا اگر وہ اٹھاتی نہیں۔

کاغذ نے اس کے ہاتھوں میں ٹھنڈی آہ بھری جیسے۔۔ وہ گھر آئی۔ کاغذ پر لکھی تحریر ادھوری تھی۔ اور اس نے ادھوری کہانی کو مکمل کیا۔ تب۔ جب اسے لکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ بوڑھی لکھاری کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں روشنی نے جھانکا گویا زندگی ابھری تھی، کہانی جو نسل در نسل چلتی تھی جو مرتی نہ تھی۔ بستہ اٹھائے شاید کوئی بچی۔ امید کا سرا جو ہاتھ آلگا۔ آئینے میں تھکے ہوئے عکس نے مسکان پھینکی تھی۔ کھڑکی سے تازہ ہوا نے جھانکا۔ لکھاری نے ادھوری کہانی کا صفحہ ہوا کے زور پر روانہ کیا۔ کہانی نے کہا۔ وہیں۔ جہاں سے شروع ہوئی تھی۔

*

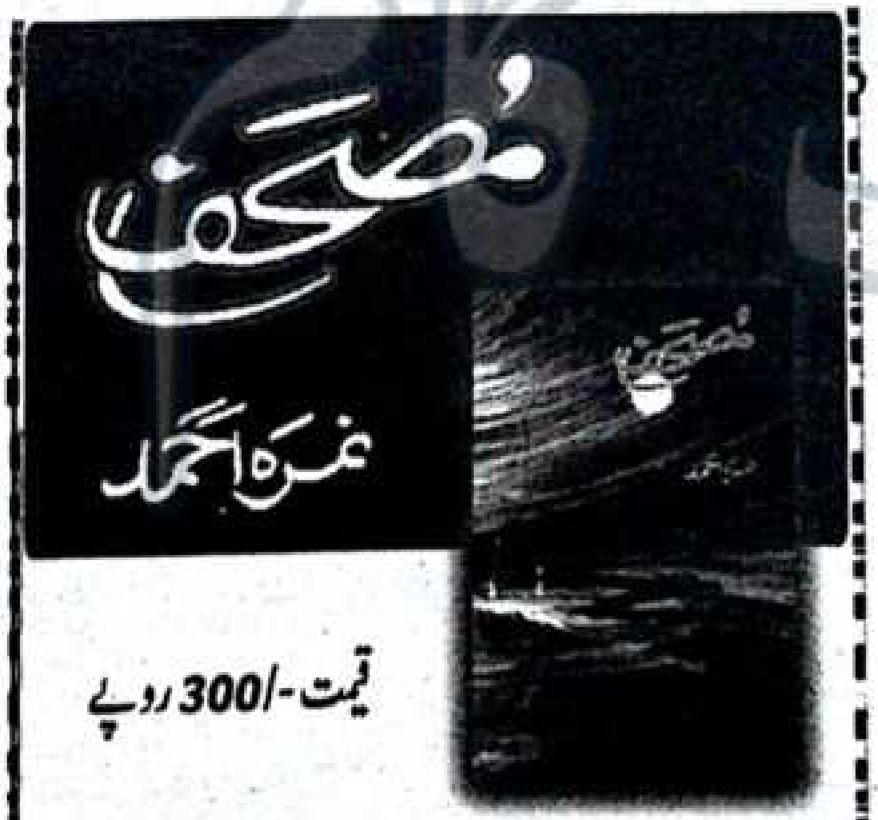

قیمت -/300 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

MEIN SITARA
aTvOne PRODUCTION
میں ستارہ
ڈائریکٹر: سیما طاہر خان، تحریر: فائزہ افتخار
کاسٹ: صبا قمر، میکال ذوالفقار، نعمان اعجاز اور میرا
THURSDAY 8:00pm
TV ONE
aap se rishta pyar ka

میں ستارہ...... کچے گھر میں رہ کر فلم اسٹار بننے کا خواب دیکھنے والی لڑکی کی ہوش ربا کہانی

فلمی دُنیا کے چمکتے دمکتے خواب نگر میں ستارے کیسے شہرت کے آسمان پر جگمگاتے اور پھر کیسے ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہیں یہ ایک دلچسپ مگر عبرت ناک معمہ ہے۔ وحید مراد سے روحی بانو تک کتنی ہی بار یہ داستان دہرائی گئی ہے۔ اس موضوع پر فائزہ افتخار نے پاکستانی فلم انڈسٹری کے عروج وزوال کے پس منظر میں ٹی وی ون کے لیے عشق کی ایک ناقابل فراموش داستان، ڈرامہ سیریل "میں ستارہ" تخلیق کی ہے۔ جو 17 مارچ 2016 سے ٹیلی کاسٹ کی جائے گی۔ ثریا کچے گھر میں رہ کر فلمی ہیروئن بننے کے خواب دیکھتی ہے۔ بچپن ہی سے اُسے ناچنے گانے اور اداکاری کرنے کا شوق ہے۔ ماں کے ساتھ کام پر جاتی ہے۔ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود جہاں موقع ملے ٹی وی پر فلمیں دیکھنے بیٹھ جاتی ہے۔ اتفاقاً ثریا کی ماں کو اپنے وقت کی مشہور ہیروئن اور گلوکارہ جھرنا بیگم کے گھر میں فل ٹائم ملازمہ کی نوکری مل جاتی ہے اور اسکا پورا گھرانہ سرونٹ کوارٹر میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ جھرنا کا شوہر فرہاد سیٹھی ایک مشہور ڈائریکٹر ہے جو ٹیلویژن سیریلز میں نام پیدا کرنے کے بعد پہلی بار فلم ڈائریکٹر کے طور پر میدان میں اُترتا ہے۔ اُسے اپنی بیوی جھرنا کا بھرپور مالی تعاون حاصل ہے جو اسکی فلم کی پروڈیوسر بھی ہے۔ فرہاد نے جھرنا سے اُس وقت شادی کی تھی جب جھرنا اپنے کیریئر کے عروج پر تھی اور وہ خود صرف ایک خواب دیکھنے والا خوش شکل اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ جھرنا عمر میں فرہاد سیٹھی سے بڑی ہے، دونوں کی محبت کی شادی ہے۔ جھرنا کو اپنی ماسی کی بیٹی ثریا کا بھولا پن اور بھاگ بھاگ کر کام کرنا اچھا لگتا ہے اور وہ اس چھوٹی سی پیاری لڑکی پر مہربان ہو جاتی ہے جبکہ فرہاد سیٹھی کو ثریا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ فرہاد سیٹھی کی پہلی فلم کامیاب ہو جاتی ہے اور وہ لگاتار ہٹ فلمیں دینے لگتا ہے۔ اسی دوران 10 سال کا عرصہ گزر جاتا ہے۔ ملازمہ ثریا ایک خوبصورت نوجوان لڑکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی خدمت گزاری سے جھرنا بیگم کے بہت قریب آ جاتی ہے۔ جھرنا ایک دن ثریا کو ریڈیو سے نشر ہونے والے فلمی گانے پر ڈانس کرتے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ فرہاد سیٹھی اپنی اگلی فلم کے لیے مشہور ہیروئن تسیم دلربا کو کاسٹ کرتا ہے اور اسکی فلم سپر ہٹ ثابت ہوتی ہے۔ اسی دوران فرہاد اور تسیم کے تعلقات کے چرچے ہونے لگتے ہیں۔ جھرنا بیگم اس بات سے خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اور تسیم دلربا کو فلم سے نکلوانے کے لیے ایک منصوبہ بناتی ہے۔ وہ فرہاد کے سامنے ثریا کے رقص کی تعریف کرتی ہے بلکہ ایک دن خود فرہاد بھی ثریا کو ڈانس کرتے دیکھ لیتا ہے۔ جھرنا کے بے حد اصرار پر فرہاد سیٹھی بادل ناخواستہ ثریا کو ایکسٹرا کا رول دیتا ہے جسے دو ڈانس کرنے ہیں اور کچھ ڈائیلاگ بولنے ہیں۔ ثریا کا فلمی نام ستارہ رکھا جاتا ہے۔ ثریا فرہاد سیٹھی سے بہت ڈرتی ہے اس لئے پہلی بار گھبرا جاتی ہے مگر جھرنا کے سیٹ پر آنے سے جلد سنبھل جاتی ہے اور اتنی زبردست پرفارمنس دیتی ہے کہ فرہاد سیٹھی عش عش کر اٹھتا ہے۔ فلم کی ہیروئن تسیم دلربا ستارہ کے حسن اور اسکی کارکردگی سے خائف ہو جاتی ہے اور وہ ستارہ کو فلم سے نکلوانے کے لیے فرہاد سیٹھی کو بلیک میل کرتی ہے کہ اگر اس نے اس معمولی سی نوکرانی کو فلم سے نہیں نکالا تو وہ کام نہیں کرے گی۔ ایک دن شوٹنگ کے دوران فرہاد اور تسیم کا زبردست جھگڑا ہوتا ہے اور فرہاد سیٹھی غصے میں تسیم کو کھڑے کھڑے فلم سے آؤٹ کر دیتا ہے فرہاد چیلنج کے طور پر ستارہ کو فلم کی ہیروئن بنا دیتا ہے۔ ستارہ کے ہوش اُڑ جاتے ہیں مگر جھرنا اسکی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ فلم کی تیاری اور شوٹنگ کے دوران ایک جادوئی لمحے میں فرہاد سیٹھی ستارہ کو دل دے بیٹھتا ہے، ستارہ بھی اسکی بے پناہ کشش سے نہیں بچ پاتی اور اس سے پیار کرنے لگتی ہے مگر اس کے دل و دماغ میں ایک خوفناک جنگ چھڑ جاتی ہے کہ وہ اپنی محسنہ جھرنا بیگم سے بے وفائی کرے یا اپنے عشق کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کے پرخچے اُڑا دے؟

فرہاد سیٹھی کا عشق روز بروز جنون کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے اُسے ستارہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ستارہ اُس کے والہانہ عشق سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ستارہ کا گریز فرہاد سیٹھی کے عشق کو پاگل پن میں بدل دیتا ہے اور ایک دن جھرنا بیگم پر اس عشق کا راز کھل جاتا ہے۔ یہاں سے کہانی ایک زبردست موڑ لیتی ہے۔

کیا ستارہ فلم نگری پر راج کر پائے گی۔؟ کیا فرہاد اور ستارہ کے عشق کو منزل مل سکے گی۔؟ کیا جھرنا کی پیٹھ میں بے وفائی کا خنجر اتر جائے گا۔؟

www.tvoneglobal.com tvoneglobalpakistan tvoneglobal type fb & send it to 9922

سوکھے پھولوں جیسی محبت

اک دن میں نے خواب میں دیکھا
دستِ غیب میں سوکھے پھول
پوچھا، "مالک! سوکھے پھول؟"
ندا سی آئی
تیرے دل میں میری محبت
ان سوکھے پھولوں جیسی ہے
جانے کتنے موسم بیتے
جب بھی میں نے سوچا ہے
ان سوکھے پھولوں کو، آنکھیں بھر آئی ہیں
اپنے مالک سے میری محبت ایسی ہے؟
تب سے آج تلک میں نے
اس کو ڈھونڈا بارش میں، نئے موسم کی آہٹ میں
باغوں میں کھلیانوں میں، دریاؤں طوفانوں میں
مہر و ماہ کی کرنوں میں، گرم دنوں دوپہروں میں
بادل اور ہواؤں میں، نابینا کی صداؤں میں
اب تو یہ بھی یاد نہیں ہے، کہاں کہاں ڈھونڈا
ہے اس کو
لیکن اک دن ملا وہ مجھ کو
اپنے دل کی ویرانی میں، درد بھری کہانی میں
اور اب کچھ ایسا ہے
ایسی دل کش پھوار پڑی ہے مجھ پر اپنے
مالک کی
میں تو بھیگ گیا ہوں بالکل
مگر وہ سوکھے پھول ابھی تک میرے دل
میں زندہ ہیں
ان کو سوچ کے اب بھی
آنکھیں میری بھر آتی ہیں

ڈاکٹر طاہر مسعود

عجیب شخص ہے خوش بھی نہیں خفا بھی نہیں
ہوا تھا دُور مگر دور وہ رہا بھی نہیں

مجھے پکارا ہے اس نے کہ میرا وہم ہے یہ
صدا سُنی ہے دریچہ مگر کُھلا بھی نہیں

میں ساتھ چھوڑ دوں اس کا کہ اس کو اپناؤں
وہ میرا دوست ہے، ناداں بھی ہے، بُرا بھی نہیں

ہوا بکھیرے گی مجھ کو تو اور اچھا ہے
نہیں ہوں شعلہ مگر میں ابھی بجُھا بھی نہیں

یہ مرحلہ بھی بڑا خوش گوار ہے ساحلؔ
کہ پھوّل شاخ پہ آیا بھی ہے، کِھلا بھی نہیں

لطیف ساحل

صوفیٔ شہر میرے حق میں دُعا کیا کرتا
خود تھا محتاجِ عطا، مجھ کو عطا کیا کرتا

اپنی آواز کے سنّاٹے سے ہَول آتا ہے
میں بیابانِ تمنّا میں صدا کیا کرتا

محتسب جُرم مرا دیکھ کے خاموش رہا
خود خطا کار تھا، احکامِ سزا کیا کرتا

رفعتِ دار بھی چھولی تیری خاطر میں نے
منکرِ عہدِ وفا! اور بتا کیا کرتا

خود فراموشی کے صحراؤں میں گُم تھا محسنؔ
کوئی اس بے خبرِ جاں سے گِلہ کیا کرتا

محسن احسان

ادارہ

اِس ماہ کی مسکراہٹیں

ڈراپ سین

"ہیلو… کیسی ہو تم؟" بڑی چہکتی ہوئی آواز آئی۔

"کتنی دیر لگادی تم نے، میں کب سے بیٹھی تمہارے فون کا انتظار کر رہی تھی۔"

"ہاں بس! امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے کھانا بناتے ہوئے ذرا دیر ہوگئی۔"

"اچھا اور کیا حال ہے تمہارا…؟" جمائی لیتے ہوئے پوچھا گیا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں آج تو!"

"کیوں کیا کیا تھا؟"

"بس امی کے ساتھ بازار گئی تھی پوری گرمیوں کی شاپنگ کرلی ہے۔"

"اچھا سنو! جس کام کے لیے فون کیا تھا' وہ تو میں بھول ہی گئی۔ اگر یاسمین سے بات ہو تو اسے کہنا کہ وہ اپنی اور بج جارجٹ کی قمیص بھیج دے' مجھے بھی ویسی ہی بنوانی ہے۔"

"کون یاسمین؟ کون سی قمیص…؟"

"کیا۔ مطلب 'کون یاسمین؟ وہ جو ایف اے میں ہمارے ساتھ پڑھتی تھی۔"

"کیا عظمی! ہم تو میٹرک کے بعد اسکول گئے ہی نہیں اور کون سی سہیلی یاسمین؟"

" ارے بھئی کون عظمی میں تو حیا ہوں… اور کیا تم رباب نہیں؟ "

"رباب…؟ نہیں تو… میں تو سمعیہ ہوں۔"

"کیا یہ 021760201 نہیں ہے؟"

"سوری' رانگ نمبر…!!!"

مسرت الطاف احمد… کراچی

حکمت عملی

ایک آدمی اونچے درخت پر چڑھ گیا' پھر اس سے نیچے نہیں اترا جا رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ مختلف طریقے آزمائے گئے۔ اسے مختلف مشورے دیے گئے مگر وہ شخص ڈر کے مارے اُترنے پر کسی طور پر راضی نہیں ہوا۔ کسی نے مشورہ دیا۔ علاقے کے بزرگ حکیم کو بلایا جائے۔ ہو سکتا ہے یہ شخص احتراماً ان کی بات مان لے یا وہ کوئی کارگر طریقہ بتادیں۔ حکیم صاحب آئے۔ ان کے مشورے پر ایک موٹا رسا اوپر چڑھے شخص کو اچھال کر فراہم کیا گیا۔

"اسے اپنی کمر کے گرد کس کر باندھ لو۔" حکیم صاحب نے مشورہ دیا۔ اس شخص نے باندھ لیا تو حکیم صاحب نے نیچے کھڑے تین قدرے سمجھ دار آدمیوں سے کہا۔

"رسا پکڑ کر زور سے کھینچو۔" آدمیوں نے رسا پکڑ کر کھینچا۔ وہ آدمی دھڑام سے نیچے آگرا اور گرتے ہی مر گیا۔ لوگ گھبرا گئے۔ کسی نے شکوہ کیا۔ "حکیم صاحب…! آپ نے ایک بے گناہ آدمی کو مار دیا۔" حکیم صاحب سٹپٹا گئے۔ سوچتے ہوئے بولے۔

"یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ ورنہ میں نے بہت سے لوگوں کو ایسے ہی کنوؤں سے نکالا ہے۔"

مرحا گل… درابن مکدن

ایک سے بڑھ کر ایک

ایک ڈاکٹر صاحب کا ٹی وی خراب ہوگیا۔ انہوں نے مکینک کو گھر بلا کر اسے چیک کروایا تو مکینک نے صرف معائنہ کرنے کی اجرت پانچ سو روپے بتائی

اور کہا کہ اگر کوئی پرزہ خراب ہوا تو وہ آپ منگوائیں گے۔

ملنسار ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی تم تو ہم سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہو۔ میں تین مریضوں کے معائنے کے صرف دو سو روپے لیتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" مکینک نے مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"مگر ہم میں اور آپ میں یہ فرق ہے کہ ہم گارنٹی بھی دیتے ہیں۔"

حرمہ واجد۔۔۔۔ کراچی

صورت حال

مندی کے دنوں میں کپڑے کے کارخانے کے مالک نے دوسرے کارخانے کے مالک سے پوچھا۔

"کاروبار کیسا جا رہا ہے؟"

"بس ٹھیک ہی ہے کل ہی ہمیں پچاس ہزار تھان کی سپلائی کا آرڈر ملا ہے۔" دوسرے مل اونر نے بتایا۔

"جھوٹ۔" پہلے مل اونر نے فوراً" کہا۔ "میں یقین نہیں کر سکتا۔

آج کل پچاس ہزار تھان کا آرڈر کہاں سے آسکتا ہے؟"

"اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟" دوسرے مل اونر نے گویا برا مانتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی اس آرڈر کے کینسل ہونے کا لیٹر دکھا دیتا ہوں۔"

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔۔ کہروڑپکا

اطمینان

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب بولے۔

"میں جب بھی کسی ٹیکسی میں بیٹھتا ہوں، مجھے سب سے زیادہ فکر بریکوں کی ہوتی ہے۔"

"اس ٹیکسی میں بیٹھ کر آپ کو بریکوں کے بارے میں فکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس میں بریکیں ہیں ہی نہیں۔" ڈرائیور نے اطمینان دلایا۔

گڑیا شاہ۔۔۔ کہروڑپکا

عاجز فقیر

ایک خستہ حال دروازے کے سامنے فقیر نے صدا لگائی۔ "اے نیک بی بی! کچھ کھانے کو ملے گا، بابا بھوکا ہے۔"

گھر سے کوئی آواز نہ آئی۔ فقیر دوبارہ عاجزانہ گویا ہوا۔

"اے بی بی! بابا روٹی بھی کھا لیتا ہے، چاول بھی کھا لیتا ہے۔ برگر بھی کھا لیتا ہے۔"

ایک دم گھر سے ایک کڑک دار نسوانی آواز سنائی دی۔ "بابا جوتے بھی کھا لیتا ہے؟"

"نہیں بی بی! بابا کو سخت غذا منع ہے۔" بابا نے اطمینان سے جواب دیا۔

ملائکہ کوثر۔۔۔۔ بسم اللہ پور

اہم شخصیت

ایک دفعہ میخائل گورباچوف ایک میٹنگ سے لیٹ ہو گئے تو اپنے شوفر سے بولے۔ "جلدی کرو"

شوفر نے کہا۔ "اگر میں گاڑی تیز چلاؤں گا تو قانون کی خلاف ورزی ہو گی۔"

چنانچہ گورباچوف نے اسے حکم دیا کہ تم پچھلی سیٹ پر بیٹھو اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا ابھی وہ چند کلو میٹر ہی گئے تھے کہ گشتی پولیس نے دھر لیا سینئر آفیسر نے اپنے ماتحت کو بھیجا کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو پکڑ کر لائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پولیس والا آگیا اور کہا۔

"گاڑی والا اتنا اہم شخص ہے کہ اس کا چالان نہیں ہو سکتا۔" پولیس چیف نے پوچھا۔

"وہ کون ہے؟"

"اس کا تو مجھے پتا نہیں لیکن کامریڈ گورباچوف اس کے شوفر ہیں۔" پولیس مین نے جواب دیا۔

ثمر اقرا۔۔۔ کراچی

شگفتہ شاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سوتے ہوئے تم اپنے گھروں میں آگ (جلتی ہوئی) نہ چھوڑا کرو۔"

اقوال حضرت علیؓ،

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"جو آدمی اپنے دینی بھائی کی نیک نیتی پر شکر نہ کرے گا وہ نیک کام پر بھی شکر ادا نہ کرے گا اور چاہیے کہ پس پشت اس کی مدد واعانت کرے اور طعن و تشنیع کرنے والے کو اس کا جواب دے اور اسے اپنی طرح تصور کرے اور یہ بڑا ظلم ہے کہ کوئی اس کے دوست کو برا کہے اور یہ چپ بیٹھا رہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ اس کے دوست کی پٹائی ہو رہی ہو اور وہ بیٹھا دیکھتا رہے اور اس کی کچھ مدد نہ کرے۔"

غلام سے سلوک،

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ بیس برس تک میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ جو کام میں نے نہیں کیا آپ نے اس کے بارے میں کبھی ارشاد نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا۔ البتہ جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے کوئی مجھ پر میرے کام پر غصہ ہوتا تو آپؐ فرماتے اس کو معاف کر دو۔ اگر تقدیر میں ہوتا تو یہ کام ٹھیک سرانجام ہوتا۔

شاہین رضوان۔ کراچی

اللہ کا ذکر،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا "اے روح اللہ! کیا روئے زمین پر کوئی بشر آپ جیسا ہوگا؟"

آپ نے فرمایا۔ "ہاں! وہ شخص جس کی تمام گفتگو اللہ کا ذکر اور خاموشی تفکر اور اس کی نظر عبرت آموز ہو، وہ مجھ جیسا ہے۔"

خوفِ خدا،

ابن الصمہ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنے نفس کا حساب کیا تو ساٹھ برس ہو گئے تھے۔ (ان کی عمر ساٹھ سال تھی) دنوں کا حساب کیا تو اکیس ہزار چھ سو دن ہوئے۔ کہنے لگے۔

"اگر روز ایک گناہ سرزد ہوا تو اس طرح اکیس ہزار چھ سو گناہ ہوئے اور اتنے گناہوں سے تیری رہائی کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ اس مدت میں ایسا دن بھی شامل ہے جس میں ایک ہزار گناہ سرزد ہوئے ہیں۔"

پس خوف سے ایک نعرہ مارا اور گر پڑے۔ جب ان کو دیکھا گیا تو وہ انتقال کر چکے تھے۔

شگفتہ یونس۔ لکی مروت

کمینہ،

یحییٰ بن خالد کا قول ہے کہ کریم جب پارسا ہوتا ہے تو تواضع اختیار کرتا ہے اور کمینہ، نادان جب پارسائی اختیار کرتا ہے تو اس میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔

فریحین ظفر۔ سیمی ظفر۔ کراچی

متکبر،

شیخ بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں۔ "جب تک ایک آدمی کسی شخص کو بھی خود سے بدتر سمجھتا ہے وہ متکبر ہے۔"

وشال فرحان۔ کراچی

دکھ،

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے اسے دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اسے اپنی جانب متوجہ کر

لیتا ہے۔ دُکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے۔

پھر اس سے نیک اعمال خود بہ خود اور بہ خوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دُکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے۔ اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتا ہے۔

(بانو قدسیہ)

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران۔ کراچی

شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے،

۞ دو چیزیں آپ کی فطرت کی وضاحت کرتی ہیں

آپ کا رویہ جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔
آپ کا رویہ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔

۞ اپنا پن تو ہر کوئی دکھاتا ہے... پر اپنا ہے کون؟ یہ صرف وقت بتاتا ہے۔

۞ اللہ کے خوف سے گرنے والے آنسو وہ واحد ذریعہ ہیں جو گرتے تو باہر ہیں... مگر صفائی اندر کی کر ڈالتے ہیں۔

۞ ریس میں جیتنے والا گھوڑا نہیں جانتا کہ کامیابی کیا ہے؟ وہ دوڑتا ہے تو اپنے مالک کی طرف سے ملنے والی تکلیف کی وجہ سے... تو جب کبھی تم خود کو تکلیف میں پاؤ تو سمجھ لینا کہ تمہارا مالک اللہ چاہتا ہے کہ جیت تمہاری ہو۔

۞ جب تمہاری زندگی میں دو ایسے راستے سامنے آجائیں کہ ظالم تمہیں گردن اٹھانے نہ دیں۔ اور دین تمہیں گردن جھکانے نہ دے تو تیسرا راستہ گردن کٹانے کا ہے۔

۞ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جینا ہی بہت دیر سے سیکھتے ہیں۔

رضوانہ شکیل، اذ۔ لودھراں

یقین کامل،

حضرت زنیرہ رومیہؓ ان خواتین اسلام میں سے تھیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی ایام میں اسلام کے شرف سے مشرف ہوئی تھیں۔ یہ بنو مخزوم کی لونڈیوں میں سے تھیں۔ ایک قول کے مطابق بنو عبدالدار کی لونڈی تھیں۔ جب انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو ان کے اوپر ظلم و ستم کا وہی پہاڑ ڈھایا جانے لگا جیسا کہ ان سے پہلے کمزور و لاچار مسلمانوں پر ڈھایا جا رہا تھا۔ مشرکین مکہ انہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرتے مگر یہ اللہ کی بندی پورے صبر و تحمل کے ساتھ اپنے ایمان پر قائم رہیں۔ اسلام کی راہ میں ہر تکلیف برداشت کی۔ مشکلات و مصائب سے تنگ آکر بھی اپنی زبان پر حرف شکایت اُف تک نہیں لائیں۔

ابوجہل ملعون سیدہ زنیرہ رومیہؓ کو سزائیں دینے میں پیش پیش تھا۔ علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ ابوجہل اپنے لوگوں سے کہا کرتا تھا۔

"تم لوگوں کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا کہ یہ کیسے کیسے (کمزور و لاچار) لوگ کس طرح محمدؐ کی پیروی کرتے ہیں؟ اگر محمدؐ کا لایا ہوا دین بہتر اور حق ہوتا تو یہ (خستہ حال لوگ) ہم سے پہلے اسے قبول نہیں کر سکتے تھے۔ (بلکہ ہم مال دار، سمجھ دار اور اثر و رسوخ والے پہلے اسے قبول کرتے) کیا یہ زنیرہ رشد و ہدایت کی طرف ہم پر سبقت لے گئی۔ جبکہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کون ہے (اور اس کی حیثیت کیا ہے)؟

حضرت زنیرہ رومیہؓ کو کفار مکہ مارتے جاتے اور کہتے جاتے "تم محمدؐ کا دین چھوڑ دو۔" مگر قربان جائیے اس اولوالعزم اور بہادر خاتون کے مضبوط ایمان پر کہ اس نے کفار کے ہر ستم کو برداشت کر لینا گوارا کر لیا لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو ایک لمحے کے لیے چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ بالآخر اللہ کی راہ میں مسلسل سزائیں برداشت کرتے کرتے ان کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی۔ اس وقت کفار مکہ حضرت زنیرہ رومیہؓ سے کہنے لگے۔

"یقیناً لات و عزیٰ نے تمہارا یہ حال کیا ہے جو تم دیکھ رہی ہو۔"

حضرت زنیرہ رومیہؓ بلاشبہ اندھی ہو چکی تھیں مگر ان کی دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کفار کی باتوں کا فوراً دو ٹوک جواب دیا۔

"لات و عزیٰ کو کیا معلوم کہ کون ان کی پوجا کرتا ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

بلکہ یہ بینائی آسمان والے کے حکم سے زائل ہوئی ہے۔ (میری قسمت میں تمہارے ظلم و ستم کی بدولت مجھے اندھا ہونا لکھا تھا) اور ہاں، میرا پروردگار اب بھی میری بینائی واپس کرنے پر قادر ہے۔"

سیرو تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔

اسی رات کی صبح کو رب تعالیٰ نے حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا کی بینائی واپس کر دی۔

بجائے اس کے کفار قریش اس واقعے سے درس عبرت لیتے۔ الٹا کہنے لگے۔

"ارے یہ تو محمدؐ کے جادو کا کرشمہ ہے۔"

حضرت زنیرہ رومیہؓ پر آئے دن کفار قریش ستم توڑ رہے تھے۔ چنانچہ ایک دن سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ حضرت زنیرہ بھی ان سات لوگوں میں سے ایک تھیں، جنہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کیا تھا اور جو خدا کے راستے میں ستائے جا رہے تھے۔

نخبہ اکرم۔ گاؤں گویلکی

واصف علی واصف کے افکار

- وہ ہر شخص جو اللہ سے معافی کا خواستگار ہے، اسے سب کو معاف کر دینا ہے۔ جس نے معاف کیا وہ معاف کر دیا جائے گا۔ حق والے کو حق ادا کرو بلکہ اسے حق سے بھی ماسوا دو۔ بس اتنے سے عمل سے ظلم ختم ہو جائے گا۔ جس معاشرے میں مظلوم محروم نہ ہوں وہ معاشرہ فلاحی ہے۔
- پست خیال انسان آکاس بیل کی طرح خود پھیلتا ہے اور دوسروں کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ وہ دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کر کے اپنے نفس کی تسکین کرنا چاہتا ہے۔
- بلند خیال انسان شمع کی طرح جلتا ہے اور روشنی دیتا ہے جلتا ہے روشن رہتا ہے۔ وہ اپنے اصل کی طرف یعنی نور کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کی زندگی دوسروں کے لیے اور دوسروں کا دکھ اپنے لیے۔

- خوشامد اس بیان کو کہتے ہیں جس کو دینے والا جانتا ہے کہ جھوٹ ہے اور سننے والا سمجھتا ہے سچ ہے۔
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر تقرب الٰہی کا تصور خارج از اسلام ہے۔
- غم ہو یا خوشی... اللہ والوں کو یہ دونوں اللہ کے قریب لے جاتے ہیں۔
- صرف بزرگوں کی یاد منانے سے بزرگوں کا فیض نہیں ملتا۔ بزرگوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے بات بنتی ہے۔
- بادشاہوں کی بادشاہی چھوڑ کر درویشی تو قبول کی لیکن کسی درویش نے درویشی چھوڑ کر بادشاہی قبول نہیں کی۔

حمزہ، اقراء۔ کراچی

سادگی

جب حضرت عمرؓ ملک شام تشریف لے گئے تو لوگوں نے اور وہاں کے سرداروں نے حضرت عمرؓ کا استقبال کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"میرا بھائی کہاں ہے؟"

لوگوں نے پوچھا "وہ کون ہے؟"

انہوں نے فرمایا "حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ۔"

لوگوں نے کہا۔ "وہ ابھی آپؓ کے پاس آ جائیں گے۔

چنانچہ جب حضرت ابوعبیدہؓ آئے تو سواری سے نیچے اتر کر حضرت عمرؓ نے انہیں گلے لگایا۔ پھر ان کے گھر تشریف لے گئے اور انہیں گھر میں صرف یہ چیزیں نظر آئیں۔ ایک تلوار، ایک ڈھال اور ایک کجاوہ۔

حضرت ابوعبیدہ ابن جراح اسلامی فوج کے سربراہ تھے۔

صدف عمران۔ کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY READING Section

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

راضیہ بتول ——— گھوٹکی

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

رقیہ سیف ——— ملتان

اے عشق! دل کی بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے
بڑی راحت کے دن تھے تیری پہچان سے پہلے

ارم کمال ——— فیصل آباد

یہ حقیقت سراب ہے پیارے
ظلمتوں کا یہاں بسیرا ہے
وقت کے سب غلام ہیں ورنہ
کون تیرا ہے، کون میرا ہے

شازیہ حقی ——— لی مارکیٹ، کراچی

چاند نکلا تھا مگر رات نہ تھی پہلی سی
یہ ملاقات، ملاقات نہ تھی پہلی سی
رنج کچھ کم تو ہوا آج ترے ملنے سے
یہ الگ بات کہ وہ بات نہ تھی پہلی سی

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

ہنسی کے رنگ بہت مہرباں تھے لیکن
اداسیوں سے ہی نبھی خمیر ایسا تھا

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

درد کی خوشبو گئی، زخموں کی رعنائی گئی
موسم ہجراں تری اب کے پذیرائی گئی
کون سی محفل، کہاں کے روز و شب کیسا قیام
زندگی تو اصل میں اک سانس ہے آئی گئی

تسنیم کوثر ——— کراچی

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

کوثر خالد ——— جڑانوالہ

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

جس شہر میں ہوئے ہیں آباد سنگ زادے
وہاں سب لوگ آئینوں سے محروم ہو گئے ہیں

ریما نور رضوان ——— کراچی

جیون گھرا ہوا تھا اندھیروں کے شہر میں
سوچوں کا ایک دیپ جلانا پڑا مجھے

نایاب نگینہ ——— بنوں

سائے کا بھی ہم نے اگر احسان لیا ہے
گھر کس کا ہے دیوار سے پہچان لیا ہے

شائستہ اکبر ——— گدو کالونی

نام ہی نام چار سو، ایک ہجوم روبرو
کوئی تو ہو مرے سوا، کوئی مرے سوا نہیں

ثوبیہ قطب ——— کراچی

دل گیا، رونق حیات گئی
غم گیا، ساری کائنات گئی

بینا ظفر، فرحین ظفر ——— کراچی

تمہارا ہجر صدی دو صدی پالیں گے
ابھی کچھ اتنی سکت تو ہماری چاہ میں ہے

بریرہ اکرام، قرأت اکرام ——— کراچی

مجھے تعمیر کرتا جا رہا ہے جذب و مستی میں
میں جب تعمیر ہو جاؤں گا پھر مسمار کر دے گا

شاہدہ، سیمی، ثروت راشد ——— کراچی

فطرت کسی کے ظرف کو اتنا نہ آزما
ہر شخص اپنی ذات میں بڑا لاجواب ہے

* * *

رضیہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔

شروع اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے جو دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔ آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو، آپ کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

پہلا خط لیاری، کراچی سے ثمینہ اکرم کا ہے، لکھتی ہیں۔

آج میں نے سوچا کہ شعاع ڈائجسٹ میں اپنی انٹری دے کر آپ کو ممکنہ تشویش سے بچالوں۔ (جو ایک قاری کی طویل غیر حاضری کی صورت میں آپ کو ہوتی ہے) ہر ماہ کوشش تو بہت کرتی ہوں کہ شعاع کے مستقل سلسلوں کا حصہ بنوں۔ آپ سے نصف ملاقات کروں۔ مگر کاغذ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتی ہوں تو سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں، پھر چند لائنیں لکھ کر میں اپنا ارادہ ترک کردیتی ہوں۔ طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ میرا ہیپاٹائٹس کے انجکشن کا دوسرا کورس ہو رہا ہے۔ آج اکرم نے بہت اصرار کرکے یہ خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ پلیز میرے لیے آپ ضرور دعا کیجئے گا۔ مارچ کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو سب سے پہلے سائرہ رضا کے نام نے ہی جی خوش کردیا۔ ناول کا عنوان "محبت مارچ کا موسم" بہت منفرد لگا۔ جبکہ ہم بحیثیت استاد مارچ کو "امتحان کا موسم" کہتے ہیں۔ ٹائٹل بھی جاذب نظر لگا۔ بہت سادہ نکھری نکھری ماڈل.... ناظمہ زیدی نے چوک اعظم کا احوال بہت خوب تحریر کیا۔ آپ خوش نصیب ہو جو تازہ ہوا اور خالص غذا میسر ہے۔ ہم کراچی والے تو ان چیزوں کے لیے ترستے ہی رہتے ہیں۔ کوثر خالد اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک.... خالص اور بے ریا لوگ عطیہ خداوندی ہوتے ہیں۔ آپ کو دادی بننے پر مبارک باد۔ آپ کی طرح کوثر خالد کی کمی ہر ماہ مجھے بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔ اس ماہ تینوں مکمل ناول لاجواب لگے۔ فرزانہ کھرل نے "محبت مانگتی ہے جو" میں عورت کی عزت نفس پر ہر شے کو ترجیح دی۔ "ایک تھی مثال" کی آخری قسط حسب توقع ہی رہی۔ ناول کے ہر کردار نے اپنا بویا ہی کاٹا۔ "سیاہ حاشیہ" ہر مرتبہ بختاور کی قسمت پر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ ہاشم جیسے بے دین شخص کا ساتھ ایک بڑی سزا ہی تو ہے۔ والدین کا دل دکھانے کی سزا... اپنی خودسری اور نافرمانی کی ایک نہ ختم ہونے والی سزا.... "دعائے خیر" ام ایمان قاضی نے بھی بہت خوب کہانی تحریر کی۔ "میں ایک قاری ہوں" عائشہ تنویر کا یہ ننھا منا افسانہ بڑا حقیقت پر مبنی محسوس ہوا۔

ج۔ پیاری ثمینہ! آپ کی کمی ہمیں ہی نہیں ہماری قارئین کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ آپ کا خط پڑھ کے تو دل دکھ سے بھر گیا۔ بیماری کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھا، آپ کی محبت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا۔ اتنی محبت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اکرم صاحب کو ہماری طرف سے سلام۔ قاری بہنوں سے گزارش ہے کہ اپنی دعاؤں میں ثمینہ اکرم کو ضرور یاد رکھیں۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے اور ہمارا ہاتھ تھامے رہے۔ (آمین)

کراچی سے مہناز یوسف نے لکھا ہے

سب سے پہلے فروری میں شائع سمیرا حمید کی تحریر "ہماری کہانی" کی مختصرا" بات کرنا چاہوں گی۔ اتنی اچھی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

لگی مجھے وہ تحریر' ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ایک بار پڑھی' دوبارہ پڑھی۔ ویسے تو سمیرا کی اکثر تحریریں دوبار پڑھنی پڑھتی ہیں۔ خاص طور سے "جوگ آس" تو میں نے تین چار بار پڑھی' تب صحیح سے سمجھ میں آئی۔ بہت ذہین ہیں سمیرا حمید.....

"سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم کو چاہیے کہ ماضی کو زیادہ سے زیادہ دہرائیں' کیونکہ اب ماضی جاننے میں زیادہ دلچسپی محسوس ہورہی ہے۔ "محبت مارچ کا موسم" سائرہ رضا کی تحریر ہو اور اچھی نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ شازیہ جمال طارق کے افسانے مختصر' مگر پراثر ہوتے ہیں۔ مجھے شازیہ جمال کی تحریریں اچھی لگتی ہیں۔ نادیہ صدیقہ کی کہانی بھی اچھی تھی۔ اس کی نندوں پر غصہ آیا۔ عائشہ تنویر کی کہانی اچھی لگی۔ "تجھ سے ناتا" اس دفعہ کا بہت اچھا تھا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جن خواتین کے شوہر دوسری شادی کرلیتے ہیں' وہ ساس' نندوں کی برائیاں نہیں تحریر کرتیں' کیونکہ سوکن کا دکھ ہر دکھ سے بڑا ہوتا ہے شاید..... جو بہنیں چاہتی ہیں کہ اس سلسلے میں ان کا نام شائع کیا جائے تو ان بہنوں کے اصل نام ضرور شائع کیا کیجیے اور جو بہنیں اصل نام شائع نہیں کروانا چاہتیں ان کے فرضی نام لکھ دیا کیجیے۔ ز۔ ن وغیرہ مناسب نہیں لگتا۔ "مثلاً" فریحہ یا ثمین (فرضی نام) یا پھر سمیرا حسن (فرضی نام) اس طرح زیادہ صحیح لگے گا۔ "خط آپ کے" کے زبردست سلسلہ ہے۔ (کیونکہ میں بھی اس میں شرکت کرتی ہوں۔) فوزیہ سلطانہ کو ان ہی کے انداز میں دیا گیا آپ کا جواب' زبردست بھئی۔ اور ہاں فرزانہ مغل کا آئیڈیا بھی اچھا ہے۔ مردوں کا "تجھ سے ناتا" شروع کروانے کا۔ اگر بہوؤں کے علاوہ ساس' نندوں کے لیے بھی ایسا ہی سلسلہ شروع کیا جائے تو؟ کیونکہ ہمیشہ بہوئیں مظلوم نہیں ہوتیں' کبھی کبھار بہوئیں بھی ساس' نندوں کے ساتھ غلط کرجاتی ہیں۔

ج ۔ کیا کرتی ہیں مہناز! آپ کا یہ جملہ پڑھ کر کہ "خط آپ کے" زبردست سلسلہ ہے' ابھی ہمارا دماغ آسمان کی سیر کو جانے ہی والا تھا کہ بریکٹ میں آپ کا تبصرہ دیکھ کر ہم ہوش کی دنیا میں لوٹ آئے' حد ہوگئی۔ بھئی لوگ تو خوش فہمیاں بھی نہیں پالنے دیتے۔

یہ سلسلہ ساس' نندوں کے مظالم بیان کرنے یا بہوؤں کی مظلومیت دکھانے کے لیے شروع نہیں کیا گیا' بلکہ ہمارے معاشرے کی تصویر ہے جہاں بہو اور ساس دونوں ہی مظلوم ہیں' شادی ہوکر بھری سسرال میں آنے والی لڑکی کو بہت سارے لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ شوہر اس کے ساتھ ہوتا بھی ہے تو لیکن ایک عمر کی ریاضت کے بعد... جب سارے ارمان ٹھنڈے اور دل بجھ چکا ہوتا ہے۔

ثوبیہ نور' کشن گڑھ بھاول پور سے لکھی ہیں

ٹائٹل اچھا تھا اور ٹائٹل پر دیا گیا پیغام بھی' لالچ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بچوں کے پیپرز ہوچکے ہیں اور میں نے "محبت مارچ کا موسم" شروع کرنے سے پہلے ہی رزلٹ بھی آفس میں جمع کروادیا اور اعلان بھی کردیا۔ خبردار! کوئی مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ شافعہ نے کہیں سے سن لیا' پھر تو سر پر سوار ہوکر جو دماغ تپایا کہ نہ پوچھیں۔ اگر آپ کے پاس بھی کوئی ایسا "ڈھیٹ" دوست ہے تو آپ کو پہلے ہی پتا ہوگا۔

سائرہ رضا کا انداز تحریر' میں صدقے جاواں' کیا کہنے بھئی۔ حضرات کے لیے سروے رکھنے والا آئیڈیا اچھا ہے۔ بیوی اور ماں کے درمیان اچھی خاصی درگت بنتی ہے بے چاروں کی۔ "رقص بسمل" میں لگتا ہے' جلد ہی رضا حیدر بسمل کی طرح تڑپنے والے ہیں۔ "باتوں سے خوشبو آئے" اس دفعہ کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ خطوط میں انیقہ انا کو ویلکم کہا جاتا ہے بھئی... اور کوثر خالد مبارک باد... "ایک تھی مثال" میں آخر میں افسانوی طور پر ہر چیز صاف' شفاف' نکھری ستھری ہوگئی' بات ختم۔ خیر اچھا اینڈ ہے حوصلہ افزا کہ بالآخر مثال کو کچھ سکون ملا۔

ج ۔ پیاری ثوبیہ! ہمارے پاس شافعہ جیسی دوست تو نہیں' البتہ قاری ضرور ہے اور اس قاری سے فرمائش ہے کہ اگلی دفعہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شریک ہو۔ معید کام بھی کرے گا اور حمیرا کے لیے بہت کچھ خرید کرلائے گا۔ کہانی ابھی باقی ہے دوست! اور نبیلہ کی کہانی میں ماورا کے عزائم بھی ضرور سامنے آئیں گے' کہانی کی چند ہی اقساط باقی ہیں۔

بلقیس تبسم اور نفیسہ حسین' بھٹیاں والا اوکاڑہ سے شرکت کررہی ہیں' لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل بھی بہت اچھا تھا۔ خاص طور پہ ماڈل کی

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گھڑی پھر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازہ کرتے ہیں، مجھے یہ سلسلہ خاص طور پہ بہت پسند ہے، بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، پھر چھلانگ لگائی "رقص بسمل" کی طرف۔ واہ کیا بات ہے نبیلہ عزیز کی صائمہ اکرم جی "دیمک زدہ محبت" کے بعد اب "سیاہ حاشیہ" زبردست ہے۔ "ایک تھی مثال" بھی بہت اچھا تھا۔ ویسے بشریٰ اور عدیل دونوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوا، پری کے انجام کے بارے میں بھی پڑھ کے بہت افسوس ہوا۔ افسانے بھی سارے اے ون تھے۔ بہت زیادہ سبق آموز، نظم میں سے محمد مشتاق آثم کی نظم بہت اچھی تھی۔ اس دفعہ سائرہ رضا کا ناول دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔ سارے مکمل ناول اے ون تھے۔ میں اپنے گاؤں سے پہلی لڑکی ہوں جو آپ کو خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ ہمارا گاؤں بہت خوب صورت ہے، یہاں پکی سڑکیں اور اسکول اور ہر سہولت ہے اور اب تو ماشاء اللہ سے سوئی گیس کی سہولت بھی ہے اور کبھی لوڈشیڈنگ بھی نہیں ہوتی۔ ہمارے گاؤں کے لوگ پڑھے لکھے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کے رہتے ہیں۔ مجھے شعاع کو پڑھتے ہوئے تقریباً 20 سال سے بھی زیادہ ہوگئے ہیں۔ سو اتنا حق تو میرا ابھی بنتا ہے نہ اور ہاں مجھے ہر ماہ ڈائجسٹ منگوانے میں بہت مشکل ہوتی ہے، تو اس لیے میں شعاع، کرن اور خواتین ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا کہ تینوں ڈائجسٹ محفوظ طریقے سے مجھ تک پہنچ آئیں۔

ج۔ بلقیس اور نفیسہ۔ پہلے تو دلی مبارک باد، آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں، یقین نہیں آرہا کہ آپ کے گاؤں میں لوڈشیڈنگ نہیں ہوتی۔ دیہات میں شہروں سے زیادہ بجلی کا مسئلہ ہے۔ آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ گھر بیٹھے تینوں پرچے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ تینوں پرچوں کی سالانہ خریدار بن جائیں۔ سال بھر تک ایک پرچا گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے آپ کو 700 روپے منی آرڈر کرنا ہوں گے۔ تین پرچوں کے لیے 2100 منی آرڈر کریں۔ منی آرڈر اس ایڈریس پر کریں۔ شعاع 37 ۔ اردو بازار کراچی

نادیہ صدیقہ بونگہ بلوچاں پھول نگر تحصیل پتوکی سے شرکت کر رہی ہیں لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت ڈیسنٹ اور سوبر.... امی کہنے لگیں، دیکھو تو شاید تمہارا نام بھی آیا ہو۔ میں نے کہا امی ابھی کہاں؟ ساتھ ساتھ ورق گردانی بھی کر رہی تھی کہ.... افسانوں پہ نظر پڑی اور خوشی سے چیخ نکلی۔ "امی.... میرا افسانہ شائع ہوگیا ہے۔" (کانپتی ہوئی آواز، لرزتے ہاتھ) حیرت، شدید حیرت، خوشی اور بہت خوشی.... زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ خوشی کی شدت سے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ امی بھی بے انتہا خوش تھیں۔ مجھے کہنے لگیں۔ "بیٹا آرام سے، آرام سے...." حالانکہ انہوں نے اپنے دل کو بھی بمشکل ہی کنٹرول کیا ہوا تھا۔ الحمدللہ.... میری امی (قاریہ عائشہ صدیقہ) بہت نیک، سادہ و صاف دل، دن رات قرآن پڑھنے والی ہیں۔ انہوں نے آپ سب کے لیے دعائیں کیں۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی طرف.... کوثر خالد (جڑانوالہ) کا خط پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ خط نہیں، کوئی کہانی پڑھ رہے ہیں، بے ساختہ انداز.... بہت خوب.... "تاریخ کے جھروکے" کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نہ پڑھیں؟ "ایک تھی مثال" کا اینڈ بہت اچھے انداز سے کیا، رخسانہ نگار آپا نے کسی قسم کی تشنگی نہ رہی۔ افسانوں میں "پہیلی" میں "ایک قاری ہوں" زبردست۔ "جیت ہماری ہے" کا افسانہ کے شروع کرنے کا انداز بہت اچھا۔ پیاری بنت سحر "اب کے برس" پچھلے ماہ والا اور "اہل جنوں باقی ہیں" دونوں ہی بہت اچھے تھے۔ "سیاہ حاشیہ" کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے امیزنگ! ناول ہے یہ تو.... "جب تجھ سے ناتا جوڑا" بند نہیں کرنا آپ نے یہ سلسلہ! تنقید تو ہوتی ہی رہتی ہے، مگر اس سلسلے کے حامی زیادہ ہیں۔

ج ۔ پیاری نادیہ صدیقہ! آپ کی والدہ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ آپ سب کی محبت، خلوص اور دعاؤں سے تو ہماری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

تسنیم کوثر ایف بی ایریا کراچی سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے

مارچ کا شمارہ پڑھا مزہ آیا۔ خاص طور پر دعائے خیر پسند آیا۔ بہت یونیک سا نام اور اسٹوری جان دار تھی۔ نہایت عمدگی سے ناول لکھا گیا ہے۔ "میں ایک قاری ہوں" بھی

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بہت خوب، کیا زندہ دل تحریر رقم کی ہے۔ بالکل حقیقت سے قریب تر، واقعی مدیرہ صاحبہ کا اناپ شناپ ٹائپ کے بے تکے خطوط پڑھ کر کیا حال ہوتا ہوگا۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا۔ کہیں ہم تو ان میں شامل نہیں؟ "کامیاب عورت" اچھا لکھا ہے، مگر ساری بہوئیں اتنی اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ "ایک تھی مثال" کا اینڈ ہوا اور بہت اچھا ہوا۔ آخری قسط شان دار لکھی گئی۔ افسانہ آزمائش مختصر اور جیسے کو تیسا تھا۔ فرزانہ کھرل کا "محبت مانگتی ہے جو" ہمیں زیادہ متاثر نہیں کیا۔ اس کا اینڈ کچھ تشنگی لیے ہوئے تھا۔ سائرہ رضا کا ناول "محبت مارچ کا موسم" ناول کا نام تو بڑا دلکش ہے۔ اسٹوری بھی بس تھوڑی بہتر ہے۔ صائمہ اکرم کا "سیاہ حاشیہ" کا جواب نہیں۔

ج ۔ پیاری تسنیم ہم اپنے قارئین سے بالکل بھی تنگ نہیں۔ یہ تو بس افسانہ ہی تھا۔ ہم تو اپنے تمام قارئین کو یاد ہی رکھتے ہیں اور جب سے آپ کا لہجہ اور تبصرہ تبدیل ہوا ہے تو آپ کو تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کوثر خالد نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

کتنی چاہت سے آپ نے طویل "نانا" کا اصرار کیا تھا۔ جو ہم نے فوراً "بھیج دیا تھا"، مگر اب طویل انتظار.... آج کل ہماری اماں جانی تشریف لائی ہوئی ہیں اور کافی مدد کر رہی ہیں۔ اس کے باوجود رسائل سے رابطوں کے لیے آج ساری رات تہجد تک جاگ کر لکھا اور ناشتے کے بعد سے پھر قلم چل رہا ہے۔ شعاع سے رشتہ جوڑا تو اس نے حوصلہ افزائی کی نوید بخشی۔ اسی نے بچوں کے رسائل میں لکھنے کا مشورہ دیا۔

اس بار پورا رسالہ ابھی نہیں پڑھ پائے۔ تاخیر کے خدشے کی بدولت۔ ناولز تو پڑھ ہی لیے ہیں.... کہ آئندہ کا دھڑکا ہوتا ہے۔ ورنہ بقول میری خالہ انور.... سب کہانیاں ایک ہی سبق دیتی ہیں۔ محبت یا نفرت کا.... گویا سب کہانیاں ایک ہی ہیں۔ "ایک تھی مثال" آخر اختتام پذیر ہو ہی گیا۔ "رقص بسمل" حسب توقع جا رہا ہے۔ البتہ "سیاہ حاشیہ" کافی غور و خوض یا صبر کا تقاضا کرتا ہے۔ غزلیات، واہ، صاحب کی شاعری ہے تو اچھی، مگر ہمارے حسب حال نہیں ہے۔ بھلا ہے کوئی جو ہم پر ظلم کرے.... اللہ ہمارے ساتھ ہے نا۔ لطیفے میرے مزاج آشنا نہیں۔ دو بار پڑھ کر تو سمجھ میں آتے ہیں۔ ہنسی تو کسی پر ہی آتی ہے۔ خطوط میں ہمارا پرانا خط سرپرائز و خوشی کی دولت سے مالا مال کر گیا۔ انیقہ جی! خوش آمدید.... اب جانا مت۔ پہلے جواب شریف ہوتے تھے اب شریر بھی.... لطیف بھی جیسا کہ فوزیہ سلطانہ والا....

ج ۔ پیاری کوثر خالد! اللہ تعالیٰ نے ہنسنے پر پابندی تو نہیں لگائی۔ جن باتوں پر ہنسی آئے دل کھول کر ہنسا کریں۔ خوا مخواہ کی پابندیاں آپ اپنے اوپر نہ لگائیں۔ کچھ خطوط ایسے ہوتے ہیں کہ ہماری حس ظرافت کو جھنجھوڑ کر جگا دیتے ہیں۔ ہمارے جواب شریف ہوں کہ شریر.... بخدا ہم بہت شریف ہیں، بس کبھی غرور نہیں کیا۔ اور آپ اپنی خالہ کی تصحیح کرا دیتیں، ہمارے ہاں جو کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ وہ صرف محبت کا درس دیتی ہیں۔ انسان اور انسانیت سے محبت کا درس....

افسر عباسی نے ہری پور عباسی سے لکھتی ہیں

افسوس.... اداسی.... ناامیدی.... میں مسلسل 2 ماہ سے خط لکھ رہی ہوں، مگر نہ جانے کیوں میرے خط قبولیت کا شرف حاصل کرنے سے محروم ہیں۔ تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ "سیاہ حاشیہ" بہترین اور اول درجے پر جا رہی ہے۔ "میں ایک قاری ہوں" کی سمجھ نہیں آئی، نہ جانے کس طرح لکھا گیا ہے یہ افسانہ! "ایک تھی مثال" کی آخری قسط بہت اچھی قسط رہی۔

ج ۔ پیاری افسر! افسوس، مایوسی، ناامیدی صرف ایک خط شائع نہ ہونے پر....؟! اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر نہیں لیتے اور پھر یہ دیکھیں کہ صرف دو کہانیوں پر تبصرہ اور باقی خط اس ضد کی نذر کہ خط ضرور شائع کریں۔ چلیں.... شائع کر دیا، خوش.... افسانہ "میں ایک قاری ہوں" آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حیرت ہوئی یہ جان کر.... بہت سادہ سا افسانہ تھا۔

روبینہ شاہد نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ہم نے قلم اٹھانے میں دیر ضرور کی، مگر قاری بہت پرانے ہیں۔ سارے افسانے بہت خوب رہے۔ امتہ العزیز شہزاد نے "پہیلی" واقعی خوب تحریر کیا ہے کہ اور ہر آزمائش پر پورا کر کے کامیاب عورت کہنے والی نادیہ صدیقہ اور شازیہ جمال کے بعد، سدرہ حیات کہتی ہیں کہ

READING
Section

(جیت ہماری ہے) بنت سحر کا ''اہل جنوں باقی ہیں'' اور عائشہ تنویر کا ''میں ایک قاری ہوں'' دونوں نے اپنی تحریروں سے انصاف کیا۔ ''سیاہ حاشیہ'' زبردست جارہا ہے۔ فرزانہ کھرل کا ''محبت مانگتی ہے'' زبردست رہا اور ''دعائے خیر ہوں'' ام ایمان قاضی کا بہت پیاری تحریر' رخسانہ نگار عدنان ''ایک تھی مثال'' بالآخر اختتام کو پہنچا۔ اچھا رہا۔ نبیلہ عزیز کا ''رقص بسمل'' بھی اپنی مثال آپ ہے۔

ج ۔ پیاری روبینہ! خط شامل اشاعت ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مختصر ہو' مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ داستان امیر حمزہ بن جائے۔ ہاں بس تبصرہ ذرا جان دار ہو.... اور بروقت مل جائے۔ اتنی سی شرط ہے۔

شازیہ کنول' چوک اعظم سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ہر ماہ آپ کے شمارے لازمی پڑھتی ہوں۔ پہلے میاں صاحب ناراض ہوتے تھے' لیکن اب تو ہر ماہ خود ہی لادیتے ہیں۔ پتا ہے کیوں؟ مزے دار کھانا کھانے کے لیے' کیونکہ میں 8th کلاس میں تھی جب امی وفات پاگئیں۔ (اللہ جنت نصیب کرے) تو میں نے — جو کچھ بھی سیکھا ان شماروں سے ہی سیکھا۔ ویسے کچھ کھانا پکانا مجھے میرے بڑے جیٹھ شہباز بھائی نے بھی سکھایا ہے' اب تو سب ہی رشتے دار کہتے ہیں کہ شازیہ کھانا بہت مزے دار بناتی ہے۔ (اپنے منہ میاں مٹھو) زندگی گزارنے کے سارے گر امی سے سیکھے۔ یہ شمارہ تو میری دوسری امی ہے۔ اب آتی ہوں کہ خط کس وجہ سے لکھا' تو جناب وہ میں نے اپنی قاری بہن

ناظمہ زیدی کا خط پڑھا تو بہت خوشی ہوئی۔ 20 سال بعد قلم اٹھا ہی لیا۔ ''ایک تھی مثال'' پڑھ کر ازدواجی الجھنیں دور کیں۔ ویل ڈن رخسانہ صاحبہ.... ''رقص بسمل'' اور ''سیاہ حاشیہ'' ماں' باپ اور بچوں کو بہت کچھ سمجھا رہا ہے' اگر کوئی سمجھنا چاہے تو بہت ہی اچھی کاوش ہے اور فرزانہ کھرل نے تو میرے دل کی بات کو لفظوں کے پیراہن پہنا دیے کہ محبت صرف عزت مانگتی ہے' عزت کے بغیر محبت کچھ نہیں۔ سائرہ اور دعائے خیر کے کردار بہت پسند آئے۔ افسانے سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ عائشہ تنویر نے تو بیچ میں بڑی میٹھی میٹھی سی کردی۔ اور یہ صفیہ جیسے کردار ہر فیملی میں ہوتے ہیں۔ کسی کی برسوں کی ریاضت کو پل میں خاک کرنے والے۔ احادیث پڑھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور دوسروں کو بھی سناتی ہوں' تاکہ کسی کا بھلا ہوجائے اور مجھے ثواب ملے۔ ''تجھ سے ناتا جوڑا'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے بالکل بھی بچیوں کو غلط اثر نہیں لینا چاہیے' بلکہ سسرالی جنگ کے لیے اپنے پاس برداشت' اخلاق اور صبر جیسے ہتھیار جمع کرلینے چاہئیں۔

ج ۔ پیاری شازیہ! اتنا اچھا خط لکھنے کا شکریہ۔ بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا۔ آپ ضرور ''جب تجھ سے ناتا جوڑا'' میں شامل ہوں۔ ہم آپ کی تحریر کے منتظر ہیں۔

آئینہ ملک نے لکھا ہے

واؤ.... سائرہ رضا کا ناول.... سائرہ رضا اونہوں.... آپ خوب صورت لکھتی ہیں نا' مسحور کن' آپ تو بس سچ لکھتی ہیں۔ آپ کا ہر کردار ہمارے اردگرد سے لیا گیا ہوتا ہے۔ کرداروں کی سوچ اور جذبات سے زیادہ ان کے ماحول اور حالات کو سادہ سے انداز میں بیان کرنے کا ہنر آج کے دور میں صرف آپ کے پاس ہے یا پھر سب سے زیادہ آپ کے پاس.... بس سائرہ کے لیے یہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ تسی گریٹ ہو۔ ''پہیلی'' کامیاب عورت اور آزمائش نے اسی خیال کو تقویت دی کہ عورتوں کے اصل مسائل' کسی بل کے پاس ہونے سے ختم نہیں ہونے والے۔ جیت ہماری ہے' شاہد آفریدی اچھا سبق ہے' یہ کھانا پینا نہیں چھوٹتا۔ ''میں ایک قاری ہوں'' مختصر' مگر پراثر (ہاہاہا) ''سیاہ حاشیہ'' نہیں پڑھ رہی۔ فرزانہ کھرل واؤ.... آپ کی ہیروئن کی باتیں بہت اچھی تھیں۔ کہانی کا کیا کہوں' مگر ڈائیلاگز خصوصا'' ہزبینڈ کے معاملے میں.... میں نے یہ جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ ''مسکراہٹیں'' اس دفعہ دلچسپ تھیں۔ ''تاریخ کے جھروکے'' اور ''احادیث'' بمع تفصیل ہمیشہ کی طرح دماغ پہ دستک دیتی اور دل کو اطمینان دیتی ہوئی تھیں۔ اوہ ہاں.... ! خطوط تو رہ ہی گئے' جو میں نے سب سے پہلے پڑھے اور پڑھ کے بہت افسوس ہوا کہ کہانیوں میں تبصرے تو ردی کی ٹوکری کی نذر ہوگئے تھے۔ خیر انیقہ انا کی واپسی ادھوری سی ہے ابھی.... آپ اپنے اپنے علاقوں کا تعارف کروانے کے لیے کوئی الگ سلسلہ شروع کریں۔ کوثر آنٹی کے دادی بننے پر خوشی.... اروی! نور اور فرح فاطمہ کیا واقعی ہی یہ سلسلہ منفی تاثر پیش کررہا ہے؟ اب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ برا ہوتا

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے، تو پڑھنے والے اور لکھنے والے دونوں کو غیر جانبدار ہو کر سوچنے سے پتا چل سکتا ہے کہ برائی کا پلڑا بھاری ہے یا اچھائی کا۔ فائزہ کی بیماری، عائش کی نونہالی، نمرہ اور رضوانہ کا تبصرہ سب ہی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھے، مگر سب سے زیادہ مزہ آیا فوزیہ سلطانہ کا خط پڑھ کے اور آپ کا سوا سیر جیسا جواب، پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ (ہنس ہنس کر) ناظمہ جی آپ کو یہ سب شعاع کے ساتھ ساتھ میں لکھنا چاہیے تھا۔ عائشہ انصاری کے دو لفظ تادیر میری آنکھوں کے سامنے رہے، ہٹ کر "عمدہ الفاظ کا چناؤ" ہاہاہاہا.... رضوانہ پروین اور عائشہ کا تبصرہ میرے لیے ڈوبتے کو تنکے کے مترادف تھا۔

ج ۔ پیاری آئینہ ملک! دنیا میں واقعی کوئی بات نئی بات نہیں۔ صرف انداز بیاں نیا ہوتا ہے۔ آپ اپنی تحریریں بھیج دیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا اندازہ غلط ہو۔ بائی دا وے یہ خیال کیونکر آیا کہ کہانیوں کے تبصرے ردی کی ٹوکری کے نذر ہو گئے ہیں۔

ثمر ہاشمی، کنڈیاں سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اس ماہ کا شمارہ بالکل بھی نہیں پڑھا، صرف ٹائٹل ہی دیکھا ہے، کیونکہ مجھے بہت تیز بخار ہے اور میرا بخار دو ہفتوں سے پہلے جاتا ہی نہیں۔ ٹائٹل گرل کا آئی میک اپ بہت خوب صورت ہے، لیکن ماڈل کی ناک نقلی لگ رہی ہے۔ پلیز مائنڈ مت کرنا حمیرا جی، یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے، ہو سکتا ہے بخار ہی دماغ پہ چڑھ گیا ہو۔ مصباح وقاص ہاشمی میری پھوپھو کی بیٹی ہے اور میری منہ بولی بہن ہے۔ مجھے رسالے پڑھنے کا شوق اسی سے لگا ہے۔

ج ۔ ثمر ہاشمی! بخار میں بھی آپ کا دماغ خوب چلتا ہے۔ نقلی ناک؟ ہاہاہا.... آپ کی بات سن کر ماڈل کی ناک کا موازنہ مائیکل جیکسن کی ناک سے بھی کر دیکھا۔ بخدا ہمیں تو کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔ مصباح وقاص ہاشمی کو ہمارا شکریہ پہنچا دیں، جنہوں نے آپ میں شعاع پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔

عائشہ رباب نے کراچی سے لکھا ہے

میرے ساتھ ساتھ میری پیاری آنٹی ساجدہ افتخار کا سلام بھی قبول کریں۔ ہر ماہ باقاعدگی سے آنٹی ہی شمارہ منگواتی ہیں۔ میرا حاصل تبصرہ کرتی ہیں۔ سرورق کچھ خاص نہیں لگا۔ ماڈل کی آنکھیں کچھ طنزیہ سی لگیں۔ حسب معمول پہلی شعاع سے آغاز کیا، کیا خوب لکھا ہے۔ "امید اور یقین کا دیا بجھنے نہ دیں۔" نیا ناول "خواب شیشے کا" عفت سحر کا ناول "بن مانگی دعا" پڑھا تھا، کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" بیش بہا خزانے اندر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ن۔ زکی والدہ نے جتنی قربانیاں دی ہیں "خدا انہیں بے حساب خوشیاں عطا کرے" (آمین) "دستک" میں محمد اکبر، شبنم ثانی، صنم سعید کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ نظمیں، غزلیں میں انتظار بہت اچھا لگا۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں ساری ہی نئی تھیں، اچھی لگی ہیں۔ "باتوں سے خوشبو آئے" "خوب صورت عورت" کمال کی لگی۔ عائشہ گوجرہ کا شعر سب سے اچھا لگا۔ "خط آپ کے" میں فوزیہ سلطانہ صاحبہ کا خط پڑھ کر چکر آنے لگا۔ صد شکر کہ ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ "آئینہ خانے" اس بار بالکل پسند نہیں آیا۔ "تاریخ کے جھروکے سے" اتنا دلچسپ.... لیکن افسوس ہے، آج کی قوم بھی جاہلیت کا لباس پہنے جا رہی ہے۔ ناول میں "ایک تھی مثال" کی آخری قسط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کسی نے ٹھیک تجزیہ کیا تھا۔ جب مصنفین کرائسس دکھاتی ہیں تو بیس قسطیں اور جب ہیروئن پر اچھا وقت آتا ہے تو اس کے خوش ہونے سے پہلے ختم کر دیتی ہیں۔ "رقص بسمل" بالکل پاکستان ریلوے کی طرح رواں دواں ہے۔ مکمل ناول "محبت مارچ کا موسم" سائرہ رضا نے بہترین لکھا ہے، لیکن آئندہ ماہ دیکھ کر افسوس ہوا۔ "محبت مانگتی ہے" بلاشبہ ایک اچھی کہانی ہے۔ اینڈ تو بہت ہی اچھا تھا۔ لڑکی کو اتنا ہی حوصلہ مند ہونا چاہیے۔ اپنی عزت، اپنی وقار بھی کوئی چیز ہے۔ جہاں عزت نہ ملے وہاں محبت کچھ کام نہیں آتی۔ "دعائے خیر ہوں" بہترین کاوش تھی۔ سیاہ حاشیہ اچھا۔ لگا میرا اندازہ ہے، شانزے صالحہ آپا کی بیٹی ہے۔ افسانہ "پہیلی" اچھی کہانی تھی۔ مریم کا فیصلہ اچھا لگا۔ "کامیاب عورت" میں کمی سی محسوس ہوئی۔ "آزمائش" بھی ٹھیک تھی۔ "جیت ہماری ہے" سدرہ حیات نے اچھی منظر نگاری کی، پاکستانیوں کے جذبات کی "میں ایک قاری ہوں" کیا کہوں اس بارے میں۔ پڑھ کر لطف آیا اور سب سے آخر میں پورے شمارے کا سب سے بہترین افسانہ "اہل جنون باقی ہیں" اتنے کم الفاظ میں اتنا

جامع افسانہ، تحریر میں روانی، بے ساختگی خوب تھی۔

ج ۔ اپنی پیاری آنٹی ساجدہ افتخار کو ہمارا وعلیکم السلام پہنچا دیں اور ان سے کہیں رائٹنگ کی پروانہ کریں، ہمیں ہر طرح کی رائٹنگ پڑھنے کی عادت ہے۔ آپ کو سرورق خاص نہیں لگا، تب ہی تو ماڈل نے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا آپ کو۔ بے چاری کا دل توڑ دیا آپ نے۔ شمارے پر آپ کا سیر حاصل تبصرہ اچھا لگا۔

فوزیہ ثمروٹ، ہانیہ عمران آمنہ میر نے گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

صبر تہذیب ہے محبت کی
وہ سمجھتے ہیں بے زباں ہیں ہم

شعاع والے اتنے ستم گر تو کبھی نہیں رہے۔ مسلسل میری تحریر کی توہین کیے جائے رہے ہیں۔ باقاعدگی سے کوئی بے عزت (شعاع سے) ہونا ہم سے سیکھے۔ ہر ماہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ جیسا ہمارے حکمران دے قرضہ پہ قرضہ عوام کی ناتواں گردنوں میں ڈال رہے ہیں۔ سرورق خوب صورت لگا۔ اس بار ہم نے سوچا، ذرا سی بھی تنقید نہیں کرنی، بلکہ ڈبل مکھن لگانا ہے تاکہ مابدولت کا خط شریف اپریل میں شامل ہو سکے۔ ماڈل سوبر سی کیوٹ لگ رہی تھی۔ مجھے تو عرصہ ہوا ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگائے ہوئے۔ شرٹ کے ساتھ میچنگ گھڑی پیاری لگی۔ اف ف ف یہ لمبے ناخن ذرا بھی اچھے نہیں لگے۔ ہاں صرف انگوٹھوں کے لمبے ناخن پسند ہیں۔ میرے خیال میں میری مدیرہ صاحبہ اس پہ تو مجھے کوئی کرارا سا کمنٹس لازمی دیں گی۔ محبت مانگتی ہے۔ عشنا کا کردار اچھا تھا۔ بولڈ اور حوصلے والا۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔

خاص کر عائشہ تنویر کا انداز تحریر پسند آیا۔ سلسلہ "پیاری باتیں" سب سے فیورٹ ہے۔ سرورق پہ سائرہ رضا کا "محبت مارچ کا موسم" خوشی سے دل جھوم اٹھا، کیونکہ ابھی تک ہماری خوشیاں یہاں ہی وابستہ ہیں۔ خیر چھوڑیں۔ پہلے بات کروں گی صائمہ اکرم کا "سیاہ حاشیہ" اس ماہ کی لاجواب تحریر رہی۔ "رقص بسمل" پڑھا۔ بہت کم تحریر تھی۔ اللہ پاک نبیلہ جی کی مشکلیں آسان فرمائے۔ ہماری پہلی سی خوش مزاج والی نبیلہ جی ہمارے سامنے ہوں۔ "ایک تھی مثال" چلو جی اپنے اختتام کو پہنچا۔ میں دعائے خیر ہوں۔ اچھا لگا۔

اس ماہ کی مسکراہٹیں تمام کی تمام مزے دار تھیں۔ خاص کر کبریٰ عباس کا لطیفہ یونیک اور منفرد لگا۔ باتوں سے خوشبو آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سبق آموز ہے۔ شاعری بھی بہت اچھی لگی۔ خط آپ کے میں سب کے خط اچھے ہوتے ہیں، مگر کوثر خالد کا انداز بیاں بہت دلچسپ لگتا ہے۔ ہر خط ایک الگ ہی داستان سنا رہا ہوتا ہے۔ ارے یاد آیا، سائرہ رضا کے قلم کا ہم پہ ادھار رہا۔ اگلے ماہ دو اکٹھی اقساط پڑھیں گے۔ کیونکہ ناول کے ابتدائے میں ہی ہم نے اینڈ کے صفحے میں باقی آئندہ پڑھ لیا تھا۔

ج ۔ پیاری بچیوں فوزیہ ثمروٹ، ہانیہ عمران، آمنہ میر! یہ لڑکیوں کے دل نازک ہوتے ہیں تو کیا مطلب؟ ہمارا دل کیا فولاد کا بنا ہوا ہے۔ خود ہی کہتی ہیں کہ ہتھ ہولا رکھیں۔ پھر کرارے جواب کی تمنا بھی رکھتی ہیں اور یہ بے زبانی کی بھی خوب کہی، ہم نے تو بخدا گونگی لڑکیوں کو بھی اشاروں کی زبان میں اتنا بولتے دیکھا ہے کہ اللہ کی پناہ!

فوزیہ آپ تو ہمارے تینوں پرچوں کی باقاعدہ قاری ہیں اور مختلف سلسلوں میں شامل بھی رہتی ہیں۔ پھر بھی شکایت۔ اللہ رے یہ نازک دل لڑکیاں.... مکھن کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم آج کل ڈائٹنگ کر رہے ہیں۔

حرا قریشی، بلال کالونی ملتان سے لکھتی ہیں

یک حرفی خط پہلی شعاع (منعکس روشنی) حمد و نعت (باعث ہدایت) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں۔ (رحمت خداوندی بصورت شعاع) عشنا نور سے ملاقات (چھوڑو جی!) دستک (ناٹ انٹرسٹڈ) شعاع کے ساتھ (اپنائیت، انسیت) آزمائش (فیصلہ کن، تفکرے پر) پہیلی (بہترین، شعور کے پرت وا کرتی مارچ کی الوہی تحریر) جیت ہماری ہے (واقعی؟ یہی سچ ہے) محبت مانگتی ہے جو (لطیف قرار و

ثبات۔ رافع اور عشنا کے مکالمے حد درجہ پر لطف) کامیاب عورت، کڑوی حقیقت "سیاہ حاشیہ" محور دلچسپی۔ اہل جنوں باقی ہیں۔ اجالا بکھیرتی تحریر۔ دعائے خیر ہوں بادش بخیر! ایمان کی تحریر پہلے سے اچھی، معتبر "رقص بسمل" اجنبی ہمیشہ کی طرح کبھی پڑھی جو نہیں۔ "نظمیں غزلیں" اثر آفریں.... "مسکراہٹیں میٹھی میٹھی" "باتوں سے خوشبو آئے" "ذوق بصیرت" "کھلتا کسی پہ کیوں!" یہ

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY
READING
Section

کون ہے بھئی حرا قریشی بائیں قطار کے اشعار میں موجود آخری شعر کی صورت۔ خط آپ کے سہولت زندگی "تاریخ کے جھروکے" تحیر و حیرت' باکمال "موسم کے پکوان" شلجم کی بھجیا آج ہی بناؤں گی۔ خوب صورت بنیے جو پہلے ہی سے منظور نظر' خوب صورت ہو۔ وہ عزیزی شعاع کے لیے..... بقول حرا قریشی.....

ج ۔ پیاری حرا! آپ نگارشات بھیج کے بھول جاتی ہیں 'مگر ہم یاد بھی رکھتے ہیں اور باری آنے پر لگا بھی دیتے ہیں۔ (کیا؟ ہماری طرف سے یک حرفی اظہار) "کھلتا کسی پہ" آپ ہی کا ارسال کردہ شعر ہے۔ تبصرے کا شکریہ۔ معذرت چاہتے ہیں ہم بذریعہ ای میل کوئی بھی نگارش قبول نہیں کرتے۔

آسیہ ارم کراچی سے شریک محفل ہیں 'لکھا ہے

شکر ہے جی کہ "ایک تھی مثال" کا اینڈ ہوگیا۔ اب اس کی جگہ زبردست سی کوئی اسٹوری ہونی چاہیے۔ (طاہر لاہوتی) جیسی نبیلہ جی کا "رقص بسمل" عجیب و غریب رقص کرتا گزر ہی رہا ہے۔ "سیاہ حاشیہ" بہت خوب صورتی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ مکمل ناول میں ام ایمان قاضی کا "دعائے خیر ہوں" پڑھا۔ ویل ڈن ام ایمان آپ کی تحریر کی ہیروئن کی تو میں نام اور اس کے کردار کی فین ہوگئی۔ عائشہ تنویر آپ نے آئینہ دکھایا تو اتنا کم کہ ایک صفحہ پر ہی ختم! بہرحال ایک صفحے کا ہی سہی..... ایک قاری کے دل کا اور قلم کا حال سنا کر بے حال کردیا۔ (ہنسا کر بھئی) اب تو سائرہ رضا کا نام ہی کافی ہے' اس پر اتنا اچھوتا سا نام "محبت مارچ کا موسم" اپنے نام کی طرح ہی تھا جیسے مارچ میں جاتی سردی اور آتی بہار (21 مارچ) بہار کا پہلا دن..... حمیرا کی اپنے تایا سے محبت بہت اچھی لگی' ہر باپ کو اپنی بیٹی سے ایسی ہی محبت' انسیت اور اعتماد ہونا چاہیے۔ بنت سحر کا "اہل جنوں باقی ہیں" بہت زبردست تھا' مگر اتنے اہم موضوع پر اتنا مختصر افسانہ' تشنگی ابھی باقی ہے سحر..... "کامیاب عورت" یار یہ عورتوں کے ساتھ خاموش ظلم کب ختم ہوگا۔ فرزانہ کھل کا "محبت مانگتی ہے جو" اچھا ناول تھا' کیا بات ہے اب تمام اسٹوریز ماضی سے جڑ جاتی ہیں۔ ماضی حال پر بازی لے جاتا ہے۔ پلیز ہر کہانی کو ماضی سے جوڑنا ضروری ہے کیا۔

ج ۔ محترمہ آسیہ ارم! ہم تو خود آپ کی طرف سے تشویش میں مبتلا تھے کہ اتنے دنوں سے کہاں ہیں۔ اب پتا چلا کہ یہ سب نامہ بر کی غیر حاضری کی وجہ سے ہوا۔ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کو پرچے میں جگہ ملے نہ ملے۔ ہم نے اپنے دل میں آپ کو بہت جگہ دے رکھی ہے۔ بس اس بات کو یاد رکھیں۔

* * *

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما' ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

گئو ماتا کی وجہ سے شکست

محمد غوری نے جب دوسری مرتبہ دلی پر حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گائیوں کا بہت بڑا گلہ کر دیا۔ اور اس کی آڑ میں پیش قدمی جاری رکھی۔ گائیوں کے احترام کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹتے رہے اور محمد غوری کی فوج آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گائیوں کی ڈھال کی آڑ میں دلی فتح کر لیا اور چوہان گائیوں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے، یوں لڑے بغیر دلی فتح ہو گیا۔

تاجر کی عیاری

انگریزوں کا برصغیر میں نزول تاریخی دلچسپی کا حامل ہے۔ عظیم مغل بادشاہ، شاہ جہاں کی بیٹی ایک حادثے میں آگ سے جھلس گئی۔ انگریز ڈاکٹر کی مسیحائی نے اسے صحت دی تو احسان مند بادشاہ نے بطور اظہار ممنونیت کمپنی کو تجارتی حقوق مرحمت کر ڈالے۔ یہی حکم برصغیر کی تاریخ میں اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ انگریزوں نے ساحل سمندر پر بے شمار چھوٹے بڑے قلعے تعمیر کیے اور ان میں ڈاکوؤں سے بچاؤ کے بہانے اسلحہ ذخیرہ کر لیا۔ وہ اسلحہ بعد ازاں مغلیہ حکومت کے خلاف استعمال ہوا اور یوں عیار تاجر مالک بن بیٹھا۔

گویا گرم مسالوں سے شروع ہونے والی تجارت نے انسانوں اور پھر ملکوں کو بھی اپنا غلام بنا لیا۔

مقدس رباب، چکوال

شب دیز

ایران کے بادشاہ خسروِ کے پاس بہت سی نادر اشیا تھیں اور اس کے دربار کا عجوبہ ایک گھوڑا بھی تھا۔ یوں تو خسروِ کے پاس پچاس ہزار گھوڑے، بارہ ہزار اونٹ اور ایک ہزار ہاتھی تھے۔ لیکن وہ گھوڑا جس کا نام "شب دیز" تھا۔ اس کی سواری کے لیے مخصوص تھا۔ یہ نہایت اصیل اور خوب صورت تھا اور مؤرخین کے مطابق آب و آتش کی صفات کا مجسمہ تھا۔ جس طرح رستم کی وجہ سے اس کا گھوڑا رقش بے حد مشہور ہوا، اسی طرح خسروِ کا شب دیز نام کا یہ گھوڑا بے حد مشہور ہوا۔

مشہور روایت ہے کہ یہ گھوڑا خسروِ کو اس قدر عزیز تھا کہ وہ کہتا تھا کہ جو شخص بھی اس گھوڑے کی موت کی خبر اس تک پہنچائے گا، اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ پھر اچانک ایسا ہوا کہ شب دیز نام کا یہ گھوڑا بیمار ہو گیا اور آخر کچھ دنوں بعد مر گیا۔ خسروِ کے لیے اس کا مرنا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ جان کے خوف سے کوئی شخص یہ اطلاع بادشاہ کو نہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن خبر بھی بہر صورت پہنچانی تھی۔ آخر داروغہ اصطبل نے خسروِ پرویز کے مشہور گویے باربد کو وسیلہ بنایا۔ باربد نے خسروِ پرویز کے حضور گا کر شعر پڑھے جن کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"شب دیز نہ اب دوڑ سکے گا، نہ چل سکے گا، نہ سو سکے گا" یہ سن کر خسروِ پرویز چونک کر بولا۔ "شب دیز مر گیا۔" باربد نے کہا۔

"حضور ہی یہ فرما رہے ہیں اور کسی کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔" باربد نے کہا۔

اس پر بادشاہ بولا۔

"بہت خوب، تو نے اپنے آپ کو بچا لیا اور دوسروں کو بھی۔"

شازیہ خان۔۔۔ ملتان

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بحیرۂ روم

حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، وہاں کے افراد ایک شرم ناک فعل میں مبتلا تھے۔ وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رغبت کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے تبلیغ بے اثر دیکھی تو رب العزت سے دعا کی۔ رب تعالیٰ نے ان کی سخت ناشائستہ حرکت کی پاداش میں جو ننگ انسانیت تھی، ان پر سجیل کے پتھر برسائے۔ بارہ فرشتے جو خوش شکل اور جوان تھے، ان کے ذمہ یہ کام سونپا گیا۔ اس سنگ باری سے بستی کے افراد ہلاک ہوگئے۔ قوم لوط کی بستی بالکل تہ و بالا کردی گئی اور اس سرزمین میں دفعتاً" ایک بحیرہ نمودار ہوگیا جو بحیرہ لوط کے نام سے اب تک مشہور ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی تباہ شدہ بستی کا جائے وقوع تمام لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔ لیکن اس سے کافروں نے —— عبرت حاصل نہیں کی، وہ کہتے ہیں کہ اس مقام پر کوئلے اور گندھک کی کان تھی۔ جس کے اڑنے سے یہ بحیرہ نمودار ہوگیا تھا۔ الغرض یہ مقام صرف اہل ایمان کے لیے عبرت نگاہ ہے۔ اہل کفر اس سے سبق نہیں سیکھتے۔

بحیرہ لوط کا پانی ایسا تلخ اور بدبودار ہے کہ کوئی ذی روح اس کو استعمال نہیں کرسکتا اور اس کے کنارے کوئی درخت بھی نہیں اگتا۔

سدرہ، سونیا چوہدری گلاہور

تعرض

ایک مرتبہ چند متشدد قسم کے لوگوں نے رضیہ سلطانہ کی دین داری دیکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ جمنا میں ہندوؤں کے تہواروں پر جو اشنان ہوتے ہیں اور جمنا کے کنارے جو مندروں میں بڑے زور و شور سے گھنٹے بجاتے ہیں، ان سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں حکماً" بند کردیا جائے۔

اپنے مؤقف کو تقویت پہنچانے کے لیے مشورہ دینے والوں نے سلطانہ کے باپ التمش کی مثال بھی پیش کی کہ

"انہوں نے اپنے عہد میں مہاکال مندر مسمار کرا دیا تھا۔ آپ بھی جمنا کے کنارے جتنے مندر ہیں، مسمار کرادیں۔"

اتفاق سے سعد الدین کروی، جو اس زمانے کے ایک معتبر عالم تھے، کو اس بات کا پتا چل گیا، وہ فوراً" سلطانہ کے پاس گئے اور کہا۔

"اے سلطانہ! لوگوں کی باتوں میں نہ آنا۔ آپ کے والد نے جو مہاکال مندر ڈھایا تھا۔ وہ خود اس مندر کے برہمنوں کی التجا پر منہدم کیا گیا تھا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ وہاں آوارگی کا اڈہ بن گیا تھا اور لوگ پوجا پاٹ کے بہانے وہاں آکر فحش حرکات کرتے تھے۔ اے سلطانہ! اسلام نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو ڈھا دینے کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ایران فتح کیا تو وہاں زرتشتی مذہب قائم تھا۔ بے شمار آتش کدے روشن تھے لیکن انہوں نے فاتح ایران ہونے کے باوجود وہاں کے آتش کدوں کو مسمار نہیں کیا اور زرتشتیوں کو ان کی رسمیں ادا کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا۔ دور نہ جائیں۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی مثال لے لیں۔ اس نے سندھ اور ملتان کو فتح کرکے وہاں کے ہندوؤں کی پوجا پاٹ پر کوئی تعرض نہیں کیا اور ایک بھی مندر مسمار نہیں ہونے دیا۔ اے سلطانہ! تم ان بزرگوں

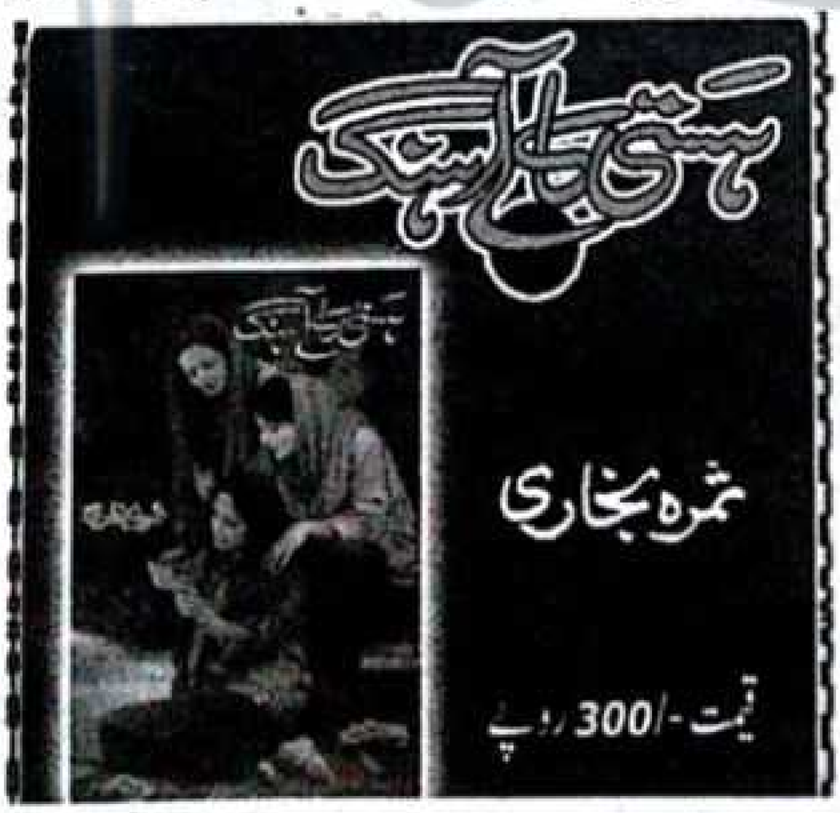

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سے بڑھ کر نہیں ہو‘ اس لیے ایسا قدم ہرگز نہ اٹھانا‘ جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔“

رضیہ سلطانہ نے سعد الدین کردی کی باتیں سن کر ندامت سے سر جھکا لیا۔ اور اعتراف کیا کہ وہ واقعی ان لوگوں کی باتوں میں آگئی تھی۔ مگر اب وہی ہو گا جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور ہندوؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

کنول شاہین‘ جلال پور جٹاں

حجاج بن یوسف کا عجیب واقعہ

ام ابان بنت نعمان بن بشیر الانصاریہ نامی ایک بہت ہی حسینہ‘ جمیلہ‘ فصیح زبان اور ذہین خاتون تھی۔ اس کا پہلا نکاح روح زنباع سے ہوا تھا۔ اس کے بعد جبراً“ حجاج نے اس سے دو لاکھ درہم پر نکاح کیا‘ مگر اس کے دل میں حجاج کی نفرت برقرار رہی۔ ایک مرتبہ آئینہ میں اپنے حسن و جمال اور حجاج کا موازنہ کرتے ہوئے بے ساختہ فی البدیہ اس کی زبان پر یہ اشعار جاری ہوئے۔

ترجمہ: ”ہندہ نہیں ہے‘ مگر عربی گھوڑی جو اچھے گھوڑے کی نسل سے ہے۔ جس سے ایک خچر نے نکاح کیا۔ اب اگر باکمال کو نہ جنے تو کیا خوب ہے اور اگر خچر کو جنے تو سمجھ لو کہ خچر سے خچر ہی پیدا ہوتا ہے۔“

جس وقت یہ شعر پڑھ رہی تھی‘ حجاج کمرے میں داخل ہوا تو اس نے یہ اشعار سن لیے اور مارے غصے کے اسے طلاق دے دی اور عبداللہ بن طاہر کے ذریعے مہر بھجوایا۔

اس غیرت مند خاتون نے ابو طاہر کو وہ رقم بطور تحفہ دے دی اور کہا۔

”ثقیف کے کتے سے نجات کی بشارت سنانے پر میں یہ خطیر رقم تجھے دیتی ہوں۔“

عدت کے بعد عبدالملک بن مروان کو اس کے حسن و جمال کی اطلاع ہوئی تو نکاح کا پیغام دیا۔ خاتون نے ایک تحریر لکھی۔ جس کا مضمون یہ تھا۔

”امیر المومنین کو معلوم ہونا چاہیے کہ برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا ہے۔“

خط پڑھ کر عبدالملک خوب ہنسا اور جواب تحریر کیا۔

”جب برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اس کو سات مرتبہ دھویا جاتا ہے۔ تم بھی برتن کو دھولو‘ قابل استعمال ہو جائے گا۔“

ہندہ ایک شرط پر نکاح کے لیے راضی ہوئی کہ ”میری رخصتی کے وقت حجاج میری سواری کی نکیل تھام کر آپ کے شہر تک پہنچائے گا‘ اس حال میں کہ وہ ننگے پاؤں چل رہا ہو اور اپنے آباؤ اجداد کے اصلی لباس اونٹ کے چرواہوں کے لباس میں ہو۔“

یہ شرط پڑھ کر عبدالملک خوب ہنسا اور حجاج کو حکم دیا کہ وہ ہندہ کو پہنچائے۔

بادشاہ کے حکم کے سامنے حجاج بے بس ہو گیا۔

جب حجاج ہندہ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر حجاج جا رہا تھا تو ہندہ نے دایہ سے کہا۔

”ذرا محمل کا پردہ ہٹاؤ۔“ پھر حجاج سے کہا۔

”اے شتربان! ہمارا ایک درہم گر گیا ہے۔ اٹھا کر دے۔“ ہندہ نے نیچے دینار پھینک دیا تھا۔ حجاج زمین پر درہم ڈھونڈنے لگا تو اس نے کہا۔

”یہاں پر دینار ہے‘ درہم نہیں۔“

ہندہ نے کہا۔ ”نہیں‘ وہ تو درہم ہی تھا۔“ اس نے کہا۔

”نہیں دینار ہی ہے۔“ حجاج نے یقین دلایا۔

ہندہ ہنس کر بولی۔

”میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ گرا تو میرا درہم تھا‘ مگر اس نے مجھے دینار عطا کیا۔ تجھ حقیر کے بدلے عبدالملک بن مروان جیسے بادشاہ کی زوجیت کا شرف بخشا۔“

حجاج پوری بات سمجھ گیا اور بے حد شرمندہ ہوا اور اس سے کوئی جواب نہ بنا۔ اس طرح ہندہ عبدالملک بن مروان کے پاس پہنچ گئی۔

فرزانہ مغل۔۔۔ واہ کینٹ

⁂

READING
Section

آئینہ خانے میں

واصفہ سہیل

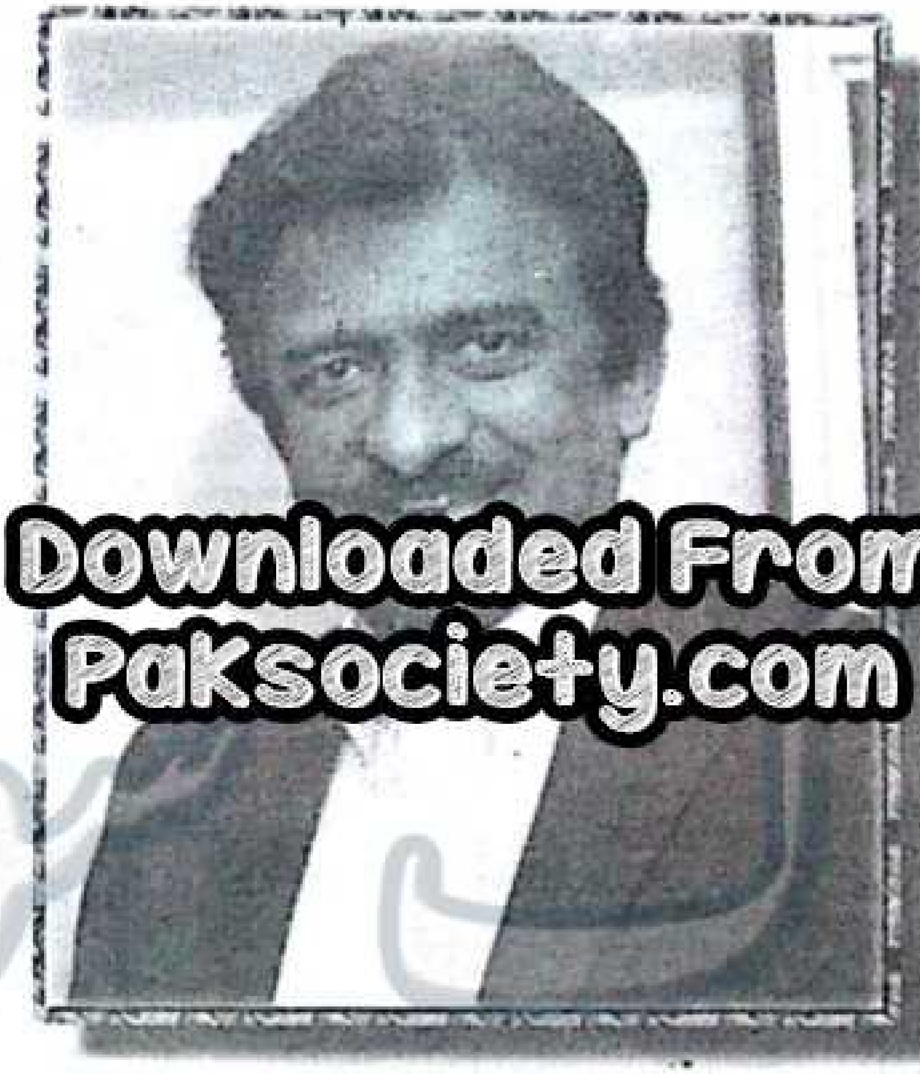

Downloaded From

معیار

معروف اداکار توقیر ناصر کا کہنا ہے کہ ٹی وی چینلز کی بہتات کے باعث ان دنوں ٹی وی ڈراما افراتفری کا شکار ہے۔ پاکستانی اداکاروں اور ڈائریکٹرز کے پاس کام زیادہ وقت کم ہے۔ اسی لیے ڈرامے کا معیار بھی کم ہو رہا ہے' (ریٹنگ کا شکار جو ہیں سب) 'انہوں نے مزید کہا کہ ماضی میں فلموں میں کام کرنے کا ان کا تجربہ اچھا نہیں رہا۔ مگر آج کل اچھی فلمیں بن رہی ہیں اور ان کا مستقبل بھی اچھا نظر آرہا ہے۔ (نئے اداکاروں اور ڈائریکٹرز کو اتنے منجھے ہوئے فنکار کی بات پر سنجیدگی سے غور ضرور کرنا چاہیے اگر وہ ٹھہرنا چاہتے ہیں تو...... ورنہ......؟)

ایک رخ یہ بھی

افغانستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والی عقیلہ آصفی نے پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے کیمپ میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے کرائے پر شامیانے لے کر پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں چند لوگوں نے اپنی لڑکیوں کو بھیجنا شروع کیا۔ عقیلہ نے سب سے پہلے انہیں غیر متنازعہ موضوعات کے متعلق تعلیم دینی شروع کی' انہوں نے سب سے پہلے بچوں کو حفظان اصول کے اصولوں کے تحت گھر سنبھالنے کے طریقے' صحت صفائی' مذہبی تعلیم کے متعلق بتانا شروع کیا اور جب لوگوں کا ان پر اعتماد بحال ہونا شروع ہوا تو پھر انہوں نے جغرافیہ' حساب اور تاریخ پڑھانا شروع کیا۔ ابتدا میں ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ بلیک بورڈ خرید سکیں تو وہ کپڑے کے ٹکڑوں پر سلائی کر کے مضامین لکھا کرتی تھیں اور پھر اسے خیمے کی دیوار پر لٹکا کر بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ لیکن ان کی ہمت اور لوگوں کے ساتھ نے انہیں آج

READING
Section

اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ آج ان کے پاس ایک عمارت ہے اور 9 خیمہ اسکول ہیں۔ جن میں کئی خواتین بچوں کو پڑھانے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں اور اس وقت ان کے اسکولوں میں پندرہ سو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں نو سو لڑکیاں ہیں۔

عقیلہ آصفی کی خدمات کو پوری دنیا میں سراہا گیا ہے اور ایک معروف برطانوی چینل نے ان پر ایک ڈاکیومینٹری بنائی ہے۔ (حیرت کی بات ہے ورنہ تو مغرب والوں کو مسلمان عورت مظلوم ہی نظر آتی ہے) 2015ء میں بھی عقیلہ آصفی کو اقوام متحدہ کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور اب ان کی خدمات سراہتے ہوئے دنیا کے بہترین استاد کے ایوارڈ (گلوبل ٹیچر پرائز ایوارڈ) کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ دس بہترین اساتذہ میں ان کا نام شامل ہے (اللہ کرے کہ یہ ایوارڈ جس کی رقم ایک ملین ڈالر کی خطیر رقم ہے عقیلہ آصفی کو مل جائے۔ شرمین عبید چنائے جیسی خواتین.....؟"

تبدیلی

ماروی میمن سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں پاک فوج کے شعبہ 'تعلقات (آئی ایس پی آر) سے وابستہ تھیں اور خود بتاتی ہیں کہ ان کی ذمہ داری پرویز مشرف کی فوجی اور سیاسی حکومت کو مشورے دینا تھا۔ (یعنی.... وہ بھی....؟) پھر وہ ق لیگ میں شامل ہو گئیں اور قومی اسمبلی کے ایوان کے علاوہ مختلف پلیٹ فارمز پر چوہدری شجاعت حسین کو ملک کا ایک عظیم راہنما ثابت کرنے کے لیے جوش خطابت کا مظاہرہ کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے جنرل ریٹائرڈ پرویز مشرف سے وابستگی اختیار کر لی اور یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ سابق صدر کے مستعفی ہونے پر وہ صدمے سے بے حال ہو گئی تھیں اور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔

مسلم لیگ ن کی قیادت پر جارحانہ تنقید کرنے والی ماروی میمن آج اسی ن لیگی حکومت میں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کی چیئرپرسن ہیں بہ لحاظ عہدہ وزیر مملکت ہیں (تو بھئی اس میں زور کس پر ہے....؟) اس سب کے باوجود ان کی ذہانت، علمیت اور اپنی ذمہ داری نبھانے پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی (لیکن انگلی تو امپائر اٹھاتا ہے ناں اور....؟) وہ ایک کامیاب بزنس وومن بھی ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ فیصل چوہدری مسکرایا اور پھر بجائے مریض کے بارے میں دلائل دینے کے اپنے بارے میں کہنے لگا کہ "آپ کو پتا ہے ناکہ ہماری فیملی برسوں سے وکالت کے شعبے سے منسلک ہے۔ میں اگر چاہوں تو اگلے چودہ سال پرویز مشرف کو عدالت میں بیمار رکھ سکتا ہوں" اس اعلانیے کے بعد مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

(چہرہ۔ مظہر برلاس)

پرویز مشرف اگرچہ بیمار ویمار کوئی نہیں۔ مگر انہیں باہر جانے کا راستہ دے دینا چاہیے۔ ہمارے وزیر اعظم نیک نیت انسان ہیں، سب سے زیادہ بھروسا بھی اللہ ہی پر کرتے ہیں۔ چنانچہ میرا مشورہ ہے کہ وہ اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے پرویز مشرف کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ بے شک وہ انصاف کرنے والا ہے۔

(روزن دیوار سے 'عطاء الحق قاسمی)

☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:-

✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز

✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت

✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی

✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج

✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک

✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ

✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی

✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج

✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن

✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ

✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

فاسٹ فوڈ اب گھر میں بنائیں

ہاٹ ڈاگ برگرز

ضروری اشیاء :

برگر بن (لمبے والے)	چھ عدد
کباب	چھ عدد
سلاد پتے	حسب ضرورت
مایونیز	حسب ضرورت
ٹماٹر	حسب ضرورت
کھیرا	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

مرغی یا گلاٹے کے قیمے میں چنے کی دال، پیاز، لال ثابت مرچ، ہری مرچیں، لہسن، ادرک، نمک اور ثابت گرم مسالا حسب منشا ڈال کر ابال لیں اور پیس کر ٹکیہ بنالیں۔

کباب کو گرم تیل میں دونوں طرف سے تل لیں برگر بن کو لمبائی کے رخ پر درمیان سے کاٹ لیں اور نچلے والے حصے میں مایونیز لگائیں۔ اس پر سلاد پتہ رکھیں۔

پھر ٹماٹر، کھیرا اور کباب رکھ کر تھوڑی مایونیز ڈال کر بن کا دوسرا حصہ رکھیں۔ کیچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔ (اس ترکیب میں آپ گھر میں موجود کوئی بھی کباب استعمال کر سکتی ہیں)۔

چکن شاورمہ

ضروری اشیاء :

مرغی کا گوشت	ایک کلو
پسا ہوا ادرک، لہسن	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	ایک چوتھائی کپ
چلی ساس	ایک کھانے کا چمچہ
پسی رائی	آدھا کھانے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ
پیٹا بریڈ	حسب ضرورت
مایونیز	آدھا کپ
دہی	ایک کپ
کھیرا	ایک عدد
ٹماٹر	دو عدد

ترکیب :

گوشت دھو کر دو انچ لمبے اور ایک انچ چوڑے پارچے بنالیں۔ ایک بڑے پیالے میں سرکہ، پسا ہوا ادرک، لہسن، چلی ساس، پسی لال مرچ اور نمک ملائیں۔ پھر اس میں گوشت کے پارچے شامل کر کے اچھی طرح ملائیں اور اس کو آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

پتیلے میں تیل گرم کریں اور اس میں گوشت ڈال کر درمیانی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں۔ جب گوشت گل جائے تو بھون لیں۔

ٹماٹر اور کھیرے کے باریک ٹکڑے کاٹ لیں۔ ایک پیٹا بریڈ لیں اس میں ایک کھانے کا چمچہ مایونیز لگائیں، دو کھانے کے چمچے گوشت رکھیں۔ ٹماٹر اور کھیرے کے ٹکڑے رکھیں اور ہر شاورمہ میں ایک چائے کا چمچہ دہی ڈال کر رول بنالیں اور چاہیں تو کیچپ اس کے اوپر ڈال کر پیش کریں۔ پیٹا بریڈ نہ ملے تو روٹی یا پراٹھے سے بھی بنایا جا سکتا ہے۔

ہوم میڈ کرسپی زنگر

ضروری اشیاء :

مرغی (بغیر ہڈی)	حسب ضرورت
پسا لہسن ادرک	آدھا چائے کا چمچہ
انڈے	دو عدد
میدہ	تین سے چار کھانے کے چمچے
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
چپس	آدھا کپ
سوکھی ڈبل روٹی کا چورا	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
بن	حسب ضرورت
سلاد پتا	حسب ضرورت
پانی	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ساس پین میں مرغی اور پسا لہسن ادرک ڈال کر کچھ دیر تک پکائیں۔ جب مرغی کا پانی خشک ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ ایک پیالے میں انڈے پھینٹ کر اس میں میدہ، نمک، پسی کالی مرچ اور تھوڑا پانی شامل کر کے آمیزہ تیار کر لیں۔

چکن کو انڈے کے آمیزے میں ڈبو کر بریڈ کرمز سے کوٹ کر لیں۔ ایک پلیٹ میں چپس پھیلا کر چورا کر لیں۔ چکن کو ایک ایک کر کے اس میں کوٹ کریں اور آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں چکن ڈال کر تل لیں۔ سنہری ہو جائے تو اس کو بن میں سلاد کے پتے کے ساتھ رکھ دیں۔ پھر سرونگ پلیٹ میں نکال کر فرنچ فرائیز اور کیچپ کے ساتھ سرور کریں۔

تل گوشت

ضروری اشیاء :

گائے کا گوشت	آدھا کلو
دہی	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
پسا لہسن	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسا ادرک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
پسی سفید مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	ایک چائے کا چمچہ
چلی ساس	ایک چائے کا چمچہ
کچری پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ
پانی	حسب ضرورت

کڑاہی میں تیل گرم کر کے پیاز کو سنہرا کر لیں اس میں گوشت ڈال کر اسے ہلکا سا بھون لیں۔ پھر اس میں اوپر دیے گئے تمام مسالا جات علاوہ تل کے ڈال کر بھون لیں۔ اگر ضرورت پڑے تو پانی ڈال لیں گوشت کو درمیانی آنچ پر گلا لیں۔ بھونتے وقت تل چھڑک دیں۔ لیموں کے سلائس سے سجا کر چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

گاجر کا موس

ضروری اشیاء :

گاجر	آدھا کلو
دودھ	ایک کلو
چینی	ایک کپ
کریم	ایک کپ
جیلاٹن پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
بادام، پستے، چاندی کا ورق	سجانے کے لیے

1 ۔ گاجر کو کش کر لیں۔ دودھ میں گاجر ڈال کر پکنے رکھ دیں، دودھ پک کر آدھا رہ جائے تو چینی ڈال دیں ایک منٹ پکا کر بلینڈر میں پیس لیں۔

2 ۔ جیلاٹن پاؤڈر کو آدھا کپ گرم دودھ میں ملا کر گاجر کے آمیزے میں ڈال کر پیس لیں۔

3 ۔ آدھی کریم ملا کر شیشے کے گلاس یا کسی پیالے میں ڈال کر فریج میں جمانے رکھ دیں۔

4 ۔ جب موس جم جائے تو کریم، بادام، پستے اور چاندی کے ورق سے سجا دیں۔

⁂

ادارہ

خوبصورت بنیے

خوبصورت ' شگفتہ ' ترو تازہ چہرہ

اگر آپ خوب صورت شگفتہ و ترو تازہ چہرہ حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں اور کسی بہترین بیوٹی پروڈکٹ کی تلاش میں ہیں تو پھر جان لیجیے کہ فیشل اور فیس ماسک ہی سب سے نمایاں اور اول درجے پر فائز ہیں۔

تاہم کسی بھی صورت حال میں فیشل کروانے سے پہلے ماہرین سنگھار یہ تجویز کرتے ہیں کہ اگر آپ حساس جلد کی مالک ہیں تو چہرے پر براہ راست فیشل کروانے سے پہلے کسی ڈرما ٹولوجسٹ سے مشورہ کریں۔ کیونکہ فیشل کے دوران استعمال ہونے والے کیمیکلز اور کریموں سے آپ کی جلد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کے برعکس چہرے کی جلد کو نکھارنے و سنوارنے کے لیے تازہ و خشک پھلوں سبزیوں اور مختلف اقسام کی نباتاتی جڑی بوٹیوں کا استعمال قطعی بے ضرر ہوتا ہے۔ حتی کہ یہ اس وقت بھی پر خطر نہیں ہوتا جب آپ کسی قسم کی الرجی کا شکار ہوں۔

ماسک

نرم و ملائم جلد کے حصول کے لیے بادام ' جئی کے دلیے ' شہد اور دہی کے **مکسچر** کو چہرے پر اپلائی کریں۔ 15 منٹ کے بعد نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو کر صاف کریں اور چہرے کی فطری شگفتگی سے لطف اندوز ہوں۔

اسکرب

ہوم میڈ اسکرب بنانے کے لیے ایک کھانے کا چمچہ اخروٹ کا پاؤڈر لے کر اس میں شہد اور لیموں کا رس ملا کر پیسٹ تیار کریں۔ اس **مکسچر** سے چہرے کی اسکربنگ کریں اور کچھ دیر کے لیے لگا کر چھوڑ دیں۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھو کر صاف کرلیں۔

فیس ماسک

چہرے کی کھوئی ہوئی رعنائی کو بحال کرنے کے لیے لوکی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے ایک انڈے کی زردی اور دودھ کے ساتھ ملا کر میش کریں ' چہرے پر یہ فیس ماسک اپلائی کریں اور 30 منٹ کے بعد چہرہ دھو کر صاف کرلیں ' دیکھیں کہ کس طرح آپ کی جلد روشن و چمکدار دکھائی دیتی ہے۔

قدرتی اشیا کی مدد سے چہرے پر نکھار لائیں

1 ۔ پودینے کے پتوں کو پیس کر اس میں شہد شامل کریں اور فیس ماسک بنائیں جو آپ . کی جلد کے مسامات کی صفائی کرے گا اور ان کے کھلے ہوئے منہ بند کردے گا۔

دو کھانے کے چمچے خشخاش لے کر رات بھر کے لیے بھگو دیں ' صبح اس میں تھوڑا سا دودھ شامل کرکے گرائنڈ کرکے پیسٹ تیار کرلیں۔ اس پیسٹ کو چہرے پر لگائیں ' خشک ہوجائے تو ٹھنڈے پانی سے دھو کر صاف کرلیں۔

چہرے پر مساج کرنا ' چہرے کے لیے بہترین ایکسرسائز ہے۔ اس سے آپ خود کو پرسکون اور اپنی روح کو توانا ہوتا ہوا محسوس کریں گی ' یہ آپ کے چہرے کے دوران خون کو بہتر بنانے میں معاونت کرے گا اور اسے جھریوں کا شکار بننے سے محفوظ رکھے گا۔

* * *

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY